ریاستہائے میسور، مدھیہ پردیش، جموں وکشمیر و ہریانہ کے تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ

پیام تعلیم

نئی دہلی

جلد ۶ جولائی ۱۹۶۹ء شمارہ ۷

ایڈیٹر

محمد حسین حسان ندوی

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

اردو بازار جامع مسجد

دہلی ۶

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

پرنسس بلڈنگ جے جے ہسپتال

بمبئی ۳

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

شمشاد مارکیٹ علیگڈھ

قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے سالانہ چندہ ۶ روپے

بچوں کی کوششیں

ہاتھی ہوتا ساتھی اپنا

ہاتھی ہوتا ساتھی اپنا
بڑا مزہ پھر مجھ کو آتا
لمبے چوڑے کان ہلاتا
سونڈ اٹھاتا سونڈ گراتا
صبح صبح وہ گھر آجاتا
تو میں اس کو کہاں بٹھاتا
کیا کھاؤ گے بولو ہاتھی
سن کر بھی وہ چپ ہو جاتا
جو میں دیتا وہ کھا جاتا
سونڈ ہلا کر کچھ بتلاتا
ڈر جاتے سب میرے ساتھی
چلاتے بس ہاتھی ہاتھی
میں کہتا وہ میرا ساتھی
چلو یہاں سے ساتھی ہاتھی
سونڈ پکڑ کر اس پر چڑھتا
پر وہ مجھ کو نہیں گراتا

قمر احمد آزاد (دھتاسوی)

خلیفہ کے بچوں کی عید

یہ بات ہے بہت دنوں پہلے کی بات ہے۔ عرب میں ایک بار عید آئی تو لوگوں نے پہلے ہی سے عید کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اپنے بال بچوں کے لیے اچھے سے اچھے کپڑے بنوائے اور خوب قیمتی سامان خریدا۔

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے صاحب زادوں نے سوچا۔ ہمارے باپ تو خلیفہ ہیں۔ وہ ہمارے لیے ان سے کہیں اچھے سامان خریدیں گے۔ ایسے کپڑے ہوں گے کہ سب دیکھتے رہ جائیں گے۔ لیکن ہوتے ہوتے عید بالکل قریب آگئی۔ عید کا چاند بھی دیکھا جا چکا۔ پر ان کے گھر کوئی سامان نہ آیا تو یہ بچے اپنی والدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کہنے لگے "امی جان کل عید ہے ہمارے تمام ساتھیوں کے لیے اچھے اچھے کپڑے بن گئے ہم کیا پہنیں گے؟" ان کی والدہ نے کہا "کیا تمہارے پاس کپڑے نہیں ہیں؟" انھوں نے جواب دیا "کپڑے تو ہیں لیکن سب پرانے ہیں کوئی ایک جوڑا بھی صحیح سلامت نہیں ہے سب میں پیوند لگے ہیں۔"

والدہ نے فرمایا "تو کیا ہوا تم وہی کپڑے پہن کر عید کی نماز پڑھ آنا۔"

لیکن بچے کہاں ماننے والے تھے۔

"نہیں امی جان! ہمارے لیے بھی کپڑے بنوا دیجیے نیا جوتا لا دیجیے، سب لوگ نئے کپڑے پہنیں گے اور ہم لوگ خلیفہ کے بیٹے ہو کر پھٹے پرانے کپڑوں میں عید کریں۔"

بے چاری ماں بچوں کو رات بھر سمجھاتی رہیں لیکن وہ نہ

بچوں کی دلچسپ و مزیدار کہانیاں

ایک تھی راج کماری	عبداللہ کمال	۳۰/-
ایک تھی رانی	عبداللہ کمال	۳۰/-
آدم خور زنگی	عبداللہ کمال	۳۰/-
افراسیاب کی بیٹی	عبداللہ کمال	۳۰/-
بہادر راج کمار	عبداللہ کمال	۳۰/-
باغی شہزادہ	عبداللہ کمال	۳۰/-
بے وقوف پریاں	عبداللہ کمال	۳۰/-
پریوں کے تحفے	عبداللہ کمال	۳۰/-
پھول شہزادی	فاروق ارگلی	۳۰/-
تیسرا انعام	عبداللہ کمال	۳۰/-
تین شہزادے	عبداللہ کمال	۳۰/-
جادو کا ہاتھ	عبداللہ کمال	۳۰/-
جادو کی بطخ	عبداللہ کمال	۳۰/-
جادو کا گھوڑا	عبداللہ کمال	۳۰/-
جادو کا پھل	عبداللہ کمال	۳۰/-
چڑیوں کی ملکہ	عبداللہ کمال	۳۰/-
خوفناک جادوگر	عبداللہ کمال	۳۰/-
دیو پیکر پرندہ	عبداللہ کمال	۳۰/-
ڈاکٹر بوجھ بجھکڑ	شاہد اقبال	۳۰/-
رحمدل پریاں	عبداللہ کمال	۳۰/-
رستم و سہراب	عبداللہ کمال	۳۰/-
شیش محل	عبداللہ کمال	۳۰/-
شہزادی بدورا	عبداللہ کمال	۳۰/-
شہزادی پری ناد	عبداللہ کمال	۳۰/-
عراق کی شہزادی	عبداللہ کمال	۳۰/-
لنگڑا دیو	عبداللہ کمال	۳۰/-
مسٹر عقلمند	عبداللہ کمال	۳۰/-
مغرور شہزادی	عبداللہ کمال	۳۰/-
بنس مکھ شہزادہ	شاہد اقبال	۳۰/-
ہیروں کا جزیرہ	عبداللہ کمال	۳۰/-

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ نزد جے جے ہسپتال بمبئی ۴۰۰۰۰۳

کی ہم پر آپ کے ابتدائی اور موجودہ مضامین بہت معلومات سے لبریز ہیں۔ چاند کی خبروں کی اشاعت کا سہرا "پیام تعلیم" کے سر رہا جس نے روس کے لونا ۹ سے امریکہ کے اپولو ۱۱ تک باقاعدہ بروقت اور مفصل خبریں شائع کی ہیں۔

نسیم محمد جان آرہ

"پیام تعلیم" کے دو شمارے ملے۔ شکریہ۔ مجموعی طور پر پسند آیا۔

خالد خاتون ملک ستوی دربھنگہ

"پیام تعلیم" برابر موصول ہو رہا ہے۔ اس رسالے میں RECENTTOPICS پر مضامین دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ جیسے ذاکر صاحب کے انتقال پر اتنے مضامین، چاند پر انسانی قدم پہنچنے پر اور ہوا بازی کے اس حادثۂ عظیم پر مضامین آپ نے شائع کیے۔ بہت بہت مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آپ کو اور آپ کے ادارے کو پیام تعلیم کو اور بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

ایچ۔ اسلم گیا

اکتوبر کا رسالہ مل گیا۔ ٹائٹل کا یہ نیا انداز بہت ہی دل کش ہے...... لطیفوں کا سلسلہ دیکھ کر بڑی ہی مسرت ہوئی۔ مضمونوں میں سب سے زیادہ پر مذاق اور دلچسپ۔ میرے خیال میں چاند کے سفر کی تیاری ہے اور سارے مضامین اور نظمیں بھی تعریف کے قابل ہیں۔ پیام تعلیم بچوں میں صلاحیت پیدا کرنے والا پرچہ ہے۔ اسی لیے تو بچوں بچیوں کو بہت محبوب ہے۔

خلیق انجم اشرفی دہلی

اردو ادب کی خدمت (خصوصاً بچوں کے) جس ڈھنگ سے ہو رہی ہے۔ قابل ستائش ہے۔ مضامین معلومات سے پُر ہوتے ہیں۔ اور بچوں کو نئی باتوں سے روشناس کرانا اس کا کام ہے۔ میں نے اس کی شکایت آپ سے ایک بار اور بھی کی تھی کہ بچوں کو الفاظ کے صرف محدود احاطے میں نہ رکھنا چاہیے۔ بلکہ ان کو اردو ادب سے بھی روشناس کرنا فرض ہے اور اس فرض کی ادائگی آپ نے صرف ننھے بچوں تک محدود رکھی ہے۔ آگے بھی قدم بڑھانا ہے۔

مختار احمد بابا دیکھوی ہیڈ ماسٹر میونسپل ہائی اسکول کانپور

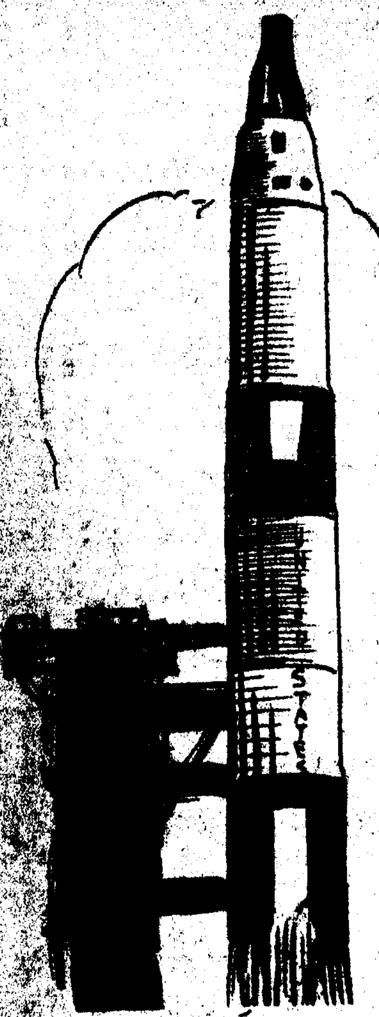
نومبر کا پیام تعلیم نظر نواز ہوا۔ پسند آیا۔ لیکن میری ناچیز رائے میں کتابت بہت جلی ہے۔ اگر کچھ مضامین کی کتابت خفی (نسبتاً باریک) رہے تو زیادہ مواد اتنے ہی صفحوں میں آسکتا ہے۔ میرے خیال میں آپ اس پر غور فرمائیں۔

محمد انوار عالم شمسی۔ بہار شریف۔

ہم نے نومبر کے پیام تعلیم کو اچھی طرح سے مطالعہ کیا۔ اور سرورق ہی کو دیکھ کر طبیعت پھڑک اٹھی۔ آپ کی محنت کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

فہرست

ادھر اُدھر سے



اپالو نمبر ۱۲ خلاء کی طرف :-

کیپ کنیڈی - ۱۰ - نومبر - اپالو نمبر گیارہ کی کامیاب اُڑان کے بعد اب چودہ نومبر کو اپالو نمبر بارہ چاند کی طرف روانہ ہو جائے گا - اپالو نمبر ۱۲ کے کمانڈر چارلس کونریڈ جونیر ہیں (عمر ۳۹ سال) یہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء میں امریکہ کی دو شخصی جیمنی خلائی مشینوں میں اُڑان کر چکے ہیں۔

چارلس کونریڈ کے ساتھی - رچرڈ ایف گارڈن جونیر (۴۰ سال) نے اپالو نمبر ۱۲ کے کمان ماڈیول کے پائلٹ ہیں - یہ ۱۹۶۶ء میں ایک جیمنی مشق میں خلائی پرواز کر چکے ہیں - تیسرے صاحب ایلن امل بین ان کے لیے یہ پہلی خلائی پرواز ہوگی۔

اپالو نمبر ۱۲ اپالو نمبر گیارہ کے مقابلے میں زیادہ دیر تک چاند پر ٹھہرے گا - (غالباً ۳۵ گھنٹے اور تین بار چاند پر گھومے پھرے گا - اس مرتبہ وہ اپنے ساتھ ہندوستان کا جھنڈا بھی لے جائے گا - امریکی حکومت نے ہندوستانی حکومت سے یہ درخواست بھی کی ہے کہ اپالو نمبر بارہ کی اڑان کے وقت خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو مدد کا ہاتھ آگے بڑھائے۔

گوئٹے کا نام آپ نے سُنا تو ہوگا - جرمنی کا مشہور فلسفی شاعر ہے - اس کی ایک مشہور تصنیف فاوسٹ کا دنیا کی تمام مشہور زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے - ابھی تھوڑے دن ہوئے لندن میں فاوسٹ کے مسودے کی ۲۶ سطروں کا ایک لاکھ چودہ ہزار روپے میں نیلام ہوا - یہ ۲۶ سطریں خود گوئٹے کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں اور کاغذ کے آدھے شیٹ میں آئی ہیں

بچوں سے باتیں

مئی کے پرچے میں آپ سے باتیں کرتے کرتے آخر میں ہم نے خوش خبری کے طور پر آپ سے کہا تھا: "اگلے پرچے میں خدا نے کیا تو بعض بہت دل چسپ مضمون شائع ہوں گے۔ انتظار کیجیے۔"

مگر مئی کے شروع میں ذاکر صاحب قبلہ اچانک ہم سے رخصت ہوگئے۔ بہت بڑا حادثہ تھا جامعہ کے لیے، مکتبہ جامعہ کے لیے، پیامِ تعلیم کے لیے۔ ہم نے جون کا پرچہ ان کے حالات کے لیے مخصوص کر دیا اور جون میں شائع ہونے والے مضمون جولائی کے پرچے میں شائع ہو رہے ہیں۔

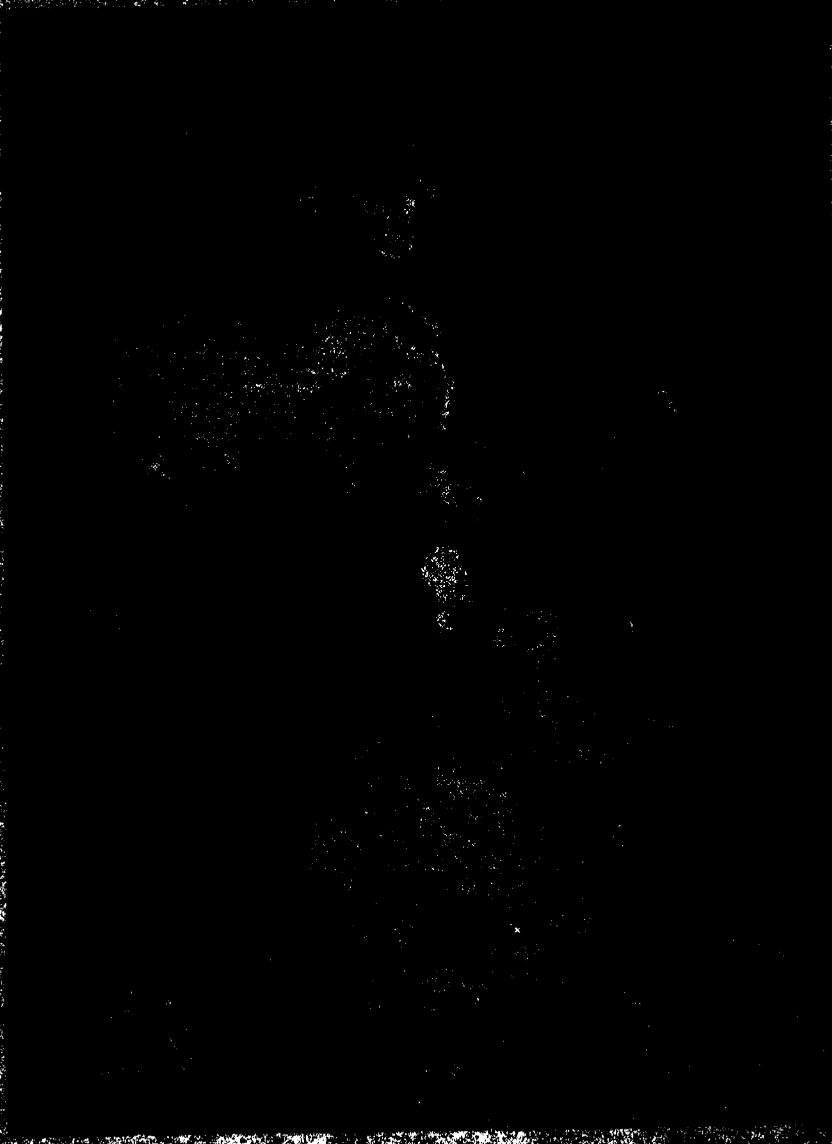
اور اب ان مضمونوں کو غور سے پڑھیے۔ سب سے پہلے تو جاوید اشرف کی نظم پڑھیے۔ ننھے میاں کا خواب۔ کتنی مزے کی ہے۔ پھر غلام حیدر صاحب کی کہانی ہمارے ننھے پیامیوں کو خاص طور پر اچھی لگے گی۔

اور صاحب ایتھوپیا کی لوک کہانی "کون بُری عادت چھوڑ سکتا ہے" کتنی دل چسپ کہانی ہے۔ ہمارے امین صاحب نے ترجمہ بھی خوب جی لگا کے کیا ہے۔ ترجمے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ پن نہ ٹپکے۔ اس کہانی میں یہ عیب آپ کو دُور دُور نظر نہ آئے گا۔

پھر محترمہ آصفہ مجیب کی کہانی "لال شہزادہ" پڑھیے۔ محترمہ آصفہ مجیب کبھی کبھی لکھتی ہیں، مگر جب لکھتی ہیں تو خوب لکھتی ہیں۔ یہ ہمارے لیے بڑی خوشی بڑے فخر کی بات ہے کہ ہماری درخواست کو کبھی رد نہیں فرماتیں۔

شعیب اعظمی صاحب کا مضمون "غالب اپنے خطوں کے آئینے میں" کی آخری قسط اس پرچے میں چھپ رہی ہے۔ آسٹریلیا کے جانوروں والا مضمون اگلے (اگست کے) پرچے میں ختم ہوگا۔ اِسے آپ نے خاص طور پسند کیا ہے۔

لینن والا مضمون بھی خدا کرے آپ کو اچھا لگے۔ یہ بھی ابھی ناتمام ہے۔ مگر اسے پڑھ کر آپ کو چند باتوں کا اندازہ ہو جائے گا۔ لینن اپنے بچپن میں بہت چنچل۔ بہت ہنسوڑ بہت کھلنڈرے تھے مگر پڑھنے لکھنے میں بھی اتنے ہی تیز تھے۔ ا اسا سبق



یاد کرنے یا دہرانے کے بعد ہی کھیل کود یا شرارتوں میں حصّہ لیتے تھے۔

نظموں میں سے جاوید اشرف کی نظم کے علاوہ "صبح" پر حضرت خضر برنی اور جناب عبداللہ شرقی کی نظمیں پڑھیے۔ اقبال نصیب صاحب کی دُعا پڑھیے۔ اور ہاں مولانا بدرالدین صاحب کی نظم کھلی ہوا کا مدرسہ پڑھیے۔ یہ سب آپ کو پسند آئیں گی بیچ بیچ میں منہ کا مزہ بدلنے کے لیے لطیفے بھی پڑھیے۔

نظموں کے بارے میں ہم اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ پیام تعلیم پیامیوں کا یعنی آپ لوگوں کا پرچہ ہے۔ اس میں ایسی ہی نظمیں چھپ سکتی ہیں جو آپ لوگوں کی سمجھ سے باہر نہ ہوں۔ دلچسپ ہوں مزے دار ہوں۔

خوشی کی بات ہے کہ ہمارے بہت سے ساتھی اور بزرگ برابر ہماری سرپرستی فرماتے ہیں۔ نظمیں تو نظمیں غزلوں سے بھی ہمیں نوازتے ہیں بعض حضرات ایسی نظمیں بھیج دیتے ہیں جنھیں نظم کی جگہ نثر کہا جاتا تو زیادہ اچھا رہے گا۔ یہ حضرات اس طرح کے تبرکات ہمیں بھیجنے سے پہلے کسی پڑھے لکھے سمجھ دار شاعر کو دکھا لیا کریں تو کیسا اچھا ہو۔ غزلیں تو پیام تعلیم میں کبھی چھپی ہی نہیں نہ آئندہ اس طرح کا کوئی ارادہ ہے۔ غزلیں بھیجنے والے حضرات ہماری طرف سے معذرت قبول فرمائیں۔

جون کا پرچہ تو آپ نے پڑھ لیا ہوگا۔ نہ جانے کیسا لگا۔ خدا کرے اچھا ہی لگا ہو۔ آج کل جامعہ میں چھٹیاں ہیں۔ کافی لوگ باہر گئے ہوئے ہیں لیکن جو تھوڑے بہت موجود ہیں انھوں نے اسے بہت پسند کیا۔

ایک بات کا خیال رکھیے گا۔ اس (جون کے) پرچے کو بہت حفاظت بہت احتیاط سے رکھیے گا۔ یہ پرچہ اب کسی قیمت پر بھی آپ کو نہ ملے گا۔ اگر آپ کے پاس ذاکر نمبر ہے تو وہ بھی بہت قیمتی چیز ہے۔ بہت سے پڑھے لکھے لوگوں نے ان دونوں پرچوں کو ذاکر صاحب کے حالات کے بارے میں تاریخی دستاویز بتایا ہے۔ بہت سے مصنفوں نے اس میں سے مضمون اکثر بلا حوالہ نقل کیے ہیں۔

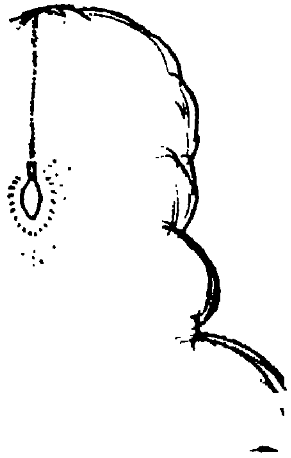
جون کا پرچہ چونسٹھ صفوں کی جگہ اسّی صفوں کا نکلا ہے۔ پھر بھی ہم نے قیمت وہی (۶۰ پیسے) رکھی ہے جو پیامی سالانہ خریدار بننا چاہیں تو بہتر ہے کہ اس پرچے سے خریداری کا سلسلہ شروع کریں۔

پیام تعلیم کا اگلا شمارہ اللہ نے کیا تو اور بھی دلچسپ ہوگا اتھوپیا کی لوک کہانی۔ انڈونیشیا کی لوک کہانی غلام حیدر صاحب کی کہانی کھلونوں کی جنگ۔ حاجی عبدالملک صاحب کا مضمون لنکا کے دن رات۔ غرض اس کا ہر حصہ خاص طور پر دلچسپ ہوں گے۔

ننھے میاں کا خواب

جناب جاوید اشرف

مُنی تمہیں خبر بھی ہے کل رات کیا ہوا
ٹھہرو، ابھی بتاتا ہوں تم کو میں ساری بات
باجا سا بج رہا تھا مرے کان کے قریب
حیران ہو کے میں نے ذرا غور جب کیا
کمرے میں ہلکا نیلا تھا اک بلب جل رہا
جیسے کہ چاند خود مرے کمرے میں آگیا
کپڑے تھے اُس کے چاندی کے موتی جڑے ہوئے
خود بھی سفید موتی بھی اس کے سفید تھے



کمرے میں میرے آئی تھی اک چاند سی پری
کل رات جانے کیسے مری آنکھ کھل گئی
شاید اسی سبب سے مری آنکھ کھل گئی
دیکھا تو میرے کمرے میں کچھ روشنی سی تھی
اس نیلی روشنی میں پری تھی کھڑی ہوئی
اب نیلی روشنی نہ تھی اک چاندنی سی تھی
مُنی میں تم سے کیا کہوں کیسی تھی وہ پری
آپا سے بھی بڑی تھی وہ باجی سے بھی بڑی



کاندھے پہ ننھے ننھے تھے دو پَر لگے ہوئے — اک ہاتھ میں تھا ہار تو اک میں کتاب تھی
مجھ کو جو دیکھا جاگتے، بولی کہ، دیکھ لو — تحفہ تمھارے واسطے لائی ہے اک پری
خوشبو سے میرا کمرہ تھا سارا مہک رہا — پھولوں کے ہار ہی سے یہ خوشبو تھی آرہی
آگے پری جب آئی تو میں نے کیا سلام — چہرے پہ اُس کے آگئی کچھ اور روشنی
مجھ کو گلے سے اس نے لگاتے ہوئے کہا — شاباش میرے ننھے، تری عمر ہو بڑی
اللہ کے خزانے کی چابی یہی تو ہے — لو میں تمھیں بتاتی ہوں اک بات کام کی
بچے جو حکم اپنے بڑوں کا ہیں مانتے — کرتے نہیں جو آکے شکایت بُری بھلی
پڑھتے ہیں پورے سال جو محنت سے شوق سے — ماں باپ کے بھی حکم بجالاتے ہیں سبھی
استاد کی جو کرتے ہیں عزت خلوص سے — پھولوں کا ہار دیتی ہے لاکر اُسے پری
اگلے برس پھر آؤں گی اچھے کیے جو کام — لو تحفہ تم یہ میری طرف سے میں اب چلی

ڈالا گلے میں ہار مرے اور اس کے بعد
وہ پھر سے اڑ کے چاند کی جانب چلی گئی

کمرے میں اس کے بعد اندھیرا سا چھا گیا — دوبارہ خود بخود ہی مری آنکھ لگ گئی
لیکن یہ میں نے سوچ لیا ہے کہ سال بھر — محنت کروں گا خوب ہی، گھڑی، بہت کڑی
مانوں گا اپنے سارے بزرگوں کا حکم میں — ہرگز نہیں لڑوں گا کسی سے میں اب کبھی

اچھے جو ہوں گے کام تو پھر سال بھر کے بعد
پھولوں کا ہار میرے لیے لائے گی پری

پہلے تو خوب شوق سے سنتی رہی یہ بات — اور اس کے بعد جوش میں منّی یہ کہہ اٹھی

میں بھی پڑھوں گی شوق سے مانوں گی سب کی بات
میرے لیے بھی لائے گی تحفہ کوئی پری



کون بڑا ہے؟

جناب غلام حیدر ایم۔ اے۔



ایک لومڑی اور ایک بھیڑیا دونوں ساتھ ساتھ گھوم رہے تھے۔ چلتے چلتے سڑک پر آ گئے۔ سڑک پر ٹین کا ایک بڑا سا "ڈبا" پڑا تھا۔ جب اُسے اِدھر اُدھر ذرا لڑھکایا تو معلوم ہوا کہ اس میں مکھن بھرا ہوا ہے۔ بس پھر کیا تھا، دونوں کی رال ٹپک پڑی۔ ظاہر ہے مکھن ان دونوں کو بہت پسند تھا۔

"اب ہمارا ناشتہ ذرا مزے کا ہوگا۔!" بھیڑیے نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا

"مگر یہاں نہیں"! لومڑی جلدی سے بولی "یہاں کھانے میں بہت خطرہ ہے۔ دیکھتے نہیں ہم اس وقت سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے ہیں۔ ہم اس ڈبے کو لڑھکا کر اُدھر درختوں کے جھنڈ میں لے جائیں، وہاں ہمیں کوئی نہ دیکھ سکے گا۔ وہاں مزے میں بیٹھ کر ناشتہ ہوگا۔"

"ہاں بی لومڑی، تم ٹھیک کہتی ہو" بھیڑیے نے کہا اور درختوں کے جھنڈ کی طرف ڈبے کو لڑھکانے لگا۔ اُس نے خود اکیلے ہی ڈبے کو دھکیلا اور ایک بار

کے دل میں لالچ پیدا ہو گیا تھا، کیوں نہ اس ڈبے کا سارا مکھن اُسی کے حصے میں آئے!

ڈبے کو پوری حفاظت کے ساتھ جھنڈ میں پہنچا دیا گیا تو لومڑی بولی:

"دیکھو بھیڑیے میاں، اس ڈبے میں اتنا مکھن تو ہے نہیں کہ ہم دونوں کا پیٹ بھر جائے۔ اس کے بانٹنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ ذرا سوچو، بانٹنے کے بعد تو ہم میں سے کسی ایک کا پیٹ بھی اچھی طرح نہ بھرے گا میرے خیال میں تو سارا مکھن ہم دونوں میں سے کسی ایک کو کافی ہوگا!"

بھیڑیے میاں اقرار میں سر ہلاتے رہے۔ "مگر ہم میں سے اسے کھائے کون؟"

"[illegible] ہم میں سے جو بڑا ہو اُسے ملنا چاہیے یہ مکھن" لومڑی نے فوراً جواب دیا۔

"مجھے منظور ہے" بھیڑیے نے جواب دیا اور سوچنا شروع کیا کہ کون سی جھوٹی سچی کہانی گھڑے



ڈبے کا سارا مکھن اسی کے حصے میں آجائے۔

— آخر تھوڑی دیر بعد بھیڑیا ہی بولا : "تم کہتی ہو کہ یہ مکھن اسی کا حصہ ہے جو عمر میں بڑا ہے، اس صورت میں تو میں ہی تم سے بڑا ہوں!"

"کیسے —؟" لومڑی نے پوچھا۔

"تمھیں وہ پہاڑ نظر آرہا ہے —؟" بھیڑیے نے سامنے والے اونچے سے پہاڑ کی طرف اشارہ کیا

"ہاں نظر آرہا ہے" لومڑی نے سر ہلایا۔

"جب میں بچہ تھا" بھیڑیے نے کہا "تو یہ پہاڑ اس وقت زمین سے اُگا نہیں تھا۔ بس یہاں چاروں طرف بہت سی کیچڑ تھی اور اُس کے بیچ میں یہ ایک ہت چھوٹا سا ٹیلا تھا اور اس کے نیچے جو یہ جھیل ب نظر آرہی ہے اس وقت یہاں برساتی پانی کا ایک چھوٹا سا گڑھا تھا —!"

لومڑی گھاس پر لیٹ گئی اور بڑے زور سے ہنسی۔

"کیوں کیوں، تم کیوں ہنس رہی ہو؟" بھیڑیے نے جلدی سے پوچھا۔

"میں اپنی ہنسی روک ہی نہیں سکتی" لومڑی نے جواب دیا "میرے دو بچے ہیں۔ ان میں چھوٹا والا بچہ بالکل تمھاری عمر کا ہے!"

بھیڑیے میاں مات کھا گئے۔ انھیں اپنی ہار پر اتنی شرم آئی کہ وہ آگے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکے اور چپ چاپ وہاں سے کھسک گئے۔

محمد حسین حسان ندوی

لینن ـــ اپنے بچپن میں

ولادامیر الیچ الیانوو VALADIMIRILYICH (لینن) ILYANOV اپریل ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ نام ہمارے آپ کے لیے بڑا ٹیڑھا سا ہے اس لیے آئندہ ہم وہی نام لکھیں گے جو اس وقت اُن کے دیس روس میں بلکہ ساری دنیا میں مشہور ہے۔ وہی ـــــ لینن

دریائے والگا کے قریب ایک شہر ہے سمبرسک SIMBIR SIK لینن اسی قصبہ یا شہر میں پیدا ہوئے اب اس شہر کا نام انھی کے نام پر الیانووسک ILYAN-OVSK رکھا گیا ہے۔

لینن کے باپ الیانکولے ای ورچ ILYANE KOLAYE VICH پبلک اسکول کے انسپکٹر تھے۔ ابھی یہ تھوڑی عمر کے تھے کہ باپ کا انتقال ہوگیا بڑے بھائی نے سرپرستی کی اور ان کی مدد سے انھوں نے یونی ورسٹی تک تعلیم پائی۔

یونیورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہو کر انھوں نے استادی کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ نمونے کے استاد تھے بڑے حلیم، بردبار، نیک، شریف اپنے شاگردوں کے سچے ہمدرد۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کو کبھی سزا نہ دی، کبھی ہیڈ ماسٹر سے ان کی شکایت نہ کی۔ آسان سے آسان عبارت میں بچوں کو سبق سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ اتوار کے اتوار وہ کمزور بچوں کو پڑھاتے تھے جنھیں گھر پر کوئی پڑھانے والا نہ تھا۔ اس لیے ان کے شاگرد انھیں دل سے چاہتے تھے دل سے ان کی عزت کرتے تھے۔

ان کی بیوی ماریا الیکزنڈروونا (لینن کی ماں) MARIA ALEKENOROVNI ایک ڈاکٹر کی لڑکی تھیں انھیں سماجی تقریبوں اور مشغلوں سے ذرا دلچسپی نہ تھی وہ بس ہر وقت اپنے بچوں کے ساتھ گھر پر رہتی تھیں اور ان کی دیکھ بھال میں لگی رہتی تھیں۔

تو بھئی اس نیک، شریف اور ہمدرد گھرانے میں یہ ننھا بچہ (لینن) پروان چڑھا۔ یہ اپنے گھر میں تیسرا بچہ تھا۔ بہت چونچال، چنچل، کھلنڈرا، ہنسوڑ۔ اس کی ایک چھوٹی بہن تھی اولیا (OLYA) اس سے ڈیڑھ برس چھوٹی تھی۔ یہ بھی بڑی پیاری بچی تھی اپنے بھائی لینن کی طرح زندہ دل اور شریر، دونوں گھر میں خوب اُودھم مچائے رکھتے تھے۔

پانچ برس کی عمر میں ماں کی نگرانی میں دونوں بھائی بہنوں نے پڑھنا لکھنا شروع کیا ان کے باپ ان کے لیے بچوں کی کتابیں منگواتے تھے۔ بچوں کے رسالے

منگواتے تھے اور یہ دونوں انھیں بڑے شوق سے پڑھتے تھے گھنٹوں پڑھتے رہتے تھے۔

تھوڑے ہی دنوں بعد لینن روسی تاریخ کی کہانیاں اور نظمیں پڑھنے لگا۔ پر وہ بڑا ذہین بچہ تھا تھوڑی دیر میں بہت کچھ پڑھ ڈالتا اور پھر وہ اپنی بہن کے ساتھ کھیل کود میں لگ جاتا۔ دونوں خوب بھاگ دوڑ مچاتے سارا گھر سر پر اٹھا لیتے۔ دونوں کو شور غل والے کھیل ہی اچھے لگتے تھے گرمی کے موسم میں وہ لان میں یا پائیں باغ میں خوب دوڑیں لگاتے۔ درختوں پر چڑھتے اور اپنے بڑے بھائی بہنوں کے ساتھ کھیلتے کودتے۔

لینن میاں شریر تو تھے ہی پر ان میں ایک عادت بہت اچھی تھی بہت ہی اچھی شرارت کرتے میں اگر ایسی ویسی بات ہو جاتی کوئی غلطی کر بیٹھتے تو فوراً اسے مان لیتے۔ پانچ برس کے تھے کہ انھوں نے اپنی بڑی بہن کا فٹ رول توڑ دیا اور انھیں یہ بات بتا بھی دی۔ بڑی بہن نے پوچھا تم نے اسے کیسے توڑا انھوں نے فوراً بتا دیا کہ ایسے توڑا۔ لینن کی ماں لینن کی اس بات سے بہت خوش ہوتیں۔ کہتیں میرا بیٹا کبھی گھٹیا بات نہیں کرتا، کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

آٹھ برس کی عمر میں وہ اپنی پھپھی کے ہاں قازان گئے وہاں اسی طرح کی بات ہو گئی۔ بچے کھیل کود رہے تھے۔ ایک کمرے میں چھوٹی سی میز پر شیشے کی صراحی رکھی تھی سب شور مچاتے ہوئے اس کمرے میں گھسے۔ اتفاق سے لینن صاحب میز سے ٹکرا گئے۔ شیشے کی صراحی فرش پر گری اور گرتے ہی پاش پاش ہو گئی۔

اتنے میں پھپھی بھی آگئیں اور پوچھا بیٹھیں بچو! یہ صراحی کس نے توڑی ہے؟" اور جناب سب نے ایک ساتھ مل کر نعرہ لگایا "ہم نے نہیں توڑی، ہم نے نہیں توڑی" انکار کرنے والوں میں ہمارے لینن میاں بھی تھے۔

اب سنئے۔ تین مہینے کے بعد لینن صاحب اپنے گھر لوٹ آئے تو ایک دن رات کو سوتے وقت ان کی امی بچوں کے کمرے میں گئیں۔ جوں ہی وہ لینن کے پلنگ کے پاس پہنچیں اچانک انھوں نے رونا شروع کیا "میں نے پھپھی اماں کو سچی بات نہیں بتائی کہہ دیا کہ صراحی مجھ سے نہیں ٹوٹی پر وہ مجھی سے ٹوٹی تھی۔"

ساڑھے نو سال کی عمر میں لینن اسکول میں داخل ہو گئے۔ وہ بہت ہی ذہین اور شوقین طالب علم تھے۔ اپنے اور بھائی بہنوں کی طرح ان میں ایک اچھی عادت تھی بہت اچھی جو کام بھی کرتے تھے پوری دلچسپی سے کرتے تھے پوری لگن سے کرتے تھے اس کو انجام دینے میں پوری احتیاط برتتے تھے اور یہ ماں باپ کی اچھی تربیت کا طفیل تھا۔ خصوصاً ان کے باپ نے اپنے سب بچوں کو اسی ڈھنگ پہ ڈال دیا تھا۔

لینن کے استاد کہا کرتے تھے کہ سبق پڑھاتے وقت استاد کی باتوں کو لینن بہت دھیان سے، پوری توجہ سے سنتے تھے۔ اس طرح سبق کا مطلب اچھی طرح سمجھ لیتے تھے۔ اس کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ ان کی اپنی ذہانت سے بھی اس میں بہت مدد ملتی تھی۔

شام کے وقت ان کے سب بھائی بہن "ہوم ورک" کے سلسلے میں کھانے کے کمرے میں ایک بڑی میز کے چاروں طرف بیٹھ جاتے تھے۔ سب کے ساتھ لینن بھی۔ لیکن اکثر ہوتا یہ

تھا کہ لینن جلدی سے اپنا سبق دہرا کر کھیل کود میں لگ جاتے تھے۔ اکثر بھائی بہنوں کو پریشان بھی کرتے تھے انھیں پڑھنے نہیں دیتے تھے۔

ان کے باپ گھر میں ہوتے تھے تو وہ انھیں اس کمرے سے لے جاتے تھے۔ ان کے ہوم ورک کو خود دیکھتے تھے اور اچھے ڈھنگ سے انھیں پڑھنے لکھنے میں لگا لیتے تھے۔ لینن ہر سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دیتے تھے لیکن اگر وہ گھر میں نہ ہوتے تو ڈائننگ روم کا امن و سکون بس تھوڑی دیر کا مہمان ہوتا۔

شطرنج تو بس یوں سمجھیے کہ ان کا خاندانی کھیل تھا۔ لینن کے باپ شطرنج کے شوقین تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی ان کے سب بچوں کو اس کھیل سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ لینن تو آپ جانیے جس کام میں ہاتھ ڈالتے تھے پورے انہماک سے کرتے تھے۔ شطرنج کا کھیل انھوں نے اپنے بڑے بھائی شاسا کی طرح بڑی توجہ سے سیکھا تھا۔ اس کھیل کے بارے میں انھوں نے کئی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اور تھوڑے دنوں میں اچھے کھلاڑی بن گئے۔

شام کے وقت، گھر میں چہل پہل رہتی۔ سب بچے اسکول سے واپس آجاتے۔ کچھ دیر آرام کرکے پڑھائی میں لگ جاتے پھر تفریحی مشغلوں کی باری آتی۔ شطرنج بھی کھیلا جاتا! لینن کے باپ بھی کھیلتے۔ شاسا اور لینن بڑے اچھے کھلاڑی تھے ان کے باپ کو بہت سوچ سمجھ کر چالیں چلنا پڑتیں۔

ہفتے کا دن اس گھر میں خاص طور پر بڑی دلچسپی، بہت خوشی کا دن ہوتا۔ اس دن بچے اپنا اخبار نکالتے تھے۔

یہ ہفتہ وار تھا۔ اس لیے اس کا نام "سپوتنک" رکھا گیا۔ بڑے بھائی شاسا اس کے چیف ایڈیٹر تھے۔ شاسا رنگین پنسلوں سے اس کا خوبصورت سرورق بناتے اور موٹے موٹے حرفوں میں اس کا نام لکھتے۔

شاسا کے علاوہ اس گھر کے اور تمام بچے اسٹاف میں شامل تھے۔ وہ اپنی کہانیاں، لطیفے، اپنی لکھی ہوئی کہانیاں وغیرہ ہر ہفتہ چیف ایڈیٹر شاسا کے حوالے کر دیتے تھے لینن اس وقت شروع کے درجوں میں تھے لیکن وہ بھی اپنے اسکول کے بارے میں اپنے دوستوں کے بارے میں کہانیاں لکھتے۔ اس طرح یہ رسالہ تیار ہوتا۔

شام کو ڈائننگ روم (کھانے کے کمرے) میں سب جمع ہوتے یہ رسالہ شروع سے آخر تک پڑھا جاتا اور پھر سب بچوں میں گشت کرایا جاتا۔ شاسا اپنا ایڈیٹوریل لکھتے۔ اس میں اپنے بہن بھائیوں کے خاکے اڑاتے۔ گھر کے سب لوگ ان خاکوں کو پڑھ کر خوب ہنستے، ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

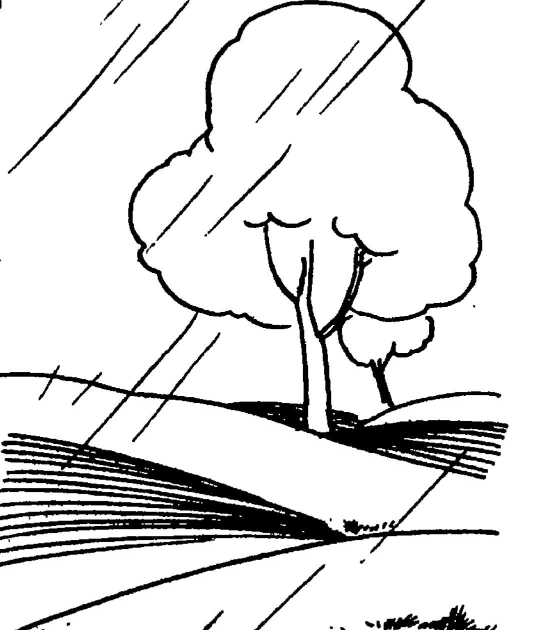
گرمیوں گرمیوں پورا خاندان کوکوشکینو گاؤں چلا جاتا۔ یہ گاؤں ایک دریا کے کنارے اونچے ٹیلے پر آباد تھا۔ چاروں طرف جنگل تھا، کھائیاں تھیں، ڈھلوانوں پر رسیلے پھلوں کی جھاڑیاں تھیں۔ بچے ان جھاڑیوں کے پھل جمع کرتے، مش روم یا کُکرمتّا اکٹھا کرتے۔

جنگل کی کھلی ہوا میں انھیں کتنا مزہ آتا، خوب کھیلتے، کودتے، دوڑ لگاتے، شور مچاتے، کبھی گپیں ہانکتے کبھی اچھی اچھی نظمیں پڑھتے، کبھی الاؤ لگاتے، آلو اور کھٹے میٹھے سیب اس میں ڈالتے اور سب مل کر کھاتے کتنی مزے کی زندگی تھی! روزانہ صبح تڑکے اٹھ جاتے جلدی

جناب خضر برنی

برسات

ٹھنڈی ٹھنڈی چلیں ہوائیں، بدل رہا ہے موسم
کالے اودے دوڑ رہے ہیں "بادل" پورب پچھم
گرمی کے منہ پر لگا طمانچہ، لو کے تھپیڑے بھاگے
چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے گہری نیند سے جاگے
بارش نے کچھ ایسی شکلیں نئی نئی دکھلائیں
رہتی ہیں جو بلوں میں اپنے نکل کے باہر آئیں
مہکیں کلیاں، پھول کھلے ہیں، لہک رہا ہے سبزہ
غنچوں کی تقدیر تو دیکھو چمن چمن ہے جلوہ
بچے اپنے ساتھ میں لے کر دوڑ رہی ہے ہرنی
اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں شوکت، کمو، پمی
باغ میں جا کر دیکھا ہم نے لٹک رہے ہیں آم
پکے پکے ٹپک رہے ہیں کچھ پیڑوں پر خام[1]
آڑو، لیچی اور خوبانی، نیلی نیلی جامن!
چڑھ کر پیڑ پہ توڑ رہے ہیں جس کو حامد، چھمن!
قدم قدم پر پھوٹ رہا ہے بارش سے فوارا
دیکھ رہے ہیں ننھے منے قدرت کا نظارا





[1] خام ـ کچا

کون بُری عادت کو چھوڑ سکتا ہے

جناب محمد امین



مغربی افریقہ کے جنگل میں دریا کے کنارے ایک درخت کے سائے میں ایک خرگوش بیٹھا تھا اور ایک بندر بیٹھا تھا۔ بندر اپنے جسم کو اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے برابر کھجلائے جا رہا تھا۔ پہلے اس نے اپنی گردن کو کھجلایا پھر اپنے گھٹنوں کو، اپنے لمبے بازوؤں سے یہاں تک کہ وہ اپنی پیٹھ کو بھی کھجلاتا تھا۔ جیسے بدن کھجلانا بندروں کی عادت ہو۔

اب رہے میاں خرگوش تو یہ بھی چپ چاپ نہیں بیٹھے تھے۔ بار بار اپنے نتھنوں سے ہو

ان کی ناک کبھی سکڑتی کبھی پھیلتی۔ اپنا سر بھی بار بار ادھر اُدھر گھماتے رہتے اور ان کے لمبے کان پٹ پٹ کرتے۔ گویا خرگوشوں کی بھی یہی عادت ہے۔ ان کو ہر وقت یہی کھٹکا رہتا ہے کہ کہیں کوئی جان جوکھوں کی بات تو نہیں۔

دونوں جانوروں نے ایک دوسرے کی حرکتوں کو بھانپ لیا۔ بندر کی خارش دیکھ کر خرگوش سے نہ رہا گیا، کہنے لگا "یہ تو بتاؤ کہ تم برابر کھجلاتے کیوں رہتے ہو۔ عجیب بات ہے کہ تم ایک منٹ خاموش نہیں بیٹھتے ہر وقت اپنے ناخنوں کو جسم میں پیوست کرتے رہتے ہو تمھاری یہ عادت اچھی نہیں۔"

ظاہر ہے کہ اگر کوئی کسی کو لعن طعن کرے تو بہت کھلتا ہے۔ اس لیے بندر نے بھی تابڑ توڑ جواب دیا "میرے پیارے خرگوش! میری عادت تمھاری عادت سے بری نہیں۔ تم بھی تو آخر خاموش نہیں بیٹھتے۔ ذرا اپنی ناک کو تو دیکھو، برابر سکڑتی اور پھیلتی ہے۔ تمھارے لمبے کان بھی پٹ پٹ بجتے رہتے ہیں۔ ہر لمحہ ڈرپوک کی طرح تم اپنے سر کو ادھر اُدھر کیوں گھماتے ہو جیسے یہی تمھارا شیوہ ہے اور دہشت زدہ رہنا تمھاری فطرت میں داخل ہے۔"

"یہ صحیح ہے کہ میں اپنی ناک سکیڑتا اور سر ہلاتا ہوں لیکن جب چاہوں آسانی سے خاموش بھی بیٹھ سکتا ہوں۔" خرگوش نے کہا

"میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے میں جب چاہوں چپ بیٹھ سکتا ہوں۔" پھر بندر نے اپنے چاروں پنجوں کو ایک ساتھ جوڑ لیا اور کھجلانا بند کر دیا۔

دونوں کافی دیر تک ایک دوسرے سے الجھے رہے اور یہ کہتے رہے "میں اپنی عادت چھوڑ سکتا ہوں لیکن تم میں ہمت نہیں۔"

"اگر تم چھوڑ سکتے ہو تو میں بھی ایسا کر سکتا ہوں" دونوں اسی طرح سر مغزنی کرتے رہے۔ آخر کار بندر سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے کہا: "چلو ہم ایک دوسرے کو آزمائیں دیکھیں ہم میں کس کے رگ پٹھے مضبوط ہیں اور اپنے اوپر قابو رکھ کر اپنی بری عادتوں کو چھوڑ سکتے ہیں۔ ابھی ہم دونوں کی شرط ہو جائے۔ میں دوپہر سے شام تک خاموش بیٹھ سکتا ہوں لیکن میرا دعویٰ ہے کہ تم ایک لمحہ ایسا نہیں کر سکتے۔"

"بہت خوب" اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ خرگوش تیار ہو جائے۔ "اگر ہم میں کوئی ہلا تو وہ شرط ہار جائے گا۔" اس نے سنبھل کر اطمینان سے آخری بار اپنے سر کو ہلایا اور اپنی ناک کو سکیڑا۔

دونوں جہاں بیٹھے تھے وہیں جم کر بیٹھ گئے۔ یہ یہ کام تھا دونوں کے لیے مشکل۔ خواہ مخواہ شرط کی مصیبت مول لے لی۔ دونوں یہی سوچ رہے تھے۔ دل میں یہ بھی خیال آیا کہ چلو آج آزما کر اسے دیکھ ہی لیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں سے کوئی خوش نہیں تھا۔

ساری عمر بندر کو کبھی بھی اپنے جسم کی خارش اور خشکی کا اتنا احساس نہیں ہوا تھا۔ ادھر خرگوش کا بھی برا حال تھا۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اسے برابر ڈر لگا تھا کہ کہیں پیچھے سے لومڑی نہ آ جائے۔ بہرحال بندر نے

ضبط کیا۔ خرگوش نے بھی اپنا سر نہیں ہلایا۔

شرط بندھے ابھی کوئی خاص دیر نہیں ہوئی تھی انھوں نے دیکھا کہ ان کے پاس سے جو کیڑا رینگ رہا تھا ابھی مشکل سے دریا کے کنارے چند گز آگے چڑھ پایا تھا لیکن دونوں کو ایسا لگ رہا تھا کہ شرط باندھے شاید پورا دن گزر گیا ہے "کیا کروں؟" خرگوش سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔ "واقعی دیر تک خاموش رہنا مشکل ہے۔ بڑے پھنسے۔ کاش ایک بار ہی میں سونگھ سکوں! اپنا سر بھی کچھ نہیں تو آدھی دور ہی گھما سکوں! شاید پھر مجھے زیادہ نہیں کھلے گا۔"

بندر صاحب کا حال بھی پتلا تھا۔ ان کے جسم میں آگ لگ رہی تھی۔ کھجلی بری طرح تنگ کر رہی تھی۔ انھوں نے سوچا "دیر تک کھجلانے سے میں اپنے آپ کو روک نہیں سکتا۔ یہ خرگوش اگر میری طرف نہ دیکھتا تو ایک بار تو میں کم سے کم کھجلا ہی لیتا۔"

خرگوش سے رہا نہ گیا اور اس نے کہا "میرے دوست بندر! دیکھو کافی دیر ہو چکی ہے۔ جہاں تک میرا سوال ہے مجھے پروا نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکن ابھی دن بہت پڑا ہے۔ زیادہ اچھا یہ ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کو کہانی سنائیں۔ اس طرح جلدی وقت گزر جائے گا۔"

بندر نے سوچا شاید اس میں خرگوش کی کوئی چال ہے۔ اس نے جواب دیا "ٹھیک ہے۔ تجویز مناسب ہے۔"

"تو پھر سنو۔ پہلے میں سناتا ہوں۔" پچھلے مہینے ایک دن کی بات ہے کہ میں جنگل میں دور نکل گیا تھا۔

ایک جگہ پہنچ کر میں نے دیکھا کہ جنگل صاف ہے اور میرے چھپنے کے لیے ایک جھاڑی بھی نہیں۔"

بندر سے ضبط نہ ہوسکا۔ وہ دل ہی دل میں پریشان کہ یہ خرگوش کیا چال بازی دکھا رہا ہے۔ اگرچہ اپنے طور پر وہ بھی تیار تھا۔ اس نے کہا "خرگوش صاحب یہی واقعہ میرے ساتھ بھی ایک بار پیش آیا تھا۔"

"ذرا سنو تو" خرگوش کو کہانی سنانے کی جلدی تھی۔ "پھر یہ ہوا کہ ایک طرف سے لمبی گھاس کے اندر سے آواز آئی۔" ہر کہانی سنانے والے کی طرح اس نے ایک طرف اپنی گردن گھمائی کہ اشارے سے سمجھائے۔ "میں نے دیکھا کہ کچھ لکڑ بگھے میری طرف بھاگے چلے آرہے ہیں۔ ایک ادھر سے آیا، دوسرا ادھر سے آیا" اس طرح بار بار خرگوش نے اپنا سر ہلا کر سمجھایا۔

"بہت سارے لکڑ بگھے میری طرف لپکے کچھ داہنی طرف سے کچھ بائیں طرف سے اور کچھ سامنے سے!" اب تو خرگوش کے بڑے ٹھاٹھ تھے۔ وہ کہانی سنانے کے بہانے اپنا سر خوب ہلا رہا تھا اور ناک کو بھی برابر سکوڑ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب کہانی میں ایسے خطرے درپیش آئیں تو کہانی سنانے والا یہی کرے گا۔

بندر کو احساس ہوا کہ اچھا تو خرگوش میاں کی یہ چال ہے! سانس لینے کے لیے جو خرگوش رکا تو جھٹ بندر نے اپنی کہانی شروع کر دی۔

اس نے کہا "ایک دن کی بات ہے کہ جنگل کے پار میں ایک گاؤں میں گیا۔ وہاں کچھ بچوں نے مجھے دیکھ [illegible]

ایک پتھر یہاں آکر لگا۔" بندر نے لپک کر اپنی گردن کی طرف اشارہ کیا اور اسی بہانے اس نے گردن کو کھجلا لیا۔ کافی مزا آیا۔

"دوسرا پتھر یہاں آکر لگا" بندر نے اب کی بار اپنے شانے کو کھجلایا۔" اور پھر پتھر ہی پتھر آنے لگے۔ ان کی بارش شروع ہوگئی۔" اب تو بندر صاحب کے پنجے پورے جسم پر تیزی سے چل رہے تھے اور وہ مزے سے کھجلاتے جاتے تھے۔

اب تو خرگوش ضبط نہ کر سکا۔ اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ مارے ہنسی کے اس کا برا حال تھا۔ بندر سے بھی نہ رہا گیا۔ وہ بھی ہنس پڑا۔ دونوں سمجھ گئے کہ کہانی سنانے کا مقصد کیا تھا۔

پھر تو دونوں ٹھٹھے مار مار کر دیر تک ہنستے رہے اس قدر ہنسے اس قدر ہنسے کہ بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ دونوں ایک دوسرے کو سہارا نہ دیتے تو صاف دریا میں گر جاتے۔

بندر نے چیخ کر کہا "دیکھو بھئی دیکھو میں ابھی شرط نہیں ہارا ہوں۔"

خرگوش نے جواب دیا "نہ میں ہارا ہوں۔ ہم دراصل ایک دوسرے کو کہانی سنا رہے تھے۔ اور کہانی سنانے میں جو ہوتا ہے وہی ہم کر رہے تھے۔"

"لیکن دیکھو دوست سچی بات تو یہ ہے کہ بری عادتیں چھوڑنا اتنا آسان نہیں۔ کوئی بھی آسانی سے اپنی عادت نہیں بدل سکتا۔ اچھا چلو قصہ ختم کرو۔"

اس طرح خرگوش کی ناک پھر سکڑنے اور پھیلنے لگی۔ اس کا سر ہلنے لگا اور اس کے کان پھٹ پھٹ بجنے لگے

بندر بھی خاموش نہیں بیٹھا۔ اس کے پنجے ایک دم حرکت میں آگئے۔ جہاں اُسے کھجلی محسوس ہوتی وہ لپک کر کھجلاتا۔

اس وقت سے لے کر اب تک ان جانوروں کے خاندان میں کوئی بھی خاموش نہیں بیٹھا۔ ہاں سونے کی، آرام کرنے کی بات دوسری ہے۔

مُنّے کی ناؤ

چھوٹی سی ہے میری نیّا
اس کو چلاتے رامو بھیّا
یہ تو ہے ساگر میں چلتی
پانی میں ہے خوب مچلتی

دھیرے دھیرے چلتی ہے یہ
کیونکہ مجھ سے ڈرتی ہے یہ
جب کہتا ہوں رک جاتی ہے
جب کہتا ہوں چل دیتی ہے

چھوٹی سی ہے میری نیّا
اس کو چلاتے رامو بھیّا

سید ذوالفقار احمد مبارکپور

جناب سعادت نظیر



صُبح

وہ آسماں کے تارے غائب ہوئے نظر سے
جو جھلملا رہے تھے بن کر چراغ شب کے

لو کارواں سحر کا مشرق کی سمت آیا
ہر پھول مسکرایا، ہر باغ ڈہڈہایا

آغوش میں افق کی سورج نے آنکھ کھولی
ہر چیز کو عطا کی رعنائی زندگی کی

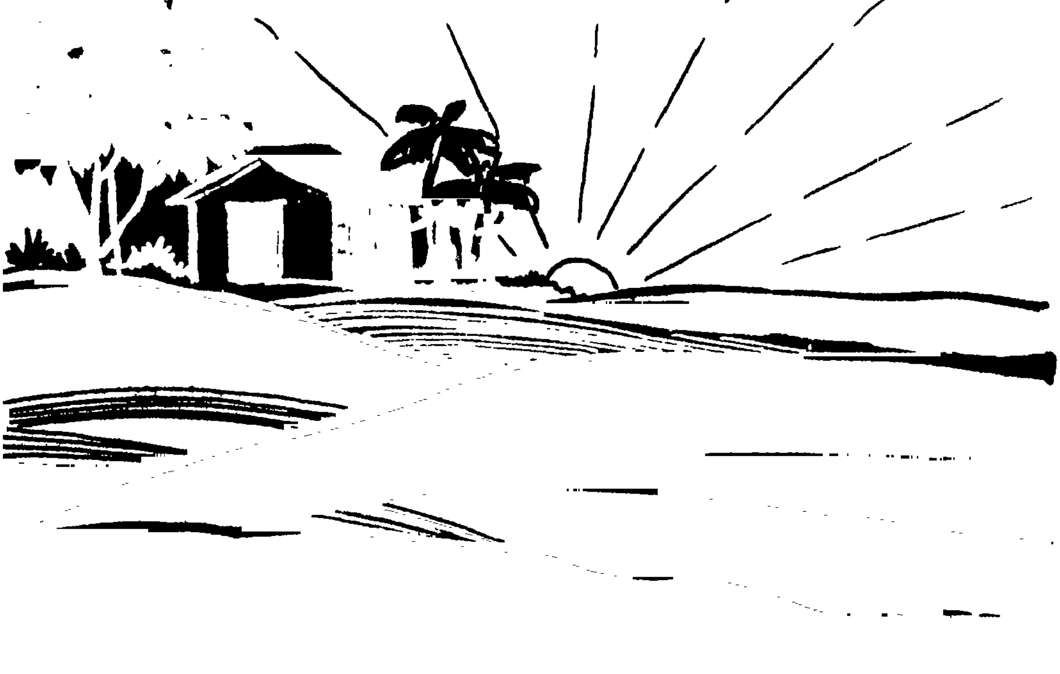
چھیڑے سریلے نغمے فطرت کی بانسری نے
پائی زبان گویا جنگل کی خامشی نے

وہ باغ کے پرندے شاخوں پہ بیٹھے جم کے
سب کو جگا رہے ہیں گا کر نئے ترانے

سویا ہوا زمانہ کروٹ بدل رہا ہے
ہر سمت روشنی کا چشمہ اُبل رہا ہے

شہروں میں زندگی ہے قصبوں میں زندگی ہے
ہر سو چہل پہل ہے، ہر سمت تازگی ہے

عالم نیا نیا ہے، نکھری ہوئی فضا ہے
ہر ذرہ اس زمیں کا رنگین ہو گیا ہے



محترمہ آصفہ مجیب

لال شہزادہ

(ننھے پیامیوں کے لیے)

ایک بادشاہ تھا۔ اللہ میاں نے اس کو سات بیٹے دیے تھے۔ چھوٹے بیٹے کو وہ سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ پیار سے اُسے لال شہزادہ کہتا تھا۔ لال شہزادہ تھا بھی بڑا ہونہار۔ عادتیں بہت اچھی تھیں۔ سب کا کہنا مانتا، سب کی عزت کرتا۔ اسی وجہ سے سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ سب کو دل سے عزیز تھا۔

جب بیٹے بڑے ہوئے، بادشاہ سلامت نے سب کی شادیاں ٹھہرائیں۔ خوب تیاریاں ہونے لگیں۔ خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ آخر بارات کا دن آیا۔ سب شہزادوں کو دولھا بنایا گیا۔ سبھی اچھے لگ رہے تھے۔ مگر لال شہزادہ تو بہت ہی پیارا لگ رہا تھا۔ ماں باپ صدقے ہو رہے تھے اور سب بلائیں لے رہے تھے۔

پر اچانک ایک عجب اتفاق ہوا۔ اُدھر سے پریوں کا تخت گزر رہا تھا۔ انھوں نے جو اتنا سُندر سماں دیکھا تو نیچے اتر آئیں اور لال شہزادہ کو تخت پر بٹھا کر اڑا لے گئیں۔ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ ایک کہرام مچ گیا۔ ماں باپ پچھاڑیں کھانے لگے۔

سب سوچ میں تھے کہ شہزادہ کیسے ملے۔ بغیر دولھا کے بارات کیسے جائے اور پھر دوسری سلطنت والوں کو، سُسرال والوں کو کیا جواب دیں؟ بادشاہ کا وزیر بڑا سمجھ دار تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ بارات جائے گی۔ دلہن والوں سے کہا جائے گا کہ دولہا اتفاق سے بیمار ہو گیا ہے۔ ہم ساتھ نہیں لا سکے، دلہن کو رخصت کر دیں۔

سب شہزادے اپنی اپنی دلہنیں لے آئے۔ چھوٹی دلہن کو دوسرے لوگ لے آئے۔ جب وہ محل میں اتری دیر تک انتظار کرتی رہی کہ کہیں تو اس کا "بیمار دولہا" نظر آئے مگر وہ کہیں نہیں تھا۔ کوئی کہتا: اسے دیو لے گئے۔ کوئی کہتا: اسے پریاں لے گئیں۔ دلہن سُن سُن کر پریشان ہوتی۔

ایک دن کیا ہوا کہ ایک فقیر آیا۔ اس نے پوچھا "بیٹی تم اتنی پریشان کیوں ہو؟"

شہزادی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے بولی: "میرا شہزادہ غائب ہے، قسمت پھوٹ گئی۔ اب یہ آس

لگانے جی رہی ہوں کہ وہ آ جائے۔"

فقیر کو بڑا ترس آیا۔ کہا: "چل بیٹی تو میرے ساتھ چل۔ میں کوشش کروں گا کہ تیرا شہزادہ تجھے مل جائے۔"

دلہن شہزادی فوراً تیار ہو گئی اور فقیر بابا کے ساتھ چل پڑی۔

چلتے چلتے بہت دن بیت گئے۔ جنگل بیابان پہاڑ، ندی، دریا پار کیے۔ ایک دن ایک بہت گھنے جنگل سے دونوں گزر رہے تھے کہ عجیب عجیب ڈراؤنی آوازیں کانوں میں آنے لگیں۔ فقیر نے کہا: "بیٹی خبردار پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا ورنہ پتھر بن جاؤ گی۔"

آخر تھوڑی دور چل کر ایک عالیشان سنہرا محل نظر آیا۔ فقیر نے شہزادی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: آنکھیں بند کرلو۔ شہزادی نے آنکھیں بند کرلیں۔ اُسے ایسا لگا جیسے وہ اُڑ رہی ہے۔ جب آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ایک نہایت حسین شہزادہ کرسی پر بیٹھا اسے دیکھ رہا ہے۔ فقیر نے شہزادے سے کہا:

"لے بچہ سنبھال اپنی امانت کو!" یہ کہہ کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

شہزادہ اپنی دُلہن کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ اُسے آرام سے بٹھایا۔ لیکن فوراً پریشان سا معلوم ہونے لگا۔

شہزادی نے پوچھا: "کیا بات ہے، آپ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟ کیسی مبارک گھڑی ہے کہ ہم ملے ہیں۔

شہزادہ بولا: "ہاں شہزادی، تم نے بڑی مصیبتیں جھیلیں۔ آج خدا نے ہمیں ملایا ہے۔ ہزار ہزار شکر ہے۔ مگر مجھے یہ ڈر لگ رہا ہے کہ ابھی پری آئے گی اور تمھیں مار ڈالے گی۔ یہی سوچ رہا ہوں کہ تمھیں کیسے اس ظالم سے بچاؤں؟" پھر خوش ہو کر کہا "ہاں ابھی مجھے فقیر بابا کی بات یاد آگئی۔ جب پری کے آنے کا وقت آئے گا میں تمھیں بتا دوں گا۔ تم بس اُس درخت پر بیٹھ جانا اس کی یہ تاثیر ہے کہ کوئی انسان اس پر بیٹھ جائے تو چڑیا بن جاتا ہے۔ اسے جب آدمی بنانا چاہیں تو درخت کا پھول توڑ کر چڑیا کی ناک میں لگا دیں۔ وہ پھر آدمی ہو جاتا ہے۔"

شہزادی خوشی سے بولی: "اچھا تب تو میں اطمینان سے تمھارے پاس رہ سکوں گی۔"

اور یوں اطمینان سے دونوں رہنے لگے۔ مگر کچھ دنوں اس طرح رہتے رہتے شہزادی کا جی گھبرانے لگا۔ ایک دن اس نے کہا: "آخر شہزادے ہم لوگ کب تک ایسے رہیں گے اب تم اپنی سلطنت واپس چلو۔ تمھارے لیے سب تڑپ رہے ہیں۔"

شہزادے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ حسرت سے بولا: "میں آزاد ہوتا تو کب کا اپنے پیارے وطن اور ماں باپ کے پاس پہنچ چکا ہوتا۔ مصیبت تو یہی ہے کہ پری نے مجھے یہاں قید کر رکھا ہے۔ کہیں جانے کی اجازت

نہیں دیتی۔ بس ایک ترکیب ہے اگر تم کر سکو۔
تم میری سلطنت میں واپس جاؤ اور ابا جان
سے کہو کہ وہاں خوب اچھا سا جشن کریں۔ اس
میں سب پریوں کو بلائیں۔ جب یہ سب اکٹھی
ہوں تو بڑی بھابی اپنے بچے کے چٹکی لے
لیں وہ رونے لگے گا۔ پریاں پوچھیں گی کہ یہ
کیا ہوا تو کہیں کہ لال پری یہ ہار جو پہنے ہے
یہی مانگ رہا ہے۔ تم بھی بچے کو سکھا دینا کہ
ہار کے لیے مچل جائے۔ ہار میں ہیرے،
موتی اور لعل جڑے ہیں۔ اس میں میری جان
ہے۔ جب وہ ہار پری بچے کو دے گی میں تمہارے
پاس آ جاؤں گا۔"

شہزادی یہ سن کر بہت خوش ہوئی اور
تن تنہا اتنے بڑے سفر کے لیے نکل کھڑی
ہوئی۔ راستہ میں اس نے بہت دکھ اور مصیبتیں
جھیلیں اور محل پہنچ کر سب کو شہزادے کے
ملنے کی خوش خبری سنائی۔ ہر طرف خوشی چھا گئی
شہزادے کی سلامتی اور جلد واپسی کی دعائیں
مانگی جانے لگیں۔ جشن کی تیاریاں بڑے زوروں
میں شروع ہوئیں۔ پریوں کو دعوت نامے
بھیجے گئے۔

اللہ اللہ! کیا شاندار جشن تھا۔ چپہ چپہ پر
بہار تھی۔ محل خوب سجایا گیا تھا۔ پریوں کا
جمگھٹ تھا۔ خوشی کے ترانے گونج رہے تھے
پھر شہزادے نے جیسا بتایا تھا ویسا ہی کیا گیا۔
بچہ ہار کے لیے مچل گیا۔ روتے روتے ہلکان
ہو گیا۔ دوسری پریوں نے لال پری سے کہا
"اے بہن دے دو نا۔ ہار کی کیا حقیقت ہے۔
بچہ ہلکان ہوا جا رہا ہے۔"

پری نے غصے سے ہار اتار کر بچے کے
سامنے ڈال دیا اور فوراً اڑ گئی کہ شہزادے
کو جا کر پکڑ لے اور آنے نہ دے۔ مگر شہزادہ
اس سے پہلے محل میں آ کر چھپ گیا۔ کب کے
بچھڑے ماں باپ بھائی ملے۔ مارے خوشی کے
سب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ سبھی خوش
تھے اور خدا کا شکر ادا کر رہے تھے۔

بقایا صفحہ ۱۲

جلدی ناشتہ کرتے اور کھیل کود میں لگ جاتے۔
لینن کو تو قدرتی نظاروں سے جیسے عشق تھا۔
پہاڑوں اور جنگلوں کی سیر کا بہت شوق تھا۔ ڈوبتے سورج
کا منظر دیکھ کر کھو جاتے تھے اسی لیے اس گاؤں کی زندگی
میں انھیں سب سے زیادہ لطف آتا تھا۔

لینن کو اپنے بڑے بھائی ساشا سے غیر معمولی
محبت تھی۔ بہت گہرا لگاؤ تھا وہ ہر بات میں ان کی نقل
کرتے تھے۔ یوں بھی سب بھائی بہنوں میں ساشا کی زندگی
نمونہ کی زندگی تھی۔ سب انھی کے ڈھنگ پر چلنے کی
کوشش کرتے تھے۔ لینن تو چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی
ان کی نقل کرتے تھے۔ (باقی)

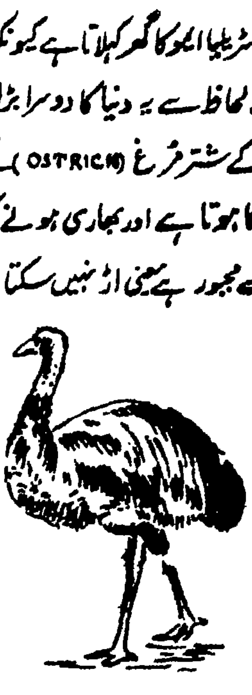
جناب علیم الدین

آسٹریلیا کے چند انوکھے جانور

ہم آپ کو پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ آسٹریلیا میں تقریباً سات سو قسم کے پرندے پائے جاتے ہیں جن میں چار سو سے زیادہ وہاں کے اصل پرندے ہیں جو کہیں اور نہیں پائے جاتے اور ان خصوصیات کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہیں اور لوگ ان کو چڑیا گھروں میں رکھتے ہیں۔ اب ہم آپ کو چند پرندوں کے حالات بتاتے ہیں۔

ایمو (EMU)

آسٹریلیا ایمو کا گھر کہلاتا ہے کیونکہ ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ قد کے لحاظ سے یہ دنیا کا دوسرا بڑا پرندہ ہے یعنی افریقہ کے شتر مرغ (OSTRICH) کے بعد اس کا قد ۶ فٹ کا ہوتا ہے اور بھاری ہونے کی وجہ سے یہ اڑنے سے مجبور ہے یعنی اڑ نہیں سکتا۔



ایمو آسٹریلیا کے مختلف علاقوں میں پایا جاتا ہے جیسے نیو ساؤتھ ویلس، مغربی کوئنس لینڈ، جنوبی آسٹریلیا کے شمال میں اور مغربی آسٹریلیا کے جنوب میں خصوصاً بہت پایا جاتا ہے۔

عموماً ایمو گروپ اور پارٹی کی شکل میں رہتے ہیں۔ پانچ پانچ اور سات سات کے گروپ میں اکٹھے رہتے ہیں اور کبھی کبھی جوڑے بھی گھومتے نظر آتے ہیں لیکن ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوتا کہ ایمو اکیلا پایا جائے۔ اس وجہ سے ان کا شمار جھنڈ میں اور غول میں رہنے والے پرندوں میں ہوتا ہے۔

انڈے دینے کا وقت یوں تو پورے سال رہتا ہے لیکن پھر بھی جب مناسب موسم اور موزوں حالات ہوں تو اسی وقت انڈے دیتے ہیں۔ عام طور سے اندرونی خشک علاقوں میں جہاں بارش وغیرہ نہیں ہوتی، یہ انڈے دیتے ہیں۔ درختوں اور جھاڑیوں کے نیچے یہ اپنا گھونسلہ یا گھر بناتے ہیں۔ اور اسی میں انڈے دیتے ہیں۔ مادہ ایمو ایک وقت میں تقریباً ۱۵ انڈے دیتی ہے۔ ہر انڈے کا وزن ۲۰ آونس ہوتا۔ ... کر

ہمارے یہاں کی مرغیوں کے ۱۴ انڈوں کے برابر ہوتا ہے ایک انڈے کی لمبائی ۵ انچ ہوتی ہے اور اس میں مرغی کے دس انڈوں کے برابر غذائیت ہوتی ہے۔

ایمو کی ٹانگیں بڑی لمبی اور مضبوط ہوتی ہیں۔ اپنی ان ٹانگوں سے یہ فائدہ بھی خوب اٹھاتا ہے یعنی ان کی وجہ سے بہت تیزی کے ساتھ دوڑ سکتا ہے۔ عموماً تمام پرندوں کے پنجوں میں چار انگلیاں ہوتی ہیں لیکن ایمو کے صرف تین ہی انگلیاں ہوتی ہیں۔ اس کے جسم کا رنگ بالکل زمین کے رنگ کی طرح ہوتا ہے۔ آنکھیں سرخ رنگ کی ہوتی ہیں۔ پروں کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اونٹ پر بہت سارے بورے لاد رکھے ہوں۔ یہ اپنے قدم بہت ہی ہلکے ہلکے بغیر آواز کیے اٹھا سکتا ہے۔ چوں کہ زمین کے مشابہ رنگ ہوتا ہے اس وجہ سے بہت آسانی کے ساتھ چھپ جاتا ہے۔ اس وقت اس کا نظر آنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ قدرت نے اس کو قدرتی طور سے دشمن سے بچنے کی غرض سے یہ خوبی عطا کی ہے۔ (اس کو ہم فوجی اصطلاح میں CAMOUFLAGE کہتے ہیں جس کے معنی ہیں دشمن کو دھوکا دینے اور اس کی نظر سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو جگہ کے مطابق ڈھال لینا۔

اگر کبھی آپ کا اتفاق ان کے جنگلات میں جانے کا ہو تو آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ یہاں پر کوئی جانور نہیں رہتا لیکن اچانک ہی لمبی لمبی گردنوں اور لمبی لمبی ٹانگوں والے ایموؤں کا گروپ آپ کے سامنے ظاہر ہو جائے گا اور آپ حیران رہ جائیں گے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے جادو کے ذریعے اچانک ہی زمین سے نکال دیے ہوں۔

گھنے جنگلات یا گھنی گھاس کے علاقے میں یہ پانی کے نزدیک رہتے ہیں۔ ان کی غذا گھاس سبزی اور چھوٹے موٹے کیڑے مکوڑے ہیں۔ تھوڑی سی غذا اور تھوڑے پانی پر یہ کئی دنوں تک رہ سکتا ہے۔ غذا کی تلاش میں یہ بہت دور دور نکل جاتے ہیں۔ ساحل کے قریب رہنے والے ایمو تیرنے کے فن سے بھی خوب واقف ہوتے ہیں۔

ایمو کا بچہ (چوزہ) بہت ہی پیارا ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس نے نائٹ سوٹ پہن رکھا ہو۔ آپ کے سامنے ہوتے ہوئے بھی یہ آپ کو بہت مشکل سے ہی نظر آ سکتا ہے کیوں کہ یہ بالکل اسی جگہ کے مطابق ہوتا ہے۔ یعنی بہترین قسم کا CAMOUFLAGE ہوتا ہے۔

چھپن ۵۶ دن تک یہ انڈے میں رہتا ہے اور جب یہ انڈے سے نکلتا ہے تو پوری طرح تیار ہوتا ہے۔ اس میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوتی۔ اس کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ انڈے سے نکل کر فوراً ہی دوڑنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے باوجود کئی ہفتے تک یہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا ہے۔ عام طور سے یہ بچہ اپنے باپ کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور رات کو بھی اسی کے پروں میں منھ چھپا کر سوتا ہے۔

ایمو بہت ہی نڈر اور بہادر پرندہ ہے۔ کاروں اور موٹروں کے بالکل نزدیک آ جاتا ہے۔ فوٹو کھنچوانے کا شوق اس کو بہت زیادہ ہے۔ جب کبھی اس کا فوٹو لیتے ہیں تو یہ بالکل کیمرے کے لینسوں کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بہت ہی مشہور پرندہ ہے۔

دوسرا اہم اور عجیب وغریب پرندہ کوکابرا ہے۔

کوکابرا

KOOKABURRA

یہ آسٹریلیا کا بہت مشہور پرندہ ہے اور اسے انگریزی میں " LAUGHING JACKASS " بھی کہتے ہیں جس کا ترجمہ کریں تو اس کا مطلب ہوتا ہے "ہنستا ہوا گدھا" آپ پوچھیں گے کہ اس کو ہنستا ہوا گدھا کیوں کہتے ہیں تو بھئی اس کی وجہ یہ ہے کہ جب یہ ہنستا ہے تو بہت ہی زور سے ہنستا ہے۔ جیسے کوئی گدھا ہنس رہا ہو۔ بہت ہی دل کھول کر ہنستا ہے۔ آسٹریلیا کی جھاڑیوں میں عام طور سے انسانوں کی ہنسی کی مانوس آوازیں آتی رہتی ہیں۔ وہاں کوئی آدمی نہیں ہوتا بلکہ یہی کوکابرا صاحب ہوتے ہیں۔



کوکابرا کنگ فشر (یعنی مچھلیوں کا بادشاہ) سے بڑا ہوتا ہے لیکن بہت حد تک اسی سے مشابہ ہوتا ہے۔ بڑا سا سر، اور مضبوط گردن ہوتی ہے۔ اس کی غذا گرگٹ، چھوٹے سانپ اور چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے ہیں۔ اپنا گھونسلہ درختوں کے سوراخوں میں بناتا ہے۔ شمالی آسٹریلیا میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

اس کی دوسری قسم آزر کنگ فشر ہے۔ اس کی غذا صرف مچھلیاں ہیں [illegible] مچھلی کا شکار کرتا ہے

کوکیٹو

COCKATOO

رنگ برنگے کوکیٹو کی تقریباً ۵۰ قسمیں آسٹریلیا میں پائی جاتی ہیں۔ یوں تو یہ ہمارے یہاں کے طوطوں سے ملتے جلتے ہیں لیکن ان سے بہت زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔ اور بناوٹ کے لحاظ سے بھی کچھ مختلف ہوتے ہیں پیلے، سفید، گلابی، نیلے، ہرے، کالے، غرض ہر رنگ کے رنگ برنگے ہوتے ہیں۔



یہ عام طور سے ساحلی پہاڑوں کے اندرونی علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان علاقوں کو سوانا یا بارش کے جنگلات بھی کہتے ہیں۔ پھل ان کی خاص اور مرغوب غذا ہے لیکن گیہوں اور چاول کے کھیتوں میں بھی گھس کر فصل کا نقصان کر جاتے ہیں۔

درختوں کے سوراخوں میں انڈے دیتے ہیں۔

ان کی خاص خوبی یہ ہے کہ یہ اپنا زیادہ تر وقت زمین پر گزارتے ہیں۔ پیڑوں پر تو شاذ ہی نظر آتے ہیں یا پھر گھونسلے [illegible]

جناب اقبال نصیب

بچوں کی دُعا

جہانوں کے مالک زمانے کے آقا — تو معصوم بندوں کی فریاد سُن لے
ہمیں شوق دے علم کی برتری کا — ہمیں حوصلہ دے نئی زندگی کا
بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلیں ہم — زمانے کی آنکھوں کا تارا بنیں ہم

جہانوں کے مالک، زمانے کے آقا
تو معصوم بندوں کی فریاد سُن لے

ہوں خوش ہم سے استاد، ایسی خوشی دے — دعائیں دیں ماں باپ، وہ زندگی دے
ہم علم و ادب سے کریں نام پیدا — وطن کے لیے بھی کریں کام اچھا

جہانوں کے مالک، زمانے کے آقا
تو معصوم بندوں کی فریاد سُن لے

کرم کر غریبوں کی فریاد سُن لے — سبھی غم نصیبوں کی فریاد سُن لے
ہمیں علم و اخلاق کی آگہی دے — دلوں میں بھی ایمان کی روشنی دے

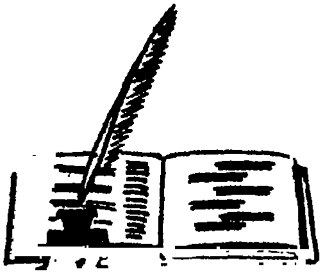
جہانوں کے مالک، زمانے کے آقا
تو معصوم بندوں کی فریاد سن لے

سہاروں میں تیرا سہارا بڑا ہے — تو ہی ساری دنیا کا حاجت روا ہے
وفا آشنا ہم کو قلب و نظر دے — زمانے کے دکھ درد آسان کر دے

جہانوں کے مالک، زمانے کے آقا
تو معصوم بندوں کی فریاد سُن لے

جناب شعیب اعظمی۔

غالب کی کہانی خود اُن کی زبانی



(سلسلے کے لیے مئی کا پرچہ دیکھیے)

پھر بھی غالب کا دل بہت درد مند تھا۔ وہ لوگوں کی تکلیف سے خوش نہ تھے لیکن بات اپنے بس کی بھی نہ تھی۔ ایک خط میں ان کا یہ درد کس طرح پڑھنے والے کو محسوس ہو جاتا ہے۔

"نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسّی کے لٹکالوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف میں جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے تو نہ سہی، جس شہر میں رہوں وہاں کوئی بھوکا ننگا نہ نظر آئے۔"

غالب دہلی میں بہت کم عمری میں آگئے تھے اسی میں اُن کا بچپن گزرا تھا۔ جوانی کے اچھے دن بتائے تھے۔ دہلی کی سج دھج اور آن بان دیکھی تھی۔ مگر یہی دہلی ان کے سامنے لٹ گئی تباہ و برباد ہوگئی۔ غدر کی لڑائی نے شہر کی اور بازاروں کی رونق ختم کردی۔ انگریزوں نے دہلی کا نقشہ ہی بدل دیا بہت دنوں تک دہلی اجڑی رہی، ویران اور سنسان رہی غالب نے بار بار اپنے خطوں میں دہلی کا حال افسوس اور رنج کے ساتھ لکھا ہے۔ غالب پر خود انگریزوں کو باغیوں کے ساتھ مل جانے کا شبہ تھا اور اس لیے غالب گھر سے کم باہر نکلتے تھے۔ مگر شہر کا حال لکھتے ہیں:

"شہر کا حال کیا جانوں کیا ہے؟ سوائے اناج اور اپلوں کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد ۲۵ - ۲۵ فٹ گول میدان نکلے گا دکانیں، حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ خان چند کا کوچہ شاہ بولا کی بڑ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑا چل رہا ہے۔ کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں؟ دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں پھر کہو دہلی کہاں۔ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں تھا۔"

انگریز سرکار نے جامع مسجد پر پہرہ بٹھا دیا تھا کہ بعد

ملتا تھا۔ غالب اپنے خطوں میں کئی جگہ اس کا ذکر کرتے ہیں ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"جامع مسجد پہ پابندی لگا دی گئی تھی اور
اُسے گرا دینے کی تیاری تھی مگر مسجد جامع
واگذاشت ہو گئی۔ چتلی قبر کی سیڑھیوں پہ
کبابیوں نے دکانیں بنا لیں انڈا مُرغی،
کبوتر بکنے لگا۔"

غالب دلی کے گلی کوچوں سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کا ذکر بار بار کرتے ہیں۔ وہ ان کا نقشہ اور رونق یاد کرتے ہیں اور اس طرح بیان کرتے ہیں گویا ہماری آنکھوں کے سامنے وہ چیزیں ہیں۔ غدر کی تباہی نے دلی میں میٹھے پانی کا کال کر دیا۔ غالب بھی تماشے کو نکلتے ہیں۔

"مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند
ہو گیا، لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری
ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے۔ گرم
پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر
کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔
جامع مسجد ہوتا ہوا راج گھاٹ کے
دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ
تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے
اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ
جائیں تو ہُو کا میدان ہو جائے۔ یاد کرو
مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو
کئی بانس نشیب تھا، اب باغیچے کے صحن
کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا
دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے
کھلے رہے ہیں۔ باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری
دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب
آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے
سے کابل دروازہ تک میدان ہو گیا
پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رامجی گنج،
سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی
حویلی، ان میں کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ
مختصر شہر صحرا ہو گیا۔ اب جو کنوئیں جاتے
رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ
صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔"

دہلی اردو زبان کا مرکز تھی اور دلی والوں کو اس پہ ناز تھا۔ غدر کی الٹ پلٹ نے وہاں کی زبان بھی ختم کر دی۔ غالب اپنے دوست کو یاد دلاتے ہیں۔

"اللہ اللہ دلی والے ابھی تک یہاں
کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ ارے
بندۂ خدا، اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں؟
دلی واللہ اب شہر نہیں کیمپ ہے، چھاؤنی
ہے، نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار۔"

خط لکھنا اور ان کا پابندی سے جواب دینا غالب کا عزیز ترین مشغلہ تھا۔ ان کے دن کا زیادہ وقت اسی خط و کتابت میں گزرتا تھا۔ اسی کے سہارے یہاں کا دن کٹ جاتا تھا۔ غالب کو اپنے خط لکھنے پر اور اس کے طریقہ پر ناز تھا۔ وہ کہتے تھے کہ میرے خط میں وہ مزا ہوتا ہے جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کرتے ہیں کسی کا

خط آجانا گویا اس کا آجانا تھا۔ وہ خط میں یوں بتاتے ہیں۔

"کیوں صاحب روٹھے ہی رہوگے یا منو
گے بھی اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو
روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی
میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں یعنی
جس کا خط آیا میں نے جانا وہ شخص تشریف
لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا
نہیں ہوتا جو دو چار خط نہ آرہتے ہوں۔
بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک
کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح ایک
دو شام۔ میری دلگی ہو جاتی ہے۔ دن ان
کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔"

جب غالب کو خط لکھنے سے فرصت ملتی تو وہ بے کار نہ بیٹھتے اور لفافے بنایا کرتے تھے۔ چونکہ انھی لفافوں میں وہ خط بھیجا کرتے تھے اس لیے انھیں خود ہی تیار کرتے تھے ایک جگہ لکھتے ہیں،

"بھائی مجھ کو اس مصیبت میں کیا ہنسی
آتی ہے کہ یہ ہم تم اور مرزا تفتہ میں مراسلت
مکالمت پیدا ہوگئی ہے۔ روز باتیں کرتے
ہیں۔ اللہ اللہ یہ دن بھی یاد رہیں گے خط
سے خط لکھے گئے ہیں۔ مجھ کو اکثر اوقات
لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ
لکھوں گا تو لفافے بناؤں گا۔ غنیمت یہ
ہے کہ محصول آدھا آنا ہے ورنہ باتیں
کرنے کا مزہ معلوم ہوتا۔"

ہم سب یہ جانتے ہیں کہ غالب آم کے بہت شوقین تھے آموں کے بارے میں ان کے کئی لطیفے بھی مشہور ہیں۔ ان کے خطوں میں بھی ان کے اس شوق کا ذکر کئی جگہ ملتا ہے۔ ان کے دوست، ملنے والے اور شاگرد ان کے پاس آم بھیجتے تھے اور آموں کی دعوت بھی دیا کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"یہاں تک لکھ چکا تھا کہ دو آدمی آگئے
دن بھی تھوڑا رہ گیا۔ میں نے بکس بند کیا
باہر تختوں پر آن بیٹھا۔ شام ہوئی۔ چراغ
روشن ہوا کہ ناگاہ سید نصیر الدین آیا۔
ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ۔ اس
کے سر پہ ٹوکرا۔ اس پہ گھاس ہری بچھی
ہوئی۔ میں نے کہا آہا ہا سرفراز حسین
دہلوی نے دوبارہ رسد بھیجی ہے۔ معلوم
ہوا کہ یہ وہ نہیں۔ یہ کچھ اور ہے۔ لطف
عام ہے آم ہے۔ ایک ایک آم گویا سر بمہر
گلاس بھایا بادہ انگوری سے بھرا ہوا اگر
واہ کس حکمت سے بھرا ہے کہ ۶۵ گلاس
(۶۵ آم) میں ایک قطرہ نہیں گرا ہے۔ بیان
کیا تھا کہ یہ ۸۰ تھے۔ پندرہ بگڑ گئے بلکہ سڑ
گئے۔ تا ان کی برائی اوروں میں سرایت
نہ کرے، ٹوکرے میں سے پھینک دیے میں
نے کہا بھائی یہ کیا کم ہیں۔"

ایک صاحب نے آم بھیجے اور گھر دعوت دی مگر غالب نے اپنے خط میں یہ بات لکھی۔ دیکھیے اس خط سے ہمیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کس قدر آم کھاتے تھے اور کتنے شوقین تھے۔

"کہار آیا، خط لایا، آم پہنچے، کچھ بانٹے کچھ
کھائے. جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں
مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ
بھر کر آم کھاؤں. اب وہ دل کہاں سے
لاؤں؟ طاقت کہاں سے پاؤں. نہ آموں
کی طرف وہ رغبت، نہ معدے میں اتنی
آموں کی گنجایش. نہار منھ میں نہ آم کھاتا
تھا، کھانے کے بعد میں نہ آم کھاتا تھا.
رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں. ہاں آخر روز
معدی آم کھانے بیٹھ جاتا تھا. بے تکلف
عرض کرتا ہوں اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ
بھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا.
اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر دس
بارہ. اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ
سات."

مولانا حالی نے غالب کو حیوانِ ظریف یعنی ہنسنے ہنسانے والا انسان لکھا ہے. غالب کے کئی خطوط ایسے ہیں جن میں ہم ایسی بہت سی باتیں پڑھ کر اپنی ہنسی نہیں روک سکتے غالب نے جب پہلی بار داڑھی رکھی تو اگر چہ کوئی خاص بات نہ تھی مگر ان کا بیان ہنسائے بغیر نہیں رہتا. دیکھیے لکھتے ہیں.

"جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آ گئے.
تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر
آنے لگے اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے
دو دانت ٹوٹ گئے. ناچار مسی بھی چھوڑ دی
اور داڑھی بھی. مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے
شہر (دہلی) میں ایک وردی ہے عام، ملّا، بساطی
نیچہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارا، جولاہہ، کنجڑا
منہ پہ داڑھی، سر پہ بال. فقیر نے جس دن
داڑھی رکھی اسی دن سر منڈوایا."

ان کی ایک ملازمہ تھیں جو باہر نکل کر سودا سلف بھی لانے لگیں. ان کی خصوصیات آج کل کی ملازماؤں سے بہت ملتی تھیں. دیکھیے غالب نے ان کی ہر بات کو کتنی دلچسپی سے لکھا ہے.

"جی وفادار جن کو تم کچھ اور بھائی خوب
جانتے ہیں اب تمھاری پھوپھی (غالب کی
بیوی) نے انھیں وفادار بیگ بنا دیا ہے
باہر نکلتی ہیں. سودا تو کیا لائیں گی مگر خلیق
اور ملنسار ہیں. رستہ چلتوں سے باتیں کرتی
ہیں. جب وہ محل سے نکلیں گی ممکن نہیں
کہ اطرافِ شہر کی سیر نہ کریں. ممکن نہیں کہ
دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں
ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی جی
کو نے جاکر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ یہ پھول
تمھارے چچا کے بیٹے کی کائی کے ایں*"

* (تمھارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں)

ایک بار غالب کو اپنے کسی ملنے والے کو کسی بات کا یقین دلانا تھا. دیکھیے وہ کتنے قسم کی قسمیں کھا کر اس بات کا یقین دلاتے ہیں اور کتنا ہنساتے ہیں اور تمام مذاہب کی کتابوں کا نام لے ڈالتے ہیں.

"بھائی قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت
کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار بید کی

قسم، دساتیر کی قسم، ژند کی قسم یا ژند کی قسم،
اُستاد کی قسم، گورو کے گرنتھ کی قسم نہ میرے
پاس وہ قصیدہ نہ مجھے وہ رباعیاں یاد۔"

غالب کے زمانے میں انگریزی حکومت شروع ہوئی اور انگریزی زبان کا چلن ہوا۔ غالب نے اپنے خطوط میں انگریزی کے الفاظ بہت زیادہ استعمال کیے ہیں۔ وہ پنجابی اور ہندی سے ناواقف نہ تھے۔ اور اپنے خطوں میں کئی جگہ پنجابی اور ہندی کے محاورے استعمال کیے ہیں۔ دو مثالیں دیکھیے:

(۱) پیٹ پڑیں روٹیاں تے سبھی گلاں موٹیاں (پیٹ بھرا ہو تو سبھی باتیں سوجھتی ہیں۔)

(۲) کھچڑی کھائی دن بہلائے مکھڑے پھاٹے گھر کو آئے۔

غالب اپنے زمانے میں اپنے شہر میں کافی مشہور ہو گئے تھے۔ ان کے خط پر صرف ان کے نام کی ضرورت تھی محلّہ اور شہر لکھنا ضروری نہ تھا ایک صاحب کو لکھتے ہیں۔

"اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ میرے خط
کے سرنامے پر محلّہ کا نام لکھنا ضرور نہیں
شہر کا نام اور میرا نام، قصہ تمام۔"

ہم نے اپنے خاندان اور پاس پڑوس میں بہت سے بزرگوں کا بڑھاپا اور آخری وقت دیکھا ہے۔ دیکھیے ایک خط میں وہ اپنے بڑھاپے کا کتنا تکلیف دہ منظر پیش کرتے ہیں:

"تیس برس دن سے بیمار تھا ایک پھوڑا اچھا
ہوا دوسرا پیدا ہوا۔ اب فی الحال دونوں
ہاتھ پاؤں میں ۹ پھوڑے ہیں۔ دونوں
پانووں پر دو پھوڑے پنڈلی کی ہڈی
پر ایسے ہیں کہ جن کی گہرائی ہڈی تک ہے
انھوں نے مجھ کو بٹھا دیا۔ اٹھ نہیں سکتا
حاجتی دھری رہتی ہے۔ پلنگ پر سے
مسلسل پڑا پھر پڑ رہا۔ روٹی بھی اسی طرح
کھاتا ہوں۔ پاخانہ کا کیا کہوں کیوں کر جاتا
ہوں۔ صبح سے شام اور شام سے صبح
تک پڑا رہتا ہوں۔ یہ سطور لیٹے لیٹے
لکھے ہیں۔ نیم مُردہ ہوں قریب بمرگ ہوں۔"

غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے مرنے کی تاریخ "غالب مُرد" کہی تھی مگر مرے نہیں۔ جب لوگوں نے پوچھا تو کہا اس سال ہیضے کی وبا سے بہت لوگ مرے تھے اور چونکہ میں عام آدمی نہ تھا اس لیے اس وقت نہ مرا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اور جینے کے خواہش مند نہ تھے مرنے سے چند مہینے قبل ایک صاحب کو لکھا اور کتنا صحیح لکھا:

"اگر جوان ہوتا تو دعائے صحت کا طلبگار
ہوتا۔ اب جو بوڑھا ہوں تو دعائے مغفرت
کا خواہاں ہوں۔"

دم واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

لطیفہ

شاگرد۔ (ٹیلیفون پر ہیڈ ماسٹر سے) بلو آج میرے لڑکے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ اسکول میں حاضر نہیں ہو سکتا اس کو چھٹی دے دیجیے۔

ہیڈ ماسٹر۔ کون بول رہا ہے؟
شاگرد۔ میرے والد

جناب بدرالدین۔ استاد مدرسہ ابتدائی

کھلی ہوا کا مدرسہ

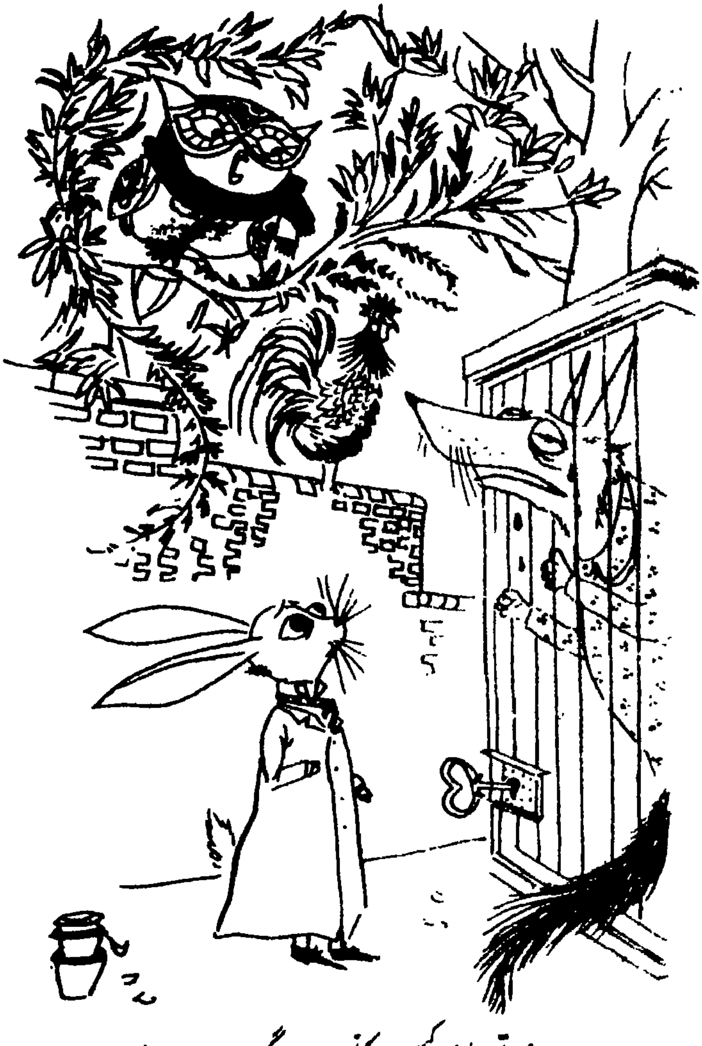
(اب کے مدرسہ ابتدائی جامعہ کا کھلی ہوا کا مدرسہ مہرولی میں ہوا تھا یہ نظم آخری دن کے جلسے میں پڑھی گئی تھی۔)

ہو تم سبھوں کو مبارک قیامِ مہرولی   خوشی دکھائیں تمھیں صبح و شامِ مہرولی
یہاں پہ کھیلنا پڑھنا تمھیں مبارک ہو   بسا رہے ہو جو دنیا تمھیں مبارک ہو
یہ شاہزادوں کا مسکن ہے اولیا کی زمیں   یہاں ہوئے ہیں کبھی آکے تاجدار مکیں
یہاں پہ شیخ محدث کا مقبرہ بھی ہے   یہاں پہ حضرتِ کاکی کا مقبرہ بھی ہے
یہاں جمالی کمالی کی شان عالی ہے   کہ جن کا نام بھی دنیا میں اک مثالی ہے
قطب مینار ہے مسجد ہے قوت الاسلام   ہزاروں سال سے دیتی ہے لاالہٰ کا پیام
یہاں پہ صدیوں اذاں کی صدائیں گونجی ہیں   فقیروں شاہوں کے دل کی صدائیں گونجی ہیں
یہاں قریب ہی دیکھوگے التمش کا مزار   جبیں پہ جس کی چمکتی ہے آیتوں کی قطار
یہاں تمدن و تہذیب کے خزانے ہیں   یہاں بلندی و پستی کے کارنامے ہیں
قدیمی ذوق کے فن کے یہاں دفینے ہیں   نظر کے سامنے قدرت کے آبگینے ہیں
کمال اب بھی جھلکتا ہے اس زوال کے بعد   زوال لازمی آتا ہے ہر کمال کے بعد
تمھارے دم سے ہوئی آج یہ زمیں روشن   بنایا تم نے اسے آج اک حسیں گلشن
تمھیں یہاں کی فضائیں سلام کہتی ہیں   خوشی میں مست ہوائیں سلام کہتی ہیں

قدم تمھارے مبارک ہوں اس زمیں کے لیے
یہاں کا آنا مبارک ہو تم سبھی کے لیے

جناب م۔ ندیم۔

احسان کا بدلہ



میری توبہ! اب کبھی دھوکہ نہیں دوں گی

جانوروں کا ڈراما

ڈرامہ میں حصہ لینے والے جانور

لومڑی
خرگوش
اُلّو
میاں گگڑوں کوں اور
بی مینڈکی

(پردہ اٹھتا ہے۔ اسٹیج پر ایک بڑا سا پنجرہ رکھا ہے اس کے اندر لومڑی بند ہے۔ پاس ہی ایک درخت کی شاخ پر اُلّو بیٹھا ہے۔ دیوار پر میاں گگڑوں کوں بیٹھے ہیں۔ ابھی سورج نہیں نکلا ہے۔)

لومڑی (نہایت خوشامد کے لہجے میں) بھائی اُلّو، خدا کے واسطے میری مدد کرو۔ مجھے اس پنجرے سے باہر کر اور سے نکالو۔ میں رات بھر کی بھوکی پیاسی ہوں۔ مجھے ایک ظالم آدمی نے اس پنجرے میں بند

ہے... میں وعدہ کرتی ہوں اب کسی جانور کو نہ ستاؤں گی۔ میں نے توبہ کرلی ہے... میری مدد کرو...!

اُلّو (خاموش رہتا ہے)

لومڑی بھائی ذرا سوچو تو، اگر تم کو بھی کسی پنجرے کے اندر بند کر دیا جائے تو تمھارا کیا حال ہوگا؟ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے اس مصیبت سے نکال سکتے ہو... تم بہت عقلمند ہو... دنیا کے سارے اُلّو بہت عقلمند ہوتے ہیں...

اُلّو (اونگھتا رہتا ہے، کوئی جواب نہیں دیتا۔)

لومڑی بھائی اُلّو اب زیادہ دیر نہ کرو، صبح ہونے کو ہے مجھے بہت زور کی بھوک بھی لگ رہی ہے۔ ہاں تم نے بھی تو اب تک ناشتہ نہیں کیا ہوگا۔ میں تمھارے ناشتے کے لیے ایک موٹا سا چوہا پکڑ دوں گی۔ مجھے اس پنجرے سے نکال دو—

(آواز نکالتا ہے) گھو... گھو... گھگ... گھگ... گ... گ...

میاں ککڑوں کوں (چونک پڑتا ہے) یہ کس نے مجھے جگا دیا؟

لومڑی بھائی ککڑوں کوں...!

میاں ککڑوں کوں اچھا تو یہ تم تھیں! تم نے مجھے کیوں جگا دیا۔ سب کو تو میں جگاتا ہوں۔ یہ میرا کام ہے تمھارا نہیں۔ (دو مرتبہ زور سے بانگ دیتا ہے ککڑوں کوں... ککڑوں کوں...!)

لومڑی یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ تم جاگ گئے۔ اب ذرا میری مدد کرو... بھوک اور پیاس کے مارے میرا دم نکلا جا رہا ہے... مجھے اس پنجرے کے اندر سے نکالو... میں توبہ کر چکی ہوں اب کسی مرغے، مرغی یا چوزے کو نہیں کھاؤں گی۔ کبھی نہیں...

میاں ککڑوں کوں (خوشی کے لہجے میں) واہ، واہ تم پنجرے کے اندر بند ہو۔ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ ککڑوں کوں... ککڑوں کوں... ابھی تک کچھ بچے بستروں سے نہیں اٹھ پائے۔ اسکول کا وقت قریب ہے۔

(خرگوش داخل ہوتا ہے)

خرگوش چچا ککڑوں کوں آداب... صبح بخیر

میاں ککڑوں کوں خوش رہو۔ صبح کی ورزش کرنے نکلے ہو؟

خرگوش جی ہاں۔ ذرا دو چار میل کی دوڑ لگا لوں۔

(چاروں طرف دوڑتا ہے۔ اس دوران اس کی نظر لومڑی پر پڑتی ہے۔ سہم جاتا ہے۔)

خرگوش اوہ! معاف کیجیے گا محترمہ لومڑی صاحبہ... میں نے بڑی گستاخی کی آپ کے سامنے...

(وہ بھاگنا ہی چاہتا ہے کہ لومڑی آواز دیتی ہے)

لومڑی میاں خرگوش مجھ سے بالکل مت ڈرو... دیکھو میں پنجرے کے اندر بند ہوں...

خرگوش (غور سے دیکھتا ہے اور اطمینان کی سانس لیتا ہے۔) اچھا تو یہ بات ہے۔ آپ اندر بند ہیں

یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔

لومڑی بیٹا! ذرا میرے قریب آؤ۔ میں تو اب توبہ کر چکی ہوں۔ اب کبھی کسی خرگوش کو نہ کھاؤں گی۔ چاہے بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر جاؤں۔ اب میں بالکل بدل گئی ہوں۔ مجھ پہ بھروسا کرو۔

خرگوش یعنی آپ نے اور توبہ کر لی ... ! اس سے زیادہ عجیب بات تو میں نے آج تک نہیں سنی کہ کسی لومڑی نے خرگوش کھانے سے توبہ کر لی ہو!

لومڑی میاں میری بات کا یقین کرو۔

خرگوش مگر محترمہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟

لومڑی کیا تم اس پنجرے کو دیکھتے ہو؟ یہ باہر سے بند ہے۔ اس کو کھول دو۔

خرگوش اور آپ باہر آ جائیں گی اور میں آپ کے پیٹ کے اندر .... نا،نا! میں ایسی حماقت نہیں کر سکتا۔

لومڑی اف، تم سمجھتے کیوں نہیں۔ میں نے بالکل توبہ کر لی ہے۔ میں تمھارے احسان کا بدلہ کبھی نہیں بھولوں گی۔ مجھے اس نامعقول پنجرے سے باہر نکال دو.... نکال دو نا، میرے اچھے خرگوش۔ میں تم کو نہیں کھاؤں گی...

خرگوش مگر محترمہ آپ میرے چچا بھورے میاں کو کھا چکی ہیں...

لومڑی وہ میری غلطی تھی مجھے اس کا افسوس ہے اب کبھی ایسا نہیں ہوگا۔ میں اب اچھی بن کر اچھی زندگی بسر کروں گی۔ اب مجھے کوئی بھی اچھا بن جانے سے نہیں روک سکتا۔

خرگوش مجھے تو ذرا بھی امید نہیں کہ آپ واقعی اچھی بن جائیں گی۔

لومڑی مگر بھلا اس پنجرے کے اندر رہ کر میں کیسے اچھی بن سکتی ہوں۔ میں توبہ کر چکی ہوں، کسی بھی خرگوش کو کبھی نہیں کھاؤں گی۔

خرگوش مگر آپ اپنا وعدہ بھول گئیں تو؟

لومڑی نہیں۔ میں اپنا وعدہ نہیں بھول سکتی.... میری یادداشت اتنی خراب نہیں ہے۔

خرگوش اچھا اگر آپ وعدہ کرتی ہیں تو... میں آپ کو پنجرے سے باہر نکالے دیتا ہوں... مگر دیکھیے آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں اسے بھولیے گا نہیں...

(وہ پنجرے کے قریب آتا ہے۔ تالے میں لگی ہوئی چابی گھماتا ہے۔ تالا کھل جاتا ہے۔ دروازہ بھی کھل جاتا ہے۔ لومڑی باہر نکل آتی ہے)

لومڑی (خوش ہوتی ہے) ہاہا... ہاہا... اب میں آزاد ہوں (خوشی کے مارے ناچنے لگتی ہے۔ ناچتے ناچتے رک جاتی ہے اور خرگوش کو سونگھتی ہے) اف میں تو بھول ہی گئی۔ میں بہت بھوکی ہوں میں نے بہت دنوں سے کسی خرگوش کو نہیں کھایا ہے۔ میاں خرگوش میں تم کو کھاؤں گی ... !

خرگوش (خوف سے کانپ جاتا ہے) مگر... مگر... آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ میں آئندہ کسی خرگوش کو نہیں کھاؤں گی... آپ اتنی جلدی بھول گئیں... !

لومڑی ہاں میں نے وعدہ کیا تھا۔ مگر میں اس وقت یہ بھول گئی تھی کہ میں بہت بھوکی ہوں۔

خرگوش مگر میں نے آپ کے ساتھ احسان کیا ہے اس کا بدلہ مجھے یہ دے رہی ہیں!

لومڑی احسان اور بدلہ یہ سب بے وقوفی کی باتیں ہیں تم نے یہ سب کہاں سے سُنا؟

خرگوش یہ سب باتیں میری ماں نے مجھے بتائی ہیں جناب!

لومڑی کیا تم نے کبھی احسان کو دیکھا ہے؟

خرگوش نہیں محترمہ، احسان اور نیکی وغیرہ دیکھنے کی چیزیں نہیں۔ انھیں کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ آپ بھی نہیں!

لومڑی افسوس! ورنہ تمھارے بدلے ان کو کھا لیتی... خیر مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے تیار ہو جاؤ...

خرگوش جناب میں نے آپ کے ساتھ ایک بھلائی کی ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ بھلائی کر دیجیے۔ مجھے بخش دیجیے۔ مجھے نہ کھائیے۔

لومڑی نہیں میں تم کو ضرور کھاؤں گی... ہاں میں تمھارے ساتھ اتنی بھلائی کر سکتی ہوں کہ اگر تم تین جانوروں میں سے دو سے یہ کہلوا دو کہ احسان کا بدلہ اچھی چیز ہے تو میں تم کو نہیں کھاؤں گی...

خرگوش اچھا، مجھے منظور ہے... پہلے چچا ککڑوں کوں سے ہی پوچھا جائے۔

(ککڑوں کوں سے مخاطب ہو کر) چچا کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ احسان کا بدلہ اچھی چیز ...

میاں ککڑوں کوں احسان کا بدلہ! میں نے اس دنیا میں بہت کچھ دیکھا ہے مگر احسان کا بدلہ مجھے کہیں نہیں ملا۔ اب ذرا حضرتِ انسان ہی کو لے لو۔ میری بیوی کے انڈے کھا جاتا ہے میرے بچوں کا شوربہ بنا کر پی جاتا ہے۔ اور تو اور میں جب صبح صبح زور دار بانگ دیتا ہوں تو بجائے اس کے کہ بستر سے باہر نکل آئے، مجھے بُرا کہتا ہے کہ اس مُرغے نے نیند خراب کر دی.... جہاں تک میں سمجھتا ہوں احسان کا بدلہ نہیں ہے۔

لومڑی میاں خرگوش۔ میرا خیال ہے تم کو اب چٹ کر جانا چاہیے.... احسان کا بدلہ اچھی چیز نہیں۔ اس کو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔

خرگوش مگر ٹھہریے۔ ذرا الّو میاں سے بھی پوچھ لیا جائے ان کی عقلمندی ساری دنیا میں مشہور ہے۔ (الّو سے مخاطب ہوتا ہے) محترم الّو صاحب ذرا سنیے، ایک بات کا فیصلہ کر دیجیے۔ آپ تو عقلمندوں کے بادشاہ ہیں... آپ نے...

اُلّو میں ابھی سو رہا ہوں.... میری نیند خراب نہ کرو...

خرگوش بس میرا ایک چھوٹا سا سوال ہے۔ کیا احسان کا بدلہ اچھی چیز ہے؟

اُلّو میں ابھی سو رہا ہوں۔ میری نیند خراب نہ کرو۔

لومڑی الّو کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ احسان کا بدلہ اچھی چیز نہیں۔ فیصلہ ہو گیا۔ اب تم یہ بتاؤ کہ

تم کو کچا کھایا جائے یا پکا کر ؟

اُلّو (جاگ جاتا ہے) کیا لومڑی پنجرے کے باہر ہے ؟

خرگوش ہاں اب وہ پنجرے کے باہر ہے

اُلّو کیا تم نے اُسے باہر نکالا ؟

خرگوش جی ہاں !

اُلّو تب مجھے کہنا چاہیے کہ احسان کا بدلہ اچھی چیز ہے

خرگوش (خوش ہوکر) خدا کا شکر ہے۔ ایک تو ملا۔

لومڑی مگر تم کو دوسرا تلاش کرنا ہے۔ جلدی کرو.... بھوک کے مارے میری آنتوں میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔

(بی مینڈکی داخل ہوتی ہیں)

خرگوش اوہو، یہ تو بہری بی مینڈکی ہیں۔ ان کی سمجھ میں کیا خاک آئے گا۔ کیا اچھا ہوتا اگر بی بطخ ہوتی...

بی مینڈکی صبح بخیر۔ سب کو سالگرہ مبارک۔ ہر روز اس دنیا میں کسی نہ کسی کی سالگرہ ہوتی ہی رہتی ہے۔ میری یادداشت اتنی کمزور ہے کہ میں نام یاد نہیں رکھ سکتی۔ خیر..

لومڑی (خرگوش سے) اب تم اس سے پوچھتے ہو یا میں تم کو کھانا شروع کروں !

خرگوش (بی مینڈکی سے) دادی آداب !

بی مینڈکی جیتے رہو۔ اچھا تو آج تمھاری سالگرہ ہے خوب۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔

خرگوش نہیں، میری سالگرہ نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ لومڑی صاحبہ پنجرے کے اندر بند تھیں۔ میں نے ان کو باہر نکالا۔ اب وہ مجھے...

مینڈکی (بات کاٹ کر) میں اب سوئٹر نہیں بن سکتی۔ تمھارے دادا کا سوئٹر بھی پھٹ گیا ہے.. مگر میری آنکھوں سے سجھائی ہی نہیں دیتا...

خرگوش (زور سے کہتا ہے) اللہ رحم کرے... بات یہ نہیں ہے... ذرا غور سے سنو.... میں نے لومڑی صاحبہ کو پنجرے کے اندر سے نکالا تھا۔ اب وہ مجھے کھا جانا چاہتی ہیں۔ مجھے دو جانور ایسے تلاش کرنا ہیں جو یہ بتائیں کہ احسان کا بدلہ اچھی چیز ہے...

بی مینڈکی اچھا تو یہ بات ہے۔ تم پنجرے کے اندر بند تھے۔

خرگوش نہیں میں بند نہیں تھا۔ لومڑی صاحبہ بند تھیں۔

بی مینڈکی اچھا تو تم دونوں بند تھے۔

خرگوش نہیں صرف لومڑی...

لومڑی جلدی کہو مجھے بھوک ستا رہی ہے۔

میاں ٹکر مٹل کول (دیوار سے اُڑ کر آتا ہے) ٹھہرو، میں سمجھاتا ہوں۔ بی لومڑی پنجرے کے اندر بند تھیں اور خرگوش باہر تھا...

بی مینڈکی اچھا تو یہ کس کی سالگرہ تھی ؟

خرگوش (جھنجھلا کر) کسی کم بخت کی سالگرہ نہیں تھی۔ ذرا غور سے سنو... !

بی مینڈکی (سنبھل کر بیٹھ جاتی ہے) اچھا تو اب بتاؤ بھلا پنجرے کے اندر کون تھا ؟

لومڑی میں تھی۔

بی مینڈکی تم اندر کیسے پہنچیں ؟

لومڑی بس میں اندر چلی گئی۔

بی مینڈکی اچھا تو بات سیدھی ہے۔ تم اندر چلی گئیں، اور باہر آگئیں۔

میاں لکڑوں کوں نہیں یہ بات نہیں ہے۔ بی لومڑی اندر سے باہر خود نہیں آئیں۔

بی مینڈکی تعجب ہے۔ بی لومڑی اندر جا سکتی ہیں۔۔۔ باہر نہیں آسکتیں ؟

میاں لکڑوں کوں دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس میں تالا پڑا تھا۔ ایک آدمی نے بند کر دیا تھا۔ آیا کچھ سمجھ میں ؟

بی مینڈکی بات تو اور الجھ گئی۔۔۔ پہلے تو صرف ایک لومڑی تھی، ایک خرگوش تھا اور اب ایک آدمی بھی آگیا اور دروازہ اور تالا۔۔۔ میری سمجھ میں ابھی کچھ نہیں آیا۔ چلو پنجرے کے پاس چلیں۔ بس ذرا سی دیر میں بات سمجھ میں آجائے گی۔

(سب پنجرے کے پاس جاتے ہیں)

لومڑی میں پنجرے کے اندر تھی۔ خرگوش باہر تھا۔

بی مینڈکی تم اندر کیسے گئیں۔ ذرا جاکر بتاؤ تو سہی !

(لومڑی اندر چلی جاتی ہے۔)

بی مینڈکی اچھا اور آدمی کہاں تھا ؟

میاں لکڑوں کوں آدمی وہاں نہیں تھا۔

بی مینڈکی تو دروازہ کھلا تھا ؟

خرگوش نہیں دروازہ بند تھا۔ تالا بھی لگا ہوا تھا۔

بی مینڈکی [illegible]

(خرگوش دروازہ بند کر دیتا ہے۔ تالا لگا دیتا ہے)

بی مینڈکی ہوں، اب سمجھی۔ میاں خرگوش نے حماقت کی تھی دروازہ کھولنے کی۔

لومڑی (چلاتی ہے) ارے دروازہ کھولو۔۔ دروازہ کھولو۔۔۔ یہ تو صاف دھوکا ہے۔۔۔ یہ بہت بری بات ہے !

بی مینڈکی بی لومڑی۔۔ اب اسی میں بند رہو اور چلاتی رہو۔ جو دوسروں کو دھوکا دیتا ہے اُسے ضرور سزا ملتی ہے

لومڑی (روتی ہے، چلاتی ہے) میری توبہ، اب کبھی دھوکا نہیں دوں گی۔۔۔ مجھے باہر نکالو۔۔۔

(میاں لکڑوں کوں، خرگوش اور بی مینڈکی ناچتے ہیں۔)

(پردہ گرتا ہے)

(انگریزی سے ترجمہ)

لطیفہ

بڑا بھائی: (چھوٹے بھائی کو مارنے کے بعد) میں تمہیں اس لیے سزا دیتا ہوں کہ تم پھر بعد میں خراب کام نہ کرو اور اچھے لڑکے بن جاؤ ورنہ مجھے تم سے محبت بہت ہے۔

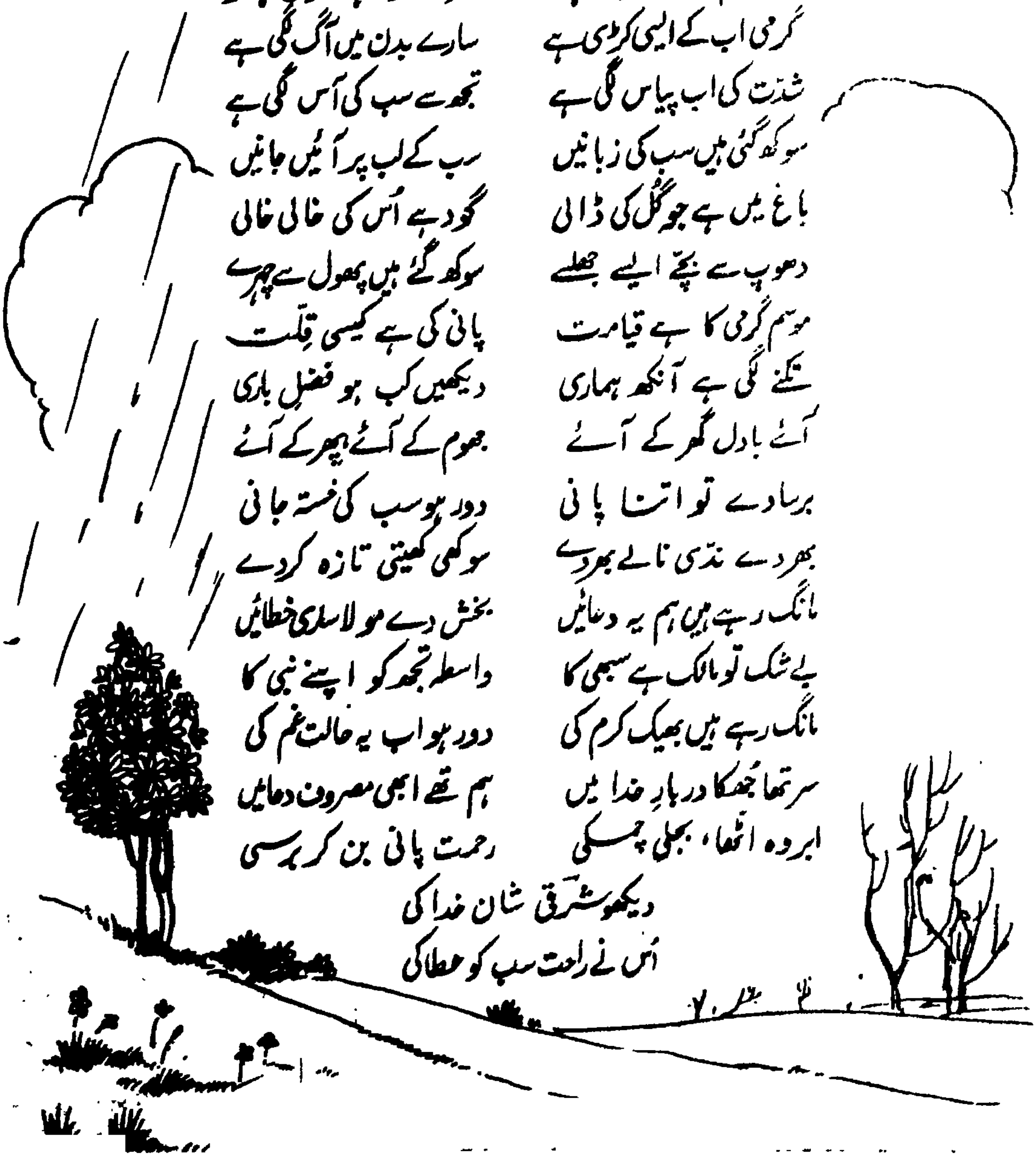
چھوٹا بھائی: محبت تو مجھے بھی آپ کے ساتھ بہت ہے۔ مگر میں اس قدر چھوٹا ہوں کہ اس کا اچھی طرح سے اظہار نہیں کرسکتا

برسات کے لیے دُعا

محمد عبداللہ شرقی مدراس

ابرِ رحمت برسا مولا! — ہم کو نہ اب تو ترسا مولا
جائیں کہاں یہ تیرے بندے — مانگیں آخر کس سے بندے
تو ہی ہم سب کا ہے سہارا — تیرے سوا ہے کون ہمارا
گرمی اب کے ایسی کڑی ہے — سارے بدن میں آگ لگی ہے
شدت کی اب پیاس لگی ہے — تجھ سے سب کی آس لگی ہے
سوکھ گئی ہیں سب کی زبانیں — سب کے لب پر آئیں جانیں
باغ میں ہے جو گُل کی ڈالی — گود ہے اُس کی خالی خالی
دھوپ سے بچے ایسے جھلسے — سوکھ گئے ہیں پھول سے چہرے
موسم گرمی کا ہے قیامت — پانی کی ہے کیسی قِلت
تکنے لگی ہے آنکھ ہماری — دیکھیں کب ہو فضلِ باری
آئے بادل گھر کے آئے — جھوم کے آئے بھر کے آئے
برسا دے تو اتنا پانی — دور ہو سب کی خستہ جانی
بھر دے ندی نالے بھر دے — سوکھی کھیتی تازہ کر دے
مانگ رہے ہیں ہم یہ دعائیں — بخش دے مولا ساری خطائیں
بے شک تو مالک ہے سبھی کا — واسطہ تجھ کو اپنے نبی کا
مانگ رہے ہیں بھیک کرم کی — دور ہو اب یہ حالتِ غم کی
سر تھا جھکا دربارِ خدا میں — ہم تھے ابھی مصروف دعا میں
ابر وہ اٹھا، بجلی چمکی — رحمت پانی بن کر برسی

دیکھو شرقی شان خدا کی
اُس نے راحت سب کو عطا کی



جناب مولانا مقبول احمد سیوہاروی

یہ ہے ایک راجہ کا انصاف

اب سے سیکڑوں برس پہلے کی بات ہے گجرات کے علاقے میں ایک بڑی مسجد تھی اس میں ایک مینارہ بھی تھا جہاں مسلمان اذان دیتے تھے۔ جس علاقے میں مسجد تھی وہاں سب ہی لوگ رہتے تھے۔ ہندو، مسلمان، پارسی۔۔

جب بھی اذان ہوتی پارسی اذان سُن کر ناخوش ہوتے پارسیوں نے ہندوؤں کو اکسا کر مسلمانوں سے لڑا دیا، اور ہندوؤں نے مسجد بھی توڑ دی اور منارہ بھی گرا دیا۔

مسجد کا امام بھاگ گیا ورنہ وہ بے چارہ بھی مارا جاتا۔

امام کا نام تھا "علی"۔ علی جانتا تھا کہ یہاں کا راجہ بڑا انصاف کرنے والا راجہ ہے۔ اس نے درخواست لکھ کر راجہ تک پہنچانی چاہی تو کسی اہلکار نے علی کی بات نہ سُنی اور راجہ تک درخواست نہ پہنچائی۔

علی نے راجہ تک رسائی کی تدبیر یہ سوچی کہ جب بھی راجہ شکار کو جائے درخواست اس تک پہنچا دی جائے اس وقت نہ کوئی وزیر اور امیر روک سکے گا اور نہ کوئی اہلکار۔۔۔۔

علی یہ جد و جہد کرتا رہا کہ راجہ شکار کو کب جائے گا اور جب اسے پتہ چل گیا تو شکار پر جانے کے راستے میں ایک جھاڑی میں جا چھپا۔

علی نے ہندی زبان میں ایک نظم لکھی تھی۔ اس نظم میں مسجد اور منارے کے ٹوٹنے کا حال لکھا تھا اور مسلمانوں کو مارنے پیٹنے کا ذکر تھا۔

اب دیکھیے! علی دیکھتا رہا، گھوڑوں، ہاتھیوں اور اونٹوں پر شکار کا سامان تھا اور شکار کی تلاش کرنے والے لوگ گاتے بجاتے جا رہے تھے۔

راجہ کا ہاتھی آیا تو علی جھاڑی سے نکل کر راجہ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "مہاراج میری فریاد سُن لیجیے۔ حضور کے راج میں مسجد توڑ دی گئی اور اسّی مسلمان شہید کر دیے گئے ہیں"۔ یہ سب حال علی نے اپنی نظم میں بھی لکھا تھا۔ راجہ نے علی سے درخواست لے لی اور ایک افسر کو دے کر ہدایت کی کہ ہمیں فرصت کے وقت یہ درخواست پھر دکھائی جائے۔ پھر وزیر کو بلا کر کہا کہ میں تین دن تک محل میں آرام کروں گا۔ ان تین دنوں میں کوئی بھی کبھی نہ مجھ نہ مجھ سے ملے نہ کسی کام کے لئے

مجھے تکلیف دی جائے۔ راج کے سارے کام تم کرنا۔

وزیر نے کہا: "ان داتا جیسا حضور فرماتے ہیں ایسا ہی ہوگا۔ حضور آرام فرمائیں۔"

رات ہوئی تو راجہ محل میں چلا گیا۔ پھر ایک تیز رفتار سانڈنی منگا کر اور بھیس بدل کر جس علاقے کی مسجد کا علی نے اپنی درخواست میں ذکر کیا تھا اس طرف روانہ ہوگیا۔

جب اس علاقے میں پہنچا تو اس نے اپنی صورت اور لباس سوداگروں جیسا بنا لیا تھا۔ راجہ بازاروں میں، گلیوں میں محلوں میں پھرا اور جس کسی سے مسجد اور منارہ کا ذکر کیا، سب نے افسوس ظاہر کیا اور مسجد و منارہ کی داستان سنائی۔ اور سب ہی نے کہا کہ مسلمان بے گناہ مارے گئے ہیں۔

سمندر اس علاقے کے قریب تھا۔ راجہ نے ایک لوٹے میں سمندر کا پانی بھرا، اس کا منھ بند کیا اور پھر اسی طرح راتوں رات اپنی راجدھانی میں پہنچ گیا۔

صبح ہوئی تو راجہ دربار میں آیا اور مسجد کے امام "علی" کو یاد کیا۔ علی حاضر ہوا تو حکم دیا کہ اپنی درخواست بھرے دربار میں پڑھ کر سنائے۔ علی نے درخواست سنائی تو سارے امیروں اور وزیروں نے علی کی درخواست کو غلط بتایا: "یہ سب جھوٹ ہے اور علی کا دعویٰ غلط ہے!"

راجہ نے سمندر کے پانی کا لوٹا منگا کر تمام امیروں اور وزیروں کو تھوڑا تھوڑا دیا کہ وہ چکھ کر بتائیں کیسا پانی ہے۔

سب نے کہا: "ان داتا یہ تو سمندر کا پانی ہے!"

راجہ نے کہا: "میں جانتا تھا کہ تم لوگ مذہب کے معاملے میں کسی کی بات چلنے نہ دوگے اور مجھے مسجد کے لوٹنے کی پوری تحقیق کرنی تھی۔ اس لیے راتوں رات گیا اور پوری جانچ کی۔ مسلمان مظلوم ہیں اور ان کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ میرے راج میں کسی پر بھی جو میرے سائے میں ہے، ایسا ظلم نہیں کیا جاسکتا! پھر برہمنوں اور پارسیوں کو سزا دی اور مسلمانوں کو ایک لاکھ بالوتڑا (گجراتی سکہ) دینے کا حکم دیا تاکہ مسجد اور منارہ دوبارہ بنوالیں۔ اور امام کو خلعت اور انعام دیا۔

مسجد دوبارہ بن گئی۔ اور یہ انعامات اسی میں بطور یادگار کے رکھے گئے۔ عید کے دن انھیں نکال کر سب کو دکھایا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو کہ راجاؤں کا انصاف ایسا بے لاگ ہوتا تھا!

جس سیاح نے یہ حال لکھا ہے اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسلام کی یہ یادگار اب تک اس ملک میں موجود ہے۔

اور یہ سیاح اب سے سات سو بیس برس پہلے اس علاقے سے گزرا تھا۔

لطیفہ

مرزا غالب سے ایک صاحب ملنے کے لیے آئے۔ اوپر سے نیچے تک ہرا لباس پہنے ہوئے تھے۔ غالب نے ان کی بہت آؤ بھگت کی۔ حقہ پلایا، پان کھلایا۔ پان کھلا کر کہنے لگے: "پہلے تم ہریل تھے اب پان کی وجہ سے چونچ لال ہوگئی اور پورے میاں مٹھو بن گئے۔" اب کہو! "نہیں جی معاف کیجیے"

سید قمر الحسن

جناب رفیق شاستری ایم اے

پنچ تنتر کی کہانیاں

مینڈکوں نے سانپ کی سواری کی

ایک جنگل میں ایک بوڑھا سانپ رہا کرتا تھا اسے بہت دنوں سے کچھ کھانے کو نہیں ملا تھا۔ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا کسی طرح گھسٹتا ہوا وہ تالاب کے پاس پہنچا وہاں بہت سے مینڈک اچھل کود رہے تھے۔ سانپ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ ان مینڈکوں کو پکڑ پاتا۔ لاچار ہو کر وہ ایک کونے میں اداس جا کر بیٹھ گیا۔ سانپ کو اس طرح اداس دیکھ کر کچھ مینڈکوں کو تعجب ہوا۔ اور ایک مینڈک سانپ کے قریب جا کر بولا: "کہ آپ آج کچھ کھا نہیں رہے ہیں۔ کیوں اس قدر اداس ہیں"

سانپ نے کہا "ہاں بھائی اس اداسی کا بھی ایک سبب ہے"

مینڈکوں نے پوچھا: "بھلا کیا سبب ہے؟"

سانپ نے مینڈک کو ایک من گھڑت کہانی سنا دی کہ آج صبح جب میں ایک مینڈک کو مارنے کے لیے آگے بڑھا تو وہ مینڈک وہاں سے اچھل کر کچھ بیٹھے ہوئے اللہ والے سادھو کے بیچ چلا گیا۔ میں بھی اس مینڈک کے لالچ میں سادھوؤں کی ٹولی میں پہنچ گیا۔ ایک سادھو کا پیر میرے اوپر آ گیا اور میں نے اسے ڈس لیا۔ وہ سادھو تو مر گیا۔ مگر دوسرے سادھو نے جل کر مجھے یہ بد دعا دی کہ مینڈک کے لالچ میں تو یہاں تک آیا تھا اب مینڈکوں کو اپنی پیٹھ پر لاد کر انھیں سیر کرا۔ یہ مینڈک سیر سپاٹے سے خوش ہو کر جو کچھ تجھے دیں گے بس وہی تیری خوراک بنے گی۔ اس کے علاوہ تو اور کچھ نہیں کھا سکے گا اب میں یہاں تم لوگوں کو سیر کرانے آیا ہوں"

اس مینڈک نے سانپ کی یہ بات اپنے ساتھی مینڈکوں سے کہی۔ سارے مینڈک بہت خوش ہوئے۔ ہوتے ہوتے یہ بات مینڈکوں کے راجہ تک پہنچی۔ راجہ نے اپنے وزیروں سے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ مینڈکوں کے لیے اس سانپ کی سواری اچھی رہے گی۔ راجہ کے ساتھ سارے مینڈک سانپ کی پیٹھ پر لد گئے۔ جن کو سانپ کی پیٹھ پر جگہ نہیں ملی وہ پیچھے ایک گاڑی جوڑ کر اس میں بیٹھ گئے۔

پہلے تو سانپ نے بہت تیزی دکھائی بعد میں اس کی چال سست ہو گئی۔ راجہ نے پوچھا کیا بات ہے؟ چال کیوں دھیمی ہو گئی؟ سانپ نے جواب دیا: "مہاراج صبح سے بھوکا ہوں۔" اس پر راجہ نے اسے چھوٹے چھوٹے مینڈک کھانے کی اجازت دے دی۔

سانپ نے کہا: "سادھوؤں نے مجھے یہی بد دعا دی تھی کہ مینڈک اپنی خوشی سے جو بھی کھانے کو دیں گے۔ وہی کھایا کروں گا۔"

چھوٹے چھوٹے مینڈک کھانے کے بعد سانپ کے اندر کچھ طاقت آ گئی۔ اور وہ پھر تیزی سے گاڑی چلانے لگا۔

کچھ دیر بعد ایک اور کالا سانپ اُدھر آ نکلا۔ سانپ کے اوپر مینڈکوں کی سواری کا تماشہ دیکھ کر اسے بہت تعجب ہوا۔ وہ بوڑھے سانپ سے پوچھنے لگا کہ آخر

یہ ماجرا کیا ہے۔ مینڈک تو تمھاری خوراک ہیں انھیں اپنی پیٹھ پر کیوں لادے پھرتے ہو؟" بوڑھا سانپ بولا۔ "ہاں بھائی ٹھیک ہے۔ مگر کیا کیا جائے وقت وقت کی بات ہے۔ میں بھی اس وقت کا انتظار کر رہا ہوں۔"

وہ بوڑھا سانپ مینڈکوں کو سیر کراتا رہا اور مناسب موقع آنے پر تمام مینڈکوں کو چٹ کر ڈالا۔

یہ کہانی سننے کے بعد کوّے شاہ نے وزیر خاص کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ بہت دور اندیش اور باہمت ہیں کسی کام کو شروع کرکے اسے انجام تک پہنچانا بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ پست ہمت لوگ تو دشواریوں کے اندیشے سے کوئی کام شروع ہی نہیں کرتے۔ اس کے بعد ان کا نمبر آتا ہے جو دشواریوں سے گھبرا کر بیچ ہی میں کام چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ مگر سب سے اعلیٰ وہ ہوتے ہیں جو دشواریوں سے گھبرا کر کام کو بیچ میں نہیں چھوڑتے بلکہ اسے انجام تک پہنچانے کے لیے جد و جہد میں لگے رہتے ہیں۔ آپ نے میرے دشمنوں کا خاتمہ کرکے واقعی ایک بڑا کارنامہ کیا ہے۔"

وزیر خاص نے جواب میں کہا:۔ "مہاراج میں نے تو بس اپنے فرض کو پورا کیا ہے۔ کبھی کبھی بڑے بڑے جواں مردوں کے بھی حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں آپ کو اپنی کھوئی حکومت مل گئی مگر ایک بات آپ کبھی نہ بھولیے گا کہ یہ سارا راج پاٹ چند دنوں کا کھیل ہے اس لیے اقتدار کے نشے میں آکر کبھی ظلم اور تشدد نہیں ڈھانا چاہیے اور امن و انصاف سے رعایا پر حکومت کرنی چاہیے۔ اسے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ راجہ رعایا کا مالک نہیں خادم ہوتا ہے۔"

اس کے بعد کوّے شاہ کئی برسوں تک وزیر خاص کی مدد سے ہنسی خوشی حکومت کرتا رہا۔

(تیسرا منتر ختم ہوا)

اگلے شمارے سے اب چوتھا منتر شروع ہوگا جس کی بنیادی کہانی بندر اور مگرمچھ کی دوستی ہے۔

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابن بطوطہ

مئی ۱۹۹۹ء سے سلسلہ ملائیے۔

عید آگئی

عید کے دن بادشاہ کا جلوس نہایت شان دار نکلتا ہے
نوجیں ساتھ ہوتی ہیں بیگمات گاڑیوں میں اپنے باڈی گارڈ کے اور
خادماؤں کے ساتھ چلتی ہیں۔ سلطان کی بیٹی کی سواری نکلتی ہے
جس کے سر پر تاج ہوتا ہے۔ جان بک اور تین بک اپنی فوجوں
کے ساتھ چلتے ہیں۔ جلوس میں قاضی القضاۃ شہاب الدین بھی
ساتھ رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ علماء و مشائخ ہوتے ہیں۔ امام
بدرالدین قواس شریف ابن عبد الحمید ولی عہد تین بک کے ساتھ
چلتے ہیں۔

عید کی نماز قاضی القضاۃ شہاب الدین نے پڑھائی
خطبہ نہایت شان دار تھا۔ نماز کے بعد سلطان سوار ہو کر اپنی
نشست گاہ پہنچا جسے خاص عید کے لئے آراستہ کیا جاتا ہے۔
بیٹی اور ولی عہدوں کے لیے دوسری نشست گاہ تھی۔
امیروں اور اہل خاندان کی نشست الگ تھی، جس
میں نہایت عمدہ کرسیاں جنھیں یہاں صندلی کہتے ہیں برابر برابر
بچھی ہوئی تھیں۔ پھر فوجی کھیل دکھائے گئے۔ تیر اندازی کے
کمالات دکھائے گئے۔

امیروں میں ستّرہ امیر تھے، انھیں امیر طومان کہتے ہیں
امیر طومان کے جلوس میں دس ہزار سوار رہتے ہیں۔ اس حساب
سے یہ تمام امیر ایک لاکھ ستّر ہزار فوج کے سرگردہ تھے۔ فوجی
کمالات اور تیر اندازی ایک گھنٹہ تک ہوتی رہی۔ پھر خلعتیں
لائی گئیں اور بادشاہ کی طرف سے امیروں کو پہنائی گئیں خلعت
پہن کر ہر ایک امیر سلطان کی نشست تک جاتا اور دو زانو ہو کر
تعظیم بجا لاتا۔

ان تمام رسموں کے بعد سلطان نشست گاہ سے
اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گیا دائیں طرف ولی عہد بائیں طرف
دوسرا بیٹا، بیچ میں بیٹی سامنے چاروں بیگمات۔ بیگمات گاڑی
میں سوار تھیں جس میں زرنگار جھولوں سے آراستہ گھوڑے
جُتے ہوئے تھے۔ سلطان کے سوار ہوتے ہی چھوٹے بڑے
تمام امرائے دولت پاپیادہ ہو گئے اور جو بارگاہ عید کے
دربار کے لیے آراستہ کی گئی تھی وہاں تک ساتھ گئے۔

یہ بارگاہ لکڑی کے چار کھمبوں پر ٹکی ہوئی تھی۔
جن پر چاندی کے پتّر نہایت کاریگری سے چڑھے ہوئے
تھے۔ چاروں کھمبوں پر چاندی کے کلس جن پر سونا جڑا ہوا تھا
سورج کی روشنی میں ایسے جگمگا رہے تھے کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی
تھی۔ بارگاہ کیا تھی ایک عظیم الشان عمارت تھی جس کا پورا
فرش ریشمین غالیچوں سے آراستہ تھا۔ وسط بارگاہ میں شاہی
تخت تھا۔ تخت پر بھی چاندی کے پتّر چڑھے ہوئے تھے اور
سونے کی مُلمّع کاری تھی۔ بیچ میں شاہی مسند تھی جس پر سلطان
اور سلطان کی بیگم جلوہ افروز تھی۔ دائیں طرف کی مسند پر
لڑکی بیٹھی تھی جس کے ساتھ دردجا بیگم اور بائیں طرف کی مسند

پر بیلون بیگم اور کبک خاتون کی نشست تھی۔

تخت کی دائیں طرف کی کرسی پر تین بک ولی عہد سلطنت اور بائیں طرف جان بک بیٹھے تھے۔ اور پھر دائیں بائیں حسب مراتب بڑے چھوٹے امیر بیٹھے تھے۔ اس کے بعد چاندی سونے کی کشتیوں میں کھانا لایا گیا۔ گھوڑوں اور بکروں کا گوشت تھا۔

ہر امیر کے سامنے ایک کشتی رکھ دی گئی۔ پھر ریشمی لباس اور ریشمی پٹکے باندھے ہوئے باورچی حاضر ہوئے جن کے پاس تھیلیوں میں چھریاں تھیں۔

باورچی ہر ایک امیر کے سامنے سونے یا چاندی کا پیالہ رکھ دیتا تھا جس میں نمک کا پانی ہوتا تھا۔ اور ایسے گوشت کے ٹکڑے جو ہڈیوں سے لگے تھے کاٹ کاٹ کر سامنے رکھ دیتا تھا۔

کھانا ختم ہوگیا تو نبیذ آئی جسے شہد سے بنایا جاتا ہے نبیذ میں نشہ نہیں ہوتا مگر ہلکا سا سرور ہوتا ہے۔ حنفی مسلمان اسے جائز سمجھتے ہیں۔ سلطان نے پیالہ لینا چاہا تو فوراً اسکی بیٹی مسند سے اٹھی اور سلطان کے سامنے نہایت ادب سے پیالہ پیش کیا۔ سلطان کے بعد دوسرے پیالے بڑی بیگم اور دوسری بیگمات کے سامنے پیش کیے۔ اس کے بعد پیالہ ولیعہد نے لیا بیگمات کے سامنے درجہ بدرجہ پیش کیے۔

پھر ولی عہد کے بھائی جان بک نے ساقی گری کی اور سب کو نبیذ پلائی۔ اس کے بعد امیروں کے لڑکے کھڑے ہوئے اور اپنے اپنے بزرگوں کے سامنے پیالے پیش کیے۔

جب تک دور چلتا رہا گانے والے اپنے گانے کے کمالات سے سامعین کو لطف اندوز کرتے رہے۔

علماء اور مشائخ کے لیے بھی ایک خیمہ نصب کیا گیا تھا اور ان کے سامنے بھی سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے لائے گئے جن میں کچھ نے ان برتنوں میں کھانا پسند نہیں کیا اور لکڑی کے پیالوں میں کھایا۔ کچھ نے ان ہی برتنوں میں کھالیا۔

جہاں تک نگاہ جاتی تھی گھوڑوں کے دودھ کے بھرے ہوئے برتن گاڑیوں میں بھرے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ جنھیں سلطان نے تقسیم کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ میرے سامنے بھی ایک گاڑی لائے جسے میں نے اپنے ترک پڑوسی کو دے دیا۔

حاج ترخان

جس شہر سے کسی قسم کا ٹیکس نہیں لیا جاتا یعنی معافی الاخراج ہوتا ہے اسے ترکی زبان میں ترخان کہتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہاں ایک حاجی نے قیام کیا تھا۔ یہ بڑا مقدس اور نیک آدمی تھا اس لیے یہ جگہ اسے بطور معافی دیدی گئی تھی۔ اس وقت یہاں کوئی آبادی نہ تھی کچھ دن بعد لوگ آنے لگے اور رفتہ رفتہ اچھی خاصی آبادی ہوگئی۔ اور اب بڑا اچھا شہر ہوگیا ہے۔ سلطان یہیں رہتا ہے شہر کی آبادی نہر اتل پر ہے۔

نہر اتل دنیا کی بڑی نہروں میں سے ایک نہر ہے سردی کے زمانے میں اس کا پانی اور آس پاس کے تالاب جم جاتے ہیں پھر ہزاروں گھاس کے گٹھے دریا میں ڈالے جاتے ہیں تاکہ گاڑیاں اور گھوڑے گزر سکیں۔

سردی کے آخر میں کبھی کبھی مسافر ڈوب کر ہلاک بھی ہوجاتے ہیں کیونکہ برف نرم پڑجاتا ہے اور چلنے والا بے خبری میں غرق ہوجاتا ہے۔

سفرِ قسطنطنیہ

بیگم بیلون نے سلطان سے میکہ جانے کی اجازت مانگی

ہے اور اپنے باپ سے ملنے جارہی ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی اپنے ہمراہ چلنے کی اجازت دلا دیجیے قسطنطنیہ دیکھنے کا بڑا اشتیاق ہے۔"

بیگم نے کہا "قسطنطنیہ میں ہر وقت مسلمانوں کی جان کا خطرہ ہے وہ خالص عیسائیوں کا ملک ہے آپ نہ جائیے۔"

میں نے کہا "آپ کے ساتھ رہ کر خطرہ کا کیا سوال ہے آپ تو شاہِ قسطنطنیہ کی نورِ نظر ہیں۔" اس پر وہ خوش ہوگئی اور مجھے سلطان سے اجازت دلا دی۔ چلتے وقت مجھے سلطان نے ڈیڑھ ہزار اشرفیاں، خلعت، بہت سے گھوڑے کپڑے سنجاب اور سمور کی پوستینیں دیں۔ بیگمات اور لڑکوں نے بھی دیا اور بڑی عزت سے رخصت کیا۔

سلطان ملکہ اور ولی عہد نے بیلون بیگم کو ایک منزل تک پہنچایا۔ پانچ ہزار سوار، ایک سو چھوکریاں، چار سو گاڑیاں گاڑیوں کو کھینچنے والے ایک ہزار گھوڑے تین سو بیل اور دو سو اونٹ تھے۔ ساتھیوں میں دس ہندی اور دس رومی جوان تھے ہندی جوانوں کا سردار سنبل تھا اور رومیوں کا میخائیل۔

راستے میں ایک شہر آیا جس کا نام اُکک ہے۔ یہاں سردی زیادہ تھی اس شہر سے ایک دن کے فاصلے پر روس کے پہاڑ ہیں۔

روس میں رہنے والے عیسائی بڑے دغا باز ہیں اُنکی صورت بھی اچھی نہیں ہوتی۔ روسیوں کے بال بھورے آنکھیں کرنجی ہوتی ہیں۔ روس میں چاندی کی کانیں ہیں۔

یہاں سے چلے تو دس رات سفر کرنے کے بعد سرادق پہنچے جو صحرائے خفچاق کے ساحل پر ہے۔ یہاں بہترین گودی ہے حکومت ترکوں کی ہے یونانی اس کے تابع ہیں۔

ان تمام شہروں سے گھوڑے بھیڑیں گائے دودھ گھوڑیوں کا دودھ بیگم کے لئے بطور دعوت آتا تھا۔ اور ہر ایک شہر کا امیر بیگم کو دوسری سرحد تک پہنچا دیتا تھا۔ اس سفر میں پانی کم ملتا ہے ترکوں نے پانی اور دودھ مشکوں میں بھر لیا تھا۔ اس لئے کوئی تکلیف نہیں ہوئی

صبح شام میں بیگم کے سلام کے لیے جاتا تھا۔ اور جب بھی وہ ہمارے لیے کھانا بھیجتی دو تین گھوڑے بھیج دیا کرتی۔ اور بھیڑیں بھی۔ میں گھوڑوں کو ذبح نہ کرتا تھا اور میرے پاس پچاس گھوڑے ہوگئے تھے۔ سرحد کے آخر میں شہر بابا سلطوق میں ہم پہنچے تو خوب سردی تھی اور پیاس کا نام و نشان نہ تھا۔ ایک دن بیگم کے سلام کو گیا تو انھوں نے اپنے وکیل کو حکم دیا کہ باورچی خانے سے پندرہ تیار گھوڑے مجھے دے دیے جائیں اور مجھ سے کہا۔ آپ ذرا فکر نہ کریں ضرورت ہو تو اور منگالیں۔

مہنولی

مہنولی سے رومی عملداری شروع ہوگئی ہے اور بیگم اپنے باپ کے دار الحکومت میں پہنچ گئی ہے۔ رومی حکمراں کی طرف سے بڑی شان دار دعوت آئی ہے۔

مہنولی سے فقط گھوڑوں کے ذریعے سفر ہوگا، گاڑیاں سب چھوڑ دی گئیں۔ حکمراں نے بہت سے خچر بھیج دیے ہیں۔ ان میں سے چھ خچر بیگم نے مجھے بھیج دیے۔ مسجد کا خیمہ قلعہ میں چھوڑ دیا اور ان کی حفاظت کر دی گئی۔

کھانے میں سور اور کھانے کے بعد مشروب میں شراب آنے لگی خواصوں نے مجھے بتایا کہ بیگم نے شراب بھی پی ہے اور سور بھی کھایا ہے بیگم کے ساتھیوں میں ترکوں کے سوا کوئی نماز پڑھنے والا نہیں رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میرے قلب پر تاریکی آگئی ہے شاید

جناب محمد شاہد عظیم

وہ بے قصور تھا!

جب دوسری بس بھی رُکے بغیر گذر گئی تو میرا چہرہ اُتر گیا۔ انتظار میں کھڑے کھڑے ٹانگیں دُکھنے لگی تھیں — تھوڑی دیر بعد ایک اور بس آئی۔ اس میں بھی جگہ نہیں ملی میں نے اپنے دل کو تسلی دی "اگلی بس میں ضرور جگہ مل جائے گی۔"

"بابو جی — امیرا پیر!!" پیچھے کھڑا ہوا آدمی چلا اٹھا اس کا پیر میرے جوتے سے کچل گیا تھا۔ میں نے معافی مانگ لی۔ وہ بہت دیر تک آپ ہی آپ بڑبڑاتا رہا۔ اس کے کپڑوں سے سخت بدبو نکل رہی تھی۔ یہ بدبو میری برداشت سے باہر ہوگئی تھی — میلی چکٹ قمیص کے پھٹے ہوئے حصّوں سے اس کا بدن نظر آرہا تھا جس پر مَیل کی تہیں جمی تھیں۔ شاید بارش کے چھینٹوں سے بچنے کے لیے اس نے جھولی سر پر اوڑھ رکھی تھی۔ یہ کپڑوں سے زیادہ غلیظ تھی۔ اس کے چہرے کا کافی حصّہ ڈھک گیا تھا۔

ایک بار اس کا زخمی ہاتھ میری سفید بے داغ شرٹ سے چھو گیا تو میں تلملا کر رہ گیا۔ بدبو کے رے دماغ پھٹا جارہا تھا۔ میں اُسے اپنے پیچھے جگہ دے کر پچھتا رہا تھا۔ اتنے میں ایک اور بس آئی۔ دوبارہ دھکم دھکا شروع ہوگیا۔ لائن کب کی ٹوٹ چکی تھی، ہر کوئی اندر گھسنے کے لیے اپنا پورا زور لگا رہا تھا۔

جیسے تیسے میں بس کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ لیکن ابھی ایک اور مرحلہ باقی تھا — یعنی اندر داخل ہونا۔ بہت سے آدمی پہلے ہی دروازے سے چمٹے کھڑے تھے۔ میں نے بھی کوشش کرکے وہاں کھڑے رہنے کے لیے جگہ بنالی لیکن بس کنڈکٹر نے روک دیا "اندر جگہ نہیں ہے"

میں نے سنی ان سنی کردی۔ "میں کہتا ہوں جگہ نہیں ہے!" اس نے چیخ کر کہا۔ اس کے کانوں کی لویں تک سرخ ہوگئیں۔ ساتھ ہی اس نے گھنٹی بجادی۔ بس ایک جھٹکے کے ساتھ چل پڑی۔ میں جھنجھلایا ہوا اپنی جگہ واپس آگیا۔ وہ گندا سا آدمی اب بھی میرے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی جیسے میرا مذاق اڑا رہا ہو۔

میں نے نفرت سے اپنا منہ پھیر رکھا تھا۔ اس کے جسم سے نکلتی ہوئی بدبو نے شدت اختیار کرلی تھ

میں ذرا اور آگے ہو گیا۔ مصیبت یہ تھی کہ اپنی جگہ چھوڑ بھی نہ سکتا تھا۔ کیونکہ اس صورت میں مجھے بارش میں بھیگنا اور لائن میں سب سے پیچھے یعنی آخری سرے پر کھڑا ہونا پڑتا اور غالباً دو تین گھنٹے بعد ہی بس مل پاتی۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی شاید کوئی دوست نظر آ جائے۔ پھر دور کھڑے ہوئے ایک نوجوان نے اپنے پیچھے مجھے جگہ دے دی۔ یہ صاحب خاصے فیشن ایبل تھے۔ گبرڈین کا سوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر فیلٹ ہیٹ جمی ہوئی بڑی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ایک اور بس آئی۔ ابھی رکی بھی نہ تھی کہ لوگ ٹوٹ پڑے۔ اب کے لوگوں کو دھکیل دھکال میں چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ سیٹ پر پہنچ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ بس فراٹے بھرنے لگی۔ وہ گندا سا آدمی دروازے کے پاس والی سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ بس کے جھٹکوں کے ساتھ اس کا سر پاس بیٹھے ہوئے مارواڑی لالہ کے کندھوں سے ٹکرا جاتا اور وہ اسے گالیاں دیتا۔

"بابو جی ٹکٹ!"

"آں... ں..." میں چونک پڑا۔ کنڈکٹر سامنے کھڑا تھا۔ آپ سے آپ میرے منھ سے نکل گیا "راجہ جی نگر"۔ کنڈکٹر نے ٹکٹ دے دیا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر یہ تو خالی واپس آ گیا! میں نے گھبرا کر دوسری جیب دیکھی جلدی سے بش شرٹ کی دونوں جیبیں دیکھ ڈالیں۔ اس وقت میری پریشانی دیکھنے کے قابل تھی۔ کسی نے موقع پا کر میری جیب پر ہاتھ صاف کر دیا! اس وقت بس میں بیٹھے سارے مسافر اب میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"جیب کٹ گئی —!"

"ارے کب؟"

"کس کی —؟"

آخری سرے پر بیٹھا عینک والا بوڑھا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سب کی نظروں میں بے پناہ ہمدردی اور رحم کے جذبات پا کر میری ڈھارس بندھی۔ اتفاق سے اسی بس میں میرے ایک دوست بھی تھے۔ انھوں نے ٹکٹ کے پیسے ادا کیے تب کہیں جا کر اطمینان نصیب ہوا۔ ورنہ شاید اس اندھیری طوفانی رات میں بس سے اتار دیا جاتا۔

مجھے اپنے روپوں کا بے حد رنج تھا۔ یہ میں نے ایک ایک پیسہ جوڑ کر جمع کیے تھے۔ یہی کوئی پچیس کے قریب روپے ہوں گے۔ لوگوں کے سروں پر سے پھسلتی ہوئی میری نظریں اسی گندے آدمی پر آ کر ٹک گئیں۔ میں نے سوچا وہی چور ہے، لائن میں وہی میرے قریب تھا۔ بس پر چڑھتے وقت اس نے مجھے دھکا بھی دیا تھا — کمینے — بدمعاش —!! میں نے اس کو گریبان سے پکڑ کر اٹھا لیا اور اس کے ساتھ ہی دو تین تھپڑ جڑ دیے۔

"میں نے کیا کیا بابو جی —؟"

"بابو جی کے بچے، اوّل تو جیب کاٹ لی اب ہم سے ہی پوچھتا ہے میں نے کیا کیا بابو جی —!" میں نے اُسے پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دی۔

"میں نے کسی کی جیب نہیں کاٹی — دیکھ لو میرے سارے کپڑے دیکھ لو —" وہ روتا ہوا بولا۔ اس کھینچا تانی میں اس کے سر پر سے کپڑا ہٹ گیا۔ لیکن یہ کیا —! میں نے حیرت سے دیکھا اور دونوں آنکھیں بند

کرلیں۔ وہ دونوں آنکھوں سے معذور تھا اور جزامی بھی کیونکہ اس کی ناک کچھ دب سی گئی تھی۔ چہرہ پھولا پھولا سالگ رہا تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر دوبارہ کپڑا ڈال لیا۔ وہ بے قصور تھا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔

فیلٹ ہیٹ والے نوجوان کا بس میں کہیں پتہ نہ تھا۔ وہی جیب کترا تھا۔ پہلے تو مجھے یقین نہیں آیا لیکن جب کنڈکٹر نے بتایا کہ فیلٹ ہیٹ والا کوئی نوجوان بس میں سوار ہی نہیں ہوا تو مجھے یقین ہوگیا کہ یہ کارروائی اسی کی تھی۔ لائن میں کھڑے کھڑے اس نے میری جیب کاٹ لی اور چلتا بنا۔ میں غلطی سے اندھے کو چور سمجھ بیٹھا۔ مجھے اپنی غلطی پر بڑا افسوس ہوا۔

بس ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی اور میں جیسے سوچتے سوچتے چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اندھے کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ پچھلے اسٹاپ پر اتر گیا تھا۔ پھر کبھی نظر نہ آیا۔

میں مسلسل کئی دن تک سڑکوں پر ادھر اُدھر پھرتا رہا کہ شاید وہ مجھے مل جائے۔ میں آج تک اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہوں۔ میرا ضمیر مجھے برابر ملامت کررہا ہے۔ کاش وہ مجھے معاف کردے۔

ملک :- (نوکر سے) تم نرے احمق ہو! میں نے تم سے کہا تھا کہ بیگم صاحبہ کو یہ نہ بتانا کہ میں رات کو کب واپس آیا تھا۔ پھر تم نے کیوں بتایا؟"

نوکر :- حضور میں نے نہیں بتایا۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ جب آپ واپس آئے تو ۔۔۔۔۔ میں صبح کا کھانا تیار کرنے میں مصروف تھا گھڑی نہ دیکھ سکا۔

نہال احمد صدیقی



جناب رشید الوحیدی جامعی

ساٹھ برس پورے ہوگئے

اکتوبر نومبر کی گلابی سردی شروع ہوچکی
تھی۔ انگیٹھی کے کنارے بیٹھنے کی ضرورت تو ابھی نہیں تھی
مگر رات کی ٹھنڈک مجبور کرتی تھی کہ ہلکی رضائی میں گھس کر
بیٹھیں۔ ایک ایسی ہی رات میں جمیل، عرفان، ناہید اور ننھا قدیر
دادی کو گھیرے بیٹھے تھے "دادی جان آپ نے کہا تھا کل
آپ ہمیں کہانی سنائیں گی۔ میری دادی آج سنا ہی دیجیے"۔
سب بچے ضد کررہے تھے: "اچھا بھائی" دادی نے
تسبیح جیب میں رکھتے ہوئے کہا "تم سب صبر کیے بیٹھے رہو
میں نماز پڑھ لوں تب سناؤں گی۔"

قدیر مچل گیا "دادی آپ کی نماز تو بڑی لمبی ہوتی
ہے۔ ہم سو بھی جائیں گے۔"

دادی نے محبت سے ڈانٹا: "چل شیطان، ابھی
ابھی کیا جلدی ہے۔ نماز کو ایسا نہ کہو، اللہ پاک خفا ہوجائیں گے۔"

"توبہ، میری توبہ!" قدیر جلدی سے بولا۔

ناہید بولی "دادی آپ خوب لمبی نماز پڑھیے جتنی عزیز کے
دادا کی داڑھی لمبی ہے۔ اتنی لمبی! ہم انتظار کرلیں گے۔"

عرفان نے لقمہ دیا: "نہیں دادی اتنی لمبی نماز
پڑھیے جتنی لمبی مال گاڑی ہوتی ہے۔ تب اللہ میاں بہت
خوش ہوں گے اور ساری مال گاڑی کے ڈبوں کو ثواب سے
بھردیں گے۔"

دادی ان معصوم باتوں پر مسکراتی ہوئی جانماز
پر کھڑی ہوگئیں۔

بچے آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔

اور جب دادی نماز سے فارغ ہوکر چارپائی
پر آئیں تو سب بچوں نے گھیر لیا۔ قدیر چلایا
"آگئیں دادی، بڑی اچھی دادی ہیں، منی سی!"

"جی ہاں!" جمیل نے منہ بنا کر کہا "منی سی کیوں
ہوتیں ماشاءاللہ ۱۰۰ برس کی تو ہیں۔"

"جی نہیں ایک سو دس برس کی۔" ناہید نے اس کی
بات کاٹی۔

"دادی آپ کی عمر کیا ہے؟" قدیر نے فیصلہ کرنا
چاہا۔

دادی نے اس کے گال پر ہلکے ہلکے تھپکی دیتے
ہوئے کہا "بیٹا کل نومبر کی ۲۵ تاریخ کو مجھے پورے ساٹھ برس

کی ہو جاؤں گی۔"

"ابا" قدیر چلایا "تب تو ہم دادی کی ساٹھویں سالگرہ منائیں گے۔"

"جی ہاں" جمیل نے اسے چپ کرتے ہوئے کہا "ہماری دادی بچاری کتنی تو بیمار ہیں۔ دیکھو نا انھیں کبھی کبھی نیند میں جو دورہ پڑتا ہے تو گھنٹوں بے ہوش رہتی ہیں۔ وہ تو اللہ کا فضل ہے کہ جلد ٹھیک ہو جاتی ہیں نہیں تو مر ہی جائیں۔"

"چپ پاگل!" ناہید نے ڈانٹا "ایسی بات منھ سے کیوں نکالتا ہے۔ دعا کرو کہ دادی دیر تک زندہ رہیں اچھی ہو جائیں۔"

اسی کائیں کائیں میں دادی نے کہا "اب تم لوگ بکتے رہو گے کہ کہانی بھی سنو گے۔"

"ہاں! ہاں!!" سب بچے ایک دوسرے کو چپ کرنے لگے۔ "سنائیے دادی، ہم سب چپ ہو گئے۔"

دادی نے کہانی شروع کر دی "سنو بچو! بیچ میں مت بولنا، بالکل سچی کہانی سناؤں گی۔"...

"بہت دنوں کا قصہ ہے، اسی شہر میں ایک لڑکی رہتی تھی۔ اپنے ماں باپ کی بڑی لاڈلی تھی۔ ماں باپ اس کی ہر ضد پوری کر دیتے تھے۔ اس لڑکی میں ایک خراب عادت تھی۔ وہ غصہ بہت کرتی تھی۔ اکثر غصے میں وہ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو پیٹ دیتی، گھر کے برتن توڑ ڈالتی، گڑیاں نوچ کر پھینک دیتی۔"

ایک بار اس کے ابا کہیں دورے پر جا رہے تھے اس نے بھی ضد کی کہ میں بھی ساتھ جاؤں گی۔ ابا نے بہت سمجھایا "نہیں بیٹی میں معلوم نہیں کہاں جنگل بیابان میں گھومتا پھروں گا تم میرے ساتھ کہاں چلو گی۔" مگر وہ نہ مانی۔

آخر مجبور ہو کر اس کے باپ کو ساتھ لے جانا پڑا اس کے باپ محکمۂ جنگلات میں کام کرتے تھے۔ انھیں اکثر دورہ کرنا پڑتا اور مہینوں گھر سے باہر جنگل میں پڑاؤ ڈال کر رہتے۔ اس بار بھی انھیں جنگل میں کافی دنوں ٹھہرنا پڑا۔ ایک جگہ خیمے لگا کر اپنی لڑکی کے رہنے کا انتظام کر دیا۔ اس کے ساتھ مزدوروں میں سے ایک مزدور کی بیوی اور ۵ سال نھا بچہ رہتے تھے۔

باپ تو دور دور کام کے لیے نکل جاتے۔ لڑکی مزدور کے لڑکے کے ساتھ کھیلتی اور کبھی کبھی غصے میں اس کی بری طرح مرمت کر دیتی۔ مزدور کی بیوی بچاری کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔

ایک بار اس نے مزدور کے لڑکے کے سر پر اس زور سے لکڑی ماری کہ وہ بے ہوش ہو گیا اور بہت سا خون نکلا بچارے بچے کی ماں رونے لگی اور اس کے دل سے اس لڑکی کے لیے بد دعا نکلی۔

مرہم پٹی تو کہاں سے ہوتی کچھ دیہاتی اور جنگلی دواؤں سے کام لے کر اس نے بچے کا علاج کیا اور وہ ٹھیک ہو گیا۔ مگر اب وہ اس لڑکی سے بہت ڈرنے لگا۔ لاکھ بلانے کے بعد بھی وہ اس کے پاس نہ آتا۔ اسی طرح دن گزرتے رہے۔ لڑکی طرح طرح سے اس معصوم کو ستانے لگی۔

آخر دو ماہ بعد واپسی کا پروگرام بنا۔ واپس ہوتے ہوئے لڑکی نے ضد کی کہ بچے کے پاس جو بکری ہے وہ میں لوں گی۔ باپ نے لاکھ سمجھایا کہ بیٹی پرائے مال کو اس طرح

نہیں چھینا کرتے۔ مگر وہ کب ماننے والی تھی۔ زبردستی بکری کو گاڑی پر رکھوالیا۔ بچہ بلک بلک کر روتا رہا اور یہ چل دی۔

بکری کے دو بچے تھے دونوں جنگل میں چرتے تھے دونوں ماں کو نہ پاکر چلانے لگے۔ اب بکری کے دونوں بچے اور مزدور کا معصوم ننھا بکری کے لیے بے تاب تھے۔ اُدھر بکری کا یہ حال تھا کہ اپنے بچوں اور چھوٹے سے مالک کی یاد میں اور کھلے جنگل کی تڑپ میں دن رات چلاتی تھی۔ گھاس دانہ سب چھوٹ گیا۔ لڑکی نے پہلے تو اسے بلانا چاہا مگر جانور بھی بچوں سے اور اپنے مالک سے پیار کرتے ہیں۔ اُسے کہاں چین تھا۔ آخر لڑکی کو ایک دن غصہ جو آیا تو اس نے بکری کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔ نہ دانہ نہ پانی۔ دو دن دو رات بند رکھا اور تیسرے دن جب کھولا تو وہ سوکھ کر کانٹا ہو چکی تھی۔ اب اس نے چاہا کہ اپنے ساتھ لے کر چرانے جائے مگر وہ ایک جگہ جم کر رہ گئی۔ لڑکی کو جو غصہ آیا تو ابا کا بید اُٹھا لائی اور اس کی پٹائی شروع کر دی۔ اس قدر مارا، اس قدر مارا کہ اس کے منھ اور ناک سے خون نکل آیا۔ آخر وہ غریب اپنے بچوں کی ممتا اور ننھے مالک کی یاد سینے سے لگائے مار کی تاب نہ لاکر مر گئی۔ لڑکی پہلے تو گھبرائی مگر پھر فوراً اسے کھینچ کر باہر پھینک دیا۔

رات کو جب لڑکی سوئی تو اس نے ایک خواب دیکھا۔ ایک نہایت خوفناک دیو اس کی طرف لال لال آنکھیں نکالے چلا آرہا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں بکری ہے اور دوسرے ہاتھ کی انگلی ایک بچے نے پکڑ رکھی ہے۔ دیو قریب آیا تو بچے نے انگلی سے اس لڑکی کی طرف اشارہ کر دیا۔ دیو نے پہلے تو بکری کو اس کی طرف کر دیا۔ بکری نے پوری قوت سے اس کی پیشانی پر سینگ مارا۔ لڑکی چکرا گئی اور ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ دیو کا جبڑا کھلا اور دوسرے لمحے وہ ہاتھ جس سے اس نے بکری کو مارا تھا، اپنے جبڑے سے چبا ڈالا۔

لڑکی ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ رات سے جب ہوش آیا تو دیکھا کہ اس کی چارپائی کے پاس اماں ابا بیٹھے ہیں، وہ ان کی گود میں ہے۔ جب اس نے آنکھ کھولی تو ابا نے پوچھا: بیٹی کیسی طبیعت ہے کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ مگر لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا۔ ایک گھنٹے کے بعد اس کی طبیعت سنبھل گئی۔

دوسرے دن پھر اس نے یہی خواب دیکھا۔ اب کے اُسے ایک عورت بھی نظر آئی جو خواب ہی میں اس سے کہہ رہی تھی "اے ظالم لڑکی تو ساٹھ برس جیے گی اور ہمیشہ تجھ کو تیرے ظلم کی سزا ملتی رہے گی۔۔!"

لڑکی کے ماں باپ نے علاج تعویذ میں کوئی کسر نہ چھوڑی مگر ہر مہینے یا دوسرے مہینے اُسے یہ خواب نظر آتا اور وہ بے ہوش ہو جاتی۔ جب ہوش آتا تو اس کی پیشانی اور ایک ہاتھ میں سخت درد ہوتا تھا۔ اتنا کہہ کر دادی چپ ہو گئیں۔ عرفان، ناہید اور جمیل حیرت سے ایک دوسرے کا منھ دیکھ رہے تھے۔

"بچو اب سو جاؤ، باقی کہانی کل سناؤں گی" دادی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ دوسرے دن دادی دوپہر میں آرام کر رہی تھیں کہ اچانک انھیں پھر دورہ پڑا۔ سب بچوں نے انھیں گھیر لیا۔ وہ کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔ جمیل نے کان لگا کر سنا تو یہ سمجھ میں آیا:

"آج تیرے ساٹھ برس پورے ہو گئے آج بکری، بکری کے بچے اور ننھے مالک کا انتقام بھی پورا ہو گیا۔"

اور دادی اب بے ہوش ہو گئیں۔ شام تک

محترمہ زہرہ جبیں

نامِ گاندھی

جہاں میں رہے گا اَمر نام گاندھی!
ہے مانند شمس¹ و قمر² — نام گاندھی!

کیا کام تب نام اتنا ہے پایا
غلامی کے بندھن سے ہم کو چھڑایا
حکومت سے غیروں کی ہم کو بچایا
وطن کے لیے جان کو بھی کھپایا

جہاں میں رہے گا اَمر نام گاندھی!
ہے مانند شمس و قمر — نام گاندھی!

ہے امن و اماں کا وہ اوتار اپنا
ہے الفت محبت کا کردار اپنا
بڑھا اُس کی ہستی سے دربار اپنا
ہے سردار جگ کا وہ سردار اپنا

جہاں میں رہے گا اَمر نام گاندھی!
ہے مانند شمس و قمر — نام گاندھی!

تعصب سے دل ان کا ایسا بَری تھا
کہ بس ایک اُس کو خدا اور ہری تھا
مسلمان، عیسائی یا پارسی تھا
وہ زنجیرِ حبِ وطن کی کڑی تھا

جہاں میں رہے گا امر نام گاندھی!
ہے مانند شمس و قمر — نام گاندھی!

وہ اخلاق و انسانیت تھا سراپا
غریبوں کا حامی، ہری جن کا داتا
بسا تھا اچھوتوں کی بستی میں ایسا
دلوں پر بھی اُن کے تھا قبضہ اُسی کا

جہاں میں رہے گا امر نام گاندھی!
ہے مانند شمس و قمر — نام گاندھی!

¹ سورج ² چاند

مہربانو عبداللہ فقیہ (دبئی)

ہم نے ریڈیو سُنا

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں بمشکل چار پانچ سال کی تھی۔ ایک دن گھر میں ریڈیو آیا ــ ویسے تو سبھی خوش تھے لیکن میری خوشی سب سے بڑھ کر تھی (حالانکہ ریڈیو کا بٹن آن کرنا نہیں آتا تھا) میری سب سہیلیوں کے گھر ریڈیو تھا۔ نہیں تھا تو میرے گھر میں۔ کبھی کبھی مجھ میں احساسِ کمتری بھی پیدا ہوجاتا تھا۔ امّی کے سامنے کئی بار بسور چکی تھی کہ ہمارے گھر میں ریڈیو کیوں نہیں۔ لیکن ابا سے کہنے کی ہمت نہ ہوتی تھی بالآخر خدا نے سن لی اور ہمارے گھر میں ریڈیو آگیا۔ امّی کی کوششوں سے آیا۔

پھر کیا تھا۔ دن بھر سب اس کے گرد رہتے۔ کوئی تو کوئی آکاش وانی لگا رہا ہے تو کوئی آل انڈیا ریڈیو ایک دن دوپہر تک ریڈیو چلا کے تھک گئے اور انھیں نیند کی دیوی نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اب میں آزاد تھی۔ کافی دیر سے میں بس اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ کوئی جاگتا ہوتا تو بھلا کاہے کو ہاتھ لگانے دیتا۔ تو خیر اب میں نے چاروں طرف دیکھا سب کی آنکھیں بند تھیں۔ میں بلّی کی طرح دبے پاؤں باہر نکلی ابھی قدم دروازے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ایک آواز "نرگس کہاں جارہی ہو اس کڑی دھوپ میں" میرے کانوں پر ہتھوڑا بن کر لگی۔ اور میں جلدی سے بستر میں دبک گئی۔ امّی پھر پانچ منٹ میں دوبارہ سو چکی تھیں۔ اب میں نے کافی احتیاط سے کام لیا۔ اور چوہوں کی طرح باہر نکلی۔ دروازہ کھولتے ہی اس طرح بھاگی جیسے کوئی میرا پیچھا کر رہا ہو۔

جلدی جلدی اپنی سہیلیوں کو جمع کیا اور ایک لیڈر کی طرح تقریر کی "دیکھو سیما، عذرا، صبا اور غزالہ ایک خوش خبری سنو۔ بات یہ ہے کہ ہمارے گھر میں آج ریڈیو آیا ہے۔ اب گھر میں صرف میری حکومت ہے چلو ہم موقع سے فائدہ اٹھا کر کیوں نہ ریڈیو سُنیں" سب نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ اور ہم چھپتے چھپاتے ڈرائنگ روم میں آگئے میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا اور ہم ریڈیو کی طرف بڑھ گئے۔

لیکن اب جو میں نے اسٹیشن لگانا چاہا تو چکرا گئی صبح کے وقت تو اچھی طرح یاد تھا مگر اب کیا کروں۔ سہیلیاں سامنے تھیں ان کے سامنے اپنی ہار کیسے مان لیتی۔ چاروں خاموشی سے میرا منہ تک رہی تھیں۔ ہولے سے میں نے ایک بٹن دبا دیا۔ مگر مایوس ہونا پڑا۔ آواز نہیں آرہی تھی۔

کچھ سوچ کر میں نے کہا: "دیکھو مجھے تو ریڈیو لگانا آتا ہے۔ لیکن دیکھتی ہوں تم لوگوں میں سے کس کو آتا ہے ذرا لگاؤ تو" یہ سننا تھا کہ چاروں ریڈیو پر پل پڑیں۔ کوئی یہ بٹن دبا رہی ہے کوئی وہ۔ اور ساتھ ہی ساتھ گل افشانیاں بھی کرتی جا رہی ہیں۔ عذرا ایک بٹن دباتے ہوئے بولی۔ میری

آپا یہی بٹن دبا کر ریڈیو لگاتی ہیں " غزالہ دوسرا بٹن دباتے ہوئے بولی :- "نہیں بھائی جان اس بٹن کو دباتے ہیں" صبا بولی "نہیں نہیں یہ بٹن دباؤ"، خوش قسمتی سے سیما نے جو بٹن دبایا تو ریڈیو کی لائٹ روشن ہوگئی۔ ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ لیکن فوراً ہی خوشیوں کو بریک لگ گیا۔ لائٹ تو روشن ہوگئی مگر آواز نہیں آرہی تھی۔ بالآخر میں نے سیما سے کہا "سیما تم ہی چلاؤ نا ہمیں تو نہیں آتا" سیما نے ایک فاتحانہ مسکراہٹ سے ریڈیو کی طرف دیکھا شاید باقی تینوں سہیلیوں کو یہ بات پسند نہ آئی۔ بھلا سیما میں کون سے لال لگے تھے جو ان سے فرمائش کی۔ ایک نے دوسرے کو اشارے کئے اور عذرا نے کہا "بھئی ہم تو جاتے ہیں تمھارا ریڈیو ہی خراب ہے" صبا نے ہاں میں ہاں ملائی "اور نہیں تو کیا جب سے ہم لگا رہے ہیں لگتا ہی نہیں"، غزالہ بھی کم نہ تھی اس نے کہا "تمھارے ابا آدھی قیمت میں لے آئے ہوں گے؟" یہ جملے سن کر مجھے غصہ آگیا میں نے تڑ سے ایک تھپڑ مارتے ہوئے کہا "بڑی آئی تیرے گھر ہوگا سیکنڈ ہینڈ ریڈیو"، وہ اپنی بے عزتی برداشت نہ کرسکی۔ اور فوراً میرے بال پکڑ لئے اور پھر زوردار جنگ چھڑی تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ غضب تو یہ ہوا کہ سیما نے نہ معلوم کون سا بٹن گھمایا کہ ریڈیو اپنی پوری طاقت سے واہی تباہی بکنے لگا اور اب سیما بھی گھبرا گئی۔ ایک ریڈیو کا شور ہی کیا کم تھا کہ ہمارا دوسرا شور۔

اتنے میں امی باجی آندھی کی طرح آئیں صورت حال پر غور کیا پھر جیسے ساری بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ میری سہیلیوں کو باہر نکالا گیا ریڈیو کو زور دار آواز سے نجات دلائی گئی اور میری تو خیریت ہی نہ تھی باجی نے جو کان پکڑے تو بالکل اسٹینڈ اپ ہوگئی۔ اور پھر امی کی باتیں خدا جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ میری سمجھ میں تو صرف اتنا

بقیہ "ساٹھ برس پورے ہوگئے" ۲۷

انہیں ہوش میں لانے کی ترکیبیں ہوتی رہیں مگر بے سود بالآخر کو ڈاکٹر نے آکر فیصلہ کر دیا۔

بڑی بی تو کب کی مر چکی ہیں!

سارے بچے سہمے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور سب نے مل کر عہد کیا کہ کبھی غصہ نہ کریں گے! کسی کو ماریں گے نہیں!! جانوروں کو نہ ستائیں گے ناہید جمیل سے کہہ رہی تھی۔ "آہ کیا معلوم تھا کہ رات دادی نے اپنا ہی قصہ سنایا تھا۔!"

عرفان بول پڑا "ہمیں کیا خبر تھی کہ دادی کو اکثر دورہ کیوں پڑا کرتا ہے۔ اب یہ راز کھلا۔ بھیا قدیر آج نومبر کی ۲۵ ہے۔ دادی کے ساٹھ برس پورے ہوگئے۔

نیچے کے دائرے میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینے کے بعد آپ کی مدت خریداری ختم ہوجاتی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے پیارے پیام تعلیم کی سرپرستی جاری رکھیں گے۔

براہِ کرم مبلغ ۶ روپے کا منی آرڈر اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک بھیج دیجیے تاکہ یہ سلسلہ قائم رہے آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کو پرچہ پسند نہیں آیا۔ اور افسوس کے ساتھ اسے بند کر دیں گے۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے

آپ کا خریداری نمبر .... ہے۔ منیجر

بڑوں کی کوششیں

چوہیا اور ڈھولک

ایک دفعہ ایک چوہیا پہاڑ پر سے آرہی تھی اسے ایک لکڑی ملی اس نے سوچا کہ لکڑی کام آئے گی اِسے اٹھالینا چاہیے۔ وہ لکڑی لے کر جا رہی تھی تو اس نے ایک بُڑھیا کو روٹیاں پکاتے دیکھا۔ بے چاری کے پاس اتنی لکڑیاں نہیں تھیں کہ پوری طرح سے روٹیاں پک سکیں۔ بڑھیا نے چوہیا سے ایک روٹی کے وعدے پر وہ لکڑی لے لی۔ چوہیا روٹی لے کر آگے چل پڑی۔ اس نے ایک جگہ دیکھا کہ ایک کمہار کا بچہ بھوک سے رو رہا ہے۔ چوہیا نے روٹی بچے کو دے دی، کمہار نے روٹی کے بدلے اُسے ایک مٹکی دے دی۔ چوہیا مٹکی لے کر جا رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ ایک گوالا اپنی بیوی کو پیٹ رہا ہے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ دودھ دوہنے کی مٹکی ٹوٹ گئی ہے۔ چوہیا نے مٹکی گوالے کو دیدی، گوالے نے مٹکی کے بدلے اُسے ایک بھینس دے دی۔ بھینس لے جاتے ہوتے اُس نے دیکھا کہ کچھ لوگ دلہن بیاہ کرلائے ہیں پر اُن کے پاس دلہن کو بٹھانے کے لیے کوئی سواری نہیں ہے۔ چوہیا بولی :۔

"دلہن کو بٹھانے کے لیے میری بھینس لے لو"

خدا کا کچھ ایسا کرنا ہوا کہ دلہن کے بیٹھتے ہی بھینس مر گئی

بس چوہیا تو براتیوں کے پیچھے پڑگئی، بولی :۔

"یا تو میری بھینس زندہ کرو ورنہ مجھے دلہن دو" چوہیا کے بہت پیچھے پڑنے پر بے چاروں نے اُسے دلہن دے دی۔ کیونکہ بھینس چلانا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ دلہن لے کر چوہیا جا رہی تھی تو راہ میں اُسے ایک ڈھولک والا مِلا۔ چوہیا نے دُلہن دے کر اس سے ایک ڈھولک لے لیا۔ وہ ڈھولک بجانے لگی اور گانے لگی :۔

"پہاڑ نے مجھے لکڑی دی
لکڑی میں نے بڑھیا کو دی
بڑھیا نے مجھے روٹی دی
روٹی میں نے کمہار کو دی
کمہار نے مجھے مٹکی دی
مٹکی میں نے گوالے کو دی
گوالے نے مجھے بھینس دی
بھینس سے میں نے دلہن لی
دُلہن کی میں نے ڈھولک لی
بج میری ڈھولک ڈھمک ڈھولا
ڈھمک ڈھوں ڈھمک ڈھوں"

بملا کماری کوشک۔ فرسٹ ایر
ڈپلوما اِن ٹیچنگ آف آرٹ اینڈ
کرافٹ۔ ٹیچرس کالج جامعہ۔

بچوں کی کوششیں

انوکھا بھوت

ابھی کچھ دن ہوئے میرے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ہم چار دوست ساجد، رشید، طاہر اور میں ہائی اسکول کا امتحان دینے علی گڈھ گئے تھے۔ ہم چاروں کے کمرے برابر برابر تھے۔ اکثر جب میرے دوست بھوتوں وغیرہ کا ذکر کرتے تو میں ان کا خوب مذاق اڑاتا کیونکہ میں بھوت پریت وغیرہ کا قائل نہیں تھا۔ لیکن میرے دوست ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ بھوت وغیرہ ہوتے ہیں اور چونکہ تمہاری کسی بھوت سے ملاقات نہیں ہوئی اس لیے تم بھوتوں کا مذاق اڑاتے ہو۔

ایک رات تقریباً بارہ بجے میں اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ اور پھر مجھے اپنے کمرے کے باہر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ قدم میرے کمرے کی طرف بڑھے چلے آرہے ہیں۔ میرے دل میں خیال آیا کہ ساجد حامد میں سے کوئی ہوگا۔ اور میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولنا ہی چاہتا تھا کہ چاروں طرف ایک دم اندھیرا ہوگیا۔ میں ڈر کے مارے لحاف میں چھپ گیا۔ اور لحاف سے اپنا منہ بری طرح ڈھک لیا اچانک کسی نے میرا لحاف اتار پھینکا۔ میرے منہ سے ایک زوردار چیخ نکل پڑی کیونکہ میرے سامنے ایک سایہ کھڑا تھا جس کے لمبے لمبے بال تھے اور اس نے بالکل کالا لباس پہن رکھا تھا۔ یکایک اس نے گرجدار آواز میں کہا۔

"کیوں بچہ بہت مذاق اڑاتا تھا بھوتوں کا۔ اب اڑا ؤ" اور اپنے خوفناک ناخن میری طرف بڑھانا شروع کر دیئے۔ میں نے اس کی بہت منت سماجت کی۔ لیکن وہ کہہ رہا تھا۔

بچہ آج تو تیری بریانی کھاؤں گا میرا ڈر کے مارے برا حال تھا۔ بھوت نے میری طرف دیکھا اور کہا بچہ بیس روپے دے تو میں تجھے چھوڑ دوں گا۔ میں نے اسے پانچ روپے دیئے تو وہ بولا بچہ مہنگائی کا زمانہ ہے پانچ روپوں سے کیا بنے گا۔ بیس روپے دے تب ہی میں تجھے چھوڑوں گا۔ میری تو جان پر بنی تھی اس لیے بیس روپے دے دیئے۔

دوسرے دن صبح کو جب میں نے یہ واقعہ اپنے دوستوں کو سنایا تو وہ سب ایک دم بولے "کیوں جناب اب تو ہو گئے بھوت پریت کے قائل۔ اور میں نے شرم سے اپنی گردن جھکا لی۔ رشید نے کہا خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ اب تو فلم دیکھنے چلتے ہیں۔ اور سب کے ٹکٹ میں لوں گا۔ مجھے حیرت تھی کہ اتنا کنجوس دوست

تا سجی بھی ہو سکتا ہے اور فلم دیکھنے کے بعد رشید نے ہنستے ہنستے بتایا کہ وہ بھوت میں ہی تھا اور یہ فلم بھی انھی روپوں کی بدولت دیکھی جا رہی ہے یہ سن کر آپ خود سوچیے کہ میرا کیا حال ہوا ہوگا۔

محمد سلیمان فاروقی

پہیلی بوجھ پہیلی

ایک چیز کا بتاؤ نام
تین ہیں اس کے اچھے کام
کھاتے پیتے اور لگاتے
ع سے شروع ہوتا ہے نام

[illegible]

(۲) ایک چڑیا کے تین رنگ
ولنت ہیں اس سے زیادہ تنگ
پنجرے کے اندر ایک رنگ
بڑے نرالے اس کے ڈھنگ

[illegible]

(۳) ایک کہانی میں کہتا ہوں سن لے میرے پوت
بنا پروں کے اڑ جائے وہ باندھ گلے میں سوت

[illegible]

کیا آپ جانتے ہیں کہ؟

عادل فرید (ٹنگ)

آزاد ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن، اور آخری گورنر جنرل ـ

ہندوستان کے پہلے وائس رائے لارڈ کیننگ تھے۔

آزاد ہندوستان کے پہلے سپہ سالار جنرل کریپا تھے

ہندوستان میں سب سے زیادہ بارش چیراپونجی (آسام) میں ہوتی ہے۔

اقوام متحدہ کے ممبر ملک ۵۵ ہیں۔

سب سے تیز اڑنے والی چڑیا سوری فٹ ہے جو ۲۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ سکتی ہے۔

دنیا میں سب سے اونچا مینار "ایفل ٹاور" پیرس میں ہے۔

ہندوستان کا سب سے بڑا چڑیا گھر کلکتہ میں ہے۔

قرار احمد آزاد رہتاسوی
(اکبرپور)

ایک ذرہ مٹی کی قیمت

علی بن مفیدؒ ایک کرایہ کے مکان میں رہتے تھے ایک مرتبہ انھوں نے کچھ لکھا اور اس کو خشک کرنے کے لیے مٹی کی ضرورت ہوئی، کچی دیوار تھی۔ ان کو خیال آیا کہ ذرا سی مٹی کھرچ کر تحریر پر ڈال لیں۔ پھر خیال آیا مکان کرایہ کا ہے رہنے کے واسطے کرایہ پر دیا گیا نہ مٹی لینے کے واسطے۔ مگر ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ اتنی ذرا سی مٹی لینے میں کیا حرج ہے معمولی چیز ہے۔ انھوں نے مٹی لے لی رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک صاحب کھڑے ہیں جو فرما رہے ہیں کہ کل قیامت کے دن معلوم ہوگا کہ یہ معمولی مٹی کیا چیز ہے۔

ساندڈ دیوگاؤں
کرکا سودری

سیدہ کلیم غازی پاشاہ

اُدھر جائے تو بلی
اِدھر آئے تو خرگوش!

کسی گاؤں میں ایک زمیندار تھا۔ اس کے پاس بہت سے جانور تھے وہ ان جانوروں کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے ملازم سے کہا: "تم وہ لال خرگوش پکڑ کر میرے دوست حاجی میاں کو دے آؤ حاجی میاں یہاں سے چھ کوس دور رہتے تھے نوکر نے خرگوش کو پکڑ کر تھیلے میں ڈال لیا۔ پہلے تو خرگوش بہت اُچھلا کودا مگر پھر خاموش تھیلے میں رہا۔ نوکر تھیلا لے کر مالک کے دوست حاجی میاں کے گاؤں کی طرف چل دیا۔ راستے میں پیاس لگی تو وہ ایک سرائے میں ٹھہرا۔ تھیلا سرائے میں رکھ کر وہ پانی پینے کنوئیں کی طرف گیا۔ جب سرائے والے نے تھیلے کے اندر کوئی چیز ہلتی ہوئی دیکھی تو اُسے کھولا، دیکھا کہ اندر خرگوش ہے اس نے سوچا اس آدمی سے مذاق کرنا چاہیے۔ اس نے خرگوش کو نکال لیا اور سرائے کی بلّی اس میں بند کردی۔ پہلے تو بلّی بھی اُچھلی کودی مگر پھر خاموش ہو رہی وہ پانی پی کر آیا اور تھیلے کو کندھے پر ڈال کر یہ جا وہ جا۔

مالک کے دوست حاجی میاں کو سلام کیا اور کہا۔

"آپ کے دوست نے یہ خرگوش بھیجا ہے" یہ کہہ کر ملازم نے تھیلے کو کھولا مگر اس کے اندر بلّی کو دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گیا۔ دوست بہت بگڑا۔ پہلے تو سوچا شاید دوست نے مذاق کیا ہے مگر پھر اس کو خیال آیا کہ یہ شرارت اسی کی ہے، خفا ہو کر ملازم سے کہنے لگا:

"چلے جاؤ تم میرے سامنے سے"

نوکر بہت شرمندہ ہوا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا بھلا کیا لایا تھا اور کیا نکلا۔ اب پھر وہ اسی راستے پر واپس ہوا رات ہو گئی سوچا کہ "اسی سرائے میں ٹھہر جاؤں صبح سویرے ہی نکل جاؤں گا"

تھیلا سرہانے رکھ کر سستانے لگا اور پندرہ منٹ میں گہری نیند سو گیا۔ سرائے والا بات کو تاڑ گیا۔ اب اس نے تھیلے کو پھر کھولا اور اس کا خرگوش اس کے تھیلے میں بند کر کے اپنی بلّی نکال لی۔ ملازم صبح سویرے اٹھا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ دروازے میں داخل ہوا تھا کہ مالک سامنے آگیا

اس نے پوچھا:

"وہاں سے کچھ لایا ہے"

پہلے تو یہ سوچنے لگا کہ کیا کہے پھر بولا:

"واہ سرکار! آپ نے بلّی بند کرادی اس میں اور مجھے کہا کہ خرگوش ہے، آپ کے دوست بلّی کو دیکھ کر مجھ غریب پر برس پڑے"

زمیندار حیران تھا کہ کیا بکتا ہے! جب نوکر نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر بلّی کو نکالنا چاہا تو اس کے ہاتھ میں دو بڑے بڑے کان آگئے۔ اور اس نے جب یہ دیکھا کہ اس کے اندر خرگوش ہے تو بولا:۔

"واہ سرکار! خوب ہے آپ کا بھی یہ خرگوش۔ اُدھر جاتا ہے تو بلّی۔ اِدھر آتا ہے تو خرگوش"

قلمی دوستی

نام :- سید ریاض حسین : عمر ۱۵ سال
مشغلہ :- قلمی دوستی، رسالوں کا مطالعہ، ٹکٹ جمع کرنا، ہاکی، ٹیبل ٹینس، بیڈمنٹن کھیلنا۔
پتہ :- نیشنل اسٹورس - آزاد روڈ - برہانپور (ایم پی)

نام :- نیاز احمد میر - عمر ۱۵ سال
مشغلے :- ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنا، آٹو گراف جمع کرنا، کرکٹ اور نٹ بال کھیلنا۔
پتہ :- نیاز احمد میر ۲۳۷ - جواہر نگر، سری نگر۔ (کشمیر)

نام :- عبدالمتین عزیزی - عمر ۱۴ سال
مشغلہ :- رسالے پڑھنا، خاص طور پر پیام تعلیم، ٹکٹ جمع کرنا، باغبانی وغیرہ۔
پتہ :- عبدالمتین عزیزی معرفت نور عبدالعزیز فروٹ کمیشن ایجنٹ باڑہ ہندو راؤ - دہلی ۶

نام :- عبدالمجید - عمر بارہ سال
مشغلہ :- مذہبی اور علمی، ادبی کتابیں پڑھنا، پیام تعلیم پڑھنا۔ قلمی دوستی کرنا
پتہ :- عبدالمجید معرفت کراڈا اسٹورس، بن چندہ کا لی کٹ ۲

نام :- فراست اللہ خاں (متعلم درجہ پنجم) عمر ۱۲ سال
مشغلہ :- رسائل کا مطالعہ کرنا، قلمی دوستی کرنا، نقلیں کرنا
پتہ :- فراست اللہ خاں معرفت خالد حسین خاں شگفتہ محلہ مہند جلال نگر، ضلع شاہجہانپور - یو - پی۔

نام :- محمد بن سعید عرف افسر عمر ۱۶ سال
مشغلہ :- اچھی کتابیں پڑھنا، نماز پڑھنا، دوستوں اور رسالوں کے ایڈیٹروں سے خط و کتابت کرنا
پتہ :- محمد بن سعید عرف افسر۔ محلہ مسافر شاہ تعلقہ بسمت نگر (پربھنی)

نام :- مشتاق احمد مشتاق
مشغلہ :- پیام تعلیم پڑھنا، قلمی دوستی کرنا، اچھے اور پر خلوص دوستوں کی تلاش، نماز پڑھنا، تفسیر قرآن اور تلاوت قرآن کرنا۔
پتہ :- مشتاق احمد مشتاق ولد محمد شریف محلہ وارثپورہ - کامٹی ضلع ناگپور (مہاراشٹر)

آدھی ملاقات

محترم حسین حسان صاحب!

تسلیم و نیاز!!

عرصے کے بعد یہ خط آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ذاکر صاحب کی غیر متوقع موت سے ہندوستانی زندگی اور معاشرت میں ایک خلا آگیا ہے اور سیاسی حالات میں انتشار پیدا ہوگیا ہے مگر بھائی موت سے کس کو رستگاری ہے۔ آج وہ کل ہماری باری ہے۔ موت کے آگے ہم سبھی بے بس اور مجبور نظر آتے ہیں۔ خیال تھا کہ صدر کا ٹرم پورا کرنے کے بعد وہ پھر جامعہ کی خدمت میں لگ جائیں گے۔ مگر آہ ایسا نہیں ہوسکا۔ میری جانب سے (بیگم صاحبہ ذاکر حسین) ان کی بچیوں اور دامادوں کو یاد کرلیں گے۔ میری دلی خواہش تھی کہ میں بھی دلی آکر خراج عقیدت پیش کرتا۔ مگر مالی دشواریوں کے پیش نظر مجبوری ہے۔

جواب کا منتظر آپ کا اپنا

انوار انصاری

کسے خبر تھی کہ ذاکر صاحب ایک دم چلے جائیں گے۔ اب پرانی یادیں ابھر رہی ہیں جی چاہتا ہے کہ کچھ لکھوں، ہاں دنیا میں فرشتے نہیں انسان ہی بستے ہیں۔ آج کل خود بھی بیمار ہوں۔" فقط مخلص — سید محمد ٹونکی۔

برس کر ہمارے آنسو نکل پڑے کہ ہمارے محبوب رہنما اور ایک شفیق استاد ہمیں تنہا چھوڑ کر رخصت ہوگئے۔

ذاکر صاحب صرف جامعہ، جامعہ ملیہ کے ہی سرپرست نہیں تھے بلکہ وہ پورے ہندوستان کے سرپرست تھے انھیں ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگوں سے یکساں محبت تھی۔

افسوس ہمارے آنسو اور اشکبار آنکھیں انھیں پھر نہیں بلا سکتیں۔ ہماری نیک دعا ہے کہ ذاکر صاحب کو خدا جنت میں جگہ دے آمین!!

بدر وفا۔ سہسرام

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل ہی میں نے صدر جمہوریہ کو ان کے انتخاب پر مبارکباد کا پوسٹ کارڈ بھیجا تھا جس کا جواب ایک قیمتی جنس کی طرح میرے پاس محفوظ ہے اور آج ہی ان کی جدائی کا رونا رو رہے ہیں۔ خدا ہم سب کی مدد کرے۔

آپ لوگوں سے صرف ایک التماس ہے کہ جس طرح صدر جمہوریہ کے انتخاب کے بعد ایک خاص نمبر پیام تعلیم کا نکالا تھا اس سے زیادہ آب و تاب کے ساتھ ایک یادگار نمبر نکالیں جو واقعی یادگار ہو اور محفوظ رکھا جاسکے۔

رشید

محترمی!

سلام علیکم! ورحمت اللہ وبرکات!

پانچ مختلف خریداروں سے (جن کے نام وپتے ذیل میں مندرج ہیں) مبلغ تین سو روپے وصول کرکے آپ کو روانہ کردیئے گئے ہیں۔ یہ رقم بذریعہ منی آرڈر ع۸۰۹ بتاریخ ۱۷/ اپریل ڈاکخانہ گارڈن ریچ کلکتہ ۲۴ سے بھیجی گئی ہے۔ براہ کرم ان پانچ افراد کے نام رسالہ "پیام تعلیم" کے سالانہ خریداروں میں شامل کرلیں اور ماہ مئی کے شمارہ سے رسالہ مذکورہ ان کے نام جاری کردیں۔

سلیمان اختر

جی ۲۷۶ الف نگر۔ مٹیابرج کلکتہ ۲۴

بہت بہت شکریہ۔ خدا اور بزرگوں اور ساتھیوں کو بھی آپ کی تقلید کی توفیق ارزانی فرمائے آمین

ایڈیٹر

مئی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ ٹائٹل بڑا دلکش تھا۔ محمد امین ایم اے کا "یوم بہاری اور سیما" سیف سہسرامی کا گیت "سنا دو" غالب کی کہانی خود ان کی زبانی "سلام بن رزاق کا "جگنو" سفر نامہ ابن بطوطہ" اور "یادداشت کا امتحان" بے حد پسند آئے۔

آپ کی دن رات محنت کا نتیجہ ہے جو کہ ہر ماہ ہر شمارہ انوکھے انداز میں پیش ہوتا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب یہ کامیابی کی منزل پر نظر آئے گا۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

… اسد اللہ خاں عطاء اللہ خاں جلگاؤں

محترمی

سلام مسنون

ماہ مئی کا پیام تعلیم موصول ہوا۔

میٹرک کا امتحان ختم کرکے میرے پاس صرف ایک ہی کام "رسالوں کا مطالعہ" کرنا ہے۔ ویسے تو میں کئی رسالوں کا مطالعہ کرتا ہوں لیکن پیام تعلیم جیسا کوئی رسالہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس کی شہرت کی وجہ صرف آپ کی دن رات کی محنت کا نتیجہ ہے۔

مئی کے شمارہ میں ویسے تو سب مضمون اور کہانیاں قابل تعریف ہیں لیکن خاص طور پر مجھے "یوم بوہی اور سیما" غالب کی کہانی "بیسہ" اور بچے کا گیت بے حد پسند آئیں میری طرف سے سب لکھنے والوں کو مبارک باد۔ خدا آپ کو پیام تعلیم کو اور خوب صورت بنانے کی ہمت دے۔

سید منور باسط

کاشانہ مستحسن

شرمندہ ہوں جواب جلد نہ دے سکا جشن غالب صدی کے سلسلے میں گیا سے کئی بار باہر رہا۔ آپ کی عنایت ہے کہ آپ نے ۳۸-۱۹۳۷ کے اس مضمون نگار کو یاد فرمایا جواب زندگی کے پچاسویں برس قدم رکھ رہا ہے مجھے فخر ہے، میری ادبی زندگی کی نشو و نما میں "پھول، پیام تعلیم اور غنچہ" جیسے معروف ومقبول رسالوں کا تعاون رہا۔ آپ کے بھیجے ہوئے پیام تعلیم کے شمارے دیکھ کر وہ دن سامنے آگئے جب ہر نیا مہینہ نئے شمارے کی آمد کی خبر لاتا تھا۔

اردو زبان کی تاریخ خصوصاً ادب طفلاں۔

CHILDREN LITERATURE میں پیام تعلیم جیسے علمی و اصلاحی رسالے کا نام ناقابل فراموش ہے۔ یہ مقام حسرت ہے کہ ادب کے اس اہم شعبہ پر ہمارے ارباب نظر و اقتدار کی ویسی نگاہ نہیں جس کی اسے حاجت ہے۔

آپ مطمئن رہیں پیام تعلیم کے لیے کچھ کروں گا اور انشاء اللہ جلد ہی۔

ناچیز (ڈاکٹر) سید حسین گیا

محترم جناب بھائی صاحب! السلام علیکم!

مئی کا پیام تعلیم پیش نظر ہے۔ پیسے کی کہانی کا آخری حصہ پڑھا۔ انھوں نے بہت ہی معلوماتی اور طویل مضمون لکھا میں بھی اپنی طرف سے جناب غلام حیدر صاحب کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ یوں تو میں غالب پر بہت سے مضمون پڑھ چکا ہوں لیکن جناب شعیب اعظمی صاحب کی مرتب کردہ "غالب کی کہانی" ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ چچا ابا نے روزہ رکھا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ جناب علیم الدین نے آسٹریلیا کے جانور لکھ کر ہم لوگوں کی معلومات میں اضافہ کیا ہے، ایک خطرناک مہم بھی بہت پسند آئی۔ گو پیام تعلیم میں ہر وہ انداز ہمیں اچھے لگے جو کسی دوسرے جریدے میں نہیں ہوتے۔ میری ایک رائے ہے امید ہے کہ اس پر مزید دھیان دینے کی کوشش کریں گے۔ بچوں سے باتیں کے تحت جو آپ کا اداریہ ہے اس میں آپ پیام تعلیم سے ہٹ کر بھی بات کریں تو بہتر ہوگا۔ یعنی کارآمد اور مہذب باتیں

ایم اسلم — گیا

غلام کی عبادت

کسی شخص نے ایک غلام خریدا۔ غلام نے اپنے آقا سے کہا "میں تین باتوں کی درخواست کرتا ہوں۔" آقا نے پوچھا: "وہ کیا؟" غلام نے عرض کیا: "جب نماز پڑھنے کا وقت ہو جائے تو آپ مجھے نماز پڑھنے کے لیے مہلت دے دیں۔ دوسری بات یہ کہ آپ مجھے صرف دن میں کام کاج میں مشغول رکھیں رات میں چھٹی دے دیں۔ تیسری بات یہ کہ آپ مجھے جو کمرہ رہنے کے لیے دیں اس میں میرے سوا کوئی دوسرا آدمی نہ جائے۔" مالک نے تینوں باتیں مان لیں اور غلام سے کہا: "گھر کے کمروں میں جو کمرہ تم کو پسند ہو لے لو۔" غلام نے گھوم پھر کر سب کمرے دیکھ لیے اور ایک ٹوٹا پھوٹا کمرہ پسند کیا۔ آقا نے اس سے پوچھا: "تم نے یہ ٹوٹا پھوٹا کمرہ کیوں پسند کیا؟" غلام نے جواب دیا: "میرے آقا شاید آپ نہیں جانتے کہ خدا کی یاد سے یہ کمرہ ایک خوب صورت چمن بن جائے گا۔" غلام اس میں رہنے لگا۔ مالک کے ہاں اکثر راتوں میں ناچ رنگ کی محفل جمتی۔ ایک رات جب اس کے دوست احباب چلے گئے تو وہ غلام کے کمرے کے پاس آیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ غلام کا کمرہ روشنی سے جگمگا رہا ہے اور غلام سجدے میں پڑا کہہ رہا ہے: "اے خدا تیرا ہزار ہزار شکر ہے کہ تو نے مجھے مالک کی خدمت میں صرف دن ہی میں رکھا اور رات کے وقت اپنی خدمت کا موقع دیا، اگر مجھ پر مالک کی خدمت فرض نہ ہوتی تو میں رات دن تیری ہی خدمت میں لگا رہتا۔"

آقا نے دوسرے دن غلام کو بلایا اور کہا: "تم آزاد ہو خدا کے واسطے اور اس کی عبادت کے لیے۔" اور آقا نے بھی اپنی ناچ رنگ کی محفل چھوڑی، خدا سے توبہ کی اور اپنی زندگی خدا کی عبادت کے لیے وقف کر دی۔

صبیحہ ناز

انسان کو چاند پر اتارنے والا جہاز
۱۶ جولائی کو روانہ ہوگا!

امریکہ کی خلائی ایجنسی نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ چاند پر انسان کو اتارنے والا جہاز کیپ کنیڈی سے سولہ ۱۶ جولائی کو چھوڑا جائے گا۔ ہندوستانی وقت کے مطابق یہ سولہ جولائی کی شام کو چھ بج کر کچھ منٹ پر روانہ ہوگا اور ۲۰ جولائی کو خلا باز آرمسٹرانگ اور الڈرن چاند کی زمین پر کائنات کی تاریخ میں پہلی مرتبہ قدم رکھیں گے۔ اور پھر ۲۱ جولائی کو ساڑھے نو بجے واپس زمین کی طرف رُخ کریں گے۔ اور ۲۴ جولائی کو نو بج کر ۲۴ منٹ پر (رات میں) بحرالکاہل میں اتریں گے۔ (الجمعیۃ روزنامہ)

۶ آدمیوں کی جان بچائی

ٹکنالوجی انسٹی ٹیوٹ جمشید پور کے ایک طالب علم نے حال ہی میں اپنی سوجھ بوجھ، ہوش مندی اور ہوشیاری سے سات آدمیوں کی جان بچائی ہے۔ یہ طالب علم اور ڈرائیور سمیت سات دوسرے آدمی ۱۱ فروری ۱۹۶۹ء کو ایک ٹیکسی میں جمشید پور سے رانچی پہاڑ پر جا رہے تھے راستے میں ٹیکسی کے بریک خراب ہوگئے اور ٹیکسی پہاڑی سے نیچے کی طرف لڑھکنے لگی۔ ڈرائیور نے فوراً ٹیکسی سے چھلانگ لگا کر اپنی جان بچائی، باقی سواریوں کو خدا کے حوالے کر دیا۔ یہ

اِدھر اُدھر سے

کی سیٹ سنبھال لی اور اسٹیرنگ کو جیسے تیسے قابو میں کرلیا اور اپنی ہوشیاری اور ہوش مندی سے دو فرلانگ گہرائی تک لڑھکنے کے بعد ٹیکسی کو روک لینے میں کامیاب ہوگیا۔ اس طرح اپنی اور اپنے چھ ساتھیوں کی جان بچالی۔

انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل نے طالب علم کی سوجھ بوجھ اور ہمت و ہوشیاری کے لیے ہند سرکار سے اس کی حوصلہ افزائی کی سفارش کی اور ہند سرکار نے اُسے ایک ہزار روپے کا انعام دیا۔

ٹینس کے بین الاقوامی مقابلے اور ہندوستان

• حال ہی میں ملک میں ٹینس کا شاندار مقابلہ ہوا۔

دنیا میں ہر سال ڈیوس کپ مقابلہ کے نام سے لان ٹینس کا بہت بڑا مقابلہ ہوتا ہے۔ اس مقابلے کے لیے دنیا کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ مشرقی زون، مغربی زون اور جنوبی زون۔ پہلے ہر ایک زون کا الگ الگ مقابلہ ہوتا ہے۔ ایک زون میں اوّل آنے والی ٹیم کا مقابلہ دوسرے زون میں اوّل آنے والی ٹیم سے ہوتا ہے۔ ان دونوں میں

ٹیم سے ہوتا ہے۔ اور اس آخری مقابلے میں جو ٹیم اول آتی ہے وہ ڈیوس کپ جیتتی ہے۔ یورپی زون میں مسلسل نو سال سے جاپان اور ہندوستان ہی فائنل میں آتے رہے ہیں اور ان نو سالوں میں ہندوستان نے مشرقی زون میں مقابلے جیتے ہیں۔ مغربی زون کے مقابلے میں ہندوستان صرف ایک بار جیت سکا لیکن تیسرے امریکی زون کے آخری فائنل میں آسٹریلیا سے ہار گیا۔

اس سال مشرقی زون کا فائنل مقابلہ یہاں پونہ میں جاپان اور ہندوستان کی ٹیموں میں حال ہی میں ہوا ہے لان ٹینس میں پانچ میچ ہوتے ہیں۔ پہلے دو سنگل جن میں ہر ٹیم کا صرف ایک ایک کھلاڑی کھیلتا ہے۔ پھر ایک ڈبل جس میں ہر ٹیم کے ساتھ دو دو کھلاڑی کھیلتے ہیں اور اس کے بعد پھر دو سنگل میچ ہیں۔ جو ٹیم ان میں سے کوئی سے تین میچ جیت لے وہ میچ پا لیتی ہے اب کے ہندوستان کی ٹیم نے یہ پانچوں میچ بہت شاندار طریقے سے جیتے ہیں۔ کل ملا کر ستر ہ سیٹ کھیلے گئے جن میں ہندوستانی کھلاڑیوں نے پندرہ جیتے۔ ہمارے کھلاڑی رام تمن کرشنن، پریم جیت لال، جے دیپ مکرجی نے جاپانی کھلاڑیوں کو جمنے ہی نہ دیا۔

چھپائی کے لیے پلاسٹک کے ٹائپ

اب پلاسٹک کا ٹائپ تیار ہو گیا ہے اور مقابلہ ابھی تھوڑے ہی دن پہلے شروع ہوا ہے لیکن نتیجے کے بارے میں کسی کو بھی کسی طرح کا شک وشبہ نہیں ہے۔ دھات کے پرانے ٹائپوں کو اپنی جگہ سے ہٹنا پڑے گا۔ میدان پلاسٹک ٹائپ کے ہاتھ رہے گا۔ اس لیے کہ یہ ٹائپ دھات کے مقابلے میں بہت ...

سکتے ہیں۔

لینن گراڈ ٹائپ فاؤنڈری میں تھرمو پلانٹ کی تین بہت ہی زیادہ کارگر خود کار مشینیں چالو کر دی گئی ہیں۔ یہ مشینیں دانے دار پلاسٹک سے، جس میں المونیم کا سفوف ملا دیا جاتا ہے، ٹائپ اور ٹائپ بنانے کا سادہ مواد تیار کرتی ہیں۔ یہ فاؤنڈری اس سال پلاسٹک کے ۳۰ ٹن ٹائپ تیار کرے گی۔ (سوویت خبرنامہ)

آریہ ۳ ہزار ۴ سو برس پہلے ہندوستان آئے تھے

ایک مشہور روسی عالم کا کہنا ہے کہ سوویت یونین کے بعض کھنڈروں سے پتہ چلتا ہے کہ آریہ لوگ حضرت مسیح سے لگ بھگ تیرہ چودہ سو برس پہلے سوویت یونین کے وسط ایشیائی خطّے سے ہندوستان آئے ہیں۔

کچھ دنوں پہلے یونسکو کی طرف سے ایشیا کے مسئلہ پر دہلی میں ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے مشہور روسی عالم بی جی غفوروف بھی تشریف لائے تھے انھوں نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ وسط ایشیائی جمہوریتوں اور ہندوستان کی پرانی تہذیب کے بارے میں روسی ماہرین نے جو تحقیق یا ریسرچ کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں گہرا تعلق تھا۔ اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح سے کوئی ۱۳ - ۱۴ سو برس پہلے خانہ بدوش آریہ قبیلے ان علاقوں میں گھوم رہے تھے۔

(الجمعیۃ ہفتہ وار)

لینن — ۱۹۲۴ء تک

Regd. No. D. 1607

Payam-i-Taleem

NEW DELHI-25

ان کتابوں کو اپنی لائبریری کی زینت بنائیے

[illegible]

ملنے کا پتہ

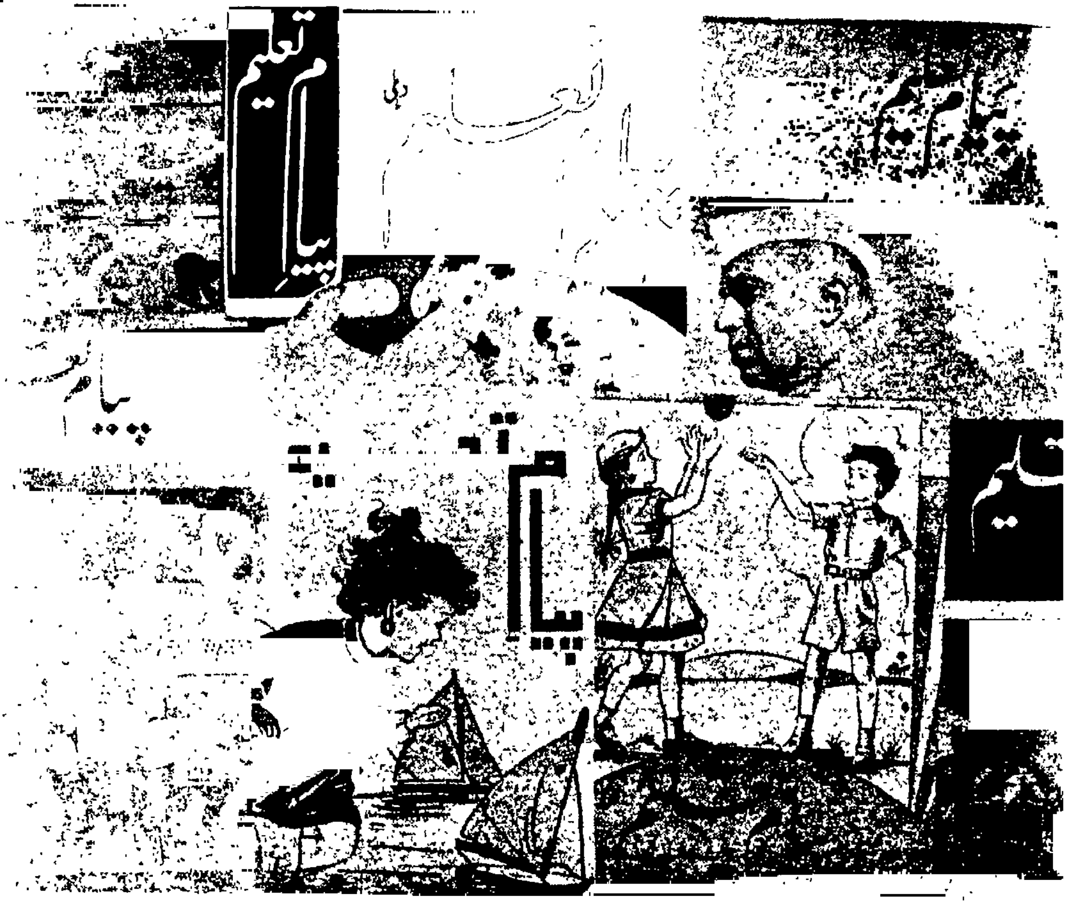
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
[illegible]

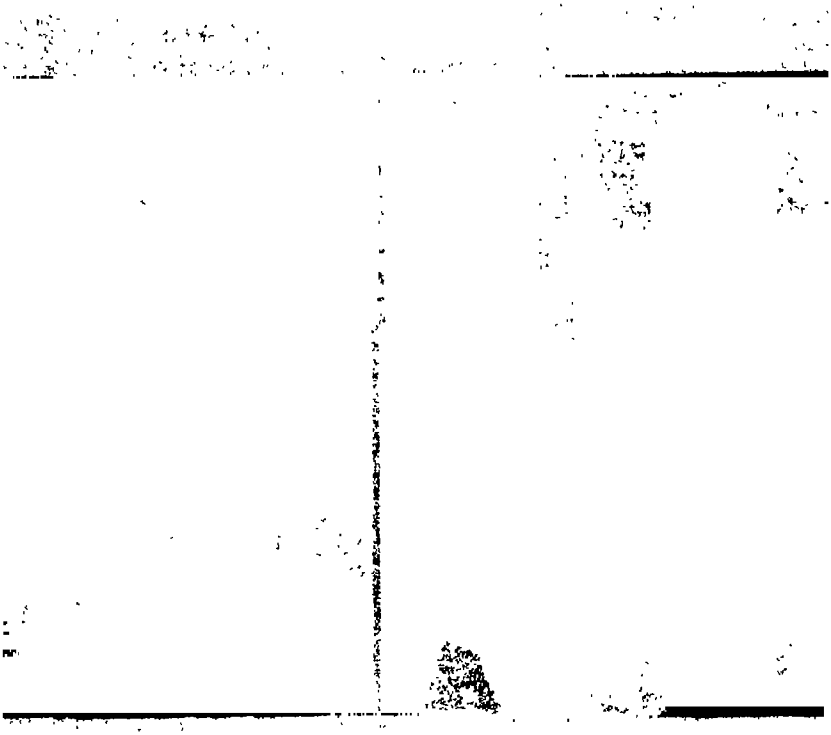
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
[illegible]

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
[illegible]

جولائی تا دسمبر ۶۹ء

جولائی کا شمارہ دستیاب نہیں





بشکریہ ہند و ایران سوسائٹی نئی دہلی

تہامائے میسور، مدھیہ پردیش، جموں و کشمیر و ہریانہ کے تعلیمی
اداروں کے لیے منظور شدہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی

جلد ۶ اگست ۱۹۶۹ء شمارہ ۸

ایڈیٹر: محمد حسین حسّان ندوی

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

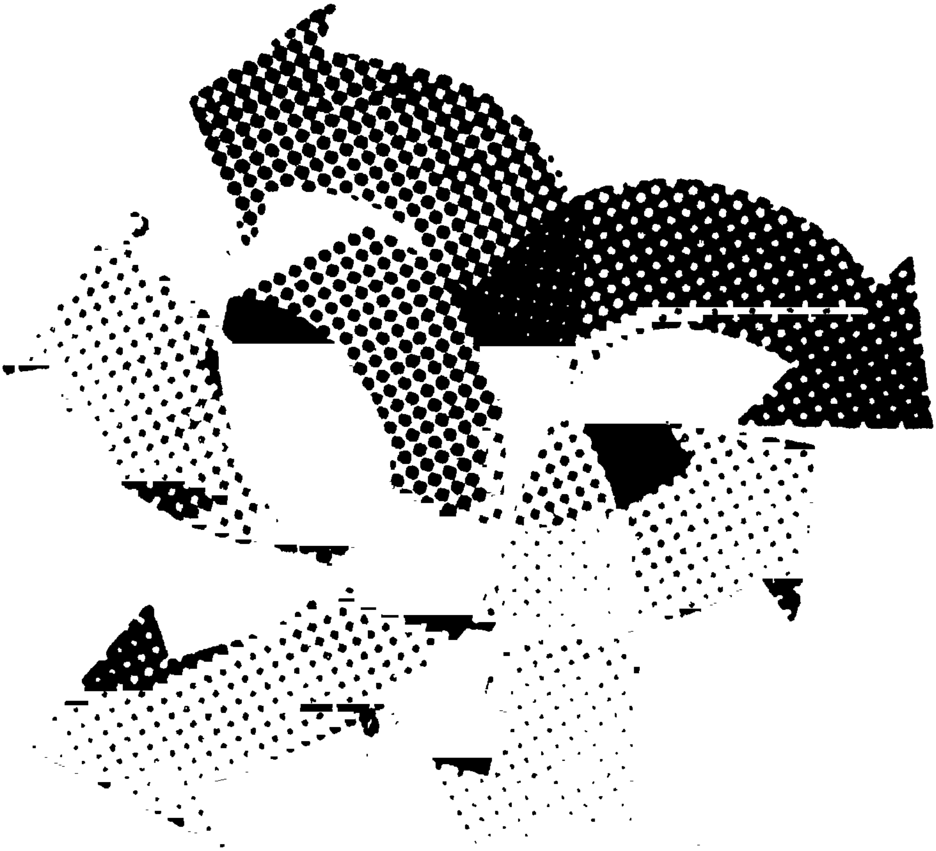
شاخیں: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علیگڑھ

قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے، سالانہ چندہ ۶ روپے

فہرست



میں بڑا ہو کر کیا بنوں گا؟

.... ڈاکٹر، وکیل، انجینئر، پروفیسر؟

آپ بڑے ہو کر کچھ بھی بن سکتے ہیں، کامیابی کے سبھی دروازے آپ کے لئے کھلے ہیں، شرط صرف اس بات کی ہے کہ آپ خوب دل لگا کر محنت کریں۔

آج آئے برس طالب علموں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ روپے پیسے کی کمی آپ کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتی۔ اگر آپ اچھے طالب علم ہیں اور اعلیٰ نمبر حاصل کرتے ہیں، تو قومی سائنس ٹیلنٹ اسکیم کے تحت آپ ماہانہ وظیفہ حاصل



کر سکتے ہیں۔ اس سے آپ بی ایس سی سال اول سے پی ایچ ڈی تک کی تعلیم کے اخراجات پورے کر سکتے ہیں۔ ہونہار طالب علموں کو ایسی سہولتیں دی جا رہی ہیں۔ انہیں بہت سے وظیفے دیئے جا رہے ہیں اور وہ بھارت میں یا بھارت سے باہر جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ ہر برس ہائی اسکولوں اور کالجوں کے طالب علموں کو ہزاروں روپے کی مالیت کے وظیفے دیئے جاتے ہیں۔

یہ ترقی پلان سے ہوئی ہے

mp 68/605

بچوّں سے باتیں

پیام تعلیم کا جون کا پرچہ (ذاکر صاحب کی یاد میں) ذرا دیر سے شایع ہوا تھا۔ اس لیے اس کے بارے رائیں ـــ بھی، ذرا دیر سے ملیں۔ اُس وقت ملیں جب جولائی کا پرچہ چھپنے چلا گیا تھا۔

اس نمبر کی تیاری میں ہمیں وقت کم ملا تھا۔ پھر بھی شکر ہے کہ آپ نے اور ہمارے بزرگوں نے اس یادگار نمبر کو غیر معمولی طور پر پسند کیا۔ اب تک بے شمار خط ہمارے پاس آچکے ہیں اور سلسلہ برابر جاری ہے۔ ان میں سے کچھ خط ہم اس پرچے میں چھاپ رہے ہیں۔ اور چند دوسرے خط اگلے پرچے میں شایع ہوں گے۔

بمبئی کے دو سب سے زیادہ چھپنے والے روزنامہ اخباروں "انقلاب" اور "اردو ٹائمز" نے ازراہ نوازش اس یادگار نمبر پر بہت اچھے تبصرے کیے ہیں۔ پرچے کو اچھی طرح پڑھ کر کیے ہیں۔ اردو ٹائمز کے تبصرہ نگار نے تو ایسا لگتا ہے کہ پرچے کا ایک ایک لفظ پڑھا ہے پھر قلم اٹھایا ہے۔ اور یہ تبصرہ نگار صاحب بھی کوئی ایسی ویسی شخصیت نہیں۔ یوسف ناظم صاحب ہیں۔ یہ تبصرہ ایڈیٹر صاحب "کتاب نما" اپنے اگلے پرچے میں شایع کر رہے ہیں۔ اور ہاں رسالہ "معارف" اعظم گڑھ نے بھی ہماری کوششوں کو سراہا ہے۔ معارف اردو کا بہت پرانا اور باوقعت علمی پرچہ ہے اس کی رائے ہمارے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

ذاکر صاحب پر مضمونوں کا سلسلہ ہم نے بند نہیں کیا ہے۔ اس پرچے میں ذاکر صاحب سے قریبی تعلق رکھنے والے بزرگ پروفیسر محمد عاقل صاحب کا مضمون پڑھیے عاقل صاحب بہت دنوں تک جامعہ کالج میں معاشیات کے لکچرر رہے ہیں۔ کچھ دن ہوئے جامعہ سے سبک دوش ہوگئے ہیں۔ پڑھنے کا شغل جاری ہے لکھنے کی عادت چھوٹ گئی ہے۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ پیام تعلیم کے لیے انھوں نے ایک اچھا مضمون لکھ دیا۔ یہ ہمارے لیے تبرک کی حیثیت رکھتا ہے۔

کسی پچھلے پرچے میں ہم نے آپ کے سامنے ایک تجویز پیش کی تھی۔ ذاکر نمبر کی فرمائشیں دفتر میں کافی تعداد میں آجائیں تو ہم یہ نمبر دوبارہ شایع کر دیں۔ یوں تو یہ تجویز عام طور پر پسند کی جا رہی ہے لیکن فرمائشیں ابھی اتنی نہیں آئی ہیں کہ ہم اسے دوبارہ چھاپنے کی

ہمت کر سکیں۔

خوشی کی بات ہے کہ جولائی کا پرچہ آپ کو بہت پسند آیا۔ اب کے اس میں اپنے ننھے پیامیوں کے لیے بھی کافی مسالہ تھا جناب جاوید اشرف، جناب سعادت نظیر، جناب خضر برنی وغیرہم کی نظمیں غلام حیدر کی کہانی کون بڑا ہے۔ لال شہزادہ، امین صاحب کی کہانی احسان کا بدلہ، لینن وغیرہ خاص طور پر پسند کیے گئے۔

اس پرچے میں کھلونوں کی جنگ پڑھیے۔ امین صاحب کی کہانی ازیزی اور جو جو پڑھیے کشتی کا اکھاڑا پڑھیے مضامین میں عربی وقت، ہوا میں پانی اور لینن وغیرہ پڑھیے۔

لینن کی یہ دوسری اور آخری قسط ہے۔ یہ مضمون لینن کے سو سالہ جینتی کے سلسلے میں شایع کیا جا رہا ہے۔ اسے آپ غور سے پڑھیے۔ دیکھیے کہ کیا باتیں تھیں جن کی وجہ سے لینن اتنا بڑا آدمی بنا۔ لینن کی کچھ باتیں تو آپ آسانی سے اپنا سکتے ہیں۔ مثلاً دوسروں سے ہمدردی، محبت خلوص، کام میں لگن، بردباری، تحمل اور غور و فکر کی عادت

عربی وقت یا کتے مدینے کے وقت پر بہت دل ہوئے حاجی عبدالملک صاحب نے مضمون لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ اپنا وعدہ پورا کرنے کی مہلت انھیں اب ملی ہے۔ یہ مضمون آپ کو کچھ عجیب سا لگے گا غور سے پڑھیے۔ ہے دل چسپ۔ ہم نے ملک صاحب سے عربوں کی مہمان نوازی کا حال پوچھا تھا۔ یہ بھی درخواست کی تھی کہ مکے کے دیہاتوں کے رہن سہن اور رسم و رواج پر کچھ لکھیے۔ انھوں نے وعدہ تو کیا تھا مگر بہت مصروف آدمی ہیں۔ بڑی مشکل وقت نکال پاتے ہیں، آج کل مدینے میں ہیں۔ وہیں سے یہ مضمون بھیجا ہے۔

اس مہینے پیام تعلیم کے بہت سے ہمدردوں اور سرپرستوں نے خریداری بڑھانے میں ہمارا ہاتھ بٹایا ہے۔ برادرم جنید الحق صاحب (جامعہ) نے پانچ خریدار دیئے ہیں۔ ردولی میں پیام تعلیم کی ایجنسی کھلوائی ہے بہت سے خریداروں کے پتے دیئے ہیں۔ جناب قطب الدین (گوا) اور رئیس احمد خاں صاحب نے دو دو خریدار مرحمت فرمائے ہیں ایک حامد حسین صاحب لکچرر (مدراس) نے دیا ہے۔ ہاں چار خریدار حبیب احمد خاں صاحب (جامعہ) نے دیئے ہیں۔

پروفیسر اذکار عارف علی خاں حسن پور۔ راشد امیر میرٹھ خود خریدار بنے ہیں۔ پرانے ساتھی اور ہمدرد مرزا عزیز اللہ بیگ نے پانچ خریداروں کا وعدہ فرمایا ہے۔ ان کا وعدہ اٹل ہوتا ہے۔ انشاء اللہ جلد پورا ہوگا۔

جناب
دینا ناتھ گرگ صاحب

چاند پر انسان کا پہلا قدم

لیجیے بھئی! مبارک!

انسان کا ہزاروں سال کا خواب آخر پورا ہو کر رہا۔ پچھلے دس سالوں کی مسلسل جدوجہد اور بے اندازہ خرچ کے بعد انسان نے آخر چاند پر پہنچ کر ہی دم لیا۔

کسی پچھلے پیام تعلیم میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ امریکہ جولائی میں انسان کو چاند پر اتارنے کا پروگرام بنا رہا ہے اور جناب اس پروگرام کے مطابق ۱۶ جولائی کو شام کے کوئی سات بجے، امریکہ کے کیپ کینیڈی راکٹ اڈے سے ایک راکٹ چھوڑا گیا۔ اس راکٹ میں تین خلا باز تھے۔ آرم اسٹرانگ، ایلڈرین اور کالنس۔

یہ راکٹ ۱۹ جولائی کو چاند کے حلقۂ گردش میں داخل ہوا۔ چاند کے گرد کئی چکر لگانے کے بعد آرم اسٹرانگ اور ایلڈرین نے اصل راکٹ سے وہ چھوٹا راکٹ الگ کیا جو خاص طور پر چاند پر اترنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اصل راکٹ کالنس کے چارج میں چاند کے گرد برابر چکر لگاتا رہا۔

چھوٹا راکٹ ۲۰ اور ۲۱ جولائی کی درمیانی رات میں ایک بج کر ۴۸ منٹ ۲۲ سکنڈ پر چاند پر خیریت کے ساتھ اتر گیا لگ بھگ سات گھنٹے بعد یعنی ۲۱ جولائی کی صبح کو ساڑھے آٹھ بجے آرم اسٹرانگ اپنے راکٹ سے باہر آئے اور چاند پر پہلا قدم رکھا۔ ۲۰ منٹ بعد ایلڈرین بھی باہر آئے۔ دونوں کوئی ڈھائی گھنٹے تک چاند کی سطح پر گھومے پھرے اور پھر اپنے راکٹ میں داخل ہو گئے۔ لگ بھگ بائیس گھنٹے ان کا راکٹ چاند کی سطح پر رہا۔

پھر دونوں خلا بازوں نے ۲۱ جولائی کی رات کے گیارہ بج کر بیس منٹ پر اپنا راکٹ چالو کر دیا۔ اور اسے خلا میں اصل راکٹ سے دوبارہ جوڑنے کے لیے لے گئے۔ ۲۲ جولائی کی صبح کو تین بج کر چھ منٹ پر دونوں راکٹ آپس میں جڑ گئے۔ آرم اسٹرانگ اور ایلڈرین اس چھوٹے راکٹ سے نکل کر بڑے راکٹ میں داخل ہو گئے اور یہاں اپنے تیسرے ساتھی کالنس سے جا ملے۔ یہ چھوٹا راکٹ اصل راکٹ سے پھر الگ کر دیا گیا۔ اب یہ چاند تو تنہا چاند کے گرد چکر لگاتا رہے گا۔

آرم اسٹرانگ اور ایلڈرین نے چاند سے لوٹتے وقت دس لاکھ ڈالر (پچھتر لاکھ روپے) سے بھی زیادہ قیمت کے کیمرے، ٹیلی ویژن کیمرے، آکسیجن گیس اور بہت سا دوسرا قیمتی سامان وہیں چھوڑ دیا تاکہ بعد میں اترنے والوں کو یہ چیزیں لے جانے کی ضرورت نہ ہو اور خود ان کے پاس بوجھ کم سے کم ہو۔

۲۲ جولائی کی صبح کو تینوں خلا باز زمین کی طرف روانہ ہوئے، کامیاب و کامران۔ جب تک چاند کے حلقۂ گردش میں رہے۔ راکٹ کی رفتار بہت دھیمی رہی۔ لیکن زمین کے حلقۂ کشش میں پہنچتے ہی غیر معمولی طور پر تیز ہو گئی اور تینوں خلا باز ۲۴ جولائی کی رات کو دس بج کر ۳۰ منٹ پر خیریت کے ساتھ بحر الکاہل میں اتر گئے۔

اتفاق کی بات بحر الکاہل میں جہاں انھیں اترنا تھا چند گھنٹے پہلے موسم خراب ہو گیا۔ اس تھوڑے وقفے میں کنٹرول روم نے مقررہ جگہ سے چار سو کلو میٹر دور جزیرہ ہوائی کے پاس راکٹ کو اتارنے کی ہدایت دی۔ بچانے والے جہاز اور ہیلی کاپٹر بھی وہاں بھیج دیے گئے۔

ایک اور اتفاق، اترتے وقت راکٹ الٹا گر الیکن اسے فوراً سنبھال لیا گیا۔ اور صاحب خدا کی مہربانی اور تمام دنیا کے لوگوں کی دعاؤں کے اثر سے چاند کا یہ سفر خیریت کے ساتھ تمام ہوا۔

اور سنیے یہ راکٹ جب چھوڑا گیا تھا تو اس کا وزن تین ہزار ٹن سے زیادہ تھا اور جب یہ واپس زمین پر اترا ہے تو اس کا وزن صرف ۵ ٹن رہ گیا تھا۔

کھلونوں کی جنگ

جناب غلام حیدر ایم اے



رضّو کو کھلونوں کا بڑا شوق تھا۔ انھیں وہ اچھی طرح سنبھال سنبھال کے رکھتی تھی جبھی تو اس کے کھلونے بہت کم ٹوٹتے پھوٹتے تھے۔ کبھی گم بھی نہ ہوتے ہاں اُن کھلونوں کی شامت اس وقت آتی جب گرمیوں کی چھٹیوں میں اس کے رشتہ کے بہن بھائی آجاتے۔ مگر یہ نیچے کا قصہ تو عجیب ہی ہے آپ بھی پڑھ کر حیران ہوں گے۔

ایک بار اس کے ایک چچا بمبئی سے آئے۔ چچا میاں جانتے تھے کہ چاہے وہ کچھ بھی لے جائیں رضّو کے لیے لیکن اگر ایک دو اچھے کھلونے لے کر نہ گئے تو وہ انھیں کبھی معاف نہ کرے گی۔ اسی لیے اب کے بھی انھوں نے اس کے لیے کھلونے

کی بھی آپ کے ابتدائی [illegible] معلومات سے لبریز ہیں۔ ملک کی خبروں کی [illegible] کا سہرا پیامِ تعلیم کے سر رہا جس نے روس کے لونا ۹ سے امریکہ کے اپولو ۱۳ تک باقاعدہ بروقت اور مفصل خبریں شائع کی ہیں۔

نسیم محمد جان آرہ

"پیامِ تعلیم" کے دو شمارے ملے۔ شکریہ۔ [illegible] بہت پسند آیا۔

[illegible] سٹوری [illegible]

[illegible] برابر موصول ہو رہا ہے۔ اس [illegible] RECENTTOPICS پر [illegible] خوشی ہوئی۔ جیسے ذکر [illegible] مضامین چاند پر انسانی [illegible] کے اس حادثۂ عظیم [illegible] شائع کیے۔ بہت بہت مبارکباد [illegible]۔ آپ کو اور آپ کے ادارے کو پیامِ تعلیم کو اور بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

ایچ۔ سالم گیا

اکتوبر کا شمارہ مل گیا۔ ٹائٹل کا یہ نیا انداز [illegible] ہے... لطیفوں کا سلسلہ دیکھ کر بڑی ہی مسرت ہوئی۔ مضمون [illegible] سب سے زیادہ پر مذاق اور دلچسپ۔ میرے خیال میں [illegible] کی کہانی ہے اور سارے مضامین اور نظمیں بھی تعریف کے قابل ہیں۔ پیامِ تعلیم [illegible]

[illegible] بچوں کو بہت محبوب ہے۔

خلیق انجم اشرفی [illegible]

اردو ادب کی خدمت خصوصاً بچوں کے جس ڈھنگ سے ہو رہی ہے۔ قابلِ ستائش ہے۔ مضامین معلومات سے پُر ہوتے ہیں۔ اور بچوں کو نئی باتوں سے روشناس کرانا اس کا کام ہے۔ میں نے اس کی شکایت آپ سے ایک بار اور بھی کی تھی کہ بچوں کو الفاظ کے صرف محدود احاطے میں نہ رکھنا چاہیے بلکہ ان کو اردو ادب سے بھی روشناس کرنا فرض ہے اور اس فرض کی ادائیگی آپ نے صرف چھوٹے بچوں تک محدود رکھی ہے۔ آگے بھی قدم بڑھانا ہے۔

[illegible] ہیڈ ماسٹر [illegible] ہائی اسکول [illegible]

نومبر کا پیامِ تعلیم نظر نواز ہوا۔ پسند آیا۔ لیکن میری ناچیز رائے میں کتابت بہت جلی ہے۔ اگر کچھ مضامین کی کتابت خفی (کسی شمارے میں) رہے تو زیادہ مواد اتنے ہی صفحوں میں آسکتا ہے۔ میرے خیال میں آپ اس پر غور کریں گے۔

محمد انوار عالم شمسی۔ بہار شریف۔

ہم نے نومبر کے پیامِ تعلیم کو اچھی طرح سے مطالعہ کیا اور سوچتے ہی [illegible] طبیعت پھڑک اٹھی۔ سب کی محنت کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

نے ہاتھ پکڑ کر سپاہی کو باہر لا کر کھڑا کر دیا سپاہی کے ایک ہاتھ میں چمکدار تلوار تھی اور اسکی صورت سے ہی غصہ ٹپکتا تھا۔

اِن دونوں کے باہر آتے ہی رضّو کو ایسا لگا جیسے کوئی بکس کے اندر سے ایک ایک کھلونے کو اچھال رہا ہے سب سے پہلے بندر باہر نکلا اس کے بہت چمکدار شیشے کی آنکھیں لگی تھیں پھر پہیّوں والا بڑا سا ہاتھی آیا، پھر جھبرا جھبرا بھالو بھی آ گیا اور سب بکس کے کنارے کنارے چاروں طرف کھڑے ہوتے رہے۔

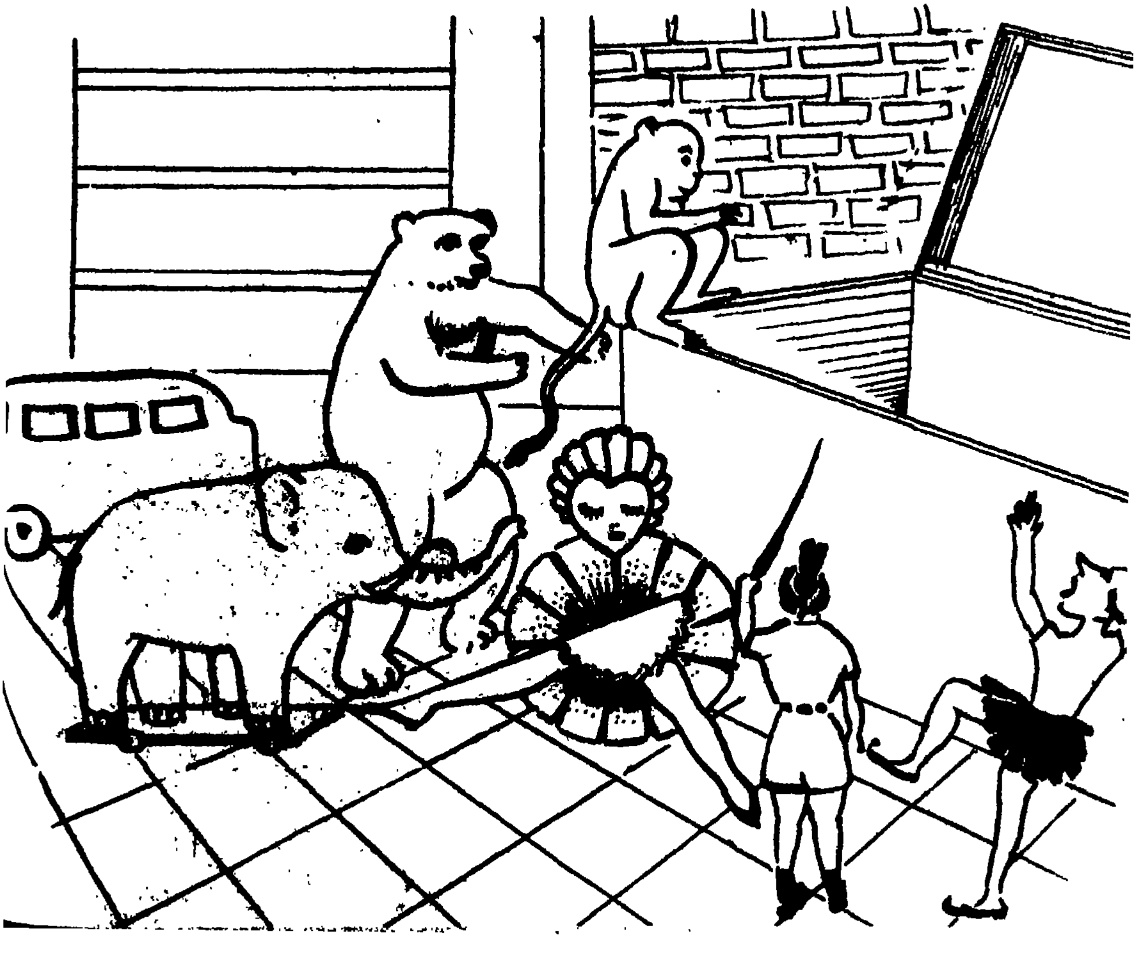
جوکر نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔ "ارے ہم سب کی بزرگ گڑیا تو آئی ہی نہیں"

بندر نے جواب دیا۔ "وہ بھلا کیسے آسکتی ہے جب تک کوئی اُسے اُٹھا کر بٹھائے گا نہیں اُس کی آنکھیں کھلیں گی کیسے۔"

"اچھا ٹھہرو، میں نکالتا ہوں۔" جوکر نے کہا اور بکس کے کنارے کھڑے ہو کر اپنا ہاتھ اندر بڑھایا۔ پھر وہ ذرا سی دیر میں چیخا:۔

"بھائیو! میں بہت چھوٹا ہوں کوئی اور میری مدد کرو۔"

"ہٹو ہٹو پرے تمہیں کیے۔" ریچھ بولا۔ "میں تم سب میں طاقت ور ہوں۔ چاہوں تو تم سب کو اُٹھا کر اپنے کندھے پر بٹھا لوں۔"



"ارے جاؤ جاؤ" ہاتھی کو یہ بات بہت بُری لگی۔

"مجھے بھی اُٹھالو گے؟"

"ہاں اگر تمہاری ٹانگوں میں پہیے نہ لگے ہوں تو تمہیں بھی اُٹھا لوں گا۔"

اور سبھی سب نے مل کر گڑیا بی بی کو باہر نکال کر فرش پر لٹا دیا مگر اس کی آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں جیسے خوب غفلت کی نیند سو رہی ہو۔ جوکر نے اُسے جھنجوڑا۔

"کیوں گڑیا بی بی! تم اٹھتی کیوں نہیں، بھلا تین دن اور تین راتوں سے یونہی آنکھیں بند کیے سو رہی ہو۔"

"کیوں کھلونو میں اپنی آنکھیں ؟ کون کھیلے گا میرے ساتھ اور پھر میری آنکھیں تو اس وقت تک کھل ہی نہیں سکتیں جب تک کوئی مجھے اٹھا کر نہ بٹھائے۔"

اور پھر سب نے مل کر ہاتھ لگایا اور بکس کی دیوار سے لگا کر بڑی سی گڑیا کو بٹھا دیا۔ بیٹھتے ہی اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

"ہرے۔" بونا جوکر خوشی میں چیخا اور کودنے لگا۔

"میری آنکھیں تو کھل گئیں مگر میں دیکھ اب بھی نہیں سکتی دیکھو نہ کتنا اندھیرا ہے کمرے میں جب تک بجلی نہ جلے گی میں کیسے دیکھوں گی۔"

اگر میرا ہاتھ بجلی کے بٹن تک پہنچ سکتا تو میں ابھی کھول دیتا۔" بونے جوکر نے کہا۔

"وہ تو میرے لیے بھی بہت اونچا ہے۔" بھالو نے کہا۔

"میں کھول تو سکتا ہوں خیر، مگر یہ کام بڑا گھٹیا لگتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے ہاتھی نے اپنی سونڈ کو ہوا میں لہرایا۔

"مگر میرے لیے بٹن اتنا اونچا نہیں ہے۔" بندر نے شرارت کے سے انداز سے سب کی طرف دیکھا۔ پھر وہ ایک کر دروازے پر چڑھ گیا۔ جب وہ بجلی کے بٹن کی اونچائی تک پہنچ گیا تو بٹن کی طرف چھلانگ لگائی اور گرتے ہی بٹن پر ہاتھ مار دیا۔ بجلی جل گئی اور سارا کمرہ چمکنے لگا۔ اب ایک ایک کھلونا صاف نظر آنے لگا۔ رضو کو اپنے کھلونوں کی حرکتیں دیکھ کر بڑا مزہ آرہا تھا، خوب ہنس رہی تھی۔

"اب بالکل ٹھیک ہے" گڑیا نے کہا۔ "اگر بندر میاں بجلی نہ جلاتے تو میں پھر پھسل کر لیٹ گئی ہوتی۔ سو بھی گئی ہوتی۔"

"دیکھو اب میں موٹر گاڑی میں بیٹھ کر پورے کمرے کا چکر لگاؤں گا۔" سپاہی نے کہا اور دوڑ کر موٹر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ یہ موٹر گاڑی ایک کونے میں پڑی تھی۔ موٹر اس کے بیٹھتے ہی چل پڑی۔ سپاہی کے ہاتھ میں تلوار چمک رہی تھی اور وہ اُسے چاروں طرف ہلاتا جاتا تھا جیسے لڑنے جا رہا ہو۔

بندر موٹر کے پاس آکر بولا۔

"دیکھو اب میں تمہاری گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑ لگاؤں گا۔ دیکھیں کون تیز دوڑتا ہے۔" وہ موٹر کے ساتھ دوڑنے لگا۔ سب کھلونے خوب دل کھول کر ہنس رہے تھے۔ گڑیا کے چہرے پر بھی مسکراہٹ نظر آرہی تھی مگر سب سے زیادہ تو جوکر کود رہا تھا۔

"ارے ٹھہرو بے وقوفی کی باتیں بند کرو۔" بھالو نے بہت اکڑ کر کہا۔ "تم سب میری بات سنو!"

"ہم سب سن رہے ہیں" کھلونوں نے جواب دیا۔ اور اپنی اپنی جگہ رک گئے۔

"میرے علاوہ۔"! ہاتھی نے بھالو سے بھی زیادہ اکڑ کر کہا۔ "میں کیوں بھالو کی بات سنوں وہ کوئی مجھ سے زیادہ طاقتور ہے؟"

"اچھا اگر تم اتنے ہی طاقتور ہو" ریچھ نے کہا۔ "تو تمھیں ہم سب کے لیے ایک کام کرنا ہوگا"

"کیا؟"

"ہم چاہتے ہیں کہ تم اس کیکڑے کے ہاتھ پیر توڑ دو" ریچھ نے کہا۔

"مگر وہ تو اپنے نکیلے ناخن میرے پیروں میں گاڑ دے گا" ہاتھی نے جواب دیا۔

رضو کو اس بات سے تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی افسوس بھی ہوا۔ مگر وہ اُن کی حرکتیں دیکھنے میں ایسی مگن تھی کہ اس نے اس بات پر زیادہ دھیان ہی نہ دیا۔ خاموشی سے دیکھتی رہی۔

"پھر میری سونڈھ بہت نازک ہوتی ہے اگر اس نے اپنے پنجے میری سونڈھ میں گڑو دیے تو کیا ہوگا۔" ہاتھی کچھ سوچ کر بولا۔

"ارے نہیں وہ ہرگز نہیں گڑو سکتا" بونے جوکر نے مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ تمھیں کیسے پتہ چلا" ہاتھی نے پوچھا۔

"مجھے سب معلوم ہے میں اپنی آنکھیں کبھی بند نہیں کرتا۔ ہر وقت دیکھتا رہتا ہوں"

"کیا بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو" ریچھ نے جھڑکا اور اس کے ساتھ ہی جوکر کو بھی غصہ آگیا۔ "دیکھو آئندہ کبھی نہ کہنا کہ میں بیوقوفی کی باتیں کر رہا ہوں۔ میں بہت چست و چالاک ہوں مگر ہاں بس اتنا طاقتور نہیں ہوں"

"بالکل ٹھیک، تم ٹھیک کہہ رہے ہو، تم اس بھالو سے کہیں زیادہ سمجھ دار ہو" ہاتھی نے کہا۔

"سنو سنو"! ریچھ پھر چیخا۔

"میں نہیں سنتا" ہاتھی اینٹھ گیا۔

"اچھا مت سنو"! ریچھ نے دھمکی دی "میں ابھی کیکڑے کو بلا لاتا ہوں، وہ میری بات سن لے گا اور تمھاری سونڈھ پر اپنے پنجے گاڑ دے گا"

"نہیں نہیں"! ہاتھی نے سچ مچ ڈرتے ہوئے کہا "بس تم کیکڑے کو نہ بلانا"

"پھر سنو گے میری بات"؟

"ہاں سنوں گا"

"اب ٹھیک ہے" ریچھ خوش ہوا۔ "یہ ہے اچھے ہاتھیوں والی بات"

"اچھا اچھا چلو کیا کہنا ہے تمھیں"

"لو اب میں بھول بھی گیا۔ تم بولتے ہی اتنا ہو کہ جو کچھ بھی دماغ میں آئے نکل جاتا ہے"

"مجھے معلوم ہے تم کیا کہنا چاہتے ہو" بونے جوکر نے کہا۔

"کیا؟"

"تم ہاتھی سے کہہ رہے تھے کہ وہ اس کیکڑے کو مار ڈالے"

"ہاں ہاں بالکل ٹھیک، میں یہی بات کہہ رہا تھا" ریچھ نے کہا۔

"میں نہ کہتا تھا کہ میں بہت ہوشیار ہوں" بونے جوکر نے شیخی بگھاری۔

"میں نہیں مار سکتا کیکڑے کو" ہاتھی نے کہا "مجھے اس سے ڈر لگتا ہے"

"نہیں تم اس سے ڈرو مت، بالکل نہ ڈرو" جوکر بولا "اس میں اس وقت چابی نہیں بھری ہے۔ ریچھ کو یہ بات نہیں معلوم حالانکہ وہ ہمیشہ شیخی بگھارتا ہے کہ اُسے سب کچھ معلوم ہے"

"اچھا تمہیں کیسے پتہ چلا کہ اُس میں اس وقت چابی نہیں ہے۔" ریچھ نے پوچھا۔

"وہ اِس وقت ہل نہیں سکتا۔ اگر اُس میں چابی بھری ہوتی تو وہ اِس وقت بھی رینگتا ہوتا۔"

"اچھا تو کیا وہ کاٹ بھی نہیں سکتا اِس وقت —؟" ہاتھی نے پوچھا۔

"ارے بالکل نہیں۔" بونے جوکر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پھر مجھے اس سے کیوں ڈر لگنے لگا۔" ہاتھی نے اکڑ کر کہا۔ اور اپنی سونڈھ کو ہوا میں لہرایا۔

"میں تمہیں بتاتا ہوں تمہیں کیا کرنا ہے۔" ریچھ بولا۔

"بالکل نہیں۔" ہاتھی چیخا۔ "میں وہ کام نہیں کروں گا جسے تم بتاؤ گے۔"

"اچھا چلو میں کود کر تمہاری پیٹھ پر چڑھ جاؤں گا۔" جوکر بولا۔ "اور تمہارا مہاوت ہو جاؤں گا۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" ہاتھی تیار ہو گیا۔

بونا کود کر ہاتھی کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور چیخا۔ "ہاں چلو۔"

"نہیں!" ہاتھی بھی چنگھاڑا۔ "تم اس طرح مجھ سے بات مت کرو۔ میں گھوڑا نہیں ہوں۔ اگر تم اس طرح بات کرو گے تو میں ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھوں گا۔"

"مجھے پتہ ہے تمہارے دوڑانے کے لیے کیا بات کہنی چاہیے۔" ریچھ نے کہا۔

"کیا —؟" ہاتھی نے غصہ میں کہا۔

"کیکڑا۔" ریچھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور سارے کھلونے ہنسنے لگے۔ مگر ہاتھی کو ضد سوار ہو گئی۔ وہ نہ ہلا۔

"اچھا چلو" سپاہی بولا۔ "اگر ہاتھی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا تو تم میری موٹر میں آجاؤ۔ ہم دونوں کیکڑے کا پیچھا کریں گے۔"

"کون کہتا ہے میں ہل نہیں سکتا۔" ہاتھی پھر چیخا۔

"میں کہتا ہوں۔" سپاہی نے جواب دیا۔ "اگر تم دوڑ سکتے ہو تو آؤ۔ میں تمہارے ساتھ دوڑ لگانے کے لیے تیار ہوں۔"

اور سپاہی نے موٹر کو بڑی تیزی سے دوڑا دیا۔ اور وہ ہاتھی سے ٹکراتے بچی۔

"ارے کہاں کہاں؟" ہاتھی ایک طرف کو ہٹتے ہوئے چیخا۔

"میں کیکڑے سے لڑنے جا رہا ہوں۔" سپاہی نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ تم اس سے ڈرتے ہو۔"

"ڈر تو مجھے بھی لگتا ہے۔" ریچھ بولا۔

"کاش میں بھی چل سکتی۔" گڑیا نے کہا۔ "میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس گڑیا کو اتنے زور سے مروڑوں کہ وہ بڑے زور زور سے ممّی ممّی چیخنے لگے۔"

"میں لڑوں گا تمہارے بدلے اس سے۔" ریچھ نے سینے پر ہاتھ مارا۔

"بڑا مزہ آئے گا۔" بندر خوشی سے کودتے ہوئے بولا اور پھر سارے کھلونے اُس الماری کے پاس پہنچ گئے۔ بس بے چاری گڑیا وہیں اپنے بکس سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی اور وہیں سے تکتی رہی۔

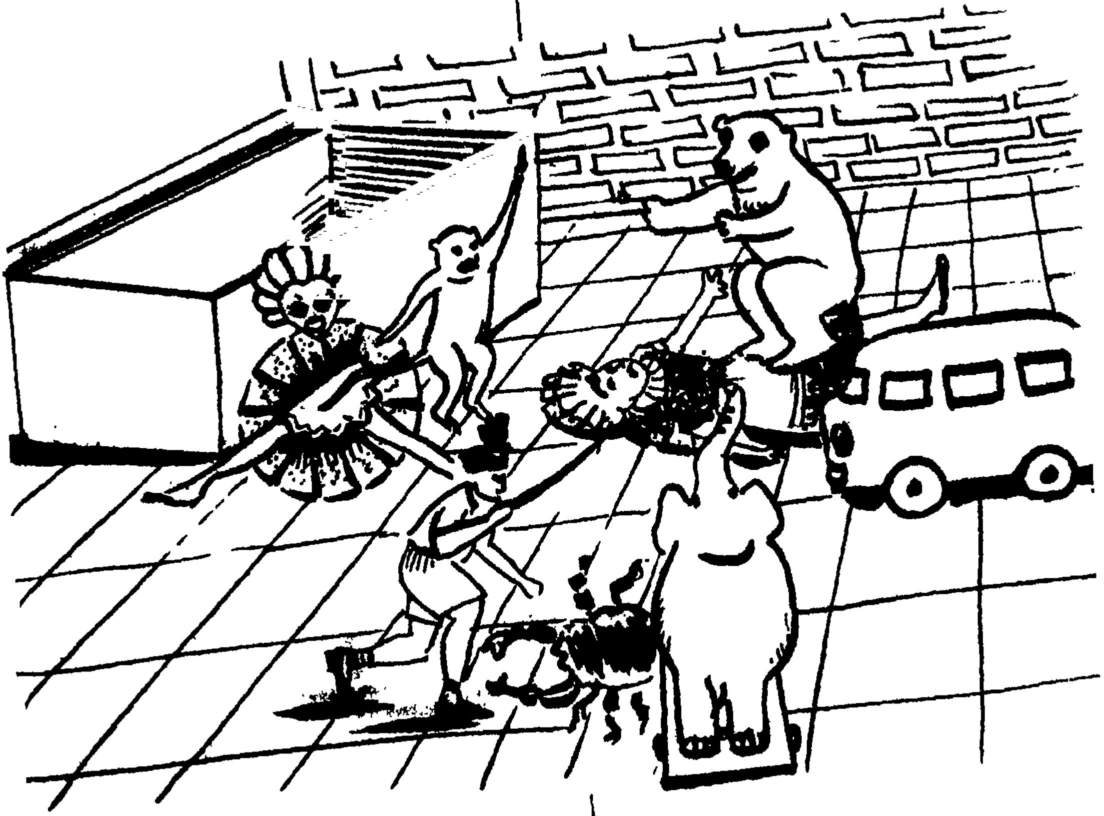
سب سے پہلے ہاتھی پر سپاہی چڑھ گیا۔ اس کے کندھے پر الماری پکڑ کر بونا جوکر کھڑا ہو گیا۔ پھر سب سے آخر میں بونے کے کندھے پر بندر میاں سوار ہو گئے۔ اک ذرا کے ذرا بندر نے بونے کے کندھوں پر پیر جمائے اور پھر ایک زوردار چھلانگ لگائی اور وہ الماری کی چھت پر تھا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے دونوں کھلونوں کو نیچے دھکیل دیا۔ اتنے میں سب اپنی اپنی جگہ

تیار ہو چکے تھے۔ سپاہی اپنی موٹر پر بیٹھ گیا۔ بونا جوکر بھی ایک طرف تیار کھڑا ہو گیا۔ سب سے پہلے سپاہی نے حملہ کیا۔ اُس نے بڑی تیزی سے کار کو کیکڑے کے پیر پر دوڑا دیا پھر اپنی تلوار سے اس کی پیٹھ پر کئی حملے کیے۔

طرف کو کود گیا۔ بونے میاں کا ڈر کے مارے بُرا حال تھا۔

"بچاؤ، بچاؤ — کیکڑا مجھے کھا جائے گا۔" جوکر چیخ رہا تھا۔

بندر ہنسنے لگا۔ اب کیکڑے کی چابی ختم ہو گئی تھی اور



"میں نے کیکڑے کو مار لیا ہے۔" سپاہی خوشی سے چیخا مگر کیکڑے کی پوری چابی ختم نہیں ہوئی تھی، شریر بندر کو یہ بات معلوم تھی۔ وہ چپکے سے کیکڑے کے پاس پہنچا اور جیسے ہی ہاتھی تیزی سے کیکڑے کی طرف بڑھا اس نے کیکڑے کو ہلکا سا دھکا دے دیا۔ بس کیکڑا اچھل پڑا اور سیدھا ہاتھی کی ٹانگوں میں گھس گیا "ارے ارے۔" ہاتھی چنگھاڑا اور ڈر کے مارے ایک

وہ ہاتھی سے ٹکرا کر اُلٹا ہو گیا تھا۔

"اب پھر مار دو اسے۔" بندر چیخا۔

سپاہی نے پھر حملہ کیا اور اپنی کار تیزی سے کیکڑے پر دوڑا دی۔ اپنی تلوار سے اس پر اتنے وار کیے کہ چابی کا اسپرنگ بالکل ہی ٹوٹ گیا۔

"بس اب کیکڑا بالکل مر گیا۔" بندر نے آواز لگائی

"اب ٹھیک ہے۔" بونا جوکر بولا اور اپنی چوٹیں سہلانے لگا۔

اتنی دیر میں ریچھ نئی گڑیا کے پاس پہنچ چکا تھا اور اُسے اپنے اگلے پنجے سے زور زور سے مار رہا تھا ہر چوٹ پر گڑیا کی ممی ممی کی چیخیں سنائی دیتیں۔

"ارے بھئی رکو۔" ہاتھی چیخا "اس کی چیخوں سے رضو کی آنکھ کھل جائے گی۔"

"نہیں اسے اور زور سے مارو۔" پرانی گڑیا اپنی جگہ سے چیخی۔ "جب سے یہ آئی ہے رضو نے میرے ساتھ کھیلنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔"

اور سچ مچ ریچھ نے اس نئی گڑیا کے اتنے زور زور سے لاتیں ماریں کہ اس نے ممی کہنا بند کر دیا۔

"یہ بہت بڑی لڑائی تھی۔" سپاہی چیخا۔ "مگر جیت ہماری ہی ہوئی۔"

"مگر جیت ہماری ہی ہوئی۔" بندر خوشی سے کود رہا تھا۔

"مگر اس کی وجہ سے ہم سب کی شامت آجائے گی۔" ہاتھی بولا۔ "بھئی میں نے تو کچھ کیا نہیں۔"

"تم ڈرپوک ہو بھاگ کھڑے ہوئے۔" ریچھ نے چڑھاتے ہوئے کہا۔

گڑیا اتنے زور سے ہنسی کہ پھسل کر لیٹ گئی اور اُسکی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔

"اچھا اب تم یہ بتی بجھا دو ورنہ رضو کو پتہ چل جائے گا کس نے اس کی گڑیا اور کیکڑے کو مارا ہے۔" ریچھ نے بندر کو مشورہ دیا۔

بندر ایک بار پھر دروازے پر چڑھ گیا اور کودتے میں اس نے روشنی بجھا دی۔

ایک بار پھر ایک ایک کھلونا کود کر بکس کے اندر چلا گیا۔ اور تھوڑی دیر میں بکس کا ڈھکن بھی بند ہو گیا۔

رضو بہت زور زور سے رو رہی تھی اس کی امی نے جب اس کی آواز سنی تو وہ جلدی سے کمرے میں آئیں اور اُسے جگا کر چوکنا کیا۔ اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا جب امی نے اُسے بہت پیار کیا اور وہ چپ ہوئی تو اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بتایا۔ امی نے جلدی سے روشنی جلا کر دیکھا تو اس کی گڑیا اور کیکڑا سچ مچ الماری کے نیچے گرے پڑے تھے اور گرنے سے دونوں کھلونے خراب ہو گئے تھے۔ اب کیکڑا نہ دوڑ سکتا تھا، نہ گڑیا ممی ممی پکار سکتی تھی

بہت دنوں تک رضو کو یہ یقین رہا کہ اس کے یہ نئے کھلونے پرانے کھلونوں نے مل کر توڑے ہیں اس کی امی، باجی اور ابو اُسے بہت سمجھاتے کہ اس نے خواب دیکھا ہوگا۔ اور کسی بلی یا کسی اور چیز کے الماری پر چڑھنے سے کھلونے گر کر ٹوٹ گئے ہوں گے۔ مگر اس کو یقین نہ آتا تھا۔ بھلا اس نے تو یہ ساری لڑائی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔

ممکن ہے یہ سب حرکت اس کے بھائی کمال کی ہو۔

مگر اب جب کبھی کوئی نیا کھلونا اس کے پاس آیا اُس نے اپنے پرانے کھلونوں سے کھیلنا نہ چھوڑا۔

(خیال۔ ڈونالڈ لائے میکنزی کی پریوں کی کہانیاں سے لیا گیا۔)

جناب مرزا شکور بیگ (حیدرآباد)

ذاکر صاحب

ذاکر صاحب صدر ہمارے
کیسے وہ بے وقت سدھارے

کام تھا ان کا خلق کی سیوا
بول تھے ان کے پیارے پیارے

دیس تھا ان کو سب سے پیارا
وہ تھے دیس کی آنکھ کے تارے

جن کا سہارا کوئی نہیں تھا
ان کے تھے مرحوم، سہارے

کام سب ان کے، کام آئیں گے
روشنی کے جیسے مینارے

ہندو مسلم، سکھ، عیسائی
ان کے لیے غمگین ہیں سارے

کھیون ہار بنا ، نیّا ہے
کون لگائے اُسے کنارے

یاد انھیں اب کر کے مرزا
روتے ہیں دکھ درد کے مارے



جناب پروفیسر محمد عاقل

دل جوئی فرض شناسی اور ذاکر صاحب

(بڑے پیامیوں کے لیے)

کچھ لوگ فرض شناس ہوتے ہیں لیکن دل جوئی نہیں کر سکتے۔ کچھ دل جوئی کر سکتے ہیں لیکن فرض شناس نہیں ہوتے۔ فرض شناس بھی ہوں اور لوگوں کی دل جوئی بھی کر سکیں، ایسے بہت کم ہوتے ہیں۔ ایسے ہی نادر لوگوں میں ذاکر صاحب تھے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ دل جوئی کو انہوں نے کمال تک پہنچا دیا تھا۔ جیسے پیغمبروں اور اولیا کے معجزے اور کرامات ہوتے ہیں، ایسے ہی دل جوئی، ذاکر صاحب کا کمال تھا۔ میرے اس کہنے سے، مجھے یقین ہے، ذاکر صاحب کے جاننے والوں کو، ان کے اس کمال کی بے شمار مثالیں فوراً یاد آجائیں گی۔

دل جوئی ایک بہت مشکل کام ہے۔ یہ بہت صبر، ضبط اور قربانی کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جن کی آسانی سے دل جوئی کی جا سکے۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو خوش رکھنے کے لیے آپ کو بڑا عالی ظرف، بڑا رواداری، بڑا انسانی ہمدرد اور دوست، بڑا خوش مزاج اور بذلہ سنج، با اخلاق اور با مروت، وسیع القلب اور وسیع النظر ہونا پڑتا ہے۔ غصہ، حقارت، نفرت اور ایسے ہی دوسرے جذبات پر زبردست قابو رکھنا پڑتا ہے۔ ایک ایک لفظ کو تول کر اور پرکھ کر منہ سے نکالنا ہوتا ہے۔ دوسرے کی بڑی سے بڑی خطا اور غلطی سے عفو اور درگذر کرنا پڑتا ہے۔ ہمدردی اور رحم کو اپنا کردار اور شعار بنانا پڑتا ہے۔

ذاکر صاحب میں یہ سب صفتیں یا تو قدرتی تھیں یا انھوں نے اپنی ذاتی تربیت اور اصلاح کے ذریعہ، ارادی طور پر، ان کو اپنے اندر پیدا کیا تھا اور ان کی مسلسل نشو و نما کی کوشش میں برابر لگے رہتے تھے۔

اس ضمن میں ان کا سب سے زریں زمانہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۸ء تک کا سمجھنا چاہیے جب وہ جامعہ ملیہ کی رہنمائی کا کام اس کے نازک ترین دور میں انجام دے رہے تھے تعلیم پانے والے بچوں کے والدین، سیاسی، تعلیمی اور مذہبی نقاد، خود ان کی جامعہ کے رفیق اور کارکن کرایہ کے مکانوں کے مالک جن میں جامعہ چلائی جا رہی تھی، قرض خواہ جن سے قرض لے کر جامعہ کے کام چلائے جاتے تھے، کیسا کیسا یہ سب لوگ ان کو تنگ اور پریشان کرتے تھے! حوصلوں کی بلندی اور وسائل کی تنگی میں کتنا بُعد اور کتنی گہری کھائیاں حایل نظر آتی تھیں! ریگزاروں میں کیسے ہل چلانے پڑتے تھے چھلنیو سے پانی بھرنے کی کیسی کیسی کوششیں کی جاتی تھیں!

کیسی کیسی سیاہ مایوسیوں میں، امیدوں کے ٹمٹماتے دیوں کو روشن رکھنا پڑتا تھا! غم ناک فضاؤں میں کیسے خوشی کے ترانے گائے جاتے تھے رجز خوانیاں کی جاتی تھیں۔ ہمت اور حوصلوں کو بلند رکھا جاتا تھا۔ سعی اور عمل کو تیز سے تیز تر کیا جاتا تھا۔

درہم و دینار من
آہوئے تاتار من
ناقۂ سیار من
تیز ترک گامزن منزل ما دور نیست

تب یہ قافلہ چلتا تھا اور اس کی جمعیت منتشر ہونے سے بچتی تھی۔ اس کے عزائم مضبوط اس کے حوصلے بلند اور اس کی کوششیں تیز سے تیز تر ہوتی رہتی تھیں۔

ذاکر صاحب سب کی دل جوئی کا کام، بڑی قیمت ادا کر کے ہی کر سکتے تھے۔ گالیوں کا جواب دعاؤں سے دیا جا سکتا ہے غصہ کا ہنس کر، دشمنی کا مصالحت سے، بدظنی کا حسن ظن سے، شیطنت کا، یزدانیت سے، بد ذوقی کا خوش ذوقی سے، کوڑمغزی کا، ذہانت سے، غلاظت وگندگی کا، صفائی اور نفاست سے۔ لیکن اس سے آدمی کے اعصاب پر، اس کی تندرستی پر حد سے زیادہ بوجھ بھی پڑتا ہے۔

جب شکایت کرنے والوں، اعتراض کرنے والوں، مخالفت کرنے والوں، بات کو غلط سمجھنے یا بات کو نہ سمجھنے والوں کا تانتا سا بندھ جائے اور ان کو راضی اور خوش اور مطمئن کرنے کے لیے لا یعنی تشویق گفتگوئیں کرنا پڑیں اور ایک کی دل جوئی کے فوراً بعد پے در پے دوسروں کی دل جوئی کرنا پڑے اور اپنی خوش مزاجی اور خندہ پیشانی کو سخت سے سخت ابتلا اور آزمائش میں بھی قایم و برقرار رکھنا پڑے۔ اس ڈر سے کہ جتنا کام کر لیا ہے وہ کہیں نامکمل نہ رہ جائے یا گرم لوہے پر ایک دو ہتھوڑے کی چوٹوں کی کسر دکھائی دے اور آپ کو اپنا کام جاری رکھنا پڑے۔ دفتر کے اوقات کے بعد بھی ذاتی بے آرامی کی پرواہ نہ کر کے آپ اپنے کام پر ڈٹے رہنا چاہیں۔ نہ حوائجِ ضروری کی پروا کریں نہ کھانے پینے کی اور نہ سونے اور آرام کرنے کی۔ آپ دفتر سے نکل کر، سرِراہ یا اپنے گھر پر، وقت ناوقت، گھنٹوں جب تک وہ خوش ہو کر آپ کے پاس سے رخصت ہونے کے لیے راضی نہ ہو، ہر مدعی کی دادرسی پر آمادہ رہیں۔ ہر دعوت کرنے والے کی دعوت اس خیال سے قبول کر لیں کہ کھانے میں شرکت دل جوئی کا ایک عمدہ راستہ ہے اور اس دل جوئی کے لیے اَلا بَلا سب کچھ کھا پی لیں اور شکایت کا ایک حرف زبان پر نہ لائیں بلکہ تعریفوں کے پل باندھ دیں، پیٹ میں گنجائش نہ ہو تو بھی دل جوئی کے لیے اس کو بھرتے چلے جائیں تو آپ کا جسمانی نظام ایک حد تک تو اسے برداشت کرے گا اس کے بعد ــــ

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

پھر جب آدمی انتہا درجہ کا فرض شناس ہو اور اس کے معیار بہت اونچے ہوں، اس کا ضمیر بہت بیدار اور حساس ہو اور اپنا فرض، انتہائی خوبی، حسن اور تکمیل کے ساتھ پورا کرنے کے لیے اپنے پر آرام

اور راحت کو تج دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہے اور جو ذمہ داری لے، جان چلی جائے لیکن اس کو پورا کرنے میں کوتاہی نہ ہونے دے۔

مضمون لکھنے بیٹھے تو ایسا لکھنا چاہا جس میں الہامی رنگ چھلکے، کسی علمی مجلس میں مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا جائے تو شاہ کار سے کم پیش کرنے پر راضی نہ ہوسکے۔ کتاب لکھے تو علمی تحقیق و جستجو میں جان کی بازی لگانے سے ہرگز نہ ہچکچائے۔ خطبہ پڑھے، تقریر کرے تو حُسنِ الفاظ، زورِ بیان اور مطالب کی گہرائی اور طبع زاد معنویت میں اس کا کوئی حریف اور ہم پلّہ نہ ہو تو پھر سوچیے اس کے جسمانی نظام پر کھنچاؤ اور دباؤ کی کیسی کیسی عجیب و غریب کیفیتیں رونما ہوں گی۔

غرض، دل جوئی اور فرض شناسی کی خاطر جب اوقات کی پابندی نہ کی گئی، ضروری آرام و سکون، صحت بخش غذا، تازہ ہوا، ورزش وغیرہ کا خیال نہ رکھا گیا، طبی مشوروں اور خبردار رہنے کی ہدایتوں کی پرواہ نہ کی گئی اور اپنی ذہانت اور طباعی کی بنا پر ان کا پرلطف خاکہ اور مضحکہ اڑایا گیا تو صحت پر اس کا خراب اثر پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ طرح طرح کی شکایتیں رہنے لگیں۔ آج اُنگلی دکھ رہی ہے اور قلم ہاتھ میں نہیں پکڑا جاتا تو کل پہنچا اور شانہ۔ آج پاؤں پر ورم ہے تو کل ٹانگ اور گھٹنوں میں درد، آج قبض ہے تو کل دستوں کا تانتا بندھ گیا اور ان سب سے غفلت اور بے توجہی اور اوندھے سیدھے یونانی، ہومیوپیتھک اور ایلوپیتھک علاجوں، طب کے ذاتی مطالعہ اور معالج دوستوں سے علاج کی جگہ علمی بحث و مباحثہ سے مرض میں تدریجی ترقی ہوتی گئی۔ اس نے شکل ذیابیطس کی دنبلوں کی اختیار کی، نیند غائب رہنے لگی۔ رات کو اچھی بری روشنی میں، غلط اندازِ نشست، غلط کروٹ سے لیٹ کر دیر دیر تک اپنے شوق کی چیزوں کے لکھنے پڑھنے سے آنکھوں پر خراب اثر پڑا۔ اس کی طرف سے لاپروائی برتنے سے اور ضروری آرام نہ کرنے سے اس نے سخت درد کی شکل اختیار کرلی۔ گلوکوما تشخیص کیا گیا۔ بالآخر آپریشن کے ذریعہ ایک آنکھ کی قربانی دے کر تکلیف سے نجات حاصل کی جاسکی۔ قلب کی حالت بھی ڈانواں ڈول ہوئی جس کا انجام بعد میں دل کے سخت دورہ کی شکل میں ظاہر ہوا۔

غرض، دل جوئی اور فرض شناسی کی مشترکہ قربان گاہ پر یہ سب قربانیاں ذاکر صاحب کو چڑھانی پڑیں۔ لیکن اُن کی یہ قربانیاں کبھی رائیگاں نہیں گئیں۔ دل جوئی اور فرض شناسی نے اپنے بھگت کو انعامات سے سرفراز کیا اور ان کے مرتبوں کو بلند سے بلند درجوں تک پہنچایا۔

جرمنی سے واپسی کے بعد جامعہ کے شیخ الجامعہ تو وہ ہو ہی گئے تھے۔ ان کی غیر حاضری میں جامعہ کو ختم کرنے کے منصوبے بنائے جانے لگے تھے۔ جو رہنما جامعہ کے قایم کرنے میں پیش پیش تھے وہ اب اس سے بیزار ہو چکے تھے اور کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار نہ تھے۔ حکیم اجمل خاں نے کچھ کرنا چاہا، لیکن ان کی زندگی نے وفا نہیں کی۔ ایسی صورت میں جامعہ کے چلانے کی ساری ذمہ داری ذاکر صاحب پر آن پڑی تھی۔

انھوں نے اپنے ان رفیقوں کی رہنمائی کی جو ہر قیمت پر اس کو چلانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ بیس سال کی خدمت ایک قلیل معاوضہ پر کرنے کا معاہدہ جن استادوں اور کارکنوں نے کیا ان کی ایک انجمن بنی اور جامعہ کو چلانے کا کام اسے سپرد کیا گیا۔ جامعہ کے کاموں کی نئی تشکیل کی گئی۔ اقامتی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کو نسبتاً زیادہ اہمیت دی گئی کیونکہ حکومت کی طرف سے اس کی مخالفت کا کم اندیشہ نظر آیا۔ اس کے لیے نئی تعلیمی تحریکوں کا مطالعہ کیا گیا اور نئی تعلیم کے تجربوں کے سلسلے کا آغاز کیا گیا جس کی وجہ سے جامعہ نے تمام ملک میں شہرت اور نیک نامی حاصل کرلی اور اس کا اعتبار اور وقار قایم ہوا۔ اُردو اکادمی اور مکتبہ جامعہ کی نئی تنظیم کی گئی۔ کتابوں اور رسالوں کی طباعت اور اشاعت کا خاص اہتمام کیا گیا اور اس شعبہ نے ملک کے ادبی اور علمی حلقوں میں ایک امتیازی مقام حاصل کرلیا۔

ذاتی طور پر بھی ادبی اور علمی حلقوں میں ذاکر صاحب نے اپنے لیے ایک اونچا مقام حاصل کیا۔ معاشیات کے ماہر کی حیثیت سے ان کا مقالہ "معاشیات مقصد و منہاج" جسے ہندوستانی اکادمی الہ آباد میں پڑھا گیا علمیت اور ادبیت کا ایک بہترین شاہکار ہے اور باوجود ۲۷ سال گذر جانے کے اب تک اپنے میدان میں ایک منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ ان کی کتاب "کیپٹلیزم" نے جو دہلی یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات اس کا کا بھائی پریم چند میموریل لکچرز کے سلسلے میں تصنیف کی گئی تھی انگریزی زبان جاننے والوں کا تعارف جرمن ماہر معاشیات زومبارٹ کے معاشی خیالات سے، ایسے جامع اور ہمہ گیر طریقہ پر اصل جرمن ماخذوں سے براہ راست استفادہ کرکے کرایا جیسا اس سے پہلے انگریزی زبان میں کبھی نہیں کیا گیا تھا۔ ان کے اردو ترجموں میں افلاطون کی "ریاست" فریڈرک لسٹ کی "معاشیات قومی" ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ تعلیمات کے میدان میں ان کے خطبے اور مضامین کلاسیکل حیثیت رکھتے ہیں۔ ریڈیو پر ان کی بہت سی نہایت اعلیٰ معیار کی تقریریں ہوئیں اور رسالہ جامعہ میں معاشی اور بین الاقوامی سیاسی مسایل پر ان کے معرکتہ الآرا تبصرے شایع ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے بچوں کے لیے کہانیاں بھی اپنی جگہ ایک نادر حیثیت کی مالک ہیں۔

ان علمی اور ادبی کارناموں کے علاوہ ان کے انتظامی، اصلاحی، اور تعمیری کاموں میں اوکھلا میں جامعہ ملیہ کی مختلف شاندار عمارتوں اور جامعہ نگر کی بستی کی تعمیر کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ جامعہ کے شعبہ تعلیم و ترقی اور شعبہ ہمدردان جامعہ کے قیام و ترقی میں ذاکر صاحب کے مشوروں اور حوصلہ افزائی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ وردھا تعلیمی سنگھ کے صدر کی حیثیت سے بنیادی قومی تعلیم کا نصاب بنانے اور بعد میں جامعہ ملیہ میں "استادوں کا مدرسہ" قایم کرنے اور اس کے لیے ایک علیحدہ شاندار عمارت تعمیر کرانے میں ذاکر صاحب کا زبردست ہاتھ رہا ہے جس شان و شوکت سے جامعہ ملیہ کی سلور جبلی منائی گئی اور اس سلسلے میں لاکھوں روپے کا چندہ جمع کرکے جامعہ کی تعلیمی عمارتیں اور اسٹاف کوارٹرز وغیرہ بنائے گئے۔ وہ بھی ذاکر صاحب ہی کا زبردست کارنامہ سمجھے

جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا اور ایک ہی اسٹیج پر ملک کی شدید ترین مخالف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو خانہ جنگی کے ایک نہایت تاریک دور میں جمع کیا گیا وہ بھی ذاکر صاحب کا ایک اعجازی کارنامہ ہے۔

پھر تقسیمِ ملک کے زمانے میں جامعہ کو اور دہلی والوں کو تباہی سے بچانے اور ان کو پناہ دینے اور راحت پہنچانے میں ذاکر صاحب نے اپنی صحت کے باوجود جو نمایاں کام انجام دیے وہ اپنی جگہ بے نظیر ہیں۔

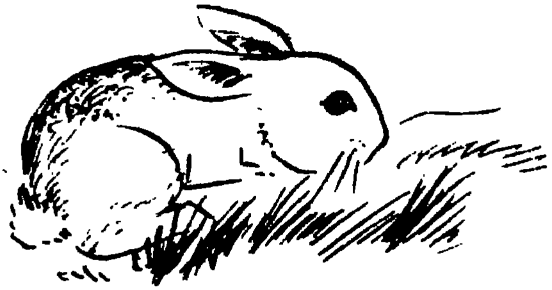
اس کے بعد ذاکر صاحب حکومتِ ہند کی درخواست پر ۱۹۴۸ء میں جامعہ سے باہر نکلے اور اپنی پرانی مادر علمی مسلم یونی ورسٹی علی گڈھ کی خدمت پر کمربستہ ہوگئے اور اُسے نہ صرف اس آزمایش کے دور سے زندہ اور سلامت نکال لائے بلکہ اس کی ترقی اور عروج کے لیے اور نئی تعمیر کے لیے انھوں نے ایسی ایسی نئی راہیں تلاش کیں اور ان کو عملی جامہ پہنایا جس کی وجہ سے اس یونی ورسٹی کا اب ملک کی ترقی پذیر یونی ورسٹیوں میں شمار کیا جانے لگا ہے۔

اسی زمانے میں ذاکر صاحب راجیہ سبھا کے ممبر بنے۔ مسلم یونی ورسٹی میں وائس چانسلری کی دوسری ٹرم ختم ہونے سے پہلے ہی انھوں نے اپنے عہدہ سے استعفے دے دیا۔ وہ آرام کرنا چاہتے تھے لیکن حکومتِ ہند نے یونسکو میں ان کو ہندوستان کا نمائندہ مقرر کیا۔ ان کو درجہ بدرجہ پدم وبھوشن اور بھارت رتن کے خطابات دیے گئے۔

پھر بہار کے گورنر بنا دیے گئے۔ اس کے بعد نائب صدر جمہوریۂ ہند اور راجیہ سبھا کے صدر بنے اور سب سے آخر میں صدر جمہوریہ ہند کی حیثیت سے ان کا انتخاب ہوا اور اس اعلیٰ ذمہ داری کو جس شان اور خوبی سے انھوں نے نبھایا وہ اپنی جگہ زندگی اور موت دونوں حیثیتوں میں ایک نادر مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔

لیکن ذاکر صاحب کی دل جوئی اور فرض شناسی کی امتیازی خصوصیتیں ان کی زندگی کی ہر منزل اور مقام پر سرگرم عمل رہیں اور ذاکر صاحب سے قربانیوں کا مطالبہ کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی جان کی آخری بھینٹ ان دونوں کو چڑھا دی۔

جناب جمشید اشرف



خرگوش

ایک لومڑی نے اپنے باغ میں مٹر بو رکھی تھی۔ اس کا ایک پڑوسی تھا خرگوش۔ یہ خرگوش بہت چالاک تھا وہ لومڑی کے کھیت کی مٹر بڑی استادی سے چرا چرا کر اپنے گھر میں جمع کرتا رہتا تھا۔ آخر کار لومڑی تنگ آگئی اور اس خرگوش کو پکڑنے کی ترکیب سوچنے لگی

خرگوش کے بل کے پاس ہی ایک پیڑ تھا لومڑی نے اس پیڑ کی شاخوں کو بل کی طرف جھکا کر باندھ دیا۔ اور رسی کا پھندا لگا دیا۔ یہ سب کام اس نے بڑی ہوشیاری سے کیا۔ خرگوش کو پتہ بھی نہ چلا۔ پھر لومڑی نے اس پھندے میں ایک لکڑی باندھ دی یہ خرگوش کے بل کے پاس لٹک گئی۔ اب پھندا بالکل تیار ہو گیا تھا۔

دوسرے دن خرگوش نے اپنے مکان سے جھانکا اور لکڑی کو دروازے کے پاس لٹکا ہوا دیکھ کر اسے ہلانے لگا۔ بس پھر کیا تھا پھندا لکڑی سے نکل کر خرگوش کی پچھلی ٹانگوں میں پڑ گیا، پھندے کا پڑنا تھا کہ پیڑ کی بندھی ہوئی شاخیں کھل گئیں اور خرگوش میاں بڑے مزے میں اٹھتے چلے گئے۔ بالکل بندروں کے انداز سے لٹک رہے تھے اور دل میں سوچ رہے تھے کہ آج تو بی لومڑی استادی کر گئیں۔ اُوں ہونہو! انھوں نے سر کو جھٹکا اور نکل بھاگنے کی ترکیب سوچنے لگے۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک ریچھ جھومتا جھامتا اسی طرف چلا آرہا تھا۔ ریچھ خرگوش کو اس طرح لٹکتے دیکھ کر حیرت سے بولا:-

"ارے ارے خیریت تو ہے! یہ پچھلی دو ٹانگوں پر لٹکے ہوئے کیا کر رہے ہو بھائی" خرگوش نے بڑی ہی بیزاری سے کہا۔

"کام کرنے دو بھئی پریشان نہ کرو"

"پر خرگوش میاں یہ کس قسم کا کام ہے" ریچھ حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"چچا مزے ہی مزے ہیں۔ ایک منٹ میں ایک روپیہ ملتا ہے" خرگوش بولا۔

"کیا کہہ رہے ہو! ایک منٹ میں ایک روپیہ" ریچھ کی دلچسپی بڑھتی گئی۔

"ہاں ہاں چچا! میں سمجھاتا ہوں آپ کو" خرگوش نے کہنا شروع کیا۔

"دیکھو چچا بات یہ ہے کہ میں بی لومڑی کے کھیت کی رکھوالی کر رہا ہوں تاکہ کوّے وغیرہ مٹر کو ضایع نہ کریں اور بی لومڑی مجھے رکھوالی کا فی منٹ ایک روپیہ دیتی ہیں میرے

پاس تو اس سے بھی اچھے کام ہیں کرنے کو، یہ تو میں صرف پڑوسی ہونے کا حق ادا کر رہا ہوں۔ تم آج کل خالی ہو تو بتاؤ میری جگہ آ جاؤ۔"

ریچھ کی تو ایک منٹ میں ایک روپیہ کا نام سنتے ہی باچھیں کھل گئیں۔ بولا۔

"ہاں ہاں بال بچوں کا ساتھ ہے اگر مجھے بھی لگا لو اس نوکری پر تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

"ارے چھوڑو چچا مہربانی کی اس میں کیا بات ہے۔ ہر جاندار ایک دوسرے کے کام آتا ہے۔ اچھا تو ایسے آ جاؤ اس راستے سے، ہاں ذرا یہ پیر نیچے کرو تو میں کود دوں یہ بات۔ اچھا اب تم آ جاؤ بس ٹھیک ہے۔"

اور پھر خرگوش یہ جا وہ جا۔ اب ریچھ میاں لٹکے ہوئے تھے خرگوش کی جگہ۔ تھوڑی دیر بعد ریچھ نے دیکھا کہ لومڑی ہانپتی کانپتی ایک موٹی سی لکڑی گھسیٹتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ بس اس نے جلدی جلدی کوؤں کو ہنکانا شروع کر دیا۔

لومڑی قریب آئی اور حیرت سے ریچھ کو دیکھنے لگی کیوں کہ اس کے خیال میں تو خرگوش مرچ چرایا کرتا تھا۔ اس بڈھے ریچھ کو دیکھ کر وہ آگ بگولا ہو گئی غصے سے بولی۔

"کم بخت بڈھے تو ہی میری مرچ چرا کر لے جاتا تھا۔ اب دیکھ تجھے کیسا مزا چکھاتی ہوں۔ بڑھاپے میں چوری کرتا ہے شرم نہیں آتی۔" ریچھ گھبرا گیا جلدی سے بولا "ارے خالہ میں تو رکھوالی کر رہا تھا" مگر لومڑی نے اس کو اس زور کا دھکا دیا کہ میاں کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ لنگڑاتے ہوئے اور خرگوش کو کوستے ہوئے اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔



اسی شریر خرگوش کا دوسرا قصہ سنیے: ایک دن صبح صبح اٹھ بیٹھا اور لگا شرارتیں کرنے۔ لومڑی بھی صبح تڑکے اٹھ بیٹھی اور سوچا کہ چلو دیکھیں یہ شریر کیا کر رہا ہے۔ ویسے بھی وہ خرگوش کو نیچا دکھانے کی فکر میں رہتی تھی اس لیے چھپ چھپ کر دیکھتی رہی خرگوش مزے سے گھاس پر کھیل کود رہا تھا۔ کھیلتے کھیلتے خرگوش نے جو سامنے نظر ڈالی تو ایک گھوڑا لیٹا ہوا دیکھا۔ اس نے سوچا "شاید مر گیا ہے بے چارہ" مگر اسی وقت گھوڑے نے اپنی دم ہلانا شروع کر دی۔ "اوہو! یہ حضرت تو زندہ سلامت ہیں۔" اس نے اپنے دل میں سوچا "کس مزے سے سو رہے ہیں جیسے اپنے گھر میں لیٹے ہوں۔" پھر یہ چپکے چپکے وہاں سے کھسکنے لگے اتفاق سے لومڑی پر نظر پڑ گئی۔ اس نے بڑی محبت سے لومڑی سے کہا۔

"اوہو! بی لومڑی۔ السلام علیکم۔ آئیے آئیے بھئی ہم دونوں اب دوست ہیں۔ پرانی باتوں کو بھول جائیے اور

پھر صبح صبح ناراضگی کیسی! ہم نے تو آپ کے لیے ایک موٹا تازہ شکار ڈھونڈھا ہے آپ کے لیے تو یہ پوری گرمیوں کام آئے گا۔ مزے سے کھاتی رہنا۔"

اور صاحب یہ شریر اس طرح لومڑی کو بہلا پھسلا کر گھوڑے کے پاس لے آیا۔ "دیکھی کیا ہو" اس نے کہا "بانده لو پکڑ کے بھاگنے گا نکھوڑا ہی اور پھر اس کو تو اپنا ہی مال سمجھو"

"مگر بھئی یہ اتنا۔۔ موٹا بھلا میں کیسے باندھوں گی" لومڑی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"لاحول ولاقوة" خرگوش حقارت سے بولا "میں اگر تمھاری جگہ ہوتا تو دکھاتا تم کو منٹوں میں باندھ کر پھینک دیتا جانتی ہو کیسے؟ اُدھر تم کیا جانو خیر سنو اس کی دم سے اپنے کو باندھ کر پڑ جاتا اور پھر کہتا اس سے اب اٹھو بیٹا کیسے اٹھتے ہو" اور جب وہ اٹھتا تو اس طرح اس کو بٹھا دیتا جیسے۔۔۔۔ کیا بتاؤں کسی مکھی کو بٹھا دیتا ہوں۔"

لومڑی کا اندر سے تو برا حال تھا مگر بات چونکہ ذرا ایسی آگئی تھی کہ خرگوش پر رعب پڑ جاتا اس لیے اس نے اللہ کا نام لے کر خود کو گھوڑے کی دم سے اچھی طرح باندھنا شروع کر دیا۔

گھوڑا مزے سے سو رہا تھا اور ابھی اس کا اٹھنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا مگر اپنی دم کے ساتھ اس قسم کی زیادتی برداشت نہ کر سکا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور پھر ابھی سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ دم کو اچانک کیا ہو گیا اور دم اتنی بھاری کیوں ہو گئی ہے۔

جلدی جلدی دم کو چار پانچ زوردار جھٹکے دیے لومڑی کے ہوش و حواس گم خرگوش نے جو دیکھا تو اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولا۔ "سوچتی کیا ہو پچھاڑ دو۔"

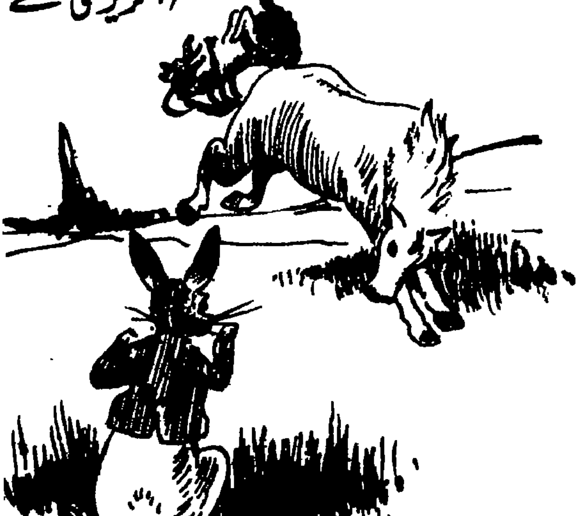
گھوڑا یہ سنتے ہی گھبرا گیا کہ نہ جانے کون سا زبردست جانور میری دم سے چمٹ گیا ہے اور لگا اپنی دم زور زور سے ہلانے۔

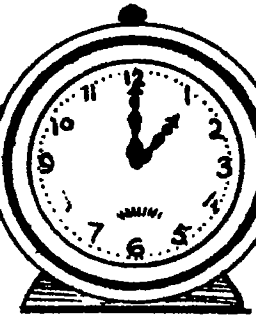
اور آخر کار لومڑی کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ہوا میں اُڑی چلی جا رہی ہے۔ اچانک کسی چیز سے ٹکرا، تمام جسم میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ آنکھیں بند۔ وہ یہ سوچ رہی تھی کہ میں مر چکی ہوں۔

ڈرتے ڈرتے اس نے آنکھیں کھولیں مگر۔ کیسے؟ گھوڑا اپنی دم کا معائنہ کر رہا تھا اور وہ ایک کانٹوں والی جھاڑی کے اوپر پڑی ہوئی تھی کچھ ہی دور پر خرگوش کھڑا ہنس رہا تھا۔

یہ نیم مردہ حالت میں لنگڑاتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔ بے چاری میں خرگوش سے بدلہ لینے کی ہمت نہیں تھی۔

(انگریزی سے)





خواجہ سید معین الدین صاحب، ایم اے بی ایڈ

وقت

(ننھے پیامیوں کے لیے)

تم نے اپنے بڑوں کو اکثر کہتے سنا ہوگا "ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔" کام تو تم جانتے ہی ہو جیسے لکھنا پڑھنا، کھیتی باڑی کرنا، دوکان چلانا، مشین چلانا۔ یہ سب کام ہیں، مگر وقت کیا ہے؟

وقت ایک عجیب چیز ہے۔ نہ اس کی شکل ہے نہ صورت، نہ اس کا کوئی رنگ ہے نہ روپ، اس کو نہ کوئی دیکھ سکتا ہے نہ پکڑ سکتا ہے مگر یہ چپ چاپ کھسک جاتا ہے یا ایسے ہی چلا جاتا ہے جیسے دریا کا پانی۔ جاکر پھر لوٹتا نہیں۔ اسی لیے تو کہتے ہیں "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔"

اچھے بچے وقت کو قابو میں رکھتے ہیں۔ وقت پر مدرسے جاتے ہیں، وقت پر پڑھتے لکھتے ہیں، وقت پر کھیلتے ہیں، وقت پر کھاتے ہیں اور وقت پر سوتے ہیں۔ "کام کے وقت کام اور کھیل کے وقت کھیل" ان کا طریقہ ہوتا ہے۔ وہی بچے کامیاب ہوتے ہیں جو وقت کو کام میں لاتے ہیں۔ بیکار آدمی کا وقت کاٹے نہیں کٹتا، وہ ہمیشہ سست اور کاہل دکھائی دیتا ہے دن رات مصیبت بھرتا رہتا ہے۔ محنتی آدمی کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کا وقت کس طرح کٹ گیا۔ وہ ہمیشہ ہنستا بولتا رہتا ہے۔

وقت کی پہچان سورج، چاند اور تاروں کے نکلنے اور ڈوبنے سے ہوتی ہے، سورج نکلتا ہے تو دن شروع ہوتا ہے ڈوبتا ہے تو رات آتی ہے۔ ان کی مدد سے دن میں محنت مزدوری اور کھیتی باڑی کرنے والے اور راتوں میں سمندر یا خشکی پر سفر کرنے والے وقت کو پہچانتے ہیں۔

گھڑی کی مدد سے تو وقت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ گھڑی کو دیکھ کر ہی سکنڈ، منٹ اور گھنٹے پہچانتے ہیں، سکنڈ، منٹ اور گھنٹے وقت کے چھوٹے چھوٹے حصے ہیں۔ وقت کے بڑے حصے دن، رات، ہفتہ، مہینہ اور سال ہیں جس طرح ساٹھ سکنڈ کا ایک منٹ اور ساٹھ منٹ کا ایک گھنٹہ ہوتا ہے اسی طرح سات دن کا ایک ہفتہ، چار ہفتوں کا ایک مہینہ اور بارہ مہینوں کا ایک سال ہوتا ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ چوبیس گھنٹوں کے ایک دن اور رات ہوتے ہیں۔

وقت ایک دولت ہے جس کے ہاتھ لگ گئی اس کی قسمت کے کیا کہنے۔ وہ ایک انمول خزانہ ہے جس نے اس کو اچھی طرح صرف کیا وہ ہمیشہ بامراد اور شاد کام رہا اور جس نے گنوایا وہ عمر بھر پچھتایا اور روتا رہا۔ اس لیے اس کو گنوانا نہیں چاہیے ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر کرو اور ہر کام وقت پر کرو۔ تیز چلتی ہوئی ہوائیں تھم سکتی ہیں، دوڑتی ہوئی گاڑی ٹھہر سکتی ہے، بہتا ہوا پانی رُک سکتا ہے لیکن وقت کا دھارا کسی کے روکے نہیں رُکتا۔ اس لیے اس کی قدر ہونی چاہیے۔

کوتاہیوں کا احساس

ونوبھاوے کا نام تو آپ نے سنا ہوگا مہاتما گاندھی کے خاص شاگردوں اور چیلوں میں ان کا شمار ہے۔ انھوں نے گاندھی جی کی اچھی باتوں کو پھیلانے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔

ونوبھاوے جی نے قرآن شریف کا انتخاب روح القرآن کے نام سے شائع کیا تھا۔ ونوباجی کے ساتھیوں کی خواہش ہوئی کہ ذاکر صاحب اس پر مقدمہ لکھیں۔ احد فاطمی صاحب (ایڈیٹر بھودان تحریک) نے ذاکر صاحب سے مقدمہ لکھنے کی خواہش کی اس سلسلے میں دو خط بھی لکھے یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ ذاکر صاحب اس وقت بہار کے گورنر تھے۔ ۲۴ فروری ۶۲ کو ذاکر صاحب نے ان خطوں کے جواب میں لکھا۔

راج بھون، پٹنہ

۲۴-۲-۶۲

مکرمی جناب فاطمی صاحب!

السلام علیکم

دونوں نوازش نامے ملے۔ یاد فرمائی کا شکریہ اور تاخیرِ جواب کی معذرت قبول فرمایئے۔ میں نے ونوباجی کا انتخاب قرآن مجید غور سے دیکھا۔ بہت اچھا ہے۔ اس سے مسلم اور غیر مسلم، سب قرآن کی تعلیم کو آسانی سے سمجھ سکیں گے۔ خدا ان کی سعی مشکور فرمائے۔

مقدمہ یا پیش لفظ لکھنے کی بہت کوشش کی مگر کچھ نہ بن سکا۔ رہ رہ کر یہ خیال کہ تعلیماتِ قرآنی کی تعمیل میں کیا کیا کوتاہیاں مجھ سے سرزد ہوتی ہیں اور اپنی زندگی اس نقشے سے کتنی دور ہے جو قرآن چاہتا ہے، کچھ لکھنے کی ہمت نہیں کرنے دیتا۔ کسی دوسرے کو اپنی اس کیفیت کا سمجھانا دشوار ہے۔ مگر یقین فرمایئے کہ سچ ہے اور باوجود کوشش کے اس نے کچھ نہ لکھنے دیا۔ امید کہ آپ میری مجبوری کو سمجھیں گے اور مجھے معاف فرمادیں گے۔

اگر بات ونوباتک پہنچ چکی ہے تو ان سے بھی معاف کرادیں گے۔ میرے دل میں ان کا جو احترام ہے اسے بآسانی الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ مسودے رجسٹرڈ ڈاک سے بیمہ کرکے واپس کرتا ہوں۔

مخلص

ذاکر حسین

اپنے عیبوں پر نظر رکھنا، اپنی کوتاہیوں کا احساس اور پھر اس کا یوں کھلم کھلا اعتراف مرحوم ذاکر صاحب جیسی بڑی ہستیوں سے ہی ممکن ہے۔

یہ خط ۱۶ مئی کے بھودان تحریک اخبار بنارس سے نقل کیا گیا

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدّت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ پیامِ تعلیم سال بھر تک آپ کے پاس آتا رہا ہے۔ اس کے دل چسپ مضمون اور مزیدار کہانیاں آپ کو پسند آئی ہوں گی۔ ہمیں امید ہے کہ آپ نہ صرف اس کے خریدار بنے رہیں گے بلکہ اپنے دوستوں کو بھی خریدار بنائیں گے۔ اس لیے ۲۵ر اگست تک آپ سالانہ چندہ ۶ روپے مینیجر صاحب پیامِ تعلیم کے نام بھیج دیجیے۔ آپ کا خریداری نمبر .... ہے اگر آپ نے ۲۵ر اگست تک منی آرڈر نہیں بھیجا تو آپ کا نام خریداری سے خارج ہو جائے گا۔

کے وقت لگوا بن کر انھیں کھیل کھلانا یہ سب باتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ ہنستے بھی بہت تھے کبھی کبھی ہنستے ہنستے آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اور کبھی کبھی اتنے قہقہے لگاتے کہ بے ساختگی میں پیچھے کی طرف جھک جاتے۔

گانے کا یا موسیقی کا شوق:۔ بچپن میں لینن کو گانے کا شوق تھا۔ ان کی ماں نے سُر تال وغیرہ کی ابتدائی مشق کرادی تھی اور بچوں کے لیے کچھ آسان گیت یاد کرادیے تھے لینن کو ایسے نغمے ایسی نظمیں جن میں غم والم، مایوسی اور ناامیدی ظاہر کی گئی ہو سخت ناپسند تھیں۔ ہاں ایسے گیت جن میں ولولہ اُمنگ ہو، بہادری کے کارنامے ہوں دل سے پسند تھے مثلاً سمندر کا یہ گیت وہ بہت شوق سے گاتے تھے۔

"لیکن لہریں وہاں لے جائیں گی۔
صرف ان کو جن کا جذبہ طاقت ور ہے
بھائیو، بہادری کے ساتھ!
طوفان زوروں پر ہے!!
اس لیے مضبوطی سے اور بہادری سے آگے بڑھو۔"

پرندوں کا شوق:۔ ان دنوں روس میں ایک دلچسپ رواج تھا۔ بہار کے موسم میں قیدی پنچھیوں کو پنجرے کا دروازہ کھول کر آزاد کردیا جاتا تھا۔ بچپن میں لینن کو یہ بات بہت ہی اچھی لگتی تھی۔ اپنی امی سے پیسے مانگ مانگ کر ایسے قیدی پرندوں کو خرید کر آزاد کردیتے تھے۔

بچپن میں انہیں پرندوں کو پکڑنے کا شوق بھی تھا اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے انھیں پکڑنے کے لیے جال بھی لگاتے تھے۔ ایک بار لینیٹ (LINNET) نام کی چڑیا ان کے ہاتھ لگ گئی نہ جانے انھوں نے خریدی تھی کسی نے تحفے میں دی تھی یا اسے خود جال سے پکڑا تھا۔ پر وہ زیادہ نہ جی پائی۔ برابر دُبلی اور کم زور ہوتی گئی۔ اور ایک دن ختم ہوگئی۔

لینن پر اس کا بہت اثر ہوا اور طے کرلیا کہ آئندہ کبھی کسی پرندے کو پنجرے میں قید نہ کریں گے مچھلی کے شکار کا شوق بھی تھا۔ بڑی عمر کو پہنچ کر اسے بھی چھوڑ دیا۔

اسکول کی تعلیم کے زمانے میں ان کا فرصت کا وقت کتابیں پڑھنے میں چہل قدمی میں۔ دوڑ لگانے میں، سردیوں میں اسکیٹنگ کرنے میں اور گرمیوں میں تیرنے میں گذرتا تھا۔ ایڈونیچرس کہانیوں سے انھیں دلچسپی نہ تھی، ہاں گوگول اور بعد میں ترگنیف کی کتابیں شوق سے پڑھتے تھے۔ بار بار پڑھتے تھے۔

اسکول میں انھیں لیٹن (لاتینی زبان) تاریخ، جغرافیہ اور ادب سے خاص دلچسپی تھی۔ مضمون بہت اچھا لکھتے تھے۔ مضمون لکھتے وقت اپنی نصابی یا درسی کتابوں کو اور استاد کی باتوں کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ لائبریری سے کتابیں لاکر پڑھتے تھے۔ ان کا مضمون بہت گٹھا ہوا ہوتا تھا مضمون کے تھیم یا مقصد کو بڑے اچھے ڈھنگ سے بہت سلیقے سے ادبی انداز میں پیش کرتے تھے۔ ان کے ادب کے استاد ہمیشہ ان کی تعریف کرتے تھے۔ انھیں سب سے زیادہ نمبر دیتے تھے۔

اپنے درجے کے ساتھیوں کے ساتھ

اپنے درجے کے ساتھیوں کے ساتھ لینن کا برتاؤ محبت دوستی اور خلوص کا تھا۔ وہ ان کی ہر مدد کو ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ان کے ترجمے ٹھیک کرتے تھے ان کے مضمونوں میں اصلاح دیتے تھے۔ کبھی کبھی مضمون لکھنے میں بھی مدد

کرتے تھے۔ ان کی دلی خواہش ہوتی کہ ان کے ساتھی مضمون لکھنے میں اچھے نمبر حاصل کریں اور کسی کو یہ پتہ بھی نہ چلے کہ کس نے ان کی مدد کی ہے۔

اسکول کے وقفے میں وہ اپنے ساتھیوں کو مشکل مشکل باتیں سمجھاتے تھے۔ اپنے بڑے بھائی ساشا کی طرح وہ آدھا گھنٹہ پہلے مدرسے آجاتے تھے اور اپنے ساتھیوں کے لیے لاطینی اور گریک زبانوں کی مشکل عبارتوں کا ترجمہ کر دیتے تھے یا ریاضی اور جبر و مقابلہ کا کوئی پے چیدہ مسئلہ حل کرنے میں مدد دیتے تھے۔

لینن ابھی سولہ(۱۶) برس کے تھے کہ اس خوش و خرم اور خوش حال گھرانے پر پہاڑ ٹوٹ پڑا لینن کے باپ کا اچانک انتقال ہو گیا (۱۸۸۶ء)، بڑے بھائی ساشا اس وقت پیٹرس برگ میں تھے۔ گھر میں سب سے بڑے یہی تھے۔ اور اور باوجود اپنی کم عمری کے نئی دشواریوں کا مقابلہ کرنے میں، انھیں جیسے تیسے حل کرنے میں نئی ذمہ داریوں کے سنبھالنے میں، اپنی سوگوار ماں کا پورا ہاتھ بٹایا۔

اس زمانے میں اس کنبے کی ایک دوست خاتون یہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ لاطینی زبان سیکھنا چاہتی تھیں لینن تو آپ جانئے یہ زبان اچھی طرح جانتے تھے۔ خاتون کا کہنا ہے کہ وہ بہت ہی اچھے استاد تھے۔ بہت دلچسپی سے پڑھاتے تھے اور سبق کو بہت دلچسپ بنا دیا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک اور صاحب تھے میٹرک پاس تھے۔ ریاضی کے بہت اچھے استاد تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ خدا نے ان کا دماغ ریاضی کے لیے بنایا تھا۔ وہ ریاضی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے مگر اس زمانے میں یونی ورسٹی میں داخلہ اسی وقت ہو سکتا تھا جب میٹرک کے سارے پرچوں کا امتحان دیا جائے۔ گریک اور لاطینی بھی اس میں شامل تھیں۔ اس بے چارے کے لیے بڑا مشکل کام تھا اس موقع پر لینن نے آگے بڑھ کر ان کی مدد کی۔ تمام مضمون پڑھائے اور دو سال میں امتحان دلا دیا۔ ماسٹر صاحب نے اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کی لینن نے یہ سب کچھ محض ہمدردی کے جذبے سے کیا ماسٹر صاحب سے معاوضے کا ایک پیسہ نہیں لیا۔

۱۸۸۷ء میں اس کنبے پر ایک اور پہاڑ ٹوٹا۔ لینن کے بہت ہی محبوب اور پیارے بھائی ساشا کو موت کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ انھوں نے زار روس کے قتل کی سازش میں حصّہ لیا تھا۔

لینن نے اس وقت جس صبر و ضبط سے کام لیا وہ اچنبھے میں ڈالنے والا ہے۔ اتنی بات ضرور ہوئی کہ اب وہ زیادہ سنجیدہ اور خاموش رہنے لگے، مگر اپنا تعلیمی کام اسی مستعدی، اسی محنت سے کرتے رہے۔

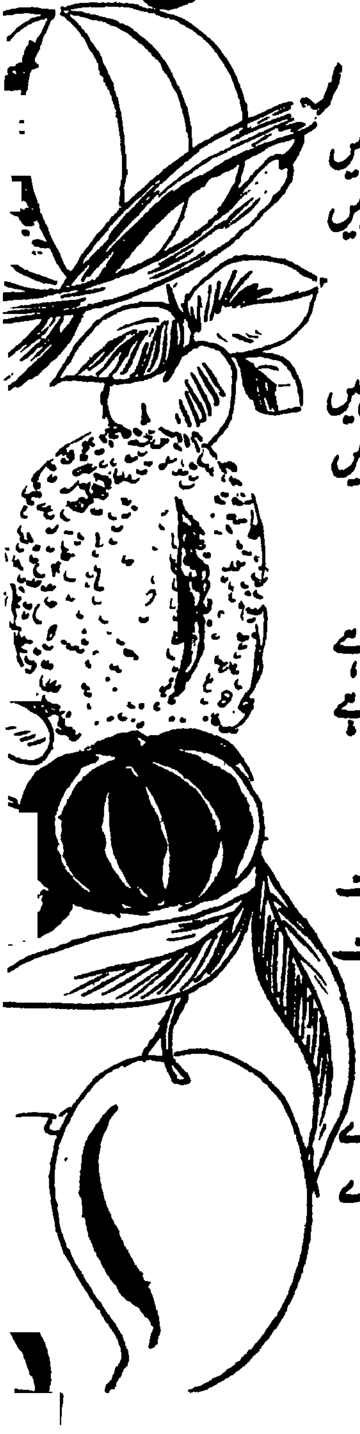
اپنے بڑے بھائی کی یہ بات لینن کے دل کو نہ لگی تعجب بھی تھا اور پھر حسرت بھی کہ کاش ان کے بڑے بھائی آزادی کی لڑائی کا صحیح راستہ اختیار کرتے۔ وہ کہا کرتے "یہ وہ راستہ نہیں ہے جو ہمیں اختیار کرنا ہے یہ صحیح راستہ نہیں ہے"

لینن بڑی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ خوب باتیں کرتے تھے۔ جذبات سے بھری ہوئی تقریریں کرتے تھے پر ان کی باتوں میں ان کی تقریروں میں ذرا بھی تصنع ذرا بھی بناوٹ نہ ہوتی تھی۔

چلنے پھرنے میں نہ زیادہ تیزی دکھاتے تھے نہ سستی۔ چلتے وقت ان کے ہاتھ بھی اس طرح نہ ہلتے تھے۔

عیسیٰ احمد صدیقی

محنت کے پھل



یہ بارش کا موسم جو پھل لے کے آیا
بڑے شوق سے جن کو ہم سب نے کھایا
مگر یہ نہ سوچا کہ یہ جتنے پھل ہیں
حقیقت میں یہ کس کی محنت کے پھل ہیں

یہ کہتا ہے تربوز کا خوں شدہ دل
کہ اس میں لہو ہے کسانوں کا شامل

یہ باریک باریک سی ککڑیاں ہیں
کہ کمزور دہقان کی پسلیاں ہیں

یہ ذرکی ہوئی پھوٹ کی خستگی ہے
کہ دہقاں کی مسلی ہوئی زندگی ہے

یہ خربوزہ جو اتنا میٹھا بنا ہے
کسانوں کی محنت کا امرت پیا ہے

یہ گنا بناتے ہیں ہم جس کی چینی
ہے اس نے بھی دہقان کی نیند چھینی

ان آموں کے اندر بھرا ہے جو امرت
ٹپکتی ہے ان سے بھی ان سب کی محنت

ہے جامُن کی ترشی میں بھی جو مٹھائی
وہ پھل بھی ہے محنت کشوں ہی کا بھائی

غرض سارے پھل، پھُوٹ، تربوز، کھیرے
سبھی ہیں کسانوں کی محنت کے ہیرے

بہے دھوپ میں وہ پسینے پسینے
تو حاصل ہوئے کھیت سے یہ نگینے

جناب محمد امین

(افریقہ کی لوک کہانی)

ازیزی اور جوجو جادوگر



مغربی افریقہ میں ایک ملک ہے غانا (یا گھانا) پرانے زمانے میں یہاں ایک جوان شکاری رہتا تھا یہ شکاری بہت بہادر بہت نڈر تھا۔ اسی زمانے میں یہاں ایک جادوگر رہتا تھا اس کا نام جوجو تھا۔ کہتے ہیں کہ جادو ٹونے میں بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ پر اس شکاری کی بات ہی اور تھی۔ اشنتی قبیلے کی اس سلسلے میں ایک کہانی ہے۔ بہت مزے دار کہانی۔

کلنکا جادو ٹونے کا ڈاکٹر یا ماہر تھا۔ اس کے جادو کو جوجو کہتے تھے اور پھر خود اس کا نام جوجو پڑ گیا اور سب ہی لوگ اس سے ڈرتے تھے۔ اسی گاؤں میں ایک شکاری بھی رہتا تھا۔ یہ بڑا خوبصورت جوان تھا وہ قبیلے کے سردار کی لڑکی کو بہت چاہتا تھا اس کا نام ازیزی تھا

کلنکا جو، جوجو کے نام سے مشہور تھا جادو دکھاتے وقت ایک لبادہ پہن لیتا تھا۔ اس لبادے میں سو جیبیں تھیں ہر جیب میں کوئی نہ کوئی کمال تھا۔ ان میں سانپ کے پھن تھے، چڑیوں اور پرندوں کی کھوپڑیاں، جادو کے پتھر اور مڑی تڑی ٹہنیاں تھیں غرض الم غلم سبھی چیزیں پڑی تھیں۔ اس کی پیٹی میں چیتے کی دم، کچھوے کی ہڈی، گھڑیال کا سوکھا جبڑا اور لکڑ بگھے کے دانت لٹکتے رہتے تھے۔ ظاہر ہے ایسے جوجو ڈاکٹر سے تو ڈر ہی لگتا ہوگا۔

ازیزی کے معنی ہیں "شیر کے" اور واقعی اس اشنتی شکاری کا نام بہت موزوں اور مناسب تھا۔ طاقت میں وہ کسی شیر سے کم نہیں تھا عمر میں ابھی وہ صرف ۱۸ سال کا تھا پھر بھی ہاتھی کو وہ کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ ازیزی اتنا طاقت ور تھا کہ بھاری سے بھاری آدمی کو اٹھا کر ہوا میں اوپر تک اچھال دیتا تھا۔ چیتے کی دم پکڑ کر اٹھا لیتا اور پھر اسے گھما دیتا۔ ایک بار گوریلا سے اس کا مقابلہ ہوا [illegible] وہ گوریلا بڑا [illegible] طاقت ور۔ لیکن آخر میں جیت ازیزی کی ہوئی۔ اشنتی کے آس پاس گاؤں میں واقعی کوئی اتنا مضبوط اور بہادر نہیں تھا جتنا ازیزی۔

قبیلے کی سردار کی لڑکی کا نام علیزا تھا۔ وہ حسن کی دیوی تھی۔ اور نوجوان شکاری کی محبت میں گرفتار ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ وہ بھی دل سے اسے اپنی دلہن بنانا چاہتا تھا۔ علیزا کی آنکھیں بڑی اور کٹورے کے مانند تھیں۔ گویا ہرن کی آنکھیں ہوں اس کا جسم بھی سڈول تھا آواز بھی سریلی تھی۔

اس گاؤں اور آس پاس کے کئی گاؤوں میں بیسیوں نوجوان چاہتے تھے کہ کاش علیزا کی شادی ان سے ہو جائے۔ علیزا کو ایک آدمی سے بڑی چڑ تھی۔ اس کا نام گوڈو تھا اس کی عمر زیادہ تھی یوں کہو کہ ادھیڑ تھا۔ پھر بہت بھدا کچھ بدمعاش اور شاطر بھی تھا لیکن اس کے پاس بڑی دولت تھی، گائیں اور بھیڑوں کی بھرمار تھی۔ اتنا خوش حال تھا کہ کسی لڑکی سے شادی کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تحفے تحائف دے سکتا تھا۔

"میں تم کو بیس گائیں دوں گا اگر تم مجھ کو علیزا دے دو گے۔" اس نے علیزا کے باپ سے کہا۔ "اس کے علاوہ سو جوڑے کپڑے بھی دوں گا اور بھیڑیں تو منہ مانگی دوں گا۔"

واقعی یہ تو منہ مانگے دام مل رہے تھے لیکن سردار نیک ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی لڑکی کو بھی بہت پیار کرتا تھا۔ اس نے کہا۔

"علیزا خود طے کرے گی۔ میری لڑکی صرف اس آدمی سے شادی کرے گی جس کے ساتھ وہ ہنسی خوشی رہ سکے۔"

اب گوڈو کو فکر لاحق ہو گئی۔ وہ فوراً علیزا کی تلاش میں نکل پڑا۔

"علیزا! مجھ سے شادی کر لو۔ میں تم کو اپنی سب سے

ری بیوی بناؤں گا۔ تم کو خالص سونے کے بازوبند دوں گا، اور ہڑے جتنے کہو گی میں لادوں گا پھر تم اپنی مرضی سے جتنے چاہنا پنی پسند کے جوڑے بنوا لینا۔"

"تم تو میری بڑی عزت کر رہے ہو، میں بھلا اس کے ابل کہاں۔" علیزا نے شرافت سے جواب دیا۔ "لیکن اصل بات ہے کہ میں تم کو پسند نہیں کرتی میں تو پہلے ہی اپنا شوہر ڈھونڈ چکی ہوں، اور اس کا نام عزیزی ہے۔"

گولو کو غصہ آگیا۔ دولت میں اس کا اور عزیزی کا بھلا کیا مقابلہ۔ لیکن شکاری جوان تھا بہت مضبوط اور طاقت ور تھا اور ظاہر ہے گولو کے لیے اس سے لڑنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

پھر بھی گولو نے ہمت نہیں ہاری۔ علیزا سے وہ بار بار ہا رہا کہ وہ اپنا ارادہ بدل دے۔ جہاں کہیں وہ جاتی گولو اس کے پیچھے پیچھے لگا رہتا۔ اگر وہ پانی بھرنے جاتی تو وہ کنویں پر پہلے سے موجود رہتا۔ اُسے دیکھ کر گھبراہٹ میں وہ پریشان ہو جاتی۔

"علیزا مجھ سے شادی کر لو۔" بار بار یہی سوال اس کے کانوں میں گونجتا اور وہ بھی بے خوف ہو کر جواب دیتی:۔

"نہیں تم کو تو میں کبھی منہ بھی نہ لگاؤں گی۔ میں تو بس عزیزی کی بیوی بنوں گی۔"

"عزیزی کے پاس اتنی دولت کہاں۔" گولو کہتا

"لیکن دیکھا نہیں تم نے عزیزی کتنی بلا کا شکاری ہے۔" علیزا کی آنکھیں چمک اٹھتیں جب وہ اپنے چہیتے کی تعریف کرتی "اس وقت بھی عزیزی ہاتھیوں کا شکار کھیلنے گیا ہوا ہے وہ شکار کر کے ہاتھی دانت لائے گا اور پھر وہ بھی امیر بن جائے گا اور اس طرح میرا باپ مجھے اس کی دلہن بننے کے لیے اجازت دے دے گا۔"

لیکن گولو بھی اپنی ضد پر اڑا رہا۔ موقع دیکھ کر ایک دن زبردستی اس نے لڑکی کو اٹھا کر اپنی جھونپڑی میں لے جانے کی کوشش کی۔ لڑکی نے ہاتھ پیر چلا کر اُس کا منہ نوچ لیا زور زور سے چیخنے چلانے لگی اتنے میں اس کی سکھیاں آگئیں اور اُسے گولو کی گرفت سے چھڑا لیا۔ اسی دوران میں وہاں بھیڑ جمع ہوگئی وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ "گولو! تم نے بہت کمینی حرکت کی ہے اپنے کیے پر پچھتاؤ گے اس نے کہا کہ وہ عزیزی کو بتائے گی اور پھر وہ تم سے سمجھے گا۔"

وہ گولو کو محض دھمکانا چاہتی تھی۔ لیکن گولو نے اس کا مطلب کچھ اور ہی لیا۔ دوسرے دن سے اس نے کہنا شروع کر دیا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ شاید وہ بیمار ہو گیا تھا یا یہ کہ جان بوجھ کر اس نے یہ چال چلی تھی اور لڑکی کو اس میں پھنسانا چاہتا تھا۔

گولو نے کلنکا کو بلا بھیجا، اسی جادو ٹونے والے ڈاکٹر کو اور اس نے کلنکا سے کہا اس کی طبیعت خراب ہے۔ اپنا جادو جوجو کی پٹی استعمال کرے اور اس کی بیماری کو بھگا دے۔

سانپ کی کھال اور کھوپڑیوں کی ٹوپی پہن کر اور اپنی جوجو کی پٹی لگا کر تنتر جادو منتر سمیت کلنکا گولو کے گھر آیا۔ اس کے دو چیلے بھی اس کے ساتھ تھے۔ آتے ہی انھوں نے دیوتا کو خوش کرنے کے لیے ایک بکرے کی قربانی کی، دو مرغوں کو ذبح کیا پھر جوجو کا ڈھول لے کر اسے خوب زور زور سے بجایا۔

لیکن ان سب باتوں سے گولو کو کوئی آرام نہ پہنچا۔ کلنکا نے لاکھ ناچ دکھایا اُلٹے سیدھے گانے گاتے بیماری کا بھوت اُسے نہیں چھوڑ سکا۔ ایک دن، دو دن، تین دن کلنکا کئی دن گولو کے گھر آیا، لاکھ جادو منتر ٹونے ٹوٹکے کیے لیکن گولو کے مرض میں

کوئی کمی نہیں آئی۔

"یہ لڑکی جس کا نام علیزا ہے اس نے مجھ پر جادو کر دیا ہے" وہ چیخ چیخ کر یہی کہتا۔ کلنکا جادوگر بھی تنگ آچکا تھا اور اُسے بڑی فکر تھی کہ جادو سے اگر گولو ٹھیک نہیں ہوا تو وہ کیا کرے گا۔ بہت پریشان ہونے کے بعد اس نے گولو کا اصل مرض پہچان لیا۔ اس نے سب سے کہا :۔

"اب تو یہ ظاہر ہے کہ علیزا جادوگرنی ہے۔ اس نے کہا بھی تھا کہ گولو پچھتائے گا۔ آخر پچھتانے کا کیا مطلب تھا سوائے اس کے وہ اپنے جادو سے اس پر بھوت سوار کر دے گی جو اُسے ستائے گا اور خوب تنگ کرے گا۔"

جادوگرنی! جادوگرنی، علیزا ایک جادوگرنی ہے۔ منٹوں میں یہ خبر سارے علاقے میں پھیل گئی۔ ہر ایک خوفزدہ تھا ہراساں تھا۔ اشنتی کے علاقے میں، غانا میں سب لوگ جانتے تھے کہ جادوگرنی کا ایک ہی علاج ہے وہ یہ کہ اُسے زہر کا ایک پیالہ پینا پڑے گا۔ اگر وہ جادوگرنی نہیں ہے تو آسمان کا خدا اُسے بچا دے گا۔ زہر پینے سے اگر وہ مرگئی تو سب کو یقین ہو جائے گا کہ وہ واقعی جادوگرنی تھی۔ یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ علیزا نے گولو پر جادو کر دیا تھا۔

جو بھی زہر کا پیالہ پیتا اس کے بچنے کا سوال ہی نہیں تھا لیکن اشنتی قبیلے کے لوگوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا یہ تو ایک رواج تھا۔ بھلا ایسے پرانے رواج کی خلاف ورزی کون کرے گا۔ قبیلے کے سرداروں میں بھی ایسی ہمت نہیں تھی۔

"کل علیزا کو زہر کا پیالہ پینا ہے" کلنکا نے یہ خطرناک الفاظ منہ سے نکالے۔ جوان شکاری بھی موجود تھا اس نے بھی یہ اعلان سُنا۔

اسی دن دوپہر کے بعد چپکے سے ازیزی جنگل میں دور تک گیا۔ وہاں ایک چھپر کے نیچے ایک مورتی بنی ہوئی تھی۔ یہ مورتی دراصل ایک دیوتا کی تھی اور وہ آسن جمائے بیٹھی ہوئی تھی۔ آنکھیں گول تھیں، منہ کھلا ہوا تھا اور ایک کان دوسرے کان تک پھیلا ہوا تھا۔ ناک چوڑی اور چپٹی۔ غرض عجیب بھدی شکل تھی۔ لیکن یہ دیوتا بھی ایک جادوگر سے کم نہیں تھا اور دراصل یہ ازیزی کا جوجو تھا۔ اس پر ازیزی کو مکمل اعتقاد تھا اسے دیکھتے ہی جوان شکاری گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ گڑگڑاتے ہوئے اس نے کہا۔

"اے میرے طاقتور دیوتا! تم نے مجھے اتنی طاقت دی کہ میں ہاتھیوں کو مار سکتا ہوں۔ اب مجھے تمہارے جوجو کی طاقت کی اور ضرورت ہے۔ کل کے دن میری منگیتر علیزا کو زہر کا گھونٹ پینا ہے مجھے بھی کوئی ایسا جادو دے دو کہ میں کسی طرح اس کی جان بچا سکوں۔"

ازیزی نے کچھ بھینٹ چڑھائی ایک مرغ ذبح کیا اور تازی تازی روٹیاں دیوتا کے ہاتھ میں رکھ دیں۔ پوجا پاٹ کے بعد وہ اپنے گاؤں لوٹ آیا۔ اسے بڑی فکر تھی کہ دیکھئے کل کیا ہوتا ہے جب اس کی معشوقہ کو گھسیٹ کر اس کے چیلے جوجو والے جادوگر کی جھونپڑی تک لے جائیں گے تو یہ منظر وہ کیسے برداشت کرے گا۔

کھلے میدان میں سب لوگ جمع تھے سینکڑوں مرد عورتیں بچے۔ سب کے منہ میں تالا لگا ہوا تھا۔ سب کی آنکھیں دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں جہاں سے کلنکا اپنا جوجو کا جادو لے کر باہر آئے گا۔

علیزا کو لاکر زمین پر ڈال دیا گیا۔ اس کی مشکیں کسی

ہوئی منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا، وہ زور لگاتی تھی، جد و جہد کرتی تھی لیکن کلنکا کے چیلے اُسے مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔

اس کا باپ، گاؤں کا سردار بھی وہاں موجود تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں لیکن وہ کیا کرتا کلنکا کے جُوجُو کے جادو کے سامنے وہ بے بس تھا۔ اگر جادو کے معاملات میں دخل دیتا تو بھیڑ اس کی دھجیاں اُڑا دیتی دراصل ہر ایک پر یہ خوف طاری تھا کہ جادوگر خفا ہو گیا تو سارے گاؤں کو تباہ کر دے گا۔

"پے پے پے" مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ جادوگر اپنے جھونپڑے سے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے اپنے بھورے جسم پر سفیدی مل رکھی تھی۔ چہرے پر لال اور کالے رنگ کی دھاریاں بنی تھیں آنکھوں کے اردگرد پیلا رنگ لگا تھا۔ وہ دیکھنے میں واقعی بھوت ہی لگتا تھا۔

لڑکی کے چاروں طرف جانور کی ہڈیوں اور گول پتھروں کا ایک دائرہ بنا ہوا تھا۔ کلنکا دائرے سے باہر آ کر اس کے اردگرد چکر کاٹنے لگا۔ گھاس کا جو بادہ اس نے پہن رکھا تھا اس سے ٹنگی ہوئی سیپیوں اور گھونگھوں سے چھن چھن کی آواز نکلتی سانپ کی سوکھی کھال اور کچھوے کی سوکھی ہڈیاں اس کی پیٹھ میں ٹھن ٹھن کرتیں۔ اس کی کلائی اور اس کے ٹخنوں میں پڑے لوہے اور پیتل کے چھلّوں سے جھنجھناہٹ ہوتی۔

شہ شہ! جُوجُو والے آدمی نے گانا شروع کر دیا۔

"کیا علیزا ایک جادوگرنی
اپنے کیے کو وہ بھرنی
زہر کے پیالے سے ہم تم
دیکھیں گے کیا ہوتا ہے اُم تُم"

کلنکا تیزی سے ناچنے لگا۔ اچھل اچھل کر اپنے پیر زمین پر پٹکنے لگا۔ چکر لگا کر وہ پتھر اور ہڈیوں کے دائرے میں داخل ہوا۔ اس نے پھر گاتے ہوئے کہا۔

"کیا اس نے گولو پر جادو کیا ہے
یا گولو نے چارسو بیس کیا ہے
آج اُسے زہر پینا ہے
پھر اُسے ثابت کرنا ہے"

مجمع میں ہر ایک سمجھتا تھا کہ علیزا جادوگرنی ہے۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگر اس نے زہر چکھا تو زندہ نہیں بچے گی لیکن ظاہر ہے بھلا کوئی کر ہی کیا سکتا تھا خطرناک جادو کے ڈاکٹر کلنکا کے جوجو کے خلاف کوئی کیسے بولتا۔

ڈاکٹر کے آدمیوں نے لڑکی کے ہاتھ کھول دیے منہ سے کپڑا بھی نکال دیا گیا۔ آزاد ہوتے ہی وہ چیخ کر بولی:۔

"مجھے بچاؤ! میرے باپ، دوستو کچھ تو کرو۔" یہ سن کر سب کے ہاتھ پیر سرد پڑ گئے لیکن بھلا کوئی کر ہی کیا سکتا تھا!

"ہائے ازیزی کا بھی پتہ نہیں" لڑکی کی چیخ نکل گئی۔

ازیزی وہیں ایک طرف موجود تھا۔ وہ اپنے دیوتا کی رہنمائی کا منتظر تھا اور ابھی کچھ کرنے کا وقت نہیں تھا۔

لڑکی کو پکڑ کر زمین سے اُوپر اٹھا لیا گیا۔ یہ دیکھ کر جوان شکاری دہل گیا۔ دو مجاور اُسے مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ اب کلنکا دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زہر کا پیالہ اس کے سامنے تیار تھا۔

ایک مجاور نے زبردستی لڑکی کا منہ کھولا، پیالہ منہ کے پاس تھا بس اب زہر منہ میں ڈالنے کی دیر تھی۔ ٹھیک اسی وقت نہایت جرأت کے ساتھ ازیزی کلنکا کے اُوپر

اچھل پڑا۔ اس نے جادوگر کے ڈاکٹر کو دھکا دے کر ایک طرف دھکیل دیا۔ ایک ہاتھ سے ایک کو دوسرے ہاتھ سے دوسرے کو، اور کو اس نے پکڑ لیا۔ شیر کی طاقت سے اس نے دونوں کو علیزا سے کھینچ لیا پھر دونوں کا سر پکڑ کر آپس میں ٹکرا دیا یہاں تک کہ ان کی کھوپڑیاں چور چور ہوگئیں۔ پھر اس نے ان کو زمین پر دے مارا اور جوجو کے آدمی کا گلہ دبوچنے کے لیے بڑھا۔

سب لوگ حیران تھے کہ کلنکا کا جادو بیکار گیا ازیزی کو روکنے کے لیے وہ اسے کام میں نہیں لایا۔ ازیزی نے جوجو والے جادوگر کو گھٹنے کے بل گرا دیا۔ اس نے مجبور کیا کہ وہ اپنا منہ کھول دے اور پھر اس نے خطرناک زہر اس کے حلق کے نیچے اتار دیا۔

نیلے پیلے ہا! ڈر کے مارے سب کا برا حال تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ انھیں یہ دہشت کہ اب خیریت نہیں، ان کا گاؤں تباہ ہوگا اور گاؤں کے سب لوگ مارے جائیں گے۔

لیکن آسمان سے کوئی بلا نازل نہیں ہوئی۔ کوئی بھی حادثہ پیش نہیں آیا سوائے اس کے کہ کروٹیں بدل بدل کر کراہتے ہوئے آخر میں جادوگر نے وہیں دم توڑ دیا۔

دوسرے دن خوشی کے شادیانے بجے اور ڈھولک کی آواز سے سارا گاؤں گونج اٹھا۔ ہاتھی دانت کے بنے ڈھول بجائے گئے تاکہ سب لوگوں کو ازیزی اور علیزا کی شادی کی اطلاع ہوجائے اور یہ کہ سب کے لیے دعوت عام ہے۔ قبیلے کا سردار بہت خوش تھا اور اس بات پر نازاں تھا کہ بہادر جوان شکاری نے لڑکی کی جان بچا کر دلہن حاصل کرنے سے پہلے ہی ایک بھاری قیمت ادا کر دی تھی۔

نوجوان جوڑے کو دیکھ کر پھولا نہ سماتا تھا۔ جوانوں میں یہ احساس کہ خود ان کی شادی ہو رہی ہے۔ کلنکا سے دنیا پاک ہوگئی اس کی روز روز کی دھمکیوں سے نجات ملی۔ لیکن جوجو پر ان کا اعتقاد اب بھی تھا۔ انھوں نے سمجھا کہ ازیزی کے دیوتا نے جو جادو دیا تھا وہ کلنکا کے جادو سے بہت طاقت ور تھا۔

انھوں نے سوچا کہ گاؤں میں جوجو جیسا کوئی اور آدمی ہونا چاہیے۔ تاکہ وہ شیطان کو مار بھگائے اور پھر ہم میں سے کوئی کبھی بیمار نہ پڑنے۔ ازیزی پر ان کو بڑا ناز تھا۔ شیر کی طاقت رکھنے والا یہ شکاری جب تک زندہ رہے گا زہر کے پیالے سے سب کو محفوظ رکھے گا۔

علیزا کی شادی ازیزی سے ہوگئی تو ظاہر ہے گولو کی چھیڑ چھاڑ بھی ختم ہوگئی۔ یہ تو معلوم نہیں گولو کا کیا حشر ہوا۔ کیا واقعی وہ بیمار پڑ گیا تھا یا یہ ایک بہانہ تھا اور وہ جان بوجھ کر علیزا کو پریشان کرنا چاہتا تھا۔ یا اس کی جان لینا چاہتا تھا۔ شاید جادوگر کو بلانا بھی اس کی چال تھی۔ اندر ہی اندر اسکی سازش تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ علیزا اگر اس کو نہیں ملتی ہے تو کوئی ایسی ترکیب کرو کہ وہ ازیزی کو بھی نہ ملے۔

لیکن اس کو اندازہ نہیں تھا کہ ازیزی میں بھی کتنا زبردست جادو ہے۔

جادوگر کو مرتے دیکھ کر گولو کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور بعد میں کچھ پتہ نہیں کہ اس کا کیا حشر ہوا۔ ہمیں بھی بھلا ایسے برے آدمی سے کیا سروکار۔ ●

کھلا گھر



میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر کے آس پاس، چاروں طرف دیواریں کھڑی کر دی جائیں۔ میرے گھر کی کھڑکیاں بند رہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمام ملکوں کی تہذیبوں کی ہوائیں میرے گھر کے گرد و نواح میں بے روک ٹوک چلتی رہیں لیکن میں یہ نہیں چاہوں گا کہ وہ مجھے پیروں سمیت اُڑا لے جائیں۔ میرا مذہب قید خانہ کا مذہب نہیں ہے۔ اس میں پرماتما کی ہر مخلوق کے لئے گنجائش ہے۔ نسلی، مذہبی یا معاشرتی برتری جیسے بیہودہ جذبات اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

مہاتما گاندھی



نسیم حبیب حسان

ہوا میں پانی



لینن گراڈ کے چڑیا گھر کے ملازموں میں اچھی خاصی ہل چل مچی ہوئی تھی اُن کے پاس ایک پارسل آیا تھا۔ لکڑی کے ایک پنجرے جیسا ڈبا۔ یہ اس پارسل کو کھول رہے تھے۔ اس کی مہریں توڑ رہے تھے۔ اس کی کیلیں نکال رہے تھے۔

پر بھلا اس میں پریشانی کی کیا بات تھی یہ ہل چل کیوں مچی تھی۔ اجی جناب اس میں ایک چھپکلی تھی چھپکلی ——— آپ کہیں گے چھپکلی تو ہم روز ہی دیکھتے ہیں۔ گرمیوں کی راتوں میں تو خاص طور پر روشنی کے چاروں طرف منڈلاتی رہتی ہیں۔ آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے پر یہ ایسی ویسی چھپکلی نہ تھی کوئی ڈیڑھ میٹر (لگ بھگ پونے دو گز) لمبی ——— اس وقت آپ وہاں موجود ہوتے تو آپ بھی اُسے دیکھ کر کچھ ہراساں ضرور ہوتے۔

اس چھپکلی کو پنجرے جیسے بکس سے نکالتے وقت چڑیا گھر کے لوگوں نے اس پر کپڑا ڈال دیا تھا۔ چھپکلی نے پنجرے سے نکلتے وقت تھوڑی بہت بھر پور مزاحمت کی پر وہ صحیح سلامت نکل آئی اس کو پکڑنے والے نے ہدایت لکھی تھی کہ: "ان واران کو اس طرح قید کرنے کے بعد پانی کی ضرورت ہوتی ہے"۔

چھپکلی کی اس قسم کا نام واران ہے۔ اس کا اصل وطن افریقہ ہے پر نہ جانے کیسے گھومتے پھرتے سنٹرل ایشیا میں آنکلی اور ہزاروں سال سے اپنا مزے سے یہیں رہتی ہے یہ ریتیلی یا پتھریلی پہاڑیوں میں پھٹ یا بل بنا کر رہتی ہے اور بس اسی وقت اپنے بل سے باہر نکلتی ہے جب گرمیوں میں ٹمپریچر ۳۵ سینٹی گریڈ سے زیادہ ہو جائے۔

جہاں یہ رہتی ہے وہاں سینکڑوں میل تک پانی کا نام و نشان نہیں ہوتا اور اس لق دق صحرا میں بنا پانی کے زندگی گزارتی ہے۔ آپ کے دل میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ تو پھر قید کی حالت میں اسے زیادہ پانی کی ضرورت کیوں۔ خصوصاً لینن گراڈ جیسے مقام میں جہاں سال بھر ہوا میں کافی نمی رہتی ہے۔

اپنا پانی خود پیدا کرتے ہیں

صحرا یا ریتیلے علاقے کے بہت سے جانور مثلاً ہرن کچھوا وغیرہ بہت دنوں تک بنا پانی کے زندہ رہ سکتے ہیں۔ یہ ہرے پودوں سے پانی حاصل کرتے ہیں اور جب سورج کی آگ برسانے والی دھوپ سے یہ پودے مرجھا جاتے ہیں تو یہ جاندار لالہ (ایک پودا) کی جڑیں کھود کر ان سے تری حاصل کرتے ہیں۔

یہاں سے سرخس ہوتے ہوئے زادہ پہنچے۔ سرخس میں پانی بہت کم ہے۔ کنوؤں سے نکالا جاتا ہے۔ ایک نہر ہے جو خشک رہتی ہے۔ بارش ہو جاتی ہے تو بہنے لگتی ہے۔ زادہ قطب الدین حیدر کا شہر ہے۔ حیدری انھی بزرگ سے نسبت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ ہاتھوں میں گلے میں اور کانوں میں لوہے کے کڑے ڈالتے ہیں۔

نیشاپور:۔ خراسان کے شہروں میں نیشاپور بھی بڑا شہر ہے۔ باغات کی کثرت ہے۔ بازار بھی اچھے ہیں۔ وسط بازار میں مسجد ہے۔ جو نہایت عمدہ ہے۔ ریشم کا کپڑا نیشاپور میں تیار ہوتا ہے جو ہندوستان تک جاتا ہے۔ یہاں سے بسطام کا سفر ہے۔ یہاں حضرت بایزید بسطامی کا مزار مبارک ہے۔ شیخ ابوالحسن خرقانی کا مزار بھی بسطام میں ہے۔

بسطام سے قندوز اور میلان کے متبرک مقامات کی زیارت کی۔ ہم یہاں چالیس دن ٹھہرے تا کہ یہاں کی سرسبز چراگاہوں میں ہمارے اونٹ اور گھوڑے کھا پی کر تروتازہ ہو جائیں۔

ہمارے طویل قیام کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ سردی شروع ہو چکی تھی۔ سردیوں کے موسم میں ہندوکش سے گذرنا مشکل ہے اور ہندوکش پار کیے بغیر ہندوستان پہنچ نہیں سکتے تھے۔

گرمی آئی تو ہندوکش سے گذرے۔ برف جگہ جگہ جمی تھی۔ ہم اپنے لبادے بچھا دیتے تھے۔ تاکہ اونٹ ان پر پاؤں رکھتے ہوئے آگے بڑھ سکیں۔ بغلان سے نکل کر اندراب گئے۔

اندراب:۔ کسی زمانے میں اندراب اچھا خاصا شہر تھا۔ اب اس کے نشانات مٹ گئے ہیں۔ جب ہم اندراب کے ایک گاؤں میں پہنچے تو وہاں محمد المہروی ایک عالم سے ملاقات ہوئی جنھوں نے کوہ ہندوکش تک ہمارا ساتھ دیا۔ پہاڑ پر ہمیں ایک چشمہ ملا۔ جس کا پانی اتنا گرم تھا کہ جب ہم نے منھ دھویا تو ہماری کھال جل گئی۔ اور بہت دن تک دکھتی رہی۔

اندراب کے بعد ہمیں ایک شہر ملا۔ اسے پنج ہیر کہتے ہیں۔ نہر کے کنارے پر آباد ہے۔ نہر کا پانی سمندر کے پانی کی طرح نیلا نظر آتا ہے۔ یہ نہر بدخشاں کے پہاڑ سے نکلی ہے۔ اور یہاں ہیرے ملتے ہیں جنھیں بلخش کہتے ہیں۔

چیک نشائی:۔ چیک نشائی میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی جنھیں ابو الولیا کہتے ہیں۔ ساڑھے تین سو سال کی عمر بتائی جاتی ہے۔ میں جب ان کی خدمت میں گیا تو بغل گیر ہو کر ملے۔ ان کا جیسا نرم بدن آج تک میں نے کسی کا نہ دیکھا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان کے بال اور دانت ہر پچاس سال کے بعد نئے نکل آتے ہیں۔ میں نے ان سے باتیں اور کچھ سوالات کیے مگر مجھے ان کی باتوں پر یقین نہ آیا۔

مگر ان میٹھی میٹھی جڑوں کو تلاش کرنا بھی کوئی آسان بات نہیں ہے ۔ تو پھر۔ یہ بے چارے کیا کرتے ہیں ۔ کہاں سے پانی حاصل کرتے ہیں ؟ ۔ جی ـــــ یہ اپنا انتظام خود کرتے ہیں گویا پانی فراہم کرنے کا کارخانہ خود بناتے ہیں۔

کام کرتے وقت ہماری طاقت یا انرجی خرچ ہوتی ہے یہ طاقت یا انرجی کاربوہائیڈریٹ اور فیٹ یا چربی کے جلنے سے حاصل ہوتی ہے۔ دونوں کے مکمل طور پر جل جانے سے دو چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ بہت زہریلی گیس ہے یہ فوراً خارج ہو جاتی ہے۔ اور پانی جسم ہی میں کام آتا ہے۔ ایک بالغ جاندار دن میں لگ بھگ تین سو گرام پانی تیار کرتا ہے

پانی کی اس طریقے سے پیداوار میرے اور آپ کے لیے تو کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن ریگستان کے جانداروں کے لیے تو پانی کا ایک ایک قطرہ قیمتی ہے ان کے لیے اتنے پانی کی بڑی اہمیت ہے کچھ جانداروں کے لیے تو پانی حاصل کرنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے انھیں جتنے پانی کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسی کیمیکل طریقے سے حاصل کرتے ہیں۔

پانی حاصل کرنے کے لیے آسانی سے حاصل ہونے والی چیزیں یہی دو ہیں چربی اور کاربن ہائیڈریٹ ان دونوں کے جسم کے اندر جلنے کے بعد پانی اور کاربن ڈائی آکسائڈ پیدا ہوتے ہیں۔

خشک صحرا اور ریگستان کے سبھی جاندار اپنے جسم میں چربی جمع کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ریگستان کے جاندار تو چربی کا خزانہ جمع رکھنے کے لیے ایک مقررہ جگہ رکھتے ہیں آپ اسے اسٹور ہاؤس کہہ لیجیے۔

اونٹوں کا کوہان تو آپ نے دیکھا ہوگا یہ اپنی چربی اس میں جمع رکھتے ہیں۔ گوفر مورتھ ہیر اور واران اپنی دموں کی جڑ میں چربی جمع کرتے ہیں۔ موٹی دم کی بھیڑ (غالباً دُنبا) اپنی دم کے دونوں طرف چربی کی خوب موٹی تہیں جمع رکھتی ہے۔

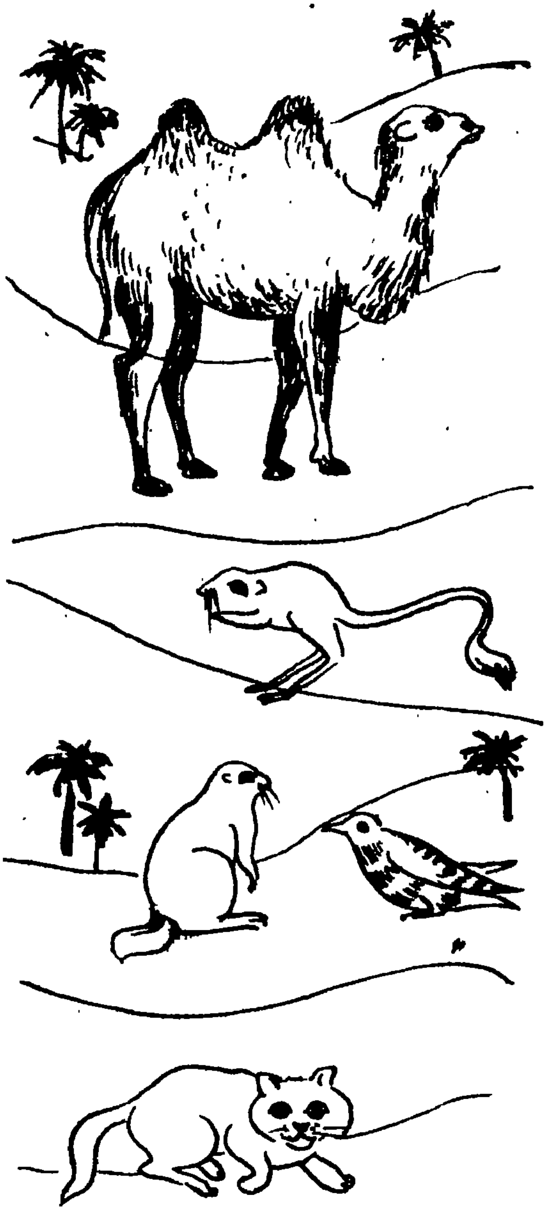
اونٹ کے کوہان میں سو سے لے کر ایک سو بیس (۱۲۰) کیلوگرام تک چربی ہو سکتی ہے اور موٹی دم والی بھیڑ کی دم میں دس کیلوگرام سے لے کر گیارہ کلوگرام تک۔

جب کبھی ضرورت شدید ہو اور آس پاس پانی کا کہیں پتہ نشان نہ ہو تو جاندار اسی چربی سے پانی حاصل کرتے ہیں اونٹ تو ۴۵ دن بلکہ اس سے بھی زیادہ دنوں تک بغیر پانی کے زندہ رہ سکتا ہے۔ شروع کے ۱۵ دن تو یہ اپنی معمولی غذا یعنی خشک گھاس کھا کر کام چلا سکتا ہے۔

پانی پیدا کرنے کا یہ طریقہ بہت مفید ہے چربی اور کاربن ہائیڈریٹ کے جلنے سے طاقت یا انرجی بھی کافی حاصل ہوتی ہے اور اس طاقت کے بل پر جاندار بغیر کچھ کھائے بھی زندہ رہ سکتا ہے۔

پانی حاصل کرنے کا یہ طریقہ بہت آسان ہے مگر بھروسے کے قابل نہیں ہے ۔ بنجر بے آب وگیاہ صحرا میں کھانے کا یا غذا کا سامان مشکل ہی سے مل پاتا ہے اور ان جانداروں کے لیے اپنے جسم میں چربی جمع کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے جبھی تو صحرا کے جانداروں نے پانی حاصل کرنے کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے۔

آسٹریلیا کے انتہائی گرم ریگستان میں ایک عجیب قسم کی چھپکلی نظر آتی ہے۔ اس کے سارے بدن پر نکیلے کانٹے ہی کانٹے ہوتے ہیں اسے مولوچ (MOLOCH) کہتے ہیں



بس جبھی تو پنجرے والا قیدی واران زیادہ چاہت سے پانی پیتا ہے
اس کے علاوہ لیتین گراڈ کی مرطوب یا نم آب و ہوا میں ریگستان
کے مقابلے پیاس کی زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ ریگستان میں انھیں
غذا کی تلاش میں دوڑ دھوپ کرنا پڑتی ہے۔ اِدھر اُدھر مارے
پھرتے ہیں اچھی خاصی طاقت صرف ہوتی ہے اور تب کہیں جاکر
پیٹ بھرنے کا سامان ہوتا ہے۔

پنجرے کی بات بالکل دوسری ہے بیٹھے بٹھائے
کھانا مل جاتا ہے اور اِدھر اُدھر دوڑ بھاگ نہیں کرنا پڑتی طاقت
یا انرجی زیادہ خرچ نہیں ہوتی۔ جسم میں پانی زیادہ نہیں بنتا۔ یہ تو
جبھی بنے جب انرجی یا طاقت زیادہ خرچ ہو اور جسم میں پانی
نہیں بنے گا تو ظاہر ہے ضرورت پورا کرنے کے لیے باہر کے پانی کی
تلاش ہوگی اس لیے جاندار قید کی حالت میں زیادہ پیاسے رہتے
ہیں

غرض ریگستان میں زندگی گزارنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے
وہاں رہنے کے لیے بس اتنی بات کافی نہیں ہے کہ جاندار کیمیکل طریقے
سے پانی پیدا کرنا جانتے ہیں یا اُسے ہوا سے حاصل کر سکتے ہیں
بلکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کڑی اور چل چلاتی دھوپ میں
کس طرح اپنے کو محفوظ رکھیں اور جو پانی انھیں میسر ہو اُسے
کیسے انتہائی کفایت شعاری اور احتیاط سے خرچ کریں۔ یہ
دونوں باتیں بھی اتنی ہی اہم ہیں کہ بنا اِن کے ریگستان میں
زندہ رہنا قطعی ناممکن ہے۔

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

کشتی کا اکھاڑا

یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت و رسالت کا اعلان نہ فرمایا تھا۔ کبھی کبھی اپنے چچا ابو طالب کی بکریاں چرانے جنگل چلے جاتے تھے۔

اسی جنگل میں ایک دوسرے صاحب بھی بکریاں چراتے تھے ان کا نام رُکانہ تھا۔ رُکانہ جس کسی سے کشتی لڑتے پچھاڑ دیتے بڑے طاقت ور تھے اور کشتی کے داؤ پیچ خوب جانتے تھے۔ جنگل میں ان کی بڑی دھاک تھی۔ جنگل میں جو کوئی بکریاں چراتا، ان سے ڈرتا تھا۔

ایک دن حضور صلے اللہ علیہ وسلم، رُکانہ سے بولے۔ رُکانہ! کشتی لڑتے ہو۔ رکانہ بولے آپ سے حضور نے فرمایا ہاں!! مجھ سے۔

رُکانہ بولے۔ جو کوئی جیتے گا اُسے ملے گا کیا؟

حضور نے فرمایا ایک بکری،

کشتی ہوئی تو حضور نے رکانہ کو پچھاڑ دیا اور ایک بکری لے لی۔

پھر فرمایا "کیا دوبارہ کشتی لڑو گے اور جب رُکانہ نے دوبارہ کشتی لڑی تو حضور نے پھر دے مارا اور دوسری بکری لے لی، رُکانہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

حضور نے فرمایا۔ دیکھتے کیا ہو، رُکانہ نے کہا یہ دیکھ رہا ہوں کہ مجھے کسی نے پچھڑتے ہوئے دیکھا تو نہیں؟ یہاں تو میری بڑی دھاک ہے۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے بکری والے مجھ سے لڑنے لگیں اور میرا رعب جاتا رہے۔

حضور نے فرمایا۔ کیا تیسری دفعہ پھر لڑتے ہو؟ او تیسری مرتبہ پھر رُکانہ کو زیر کر دیا۔

بیچارے رُکانہ غمگین ہو کر بیٹھ گئے، حضور نے پو غم کیوں کرتے ہو۔

رُکانہ نے کہا سب سے بڑا غم تو یہ ہے کہ مالک کی تین بکر کم ہو گئی ہیں۔ دوسرے مجھے اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا کہ قریش میں مجھ سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔ مگر اس وقت قلعی کھل گئی اور سا گھمنڈ جاتا رہا۔

حضور نے فرمایا کیا چوتھی بار پھر لڑتے ہو۔

رُکانہ نے کہا تین مرتبہ زیر ہونے کے بعد چوتھی دفعہ کیسے ہمت کر سکتا ہوں۔

حضور نے سب بکریاں واپس کر دیں۔

چند دن بعد حضور کی رسالت و نبوت کا شہرہ ہوا تو رُکانہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہو گئے۔

رُکانہ کہا کرتے تھے کہ حضور نے مجھے خدائی طاقت سے پچھاڑا تھا ورنہ کسی دوسرے کی کیا ہمت تھی کہ مجھ سے لڑتا اور زیر کر دیتا۔

عربی وقت

جناب محمد عبدالملک بی اے۔ مرادآبادی۔
(مقیم مدینہ منورہ)

"اللہ اکبر اللہ اکبر" اذان ہوئی اور ہر شخص کی نظر اپنی گھڑی پر پڑی، اتاری، صبح کی، کوک دی اور پھر باندھ لی۔ گھڑیاں یہاں بہت کثرت سے ہیں مگر جیب کی شاذونادر۔ ہاں نابینا (اندھے) فقیر جیب کی گھڑی ضرور رکھتے ہیں۔ عموماً سب کے پاس ہوتی ہے۔ اگر آپ دریافت کریں تو بالکل صحیح وقت بتائیں گے۔ یہاں بچے اور چھوٹے طالب علم بھی گھڑی سے خالی نہیں ہوتے اور گھڑیاں بھی عمدہ، قیمتی۔

ہاں تو یہاں گھڑیاں ٹھیک کرنے کا تعلق اذان کے ساتھ ہے۔ مگر کون سی اذان، اذانِ مغرب وہ اعلان ہے سورج کے ڈوبنے، رات کے آنے اور دن کے شروع ہونے کا۔ دن کا شروع ہونا یعنی تاریخ کا شروع ہونا۔

غروب کے ساتھ ہی گھڑیوں میں بارہ بجائے جاتے ہیں۔ اسی طرح سارے سال نمازِ مغرب بارہ بجے ہی ہوتی ہے۔ اور نمازِ عشا ہمیشہ ڈیڑھ بجے۔ دن کے گھٹنے بڑھنے کا اثر باقی تین نمازوں پر پڑتا ہے۔ دن کے غروب پر ہی نیا دن شروع ہوتا ہے اور اسی سے نئی تاریخ۔

آج جمعہ کا دن ہے مغرب کے بعد ہفتہ شروع ہو جائے گا۔ آج چاند کی دو تاریخ ہے مغرب کے بعد تیسری مانی جائے گی۔ آج کی رات کو جمعہ کی رات کہنا غلط اور ہفتہ کی رات کہنا صحیح ہوگا۔ اور چونکہ تاریخ اور دن رات سے شروع ہوتے ہیں اس لیے دن کا ذکر کرتے ہوئے "دن" کا لفظ بھی لکھتے ہیں۔ مثلاً "نہار السبت" ہفتہ کے دن دِن میں "نہار الاحد" اتوار کے دن دِن میں اِسی قاعدہ کی مشق رمضان میں ہم لوگوں کو عرب کے باہر بھی ہو جاتی ہے۔

چاند دیکھ کر تراویح شروع ہو جاتی ہے سحری کھائی جاتی ہے حالانکہ روزہ دوسرے دن ہوگا ہمارے حساب سے۔ لیکن عربی حساب سے دن شروع ہو چکا۔ اس لیے اس کے کام بھی جاری ہو گئے اور اس کے احکام بھی جاری ہو گئے۔

ہمارے ملکوں میں جمعرات کا لفظ بھی اس بات کی دلیل اور عربی تہذیب کا نشان ہے۔ جمعہ سے پہلے کی رات "جمعہ کی رات ہوتی ہے" جمعہ کی چونکہ خاص اہمیت ہوتی ہے اِس لیے اس کی رات بھی اہم قرار پائی اور وہ عوام میں اتنی زیادہ اہم ہوئی کہ جمعہ

سے پہلے دن کا نام ہی "جمعرات" (یا جمعرات) ہو گیا ورنہ عربی میں یوم الخمیس یا خمیس کہتے ہیں بلکہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے بہت سے غیر عربی علاقوں میں بھی جمعرات کو خمیس ہی کہنے لگے۔ مثلاً سندھ کے علاقے میں جمعرات کو مستقل طور پر خمیس ہی کہتے ہیں۔

اچھا عربی تقویم (کیلنڈر) کی یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ اس کے ہفتہ کے سات دنوں کے نام دیوی دیوتاؤں کے نام پر نہیں ہیں جیسا کہ انگریزی اور ہندی اور دوسری سینکڑوں زبانوں میں رائج ہیں۔ بلکہ بالکل سادہ نام ہیں، جمعہ کو مرکز مان کر ہفتہ یعنی سنیچر کو سبت کہتے ہیں اس کے بعد پہلا دن (الاحد) دوسرا دن (الاثنین) تیسرا دن (الثلاثاء) چوتھا دن (الاربعاء) پانچواں دن (الخمیس) کہلاتا ہے۔ یہ دنیا کی تاریخ میں اور قوموں کی تاریخ میں عجیب بات ہے کہ عربوں کے کیلنڈر میں بت پرستی، ہیرو پرستی، ستارہ پرستی کا کوئی نام و نشان نہیں ہے۔

جاوا ملایا اور اسلامی سیام کے علاقوں میں ہفتے کے سارے نام عربی ہیں۔ الاحد الاثنین، وغیرہ جس طرح جمعہ ساری اسلامی دنیا میں جمعہ ہی کہلاتا ہے فارسی ترکی زبان میں ہر دن کے نام الگ الگ ہیں مگر جمعہ کو جمعہ ہی کہتے ہیں۔

جس طرح عربی ٹائم (وقت) سورج کے غروب سے شروع ہوتا ہے اسی طرح مہینہ چاند کے طلوع سے شروع ہوتا ہے۔ پہلی تاریخ کے چاند کو ہلال کہتے ہیں ان دونوں چیزوں کو عینی مشاہدہ پر رکھا گیا ہے۔

اس "آنکھوں دیکھی" کو انسانوں میں راسخ کرنے اور "سنی سنائی" پر چلنے کی عادت کو توڑنے کے لیے یہاں تک فرمایا (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کہ جہاں چاند دیکھا جائے روزہ رکھ لو، جہاں چاند ہو جائے عید کر لو۔ جہاں نہ ہو مت کرو۔ یعنی کئی عیدیں ہونے اور روزوں کے آگے پیچھے ہو جانے میں اتنا حرج نہیں جتنا کہ انسانوں کی عادت خراب ہو جانے اور حقیقت سے ہٹ جانے میں ہے۔

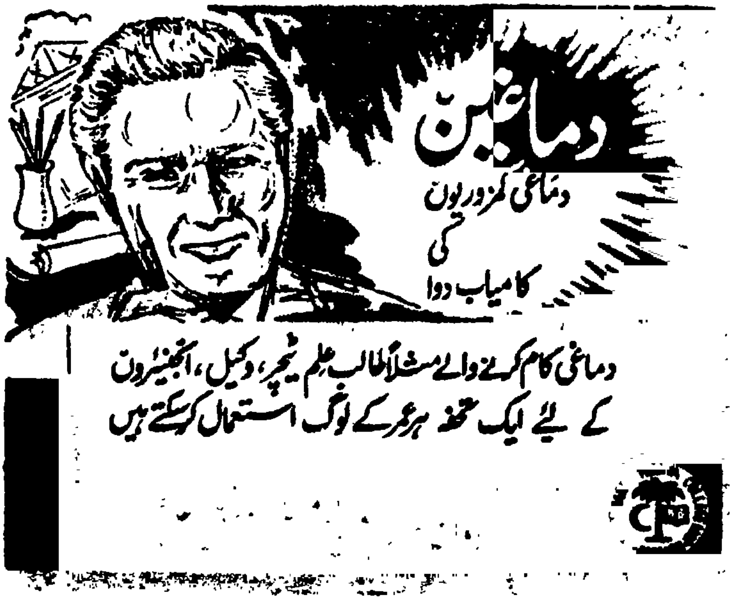
اسلام انسانوں کو ہر معاملہ میں ہر بات میں حقیقت شناس بنانا چاہتا ہے اور اسی عادت کو پختہ (پکا) کرنے کے لیے یہ ضروری رکھا گیا ہے کہ ہر نمازی خاص طور پر موذن (بانگی)، وقت کا خوب پہچاننے والا ہو۔

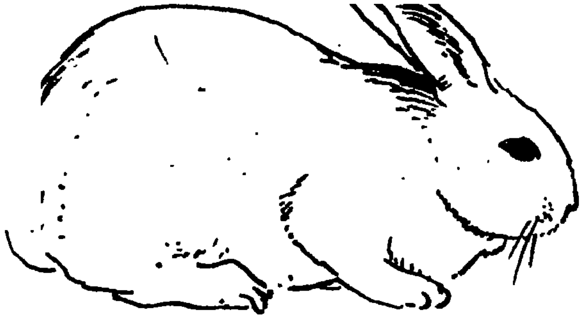
وقت پہچاننا مگر کس چیز سے؟ گھڑی سے نہیں، بلکہ سورج کی رفتار، سایہ کی مقدار، ستاروں کی دوڑ دھوپ اور آسمان کی نمایاں اور مستقل علامتوں کے ساتھ، گھڑی تو ایک عارضی چیز ہے آسمان فطری چیز ہے۔ اگر اس حکم کی قیمت کو سمجھا جاتا تو ایک گنوار سے گنوار اور جاہل سے جاہل آدمی بھی علم الافلاک (آسمانوں کا علم) کو جاننے والا بن جاتا۔ لیکن لوگوں نے اس حقیقت کو سمجھا نہیں، اور اب عالم بھی جاہل ہو گئے۔ وہ بھی اب گھڑی کے پجاری ہیں۔

دفتر یعنی سرکاری دفتر یہاں تین بجے کھلتے ہیں۔ مدرسے دو ڈھائی بجے۔ درمیان میں ۶½ بجے نماز کے لیے وقفہ ہوتا ہے۔ پھر دوبارہ جاری ہو کر ۸ بجے چھٹی ہو جاتی ہے۔ آج کل دس بجے عصر اور پھر حسب معمول بارہ بجے مغرب کی نماز ہوتی ہے۔ فجر سوا دس بجے اور سورج سوا گیارہ پر نکلتا ہے۔

یہاں اوقات کو بھی نمازوں ہی سے پہچانا جاتا ہے ہماری طرح سہ پہر دوپہر شام نہیں بولتے ان کی بجائے ظہر عصر مغرب کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ بعد العصر قبل العصر قبل الظہر بعد الظہر قبل المغرب بعد المغرب وغیرہ

جیسا کہ سب جانتے ہیں عربی سال محرم سے شروع ہوتا ہے اور "ذی الحج" پر ختم ہو جاتا ہے "ذی الحج" یعنی حج والا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں ساری دنیا کے گوشہ گوشہ سے لوگ حج کو آئیں گے اور ایک شہر اور ایک میدان میں جمع ہوں گے۔ بس اس فریضہ کو ادا کر چکے تو چاند دیکھتے ہی دوسرا سال شروع ہو جاتا ہے۔ قمری سال (چاند کے حساب کا سال) شمسی سال (سورج کے حساب کا سال) سے دس دن کم ہوتا ہے۔ اس طرح ایک صدی میں کوئی تین سال کا فرق پڑ جاتا ہے۔ (نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہجرت کو (مکّہ سے مدینہ فرمائی تھی) اس سال ۱۲ ربیع الاول کو پورے ۱۳۷۴ برس ہو گئے (یہ مضمون ۱۳۷۴ھ ہی کا لکھا ہوا ہے) لیکن انگریزی حساب والے کہیں گے نہیں، ۲ جولائی کو ٹھیک ۱۳۳۳ سال ہوتے ہیں۔ بے شک سورج چاند سے بڑا ہے مگر ہر ماں اپنے بچے کو "چاند" ہی کہتی ہے اور ماں کی محبت فطرت ہے۔ دین بھی فطرت ہی کا دوسرا نام ہے۔





لے لیورے

نام کیا رکھیں

جنگل میں ایک خرگوشش پیدا ہوا۔ بی خرگوشنی نے سوچا اپنے ننھے کا کوئی نام رکھا جائے۔ ایسا مبارک نام کہ بچے کی قسمت کھل جائے۔ سوچتے سوچتے بی خرگوشنی نے فیصلہ کیا۔" بچے کا نام شیر رکھا جائے۔"

یہ ننھے منے "شیر صاحب" باہر کھیلنے گئے۔ دوسرے جانوروں کے بچے اپنا مزے سے اِدھر اُدھر کھیلتے پھر رہے تھے ننھا خرگوش بھی ان میں جا ملا کہنے لگا۔ "مجھے بھی اپنے ساتھ کھلا لو۔"

بچوں نے کہا: "پہلے یہ بتاؤ تم کون ہو؟ تمھارا نام کیا ہے۔"

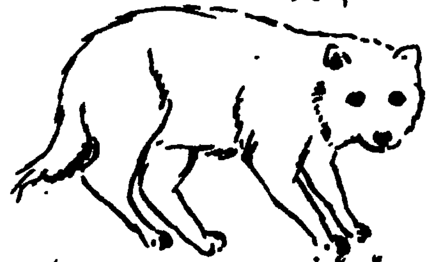
ننھا خرگوش جھٹ سے بولا۔ میرا نام "شیر" ہے

اتنا سننا تھا کہ سب بچوں کی سٹی گم ہو گئی۔ مارے ڈر کے اِدھر اُدھر جھاڑیوں میں جا چھپے۔ ننھا خرگوش اکیلا رہ گیا



بے چارے شیر صاحب اپنا سا منہ لے کر اپنی امی کے پاس لوٹ آئے۔ کہنے لگے: "میں شیر نہیں کہلانا چاہتا۔ یہ نام سنتے ہی سب بھاگ جاتے ہیں۔ کوئی میرے ساتھ نہیں کھیلتا۔"

اس کی امی۔ بی خرگوشنی سوچتی رہیں بہت دیر تک سوچتی رہیں۔ آخر ایک مبارک نام ان کی سمجھ آیا کہنے لگیں آج سے تمھارا نام "بھیڑیا" رکھا گیا۔



ننھا خرگوش پھر بھاگا۔ باہر بہت سے بچھڑے کلیلیں کر رہے تھے اپنے سینگوں سے ایک دوسرے کو چھیڑ رہے تھے۔ بھیڑیے صاحب بڑے شوق سے اس طرف لپکے۔ کہنے لگے: "میں آپ کے ساتھ کھیل سکتا ہوں"

بچھڑوں نے پوچھا۔ "تم ہو کون؟ تمھارا نام کیا ہے۔"

خرگوش میاں نے جواب دیا۔ "میرا نام ہے بھیڑیا"

اتنا سننا تھا کہ بچھڑے اس پر ٹوٹ

بے چارے کو سینگوں پر رکھ لیا۔ کہنے لگے "جان کی خیر چاہتا ہے تو ہم سے دور ہی دور رہ"

ننھا خرگوش سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔ بھاگتے میں روتا جاتا تھا اور اپنے زخموں کو چاٹتا جاتا تھا

گھر پہنچ کر وہ اپنی امّی سے بولا "امّی میں بھیڑیا کہلانا نہیں چاہتا۔ اس نام کی وجہ سے میں نے اتنی مار کھائی اور کوئی بھی میرے ساتھ نہیں کھیلتا"

اس کی امّی نے پھر سوچا بہت سوچا۔ دیر تک سوچتی رہی آخر اس نتیجے پر پہنچی "اچھا یہی ہے کہ میں اسے خرگوش ہی کہہ کے پکاروں"



ننھے خرگوش میاں پھر کھیلنے نکل گئے اور اب لومڑیوں، چوہوں، نیولوں اور بجّوؤں کے بچے اِدھر اُدھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ سب آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ خرگوش میاں بڑے شوق سے اُن کی طرف لپکے۔ کہنے لگے "کیا میں آپ کے ساتھ کھیل سکتا ہوں"

انھوں نے پوچھا "تم کون ہو تمہارا نام کیا ہے"

ننھے میاں نے جواب دیا "خرگوش"

"اسے ہے کیسا پیارا پیارا ہے۔ ننھا منا سا۔ جیسے سمور کی پیاری سی گیند۔ آؤ آؤ ہمارے ساتھ آنکھ مچولی کھیلو خرگوش میاں" چوہوں کے بچوں نے بھی آواز لگائی "ہاں ہاں ہمارے ساتھ کھیلو" "ہمارے ساتھ بھی" لومڑیوں کے ننھے منے بچوں نے دہرایا۔

ننھا خرگوش سارے دن کھیلتا رہا۔ گھاس میں خوب قلابازیاں کھائیں۔ دوڑیں لگائیں۔ آنکھ مچولی کھیلی۔ کھیلتے کھیلتے تھک گیا۔ پر آج وہ بہت خوش تھا۔ پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اپنے دل میں برابر یہی سوچ رہا تھا۔

"واہ بھئی خرگوش بھی کیسا اچھا نام ہے"

(سوویت دیس سے)

بقایا لینن کا

کر دیکھنے والوں کی نظریں اُٹھیں۔ لباس کے معاملے میں اتنا بتا دینا کافی ہے کہ ٹائی کو بھی ایک تکلیف وہ ضرورت سمجھتے تھے۔ اور بھئی جس شخص کی نیت میں خلوص ہو انتہائی خلوص جو ارادے کا پکا ہو جس کام میں ہاتھ ڈالے اُسے پوری ذمے داری، سوجھ بوجھ جوش اور ہمت و استقلال سے انجام دینے کا جذبہ رکھے۔ اُسے ایسا ہی ہونا بھی چاہیے۔ وہ بہت جذباتی تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا گہرا اثر لیتے تھے لیکن صبر و ضبط تحمل اور بُردباری کی عادت نے ان میں بہت توازن پیدا کر دیا تھا۔ ہر وقت گہری سوچ میں ڈوبے رہتے تھے۔ ان میں فن ہی کو لیک نقطے پر لے آنے کی زبردست قوت تھی۔ وہ بندھے ٹکے پرانے اور فرسودہ ڈھنگ پر زندگی گذارنے کے قائل نہ تھے اس میں ترقی کی گنجایش سمجھتے تھے۔ اُن سے پہلے کے پڑھے لکھے لوگوں نے نئے ڈھنگ سے زندگی گزارنے کا خاکہ بنایا تھا یہ خاکہ کتابوں میں لکھا تھا۔ لینن نے مناسب اصلاح و ترمیم کے بعد اس خاکے کو عملی شکل دی۔ اور اس کام میں جان کی بازی لگا دی۔ اسی کا نتیجہ تو ہے کہ ان کا روس جو زار روس کے زمانے میں غلامی کے عہد کے ہندوستان سے بھی گیا گزرا

عادل جعفری

انتخاب

(نظم بیٹیوں کے لئے نہیں، بیٹوں اور بڑی بہنوں کے لئے)

اے دوست آج چھٹیوں کے دن ہوئے تمام
کرنا ہے ہم کو ایک بہت ہی ضروری کام
طے کرنا ہے کہ کون سے مضمون ہم پڑھیں
کیا بن کے اس زمانہ میں دنیا میں ہم رہیں
واضح رہے کہ آرٹس میں اب جان ہے نہیں
کامرس کی طرف کوئی رجحان ہے نہیں
قانون کے لیے نہیں باقی کوئی دلیل
زیادہ مقدموں سے ہیں تعداد میں وکیل
سائنس، خیر ٹھیک ہے لے لیں مگر حضور
ہم چاہتے ہیں رہنا ریاضی سے دور دور
"کیا سوچتے ہیں آپ زراعت کے باب میں؟"
"ہیں شہر والے اس کے لیے کس حساب میں!
اب تو چلانی پڑتی ہے وزنی مشین بھی
دو چار بیگھے چاہئیے اچھی زمین بھی
پھر آپ کوئی لیجیے مضمون ٹیکنکل"
"یا سب سے اچھی بات کہ کر لیجیے میڈیکل"
اس میں نہیں ہے کام ریاضی کا سوچیے
پیشانی سے پسینے کو خوش ہو کے پونچھیے
ہاں یہ درست آپ نے فرمایا، سچ کہا
ہم ڈاکٹر بنیں گے بہر حال، طے رہا
خدمت کرے جو خلق خدا کی خوشی خوشی
دنیا میں اس سے بڑھ کے نہیں کوئی آدمی

(صنعتی مضمون یا ڈاکٹری)

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

ابن بطوطہ

حصن مسلمہ بن عبدالملک

جولائی سے سلسلہ ملایئے۔

یہ قلعہ ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو گیا ہے اور فقط آثار رہ گئے ہیں۔ پہاڑ کی بلندی پر ایک گھر بنا ہوا ہے۔ باہر ایک گاؤں ہے۔ دو روز چل کر ہم خلیج پر پہنچ گئے۔ پڑھاؤ کا زمانہ تھا اس لیے آگے نہ بڑھ سکے۔ اور اتار کا انتظار کرتے رہے۔

اس کا پاٹ دو میل تھا۔ چار میل ریت میں چلنا پڑا۔ دوسری خلیج کا پاٹ تین میل تھا۔ دو میل پتھروں اور ریت پر چلنا پڑتا تھا۔ تیسری خلیج کا چوڑان ایک میل تھا۔ پوری خلیج کی چوڑائی پانی ریت اور پتھریلی زمین ملا کر بارہ میل ہے۔ برسات میں بارہ میل کا رقبہ زیر آب ہوتا ہے۔ اور کشتیوں میں سفر کرنا پڑتا ہے۔

فنیکا

فنیکا چھوٹا سا محفوظ شہر ہے گرجا اور مکانات اچھے ہیں۔ باغات کی کثرت ہے۔ نہریں بہتی ہیں۔ انگور، آلوچا سیب اور بہی کی پیداوار ہے جسے یہاں کے لوگ سال بھر تک ذخیرہ رکھتے ہیں۔ فنیکا میں شاہی محل بھی ہے جس میں خاتون کا قیام ہے یہیں اس کے چھوٹے بھائی نے ملاقات کی۔ بھائی بہن کی ملاقات کا منظر نہایت شان دار تھا۔ بھائی کا نام کفالی قراس ہے۔ بھائی کے جلوس میں پانچ ہزار سوار تھے۔ سر پر جواہر نگار چھتری کا سایہ تھا۔ دائیں بائیں شاہی خاندان کے پانچ پانچ لڑکے تھے جن کے سروں پر زردی کی چھتریاں سایہ کر رہی تھیں۔ زیوروں سے سجے ہوئے کوتل گھوڑے فوجی جوانوں کی طرح پرا باندھے چل رہے تھے ہر دستے میں دو سو گھوڑے تھے جن پر ایک افسر تھا۔ افسروں کے سامنے دس مسلح سوار تھے اور ہر سوار کے ساتھ کوتل گھوڑا تھا۔ نقارے بج رہے تھے نفیریاں سریلی آواز میں گیت گا رہی تھیں۔

خاتون کی آن بان بھی دیکھنے کے لائق تھی۔ پانچ سو غلام اور زرنگار لباس والی چھوکریاں ساتھ تھیں۔ خاتون جواہر نگار لباس سے آراستہ تھی۔ سر پر مرصع تاج، گھوڑوں پر زرنگار جھولیں خاتون کا ہر زیور اپنی جگہ دیکھنے کی چیز تھی۔ آبادی سے ایک میل میدان میں بھائی بہن کا آمنا سامنا ہوا۔ بھائی بہن کے قریب پہنچا تو گھوڑے سے اتر پڑا رکاب کو بوسہ دیا اور بہن کی پیشانی چومی امیروں کے لڑکے اور شاہی خاندان کے تمام افراد گھوڑوں پر سے اتر پڑے۔

فنیکا سے اگلی بستی میں پہنچے تو بیگم کا بڑا بھائی ولیعہد سلطنت بہن کی ملاقات کے لیے آیا۔ اس کا جلوس چھوٹے بھائی کے مقابلے میں بڑا تھا۔ ترتیب وہی تھی۔ کوتل گھوڑے دائیں بائیں شاہی خاندان کے افراد۔ سر پر زرنگار چھتریاں۔ ملاقات

میں بھی وہی آداب برتے گئے جو چھوٹے بھائی کے ساتھ برتے گئے تھے۔ بھائی بہن دونوں پیادہ پا ہوئے اور ریشمی خیمہ میں چلے گئے۔ دوسرے دن بادشاہ، بادشاہ بیگم آئے اور یہ سب فوجیں ایک جگہ مل گئیں۔

جس وقت خاتون باپ کے حضور میں پہنچی پیادہ پا ہوگئی گھوڑے کی زمین کو بوسہ دیا اور سُم چومے۔

قصرِ شاہی کے پہلے دروازے پر پہنچے تو وہاں ایک سو جوان اور اُن کا افسر موجود تھا۔ یہ ایک چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی مسلمان، مسلمان کا غل مچایا اور اندر جانے سے روک دیا۔ خاتون کے ساتھیوں نے کہا "یہ ہمارے ساتھ میں" مگر افسر نہ مانا اور اس وقت تک ہمیں اندر نہ جانے دیا جب تک شاہی اجازت نامہ نہ آگیا۔ داخلہ ہوا تو ہمیں خاتون کے قریب مکان دیا گیا۔ ساتھ ہی حکم جاری کر دیا کہ شہر میں جہاں کہیں ہم جائیں روکا ٹوکا نہ جائے۔

کھانے کے سامان میں، روٹی، بھیڑیں، مرغیاں، گھی پھل مچھلیاں اور نقدی ہمارے لیے آئی

قسطنطنیہ کا سلطان

سلطان کا نام تکفور ہے۔ اس کا باپ دنیا چھوڑ کر راہب بن گیا ہے۔ صبح شام عبادت کرتا ہے اور گرجا میں زندگی بسر کرتا ہے۔ چوتھے دن سنبل ہندی ہمارے پاس آیا۔ اسے خاتون نے بھیجا تھا۔ سنبل مجھے اپنے ساتھ قصرِ شاہی میں لے گیا جہاں چار دروازوں سے گزرنا پڑا۔ ہر دروازے پر مسلح جوان پہرہ دے رہے تھے۔ پانچواں دروازہ آیا تو سنبل کے چار ساتھیوں نے میری تلاشی لی۔ تلاشی لے چکے تو پانچواں دروازہ کھلا اور چاروں جوان میرے ساتھ ہو گئے۔ دو نے میری آستینیں پکڑ لیں اور دو میرے پیچھے پیچھے ہو گئے۔

دیوانِ شاہی کے وسط میں پانی کا حوض تھا جس کے دونوں طرف رنگ برنگ کے پودے تھے۔ جو لوگ یہاں دائیں بائیں کھڑے تھے چپ کھڑے تھے جیسے پتھر کے ہوں۔ میرے ساتھ والوں نے مجھے تین آدمیوں کے سپرد کر دیا، جنہوں نے میرا دامن پکڑ لیا اور آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ ایک ان میں یہودی تھا۔ یہودی نے عربی زبان میں مجھ سے کہا:۔ "خوف نہ کرو میں تمہارا ترجمان ہوں، سامنے جاؤ تو السلام علیکم کہنا" سلطان تختِ شاہی پر بیٹھا تھا۔ ملکہ سامنے تھی خاتون اور اس کے بھائی تخت کے نیچے تھے۔ چھ دائیں چھ بائیں اور چار سنتری ہتھیار بند پشت پر کھڑے تھے۔ میں نے سلام کیا تو سلطان نے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ اور مجھ سے بیت المقدس صخرہ قمامہ مہد عیسٰے بیت اللحم مدینۃ الخلیل دمشق مصر عراق اور رومی شہروں کا حال پوچھا۔ اس نے میری باتیں پسند کیں اور بیٹوں کو حکم دیا "اس کا اکرام کرو اور اسے امن دو" پھر مجھے خلعت دی ایک گھوڑا نہایت عمدہ جو مکمل سامان سے سجا ہوا تھا مرحمت کیا اور خود بادشاہ نے میرے سر پر چھتری کا سایہ کیا۔ یہ گویا امان کی علامت تھی۔

میں نے استدعا کی کہ مجھے ایک ایسا رہبر دیا جائے جو شہر کے مشہور اور خاص خاص مقامات کی سیر کرائے اور اس عظیم شہر کے عجائبات دکھلائے۔ تاکہ جہاں کہیں میں جاؤں اس عظیم شہر کا ذکر کروں۔ میری یہ درخواست منظور کی گئی۔

چھتری لگا کر اور شاہی گھوڑے پر سوار ہو کر میں جاتا تو میرے ساتھ نقارے بجتے جاتے تھے اور شہنائیاں گیت گاتی

تھیں۔ اور ہر ایک سمجھ لیتا تھا کہ یہ شاہی مہمان ہے۔

شہر

قسطنطنیہ عظیم شہر ہے، دو حصّوں میں بٹا ہوا ہے درمیان میں ایک نہر ہے جس میں جوار بھاٹے کی کیفیت رہتی ہے۔ پہلے زمانے میں اس پر پل تھا اب نہیں ہے۔

شہر کے دو حصّے ہیں، ایک کا نام استنبول ہے دوسرے کا نام غلطہ ہے۔ سلطان، اربابِ دولت اور دوسرے استنبول میں رہتے ہیں۔ غلطہ میں زیادہ تر عیسائی رہتے ہیں جو دوسرے ملکوں کے ہیں۔ ان میں جنیوا کے ہیں، روم اور فرانس کے ہیں اور سب کے سب شاہِ قسطنطنیہ کو سالانہ مقرّرہ رقم دیتے ہیں۔ جب کبھی یہ لوگ بغاوت پر اُتر آتے ہیں تو بادشاہ انھیں سزا دیتا ہے اور جب تک پوپ بیچ میں پڑ کر فیصلہ نہیں کراتا لڑائی بند نہیں ہوتی۔ یہ سب زیادہ تر سوداگر ہیں۔

غلطہ کے بازار اگرچہ اچھے ہیں مگر گندے بہت ہیں یہاں کے گرجا بھی عمدہ ہیں۔

سب سے بڑا گرجا

قسطنطنیہ کا سب سے بڑا گرجا اباصوفیہ ہے۔ ہم اسے اندر سے نہ دیکھ سکے۔ کہتے ہیں کہ اسے حضرت سلیمان علیہ السّلام کے وزیر آصف بن برخیا نے بنوایا ہے۔ اس کا صحن ایک میل سے کم نہیں ہے۔ گرجا کے تیرہ دروازے ہیں اور ایک بہت بڑا پھاٹک لگا ہوا ہے۔ فرش سنگِ مرمر کا ہے درمیان میں چھوٹی سی نہر ہے جو کنیسہ میں سے نکلتی ہے۔ نہر کے دونوں طرف درخت ہیں۔ کنیسہ کے دروازے پر سائبان ہیں جہاں جھاڑو دینے والے اور چراغ روشن کرنے والے رہتے ہیں۔ دروازے کا کھولنا اور بند کرنا ان ہی کے ذمّہ ہے۔ یہ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دیتے۔

کنیسہ کے دروازے پر اس صلیب کا ٹکڑا ہے جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو مصلوب کیا گیا تھا۔ یہ سونے کے اندر بند ہے جس کی لمبائی دس گز ہے۔ کنیسہ کے اندر ہزاروں کی تعداد میں بڑے بڑے راہب اور پادری رہتے ہیں جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی اولاد بھی بتائی جاتی ہے ایک حصّے میں کنواری عورتیں ہیں جن کی تعداد ایک ہزار ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی عبادت کے لیے وقف کر دی ہے۔ صبح صبح روزانہ بادشاہ اور اربابِ دولت زیارت کو کتے ہیں۔ سب سے بڑا راہب جسے پوپِ اعظم کہتے ہیں اور جسے پوری عیسائی دنیا کا روحانی بادشاہ سمجھنا چاہیے سال کے سال حاضری دیتا ہے۔

جب پوپ آتا ہے تو بادشاہ شہر کے باہر تک پیادہ جاتا ہے اور اس کا استقبال کرتا ہے اور جہاں پوپ کا قیام ہوتا ہے ہر روز صبح جا کر سلام کرتا ہے۔

میر انیس

سید سفارش حسین (ادبی)

سیّد سفارش حسین صاحب کی اس کتاب میں مرثیہ کی تعریف و تاریخ، انیس اور ان کے کلام پر تذکرہ و تبصرہ، ان کی شاعری، کلام کا نمونہ اور انیس و دبیر کا موازنہ آپ کو انیس کے سمجھنے میں بہت مدد دے گا۔

قیمت:- ۲/۵۰

جناب مفتوں کوٹوی

سلطان التمش

یہ اب سے کئی سو برس پہلے کی بات ہے۔ بخارا میں ایک سوداگر رہتا تھا، اس کا ایک غلام تھا یہ غلام ایک چھوٹا بچّہ تھا۔ ایک دن سوداگر نے اس کو انگور خریدنے بھیجا۔ انگوروں کے دام بچّے سے کہیں راستے میں گر گئے۔ بچّہ رونے لگا۔ ایک درویش اُدھر آنکلے۔ انھوں نے رونے کا سبب پوچھا بچّے نے اپنی بپتا سنائی۔ درویش نے اسے انگور دلوا دیئے اور ایک انوکھی بات کی! اس بچّے سے عہد لیا کہ "بادشاہ ہو کر عالموں اور فقیروں کی خدمت کرے گا۔ انھیں مدد دے گا۔ ان کی عزت اور توقیر کرے گا"۔ بچّے نے وعدہ کرلیا۔ پر یہ بات اسے عجیب سی لگی۔

اس زمانے میں سوداگری کے اور سامان کی طرح انسان بھی بیچے اور خریدے جاتے تھے۔ آپ کو یقین آئے نہ آئے مگر اس زمانے میں یہ عام رواج تھا۔

تو بھئی یہ ننھا غلام سوداگر کے پاس سے کسی اور امیر کے ہاتھوں بکا۔ بیچنے اور خریدنے کا یہ چکر برابر چلتا رہا۔ ہوتے ہوتے یہ بچہ بغداد کے قاضی کے پاس جا پہنچا۔ ایک رات قاضی صاحب نے ایک محفل منعقد کی۔ اس محفل میں بہت بڑے بڑے بزرگ جمع ہوئے۔ بچہ ساری رات محفل میں کھڑا رہا۔ کبھی شمع کا گل کترتا تھا۔ کبھی مہمانوں کی خبر گیری کرتا تھا۔ کبھی اپنے آقا کی آواز پر دوڑا جاتا۔ جتنے بزرگ اس محفل میں شریک تھے سب اس غلام کی تہذیب اور شائستگی کو غور سے دیکھ رہے تھے جب شمع کا گل کتر کر واپس لوٹتا تو الٹے پاؤں واپس لوٹتا۔ بزرگوں کی طرف پیٹھ نہ کرتا۔ محفل ختم ہوگئی تو قاضی صاحب نے اپنے معزز مہمانوں سے درخواست کی کہ اس بچّہ کے لیے دُعا کریں۔ ہر ایک نے اس ننھے غلام کے لیے دُعائے خیر کی۔

جانتے ہو یہ غلام کون تھا؟ وہی جو ایک دن سلطان شمس الدین التمش کے نام سے ہندوستان کا بادشاہ بنا۔ جس کا انتظام اور جس کا انصاف مشہور ہے۔ رضیہ سلطانہ اسی بادشاہ کی بیٹی تھی۔ اتنی قابل اور اتنی ذہین کہ اہلِ دربار اسی کو سلطان التمش کے بعد اپنا بادشاہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے۔

اصل میں یہ بچہ صحیح معنوں میں غلام تھا بھی نہیں اپنے بھائیوں کے حسد کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کے باپ دادا خالص ترک تھے۔ التمش کا باپ ویلم خاں اپنے قبیلے میں

نامور اور بہادر شخص تھا۔ اس کے جرگہ میں بڑے بڑے بہادر ترک شامل تھے۔ التمش کے اور بھی بھائی تھے۔ لیکن سوجھ بوجھ، عقل و شعور سلیقہ شعاری میں یہ سب سے بڑھ کر تھا۔ اور اپنے باپ کا بڑا چہیتا بیٹا تھا۔ اس لیے اس کے بھائی اس سے حسد رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ کانٹا راہ سے دور ہو جائے۔

ایک روز بھائیوں نے باپ سے شکار کی اجازت لی۔ التمش کو بھی ساتھ لے جانے کی رضامندی حاصل کر لی۔ بھائیوں نے التمش کو ایک سوداگر کے ہاتھ فروخت کر دیا سوداگر التمش کو غلام بنا کر بخارا لے گیا۔ آخر کو اسی سوداگر نے منگوائے تھے جن کے دام التمش کے پاس سے کھو گئے تھے۔

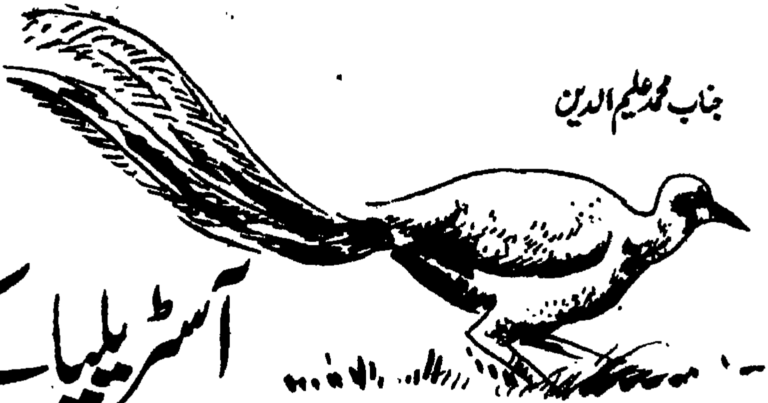
ہوتے ہوتے بغداد کے قاضی حاجی جمال الدین نے اسے خرید لیا اور حاجی صاحب نے ہندوستان کے بادشاہ سلطان قطب الدین ایبک کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ جہاں پہنچ کر اس کی قسمت کا ستارہ چمکنے لگا۔ سلطان کی نظروں نے اس کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا۔ اور ترقی کرتے کرتے سلطان قطب الدین کا میر شکار بن گیا۔ لڑائی میں دشمن کے مقابلہ میں اس نے غیر معمولی بہادری دکھائی۔ بادشاہ نے اسے غلامی سے آزاد کر دیا۔

اس کے بعد التمش نے بڑے بڑے کام انجام دیے اور اپنی قابلیت اور استعداد سے امیر الامراء کے عہدہ پر جا پہنچا۔ سلطان قطب الدین ایبک پر اس کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کا بہت اثر تھا۔ بادشاہ نے اپنی ایک لڑکی سے بیاہ دی۔

سلطان قطب الدین ایبک کی ناگہانی موت کے بعد آرام بن قطب الدین تخت پر بیٹھا۔ لیکن اس سے حکومت سنبھل نہ سکی۔ ایک ہی سال میں حکومت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ آخر امیروں وزیروں نے التمش سے تخت پر بیٹھنے کی درخواست کی وہ اس وقت بدایوں کا حاکم تھا۔ ۶۰۷ھ ہجری میں وہ تخت پر بیٹھا۔ اور اپنا لقب سلطان شمس الدین التمش رکھا۔

التمش بزرگوں اور عالموں کا بہت ادب و احترام کیا کرتا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ مجھے سلطنت بزرگوں کی توجہ اور عنایت سے ملی ہے۔ وہ بڑا منصف مزاج، بہت منتظم بادشاہ تھا۔ رعایا اس کے زمانہ میں بڑے آرام بہت سکھ چین سے رہتی۔ اس کے زمانہ میں علم و ہنر میں بھی بڑی ترقی ہوئی۔ بخارا، غزنی اور خوارزم کے مشہور کاریگر، فنکار، عالم اور صوفی ہندوستان میں کھنچ کر آ گئے۔

سچ ہے انسان اپنی نیکی، شرافت، محنت اور سوجھ بوجھ کی بدولت کہاں سے کہاں پہنچ سکتا ہے غلام سے بادشاہ بن سکتا ہے۔



جناب محمد علیم الدین

آسٹریلیا کے جانور

لائر برڈ THE LYRE BIRD ۔ دنیا کی خوب صورت ترین چڑیوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ خوب صورتی میں اضافہ اس کی حسین دم سے ہوتا ہے۔ یہ دم مور کی دم کی طرح ہوتی ہے۔ لیکن اس کی خوب صورتی کا راز صرف اس کی دم میں ہی نہیں بلکہ رنگ بھی بڑے دلکش ہوتے ہیں اور جس وقت یہ بولتی ہے اس وقت تو سونے پر سہاگا ۔ بہت ہی سریلی آواز کانوں میں رس گھولتی معلوم ہوتی ہے ۔ شاید اسی وجہ سے اس کا نام LYRE BIRD رکھا ہے۔ سب سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والی بات یہ ہے کہ جنگل کے رہنے والے تمام پرندوں اور جانوروں کی بولی کی نقل ہو بہو کر لیتی ہے۔ بلبل کی نغمہ سرائی، کوکیو کی چیخ، کوکا برا کا قہقہہ، وہپ برڈ کی چٹختی ہوئی آواز۔ بیل برڈ کی گھنٹی کی آواز اور اس کے علاوہ ہزاروں قسم کے جانوروں کے گیتوں کی نقل بالکل انھی کی آواز میں کر لیتی ہے۔ حتیٰ کہ کتے کے بھونکنے کی آواز آری چلنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اس کی نقل کلہاڑی چلانے کی آواز اور گزرتی ہوئی کار کے ہارن کی آواز کی نقل باسانی کر لیتی ہے۔ نقال چڑیا اپنی خوبصورتی اور اس نقل کرنے کی مہارت کی وجہ سے دنیا کی عجیب ترین چڑیا ہے۔ جس وقت موڈ میں آتی ہے تو مور کی طرح دم کو پھیلا لیتی ہے اور بہت ہی خوب صورت ڈانس کرتی ہے۔ لیکن یہ چڑیا شرمیلی بہت ہے۔ اسی وجہ سے آسٹریلیا کے گھنے جنگلات میں رہتی ہے۔

مور کے گھونسلے کی طرح یہ بھی اپنا گھونسلا بناتی ہے اور اس میں صرف ایک انڈا دیتی ہے۔

کالے ہنس BLACK SWAN یہ آسٹریلیا کے خاص ہنس ہیں جو صرف یہیں پر پائے جاتے تھے۔ سب سے پہلے انھیں یورپ کے لوگوں نے دیکھا جبکہ ڈچ سیاح جس کا نام ولیم ڈی ولامنگھ تھا۔ آسٹریلیا کی کھوج میں دریائے سوان جو مغربی آسٹریلیا کا دریا ہے پہنچا۔

اس وقت کی مہذب دنیا میں عام لوگوں کو صرف اس بات کا علم تھا کہ ہنس صرف سفید ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے جب ولامنگھ نے ان کالے ہنسوں کے بارے میں بتایا تو کسی کو بھی یقین نہیں آیا۔

کالے ہنس صرف آسٹریلیا میں پائے جاتے تھے۔ لیکن اپنی خوبصورتی اور رنگ کی وجہ سے ساری دنیا میں مقبول ہو کر پہنچ گئے۔ اب اکثر دنیا کے مختلف حصوں میں نظر آتے ہیں۔

یہ پنکھ بالکل کالے ہوتے ہیں چونچ لال ہوتی ہے لیکن چونچ کے نچلے حصے پر ایک پیلی دھاری ہوتی ہے۔ جب کبھی یہ اپنے پروں کو اٹھاتا ہے تو بازوؤں کے نیچے سفید سفید پر بھی نظر آتے ہیں۔ یہ ہمیشہ جوڑے جوڑے رہتے ہیں، کبھی اکیلے نہیں رہتے۔

WEDGETAILD EAGLE تکونی دم والا عقاب

آسمان میں اڑنے والے تمام پرندوں کا بادشاہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جس وقت اپنے بازوؤں کو پھیلاتا ہے تو تین گز سے بھی زیادہ میں پھیل جاتے ہیں۔ تقریباً آٹھ فٹ لمبا چوڑا اور گہرا گھونسلا بناتا ہے۔ عموماً جو درخت بالکل علیحدہ ہوتا ہے اس پر سب سے اونچی جگہ پر گھونسلا بناتا ہے۔ پرندوں میں دلچسپی رکھنے والے تکونی دم کے عقاب کو سنہری عقاب سے زیادہ خوبصورت کہتے ہیں۔ یہ عقاب ہمیشہ تازہ شکار کا گوشت کھاتے ہیں۔ آسٹریلیا کے مختلف علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔

THE BOWER BIRDS بوور برڈ

یہ صرف آسٹریلیا اور نیوگنی ہی میں پائی جاتی ہیں بولیوں کی نقل کرتے ہیں۔ یہ لائر برڈ کی رقیب ہیں لیکن اپنے میڑ کو نمائش کے لیے بہت ہی خوبصورت طریقے سے سجاتی ہیں اور آپس میں راز و نیاز کی باتیں کرتی ہیں۔

یہ چڑیا فن تعمیر سے بہت واقف ہے اپنے گھونسلے کو نیم دائرے کی شکل کا بناتی ہے۔ لکڑیوں کو آپس میں اس طرح سے ملاکر اور جوڑ کر کھڑی کرتی ہے کہ بہت خوبصورت محراب دار دروازہ بن جاتا ہے۔ دروازے بہت ہی ماہر فن مصور کی طرح سے مختلف چمکیلی اور رنگ برنگی چیزوں سے سجاتی ہے۔ جس میں رنگ برنگے پھول، سیپ اور مونگے لاکر سجاتی ہے۔ اس کا قد فاختہ کے برابر ہوتا ہے۔ گہرے اور گھنے جنگلات میں رہتی ہے۔ ان کی ایک قسم تو درختوں پر تقریباً چالیس فٹ کی بلندی پر اپنا "پلے ہاؤس" بناتی ہے اور دوسری قسم زمین پر اپنا مے پول MAYPOLE بناتی ہے۔

THE BROLGA برولگا

لمبا تڑنگا سیدھا سادھا سا برولگا بگلوں کی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ دیکھنے میں تو بگلا بھگت ہی لگتا ہے لیکن اس میں بہت خوبیاں ہیں۔ یہ خوبی اس کا ڈانس ہے اکثر یہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ناچتے ہیں تو دیکھنے والے واہ واہ کرنے لگتے ہیں۔ عموماً سینکڑوں کی تعداد میں گروپ کی شکل میں ڈانس کرنا ان کو بہت پسند ہے۔ بہت ہی موزوں اور متناسب انداز میں حرکت کرتا ہے۔ اپنے بازوؤں کو ایک ساتھ جھکاتا ہے اور ساتھ ہی اٹھاتا ہے اپنے پیروں کو ایک ساتھ ملاکر (جیسے پریڈ کرتے ہیں) اٹھاتا ہے۔ بہت ہی خوبصورت طریقے سے ڈانس کرتا ہے۔

تو بچو! یہ تھے آسٹریلیا کے چند بہت ہی عجیب غریب جانور۔ جن سے مل کر آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ واقعی آسٹریلیا "زولوجیکل میوزیم" ہے۔ ان عجیب و غریب جانوروں اور پرندوں کے علاوہ سینکڑوں قسم کے اور بھی جانور، پرندے اور کیڑے مکوڑے پائے جاتے ہیں ان کے حالات پھر کبھی سنائیں گے۔

جناب شفیع تمنا کلکتوی

ہو جاؤ گے پاس

پڑھو لکھو دل لگا کے بھیّا ہو جاؤ گے پاس
بگڑی قسمت بن جائے گی پوری ہو گی آس

سنو کر پڑھنے لکھنے سے دل اپنا جو بھی چرائے
بات یہ بالکل پکّی ہے اک دن وہ بہت پچھتائے

خون کے آنسو روئے ہمیشہ ترسے بارہ ماس
پڑھو لکھو دل لگا کے بھیّا ہو جاؤ گے پاس

نہیں کوئی دھن علم سے بڑھ کر مان لو کہنا بھائی
جوت نے اس کی ہی ہم سب کو سچّی راہ دکھائی

اسی نے بدلا ہے انساں کے جیون کا اتہاس
پڑھو لکھو دل لگا کے بھیّا ہو جاؤ گے پاس

اس کے لئے اقبال بنے جو "بانگِ درا" وہ پائے
قدر کی اس کی گاندھی نے تو "باپو" وہ کہلائے

کسی کو اس نے بنایا "ٹیگور" کسی کو "تلسی داس"
پڑھو لکھو دل لگا کے بھیّا ہو جاؤ گے پاس

[illegible] ات

[illegible] ہر طرح حال بعافیت ہو۔

[illegible] کی ڈاک سے پیام تعلیم ملا ہے۔

[illegible] سارا ایک ہی نشست میں ختم کر ڈالا۔ بلکہ

[illegible] نے بار بار پڑھے۔

[illegible] انسان کی عظمت اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں

[illegible] ضرورت ہے کہ ہم کسی کے بھیجے اس کی چھوٹی

[illegible] دیتے مگر جب وہ موجود نہیں رہتا تو یہی

[illegible] اس کی عظمت کا نشان بن جاتی ہیں۔

[illegible] ذاکر صاحب اپنے اخلاق اور اپنی عادات

[illegible] تھے۔ یہ بہت ہی اچھا کیا کہ آپ

[illegible] کیا ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] نہیں دیا اس [illegible]

[illegible] تو آخر انسان ہے [illegible]

[illegible]

پیام تعلیم کا جون کا شمارہ [illegible]

زیادہ ہو لوا اکٹھا کر لیا۔ ذاکر نمبر دسمبر [illegible]

ذاکر صاحب کی یاد میں نکالا گیا یہ شمارہ بھی [illegible]

پڑھنے والوں کے لیے بیش تر ایسا سامان [illegible]

جو دوسری جگہ آسانی سے نہ مل پائے گا

نثر اور نظم دونوں حصے ذاکر صاحب

کی طرح ذہن کی ان دیکھی فضاؤں پر [illegible]

نادیدہ گہرائیوں میں اترنے کی صلاحیت [illegible]

ہے کہ حق اس طرح ادا ہوتا ہے جیسے [illegible]

ہو۔ ذاکر صاحب نے جو گنجینہ [illegible]

[illegible] آب تاب کا شعر [illegible]

[illegible] سازمند تصنعات سے [illegible]

[illegible]

... نے اردو کی پہلی یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ قایم کر کے ایک مثال قایم کی تھی اس طرح ذاکر صاحب مرحوم نے ہر حیثیت سے ملک و قوم کی خدمت کر کے ایک مثال قایم کی ہے جو تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھی جائے گی۔ جس طرح آسمان پر "قطب تارا" بنی نوع انسان کو راہ دکھانے کے لیے موجود ہے۔ اسی طرح "ستارۂ دکن" ڈاکٹر ذاکر حسین کی بات ملک کے دکن کے ہر فرد کو راہ دکھانے کے لیے کافی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا "سارا بھارت میرا گھر ہے اور اس کے لوگ میرا کنبہ" لیکن دکن کے لوگ ڈاکٹر صاحب کے قریبی عزیز و رشتہ دار ہیں

جناب عبد اللطیف اعظمی صاحب کا مضمون "ذاکر صاحب کی زندگی ایک نظر" میں پڑھ کر بڑا افسوس ہوا۔ اعظمی صاحب شاید یہ بھول گئے کہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو ملک دکن اور ہندوستان کی پہلی اُردو جامعہ (جامعہ عثمانیہ) نے اپنی گولڈن جوبلی منائی تھی اور اس موقع پر دکن کے مایۂ ناز سپوت ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کو اپنی اعزازی ڈگری ایل ایل۔ ڈی سے سرفراز فرمایا تھا۔ شاید اعظمی صاحب کی نظر میں یہ تاریخ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا کوئی اہم واقعہ نہیں تھا یا موصوف کی نظر میں جامعہ عثمانیہ اور اس کی ڈگری کی کوئی اہمیت و وقعت نہیں ہے۔

اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات اور عرض کر دوں۔ رسالہ پیام تعلیم کے چار صفحات ہر مہینے ذاکر صاحب کی یاد کے لیے وقف کر دیے جائیں اور ان چار صفحات میں ہر ماہ ذاکر صاحب مرحوم کا لکھا ہوا کوئی مضمون یا ذاکر صاحب سے متعلق لکھے گئے مضامین نظم و نثر شایع کیے جائیں تو مناسب ہوگا۔

[illegible]

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میٹرک۔ پی

ذاکر صاحب کے ساتھ کچھ دن گزرے تھے۔ میں جوہر منزل کے باہر والے کمرے میں مرحوم کی کوٹھی سے بالکل متصل رہتا تھا مرحوم تقریباً روزانہ دفتر جاتے وقت اس کمرے میں آتے کچھ دیر بیٹھتے باتیں کرتے اور چلے جاتے اب وہ باتیں یاد آتی ہیں۔

ابراہیم عمادی

ذاکر صاحب کے انتقال پر میں آپ کو خط لکھنا چاہتا تھا لیکن کچھ ایسی مصروفیت اور پریشانی رہی کہ میں بھول گیا۔ اب پیام تعلیم کا تازہ شمارہ آیا تو آپ کے جذبۂ نذر عقیدت پر مبارک باد دینے کو جی چاہا۔ ویسے ہماری زبان سے قبل ہی اطلاع مل چکی تھی لیکن آپ نے اچھا خاصا مواد اکٹھا کر دیا ہے ذاکر صاحب کی روح خوش ہوگی۔

مناظر عاشق ہرگانوی

ذاکر نمبر کے بعد جون کا نمبر جو آپ نے ذاکر صاحب کی یاد میں شایع کیا ہے وہ قابل صد ستایش ہے ہماری دلی تمنا ہے کہ جلد از جلد آپ پیام تعلیم کا ایک خاص نمبر جو ذاکر صاحب کی پوری زندگی پر مشتمل ہو شایع کر کے ممنون کریں اور ذاکر نمبر کو شایع کرنے کے سلسلے میں کیا کوششیں ہو رہی ہیں۔

خدا ذاکر صاحب کے خاندان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے اور اگلے پیام تعلیم میں بھی کچھ ذاکر صاحب کے اوپر ضرور ہونا چاہیے۔

شاہ نواز منیا [illegible]

قلمی دوستی

نام :- عبدالمجید -

عمر :- بارہ سال

مشغلہ :- مذہبی اور علمی ادبی کتابیں پڑھنا پیام تعلیم پڑھنا - قلمی دوستی -

پتہ :- عبدالمجید معرفت کرالا اسٹورس -
من چندرہ - کالی کٹا نمبر ۳

نام :- نیاز احمد میر -

عمر :- پندرہ سال -

مشغلہ :- بچوں کے رسالے پڑھنا (خاص کر پیام تعلیم)، فٹ بال کھیلنا، آٹوگراف (دستخط) ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنا -

پتہ :- ۲۳۷ میر منزل
جواہر نگر - سری نگر (کشمیر)

نام :- شہادت حسین آزاد

عمر تیرہ سال -

مشغلہ :- پیام تعلیم اور کھلونا پڑھنا - فٹ بال کھیلنا، لطیفہ لکھنا اور آئے ہوئے خطوط کا جواب دینا ۔

پتہ :- معرفت ایم پرویز - شری پور نمبر ۳
ڈاک خانہ شری پور نمبر ۳
ضلع بردوان،

نام :- ایم پرویز - عمر ۱۴ سال

مشغلہ :- کہانیاں اور نظمیں لکھنا - آئے ہوئے خطوط کا جواب دینا۔

پتہ :- شری پور نمبر ۳ کالی پہاڑی - بردوان
(مغربی بنگال)

نام :- ایم اختر حسین نعیمی - عمر تیرا سال

مشغلہ :- فٹ بال کھیلنا اور نئے نئے رسالوں کا مطالعہ کرنا -

پتہ :- معرفت منیر عالم ٹھیکیدار - شری پور نمبر ۳
پوسٹ - کالی پہاڑی - (ضلع) بردوان بنگال

نام :- عبدالقوی -

عمر :- پندرہ سال

مشغلہ :- بچوں کے رسالے اور کورس کی کتابیں پڑھنا۔

پتہ :- عبدالقوی مبارکپور
ضلع اعظم گڈھ
یو - پی

اِدھر اُدھر سے

اپالو ۱۱ کی اڑان کا پروگرام ۔ یہ پرچہ جس وقت آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا۔ اپالو نمبر ۱۱ گیارہ کی چاند سے کامیاب واپسی پر دنیا بھر میں جشن منایا جا رہا ہوگا۔ پر اس وقت (۱۵ جولائی) جب ہم یہ نوٹ لکھ رہے ہیں اس خلائی جہاز کو چاند پر بھیجنے کی زبردست تیاریاں ہو رہی ہیں خلائی جہاز کو بار بار دیکھا جا رہا ہے۔ اسے کیل کانٹے سے ٹھیک کیا جا رہا ہے۔ ۱۶ جولائی کو خلا باز اپنی جان پر کھیل کر اس عظیم خلائی مہم پر روانہ ہو جائیں گے۔ ان کی روانگی اور واپسی کا مفصل پروگرام آپ کی دلچسپی کی خاطر یہاں دیا جا رہا ہے۔

ہندوستانی وقت

روانگی	۱۶ جولائی	۷ بج کر دو منٹ شام
زمینی مدار سے نکل کر چاند کے راستے پر	"	۹ بج کر ۴۶ منٹ رات
تیسرے مرحلے کی راکٹ کی علیحدگی۔	"	۱۰ بج کر ۱۲ منٹ رات
لیونر ماڈیول اپالو کے ساتھ جوڑا گیا	"	۱۰ بج کر ۳۲ منٹ
راستے میں حسبِ ضرورت اصلاح یا درستی۔	۱۷ جولائی	۶ بج کر ۴۶ منٹ صبح
خلا باز نو گھنٹے تک آرام کریں گے۔	"	۸ بج کر ۲۲ منٹ
خلا باز دس گھنٹے تک آرام کرتے ہیں۔	۱۸ جولائی	۷ بج کر ۴ منٹ صبح

خلائی جہاز چاند کے بیضوی مدار میں داخل ہوتا ہے۔	۱۹ جولائی	۱۰ بج کر ۲۵ منٹ صبح
لیونر ماڈیول کا خلاباز ایلڈرین اس میں آزمائشی طور پر داخل ہوتا ہے۔	۲۰ جولائی	۲ بج کر ۱۲ منٹ بعد دوپہر
لیونر ماڈیول کا پائلٹ ایلڈرن اب اس میں داخل ہوتا ہے۔	"	۶ بج کر ۴۷ منٹ شام
کمانڈر آرم سٹرانگ لیونر ماڈیول میں داخل ہوتا ہے۔	"	۶ بج کر ۲۰ منٹ شام
لیونر ماڈیول اپالو ۱۱ سے الگ تک۔	"	۱۱ بج کر ۲۰ منٹ رات
لیونر ماڈیول چاند کی سطح پر اترتا ہے۔	۲۱ جولائی	۱ بج کر ۵۳ منٹ بعد دوپہر
کمانڈر آرم سٹرانگ لیونر ماڈیول کی چاند پر اترنے والی سیڑھی پر آتا ہے	"	۱۱ بج کر ۴۷ منٹ صبح۔
چاند پر اتر کر چاند کی چٹانیں اور پتھر جمع کرتا ہے۔	"	۱۱ ۱۱ بج کر ۵۷ منٹ صبح۔
لیونر ماڈیول کا پائلٹ ایلڈرن سیڑھی پر آجاتا ہے اور آرم اسٹرانگ اس کی تصویر لیتا ہے۔	"	۱۲ بج کر ۹ منٹ صبح بعد دوپہر

ایلڈرین چاند کی سطح پر آجاتا ہے۔ ایلڈرین آفتابی آندھی کی گرد جمع کرنے والے آلے کو نصب کرتا ہے۔	۲۱ جولائی	۱۲ بج کر ۲ منٹ
کمانڈر آرم سٹرانگ مزید چٹانیں اور چاند کی مٹی وغیرہ جمع کرتا ہے۔	۲۱ جولائی	۱۲ بج کر ۲۲ منٹ
دونوں خلا باز لیونر ماڈیول کے گرد گھوم کر دیکھتے ہیں کہ اسے اترتے وقت کوئی ضرب نہیں لگی۔	۲۱ جولائی	۱۲ بج کر ۴۴ منٹ
لیونر ماڈیول کا پائلٹ ایلڈرین چاند کی سطح کی کھوج کے بعد واپس داخل ہوتا ہے۔	۲۱ جولائی	۱ بج کر ۱۴ منٹ بعد دوپہر
کمانڈر آرم سٹرانگ بھی لیونر ماڈیول میں داخل ہوتا ہے۔	۲۱ جولائی	۲ بج کر ۱۷ منٹ بعد دوپہر
خلا باز لیونر ماڈیول کو چاند کی سطح سے اوپر اٹھاتے اور اپنی واپسی کے لیے اڑان کرتے ہیں۔	۲۱ جولائی	۱۱ بج کر ۲۰ منٹ صبح
لیونر ماڈیول اپالو ۱۱ جہاز سے جڑ جاتا ہے	۲۲ جولائی	۳ بج کر ۲ منٹ بعد دوپہر
لیونر ماڈیول سے خلا باز نکل کر اپالو ۱۱ میں داخل ہوتے ہیں۔	۲۲ جولائی	۶ بج کر ۲ منٹ شام
خالی لیونر ماڈیول الگ کر دیا جاتا ہے۔	۲۲ جولائی	۷ بج کر ۲ منٹ شام
اپالو ۱۱ چاند کے مدار سے نکل آتا ہے اور زمین کا رخ کرتا ہے۔	۲۲ جولائی	۸ بج کر ۲۶ منٹ رات
سروس ماڈیول کمانڈ ماڈیول سے الگ ہو جاتا ہے	۲۴ جولائی	۹ بج کر ۴۵ منٹ
زمینی کرۂ ہوائی جہاز میں داخل ہوتے ہیں۔	۲۴ جولائی	۱۰ بج کر ۸ منٹ
بحر الکاہل میں مقررہ جگہ پر آ اترتے ہیں۔	۲۴ جولائی	۱۰ بج کر ۲۲ منٹ

روس نے اپنا خلائی جہاز بھیج دیا : لیور پیچھے روس نے اپنا خلائی جہاز ۱۳ جولائی کو بھیج بھی دیا۔ امریکی خلائی جہاز تو سولہ جولائی زمین سے روانہ ہوگا تا! اس وقت تک روسی خلائی جہاز چاند تک پہنچ چکا ہوگا۔

روس کا یہ خلائی جہاز وہاں جا کر کیا کرے گا؟ روس نے تو صرف اتنی بات کہی ہے کہ یہ خلائی جہاز چاند کی فضا کے سلسلے میں تحقیقات کرے گا اور بس۔ لیکن افواہ یہ گرم ہے کہ روس امریکہ سے پہلے چاند کی مٹی اور پتھر کے نمونے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس میں کامیاب ہوا تو اعلان کر دے گا ورنہ نہیں۔

خلائی بندر اللہ کو پیارا ہوا۔ پچھلے دنوں امریکہ نے اپنے خلائی جہاز میں ایک بندر کو بٹھا کر بھیجا تھا۔ اس بندر کو ایک مہینے تک خلا میں چکر لگانا تھا۔ اس کے کھانے پینے کا آرام کرنے کا خاص طور پر انتظام کیا گیا تھا۔ نہ جانے کتنے دنوں تک اس سفر کے لیے اسے تربیت دی جا رہی تھی۔ بے چارہ آٹھ دس دن بھی اس سفر کا لطف نہ اٹھا سکا۔ بیمار ہو گیا اور مجبوراً نیچے اتار لیا گیا اور بندر میاں نے نیچے

اترتے ہی دیکھتے دیکھتے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔ لیے
ان بے چارے کا پوسٹ مارٹم چیر پھاڑ، ہوگا اور ڈاکٹر لوگ
ان کے جسم کے ایک ایک حصے کا معائنہ کریں گے۔ یہ دیکھیں
گے کہ کس وجہ سے وہ اس سفر کی تاب نہ لا سکے۔

دونوں ہاتھوں سے معذور بچے نے میٹرک پاس کرلیا۔

سری نگر (کشمیر) میں ایک بچہ غلام حسین چھٹے درجے میں پڑھتا تھا۔ ایک دن بجلی کا جھٹکا لگا دونوں ہاتھ بے کار ہو گئے۔ کٹوا دیے پڑے۔ پر دل کا مضبوط تھا اور ارادے کا پکا دل برداشتہ نہ ہوا۔ برابر پڑھتا رہا اور پاس ہوتا رہا۔ اس کے ہاتھ تو بے کار ہو گئے تھے۔ اس نے پیروں سے لکھنے کی مشق کی۔ اس بچے نے اس سال میٹرک کرلیا ہے۔ آدمی نا امید نہ ہو، ہمت نہ ہارے جی جان سے اپنے کام میں لگا رہے تو قدرت کوئی نہ کوئی راستہ نکال دیتی ہے

کئی سال ہوئے اپنے دیس کا قومی پرندہ مور کو چنا گیا تھا۔ کتنا اچھا چناؤ تھا۔ جانوروں یا چوپایوں کا چناؤ باقی تھا۔ یہ چناؤ اس سال ہوا اور یہ عزت جناب شیر ببر صاحب کو نصیب ہوئی۔ شیر اور ہاتھی میں مقابلہ تھا۔ زیادہ رائیں شیر کے حق میں تھیں۔ کہتے ہیں یہ شیر کچھ (گجرات) کے جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔

دلی میں ایک شیرنی گولیوں کی نذر

ابھی شیر کے سلسلے میں حکومت کے اعلان کی روشنائی بھی خشک نہ ہوپائی تھی کہ دلی کے چڑیا گھر میں ایک افسوس ناک حادثہ پیش آگیا۔ ایک شیرنی گولیوں کی نشانہ بنادی گئی۔

اس شیرنی کا نام گیتا تھا۔ کل چار برس کی تھی۔ جوان اور خوب صورت زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ ارجن اور اشرفی کی اولاد تھی اور یہ دونوں پنڈت جواہر لال کے ہاں پلے ہوئے تھے۔

گیتا ۱۹۶۵ء میں پیدا ہوئی تھی چڑیا گھر کے ملازموں کے ساتھ کھیلتی تھی بڑی عمر کو پہنچنے کے بعد بھی اس نے اپنے ملازموں کو تکلیف نہ پہنچائی۔ ان لوگوں کا بھی مقابلہ نہیں کیا جنھوں نے اسے گولیوں سے ہلاک کیا۔

ہوا یہ کہ محافظ کی لاپروائی سے پنجرے کا دروازہ کھلا رہ گیا۔ گیتا کو موقع مل گیا سیر سپاٹے کی سوجھی۔ اور چڑیا گھر کے ملازموں کے آنکھوں دیکھتے چڑیا گھر کے احاطے کی دیوار کی طرف چل پڑی۔

صبح کے آٹھ بجے تھے گیتا برابر چلتی رہی چڑیا گھر کے رینجر کے گھر کے پاس سے گذری اور احاطے کی دیوار پھاند سندر نگر نرسری کی طرف چل پڑی نرسری کے مالی برابر کام میں لگے رہے اور جب پولس والے بندوقیں لئے ادھر آئے تو ان کے کان کھڑے ہوئے۔ پھر بھی وہ کام میں لگے رہے۔ گیتا آگے بڑھ کر ایک جھاڑی میں چھپ گئی۔ ادھر چڑیا گھر میں ہل چل مچ گئی پٹاخے چھوڑے گئے۔ ڈھول پیٹے گئے کہ گیتا ڈر کر اور گھبرا کر لوٹ آئے مگر گیتا پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر پولس بلائی گئی اور اسے گولیوں کا نشانہ بنادیا گیا چڑیا گھر میں جانوروں کے مرنے جینے کی واردا تیں ہوتی رہتی ہیں۔ پر گیتا کے لیے تو ڈاکٹر کے سرے نے کر مینگی تک رو پڑے۔

لینن اپنے خاندان کے ساتھ



چار سالہ لینن اپنی بڑی بہن اولگا کے ساتھ



(بہ شکریہ روسی محکمہ اطلاعات ہند)

Payam - i - Taleem

NEW DELHI-25.

اِن کتابوں کو اپنی لائبریری کی زینت بنائیے

کوے دادا	۱/۷۵	دہلی	۱/۵۰
سمندر کے نیچے	۲/-	ہماری پارلیمنٹ	۱/۵۰
سمندر کے کنارے	۱/۱۲	برف کا گھر	۰/۸۷
میرانیس	۱/۲۵	برف کے تیرتے پہاڑ	۰/۳۷
میر تقی میر	۱/-	آستین کا سانپ	۰/۵۰
ابّو خاں کی بکری	۲/۵۰	الٹی دوا	۰/۵۰
انوکھا عجائب خانہ (مکمل)	۱/۸۰	بادشاہ کے کپڑے	۰/۵۰
تین اناڑی	۱/۴۰	زمین کی گردش	۰/۵۰
ستاروں کی سیر	۱/۷۵	سونے کی چڑیا	۱/-
خرگوش کا سپنا	۱/۷۵	چمپاوت کا آدم خور شیر	۰/۳۵
جن حسن عبدالرحمن (مکمل)	۴/-	ایک ٹانگ کا بادشاہ	۰/۳۰
آدمی کی کہانی	۱/۲۵	انوکھی ملاقات	۰/۲۵
بڑے دادا کی کہانی	۰/۵۶	چلو مرغابی	۱/-
چٹانوں کی کہانی	۱/۷۵	گلابو چوھیا	۰/۴۵
دادا نہرو	۱/۵۰	ظالم کسان	۰/۳۵

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

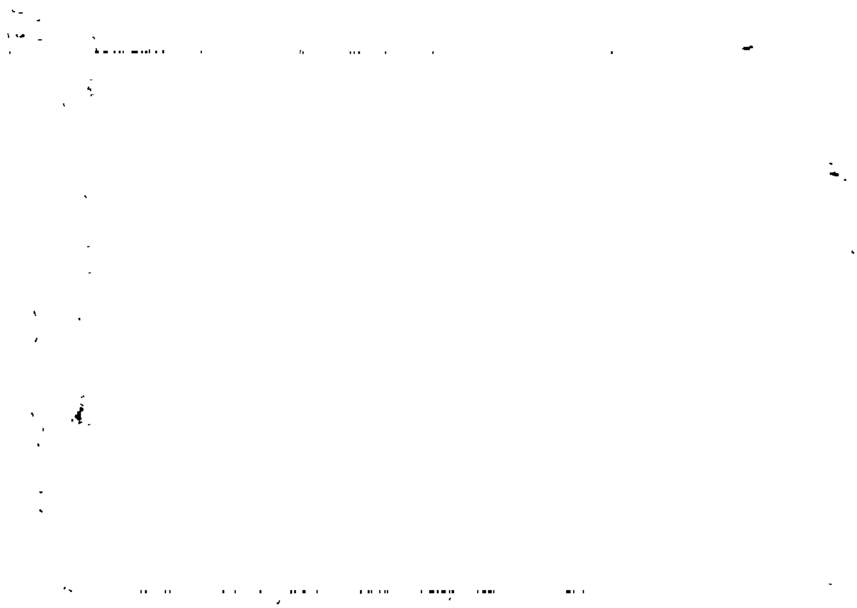
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار دہلی ۶

ٹائیٹل مطبوعہ فائن پریس دہلی

پیامِ تعلیم



چاند پر پہلا قدم (بہ شکریہ محکمہ اطلاعات امریکہ)



تینوں خلاباز : آرم اسٹرانگ ۔ مائکل کولنس ۔ ایڈون ایلڈرین
(بہ شکریہ محکمہ اطلاعات امریکہ)

ریاستہائے میسور، مدھیہ پردیش، جموں و کشمیر اور ہریانہ کے
تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ پیامِ تعلیم نئی دہلی

جلد ۹ ستمبر ۱۹۶۹ء شمارہ ۹

ایڈیٹر:۔ محمد حسین حسان ندوی

دفتر:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

شاخ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶

شاخ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے سالانہ چندہ ۶ روپے

فہرست

بچوں سے باتیں

پچھلی جولائی کو انسان کے قدم آخر چندا ماموں پر پہنچ ہی گئے۔ لوگوں کو حیرت بھی تھی، خوشی بھی تھی۔ تنگ نظر اور کٹر قسم کے مذہبی لوگوں کو غم و غصّہ بھی تھا "بھلا گستاخ انسان چاند تک کیسے پہنچ گیا!"

جہالت کا یہ انداز کوئی نیا نہیں ہے گلیلیو وغیرہ جیسے بہت سے سائنس دانوں اور عالموں کو اس مذہبی تعصّب کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان بے چارے لکیر کے فقیر لوگوں کو یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ کسی مذہب میں علمی اور سائنسی ترقی پر کوئی روک ٹوک نہیں خصوصاً مسلمانوں کے ہاں ــــ تو پوری آزادی ہے۔ خود قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے آسمان و زمین دونوں کو تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس ایک خط آیا ہے۔ اسے ہم اسی پرچے میں شایع کر رہے ہیں۔

پچھلے پرچے میں چاند پر پہنچنے کی خوش خبری ہم نے بہت مختصر لفظوں میں سنائی تھی۔ اصل میں یہ پرچہ پریس جا چکا تھا۔ مگر اس خبر کی خاطر ہم نے چھپائی رکوا دی اور پھر خلائی جہاز صحیح سلامت زمین پر آگیا تو ایک صفحے کی نظم نکلوا کر اس کی جگہ خلائی جہاز کی کامیاب واپسی کی مختصر رپورٹ شایع کر دی۔

اس پرچے میں آپ اس سلسلے کی کئی چیزیں پڑھیے۔ ہمیں اس وقت محمد امین صاحب رہ رہ کے یاد آرہے ہیں۔ انھیں اس موضوع سے خاص دلچسپی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا چاند پر پہنچنے کی کوششوں کے بارے میں انھوں نے مضمونوں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہ آٹھ قسطوں میں چھپا تھا۔ اتنے میں وہ اتھوپیا چلے گئے اور یہ سلسلہ بند ہوگیا۔

اس وقت امین صاحب یہاں موجود ہوتے تو کتنا اچھا مضمون لکھتے۔ اب مجبوراً مجھے لکھنا پڑا ہے۔ میں نے سادہ سی عبارت میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بھی کوشش کی ہے کہ ضروری ضروری باتیں آپ کو معلوم ہو جائیں۔ نہ جانے یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی ہے بتائیے گا۔

اس سلسلے کا سب سے اچھا مضمون تو آپ کے تایا جان یوسف ناظم صاحب کا ہے۔ یہ مزاحیہ بھی ہے۔ معلوماتی بھی ہے۔ نکھری ستھری زبان ہے دل چسپ اندازِ بیان ہے۔ یوں سمجھیے کہ پورے رسالے کی جان ہے۔ اس مضمون کے حاصل کرنے میں میری درخواست کے علاوہ احمد وآتی صاحب کی سفارش اور شاہد علی خاں صاحب کی کوششوں کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔

ایک تیسرا مضمون "چاند کی سیر - چند جھلکیاں" جناب دینا ناتھ گردھر کی نوازش کا نتیجہ ہے۔

پچھلے دنوں ہمارے بہت پرانے مضمون نگار جناب اظہر افسر صاحب آل انڈیا ریڈیو کے ایک سمینار کے سلسلے میں دہلی تشریف لائے تھے۔ ہمیں بھی ملاقات کی عزت بخشی۔ خود مکتبے میں آنے کی زحمت فرمائی۔ بات چیت زیادہ تر پیام تعلیم کے بارے میں رہی۔ ہماری درخواست پر آپ نے چاند پر ایک فیچر لکھنے کا وعدہ فرمایا۔ افسوس ہے کہ یہ وقت پر ہمیں نہ مل سکا۔ ورنہ اس پرچے کی زینت ہوتا۔ انشاء اللہ اگلے پرچے میں پڑھیے گا۔

پیام تعلیم میں بہت دنوں سے غلام حیدر صاحب مضمون اور کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ یہ کہانیاں بہت معیاری ہوتی ہیں۔ آپ کو بھی بہت اچھی لگتی ہیں اگست والی کہانی کھلونوں کی جنگ بچوں نے بہت پسند کی۔

اس مرتبہ وہ آپ کے لیے ایک خاص تحفہ لائے ہیں۔ ایک تصویری کہانی۔ اس کی تصویریں بھی انھوں نے ایک خاص آرٹسٹ سے بنوائی ہیں۔ اس سلسلے میں انھیں بڑی زحمت اٹھانا پڑی ہے۔ یہ کہانی مسلسل چھپے گی۔ بڑے مزے کی ہے۔ آپ کو یقیناً پسند آئے گی۔

'چاند والے مضمونوں کی وجہ سے بعض اچھے اچھے مضمون ڈرامے اور کہانیاں اس پرچے میں شایع نہ ہوسکیں انھیں اگلے پرچے میں پڑھیے گا۔

اس مہینے شاہد علی خاں (انچارج شاخ مکتبہ بمبئی) نے چار خریدار مرحمت فرمائے ہیں۔ دس خریداروں کی بھیمڑی میونسپلٹی کی طرف سے فرمایش آئی ہے۔ دو خریدار جناب بدرالدین صاحب اور ایک خریدار پرانے ساتھی جناب ابراہیم عمادی ندوی جامعی صاحب نے مرحمت فرمایا ہے۔ وحیدالحسن صاحب (داوجین) نے پیام تعلیم اور کتاب نما کے تین خریدار مرحمت فرمائے ہیں۔ ہم ان سب کے شکر گزار ہیں۔

ندولی اور کئی دوسری جگہوں کے حضرات سے معلوم ہوا کہ پیام تعلیم کو اب بہت سے جان گئے ہیں۔ یہ بھی جان گئے ہیں کہ یہ بچوں کے لیے بہت مفید پرچہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان لوگوں کو خریداری پر آمادہ کیا جائے۔ کچھ حضرات نے تو ہمیں اس کام کے لیے اپنے ہاں آنے کی دعوت بھی دی ہے۔ ظاہر ہے کہ نہ میں ہر جگہ پہنچ سکتا ہوں نہ محترم منیجر صاحب۔ پیام تعلیم کے کچھ سرپرست اور قدرداں قریب قریب ہر جگہ موجود ہیں وہ اگر توجہ فرمائیں تو یہ پیام تعلیم پر بہت بڑا احسان ہوگا۔

جناب علقمہ شبلی



چندا بھی آج اپنا ہے

ٹوٹا برسوں کا جادو
چاند نے مانی ہار اپنی
قبضے میں ہے آج اپنے
چاند نگر کی وادی بھی

کل بس دھرتی اپنی تھی
چندا بھی آج اپنا ہے
آج اک روشن سا منظر
کل کا سندر سپنا ہے

آنگن میں اب چندا کے
ہم سب بچے کھیلیں گے
نیلے پیلے پتھر سے
شام سویرے کھیلیں گے

پھول زمیں کے ہیں ہم سب
دھرتی جنت ہے ہم سے
چاند پہ بھی اب پہنچے ہیں
اس کا روپ بڑھائیں گے



جناب یوسف ناظم



کیوں نہیں ہم بھی ہیں

ہم نے طے کیا ہے کہ اب ۲۱ جولائی کو ہم ہر سال اپنی سالگرہ منایا کریں گے۔ ۲۱ جولائی کو ہم پیدا تو نہیں ہوئے لیکن اس دن ہم نے چاند کی سطح پر قدم رکھ دیا۔ تم پوچھوگے کہ مولانا آپ کب تشریف لے گئے تھے چاند پر تو بھئی سیدھا سیدھا جواب یہ ہے کہ وہ آرم اسٹرانگ نہ ہوا تو کیا ہوا۔ ہے تو وہ بھی ہماری طرح کا آدمی۔ ہم تو سمجھتے ہیں، ہم ہی گئے تھے۔ اس چاند پر۔ تین سنگھ نے جب ہمالہ کی چوٹی سر کی تھی تو ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ لوگ حیرت کرتے تھے کہ یہ شخص ۲۹ ہزار فٹ کی بلندی پر چڑھ کیسے گیا۔ یہ ۲۹ ہزار فٹ کا مطلب ہوا تقریباً پانچ میل ——— لیکن اب کہو۔ کہاں پانچ میل اور کہاں دو لاکھ پچاس ہزار میل۔ ایورسٹ سے بھی چاند اتنا ہی دور ہے جتنا چوپاٹی سے ——— لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ چاند کی سطح پر آدمی کے پہنچنے میں کمال سائنس کا ہے۔ آرم اسٹرانگ شاید ہمالہ کی چوٹی پر اب بھی نہ جا سکے اور شاید تین سنگھ چاند کے سفر کے لیے ناقابل قرار دیا جائے۔ یہ الگ الگ میدان ہیں۔ محمد علی کلے بہترین باکسنگ کر سکتا ہے لیکن سوبرس کی طرح بیٹنگ تو نہیں کر سکتا۔ اور نہ سوبرس (سوبرس ۱۰۰ برس نہ پڑھنا) راڈ لیوز کی طرح ٹینس کھیل سکتا ہے۔ اور نہ یہ تینوں عمدہ مترجن بن سکتے ہیں۔

اب رہی چاند پر جانے کی بات تو اتنی بڑی تنخواہ ہمیں دی جاتی بلکہ اس کی ایک چوتھائی بھی پیشگی دے دی جاتی تو ہم چاند کیا سورج پر بھی جانے کو تیار ہو جاتے۔ آرم اسٹرانگ کو ۳۳ ہزار ڈالر دیے گئے ہیں اس چھوٹے سے سفر کے لیے ——— ۹ دن کا سفر چھوٹا نہیں تو کیا بڑا ہوا۔ اور ایک ڈالر ہمارے ساڑھے سات روپے کے برابر ہوتا ہے۔ نکسن صاحب پیسے بچانا چاہتے تو ہم لوگ انھیں سستے میں مل جاتے۔ ہاں ہماری نبض کی رفتار شاید راکٹ کی رفتار کے برابر تیز ہو جاتی اور ہم چاند پر یادگار بن کر رہ جاتے ——— یہ تو آرم اسٹرانگ کی نبض تھی جو راشن کی طرح کنٹرول میں رہی۔ ہم نہیں سمجھے تھے کہ چاند زمین سے اتنی دور ہوگا۔ اب ہمیں اندازہ ہوا کہ ہماری بینائی کتنی تیز ہے ہم دو لاکھ پچاس ہزار میل دور تک اتنی آسانی سے دیکھ لیتے ہیں کہ چاند میں بیٹھی چرخہ کاتتی (چاند میں بیٹھی چرخہ کاتتی ہوئی بڑھیا بھی ہمیں نظر

آجاتی ہے ۔ اور یہ ڈھائی لاکھ میل کا سفر ١٦ رجولائی کو شروع ہوتا ہے اور ٢١ رجولائی کو آدمی وہاں پہنچ بھی جاتا ہے یعنی صرف ١١٢ گھنٹے ٤٣ منٹ میں ۔ یہ آدمی ہے یا چھلاوہ ۔ جس راکٹ میں ہمارے ان تین دوستوں نے سفر کیا وہ کوئی ٢٤ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ رہا تھا ۔ مذاق کی بھی حد ہوتی ہے ۔ ایسا راکٹ ہمیں مل جائے تو ہم بمبئی سے دلّی یوں آیا جایا کریں جیسے اپنے گھر میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے ہیں ۔ ہم جیسے کاہل آدمیوں کو ایسے ہی تیز رفتار راکٹ درکار ہیں ۔

سنا ہے ان تینوں کو جب اِس مختصر سے سفر پر روانہ کیا گیا تو ان کے ہاتھ میں ایک ہدایت نامہ بھی دیا گیا ۔ یہ ساری ہدایتیں ١٨٠ صفحوں پر پھیلی ہوئی تھیں ۔ ١٨٠ صفحے کی کتاب تو سال بھر کے کورس کی کتاب کے برابر ہو گئی ـــــ آرم اسٹرانگ نے اپنی ذاتی عقل صرف اس وقت استعمال کی جب چاند پر اترتے وقت اس کا پاؤں کسی تار پر پڑ گیا تھا ورنہ اس کے سارے کام ہدایت نامے کے مطابق تھے ۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ تینوں آدمی وقت پر سوئے اور وقت پر جاگے ۔ ہم پوچھتے ہیں انھیں نیند کیسے آئی ـــ جب آدمی پہلے وقت کسی نئی جگہ جاتا ہے تو راستے بھر جاگتا ہی رہتا ہے ۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ راستے میں کیا کیا چیزیں ہیں ۔ اگر تمھیں پہلے وقت دلّی سے آگرہ بھیجا جائے تو کیا تم سو جاؤ گے ؟ ناممکن ہے ۔ راستے بھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہو گے کہ سڑک کیسے پیچھے بھاگتی ہے اور ٹرین کے پل پر سے گذرتے وقت کیسی دھڑ دھڑ کی آواز آتی ہے ۔ اور یہ تین حضرات مزے سے سوتے ہوئے تشریف لے گئے ۔ ٹھیک بھی ہے ۔ راستے میں انھیں ملا بھی کیا ہوگا ۔ دو چار ستارے اِدھر اُدھر ملے ہوں گے تو چاند پر جانے والے ان میں کیا دلچسپی لیں گے ۔ بچپن میں شاید انھوں نے خواب بھی دیکھے ہوں گے ۔ آرم اسٹرانگ سے بیرنگ خط لکھ کر پوچھا جائے کہ مسٹر نے کس قسم کے خواب ملاحظہ فرمائے تھے ۔

چند دن پہلے ہم نے کہیں ایک نظم پڑھی تھی ۔ جس میں شاعر کہتا ہے کہ جب میں بچہ تھا تو اپنے ابا کی گود میں چڑھ کر ضد کیا کرتا تھا کہ ابا جی ہمیں چاند لا دو ۔ اور ابا جی ہنس کر ٹال دیتے تھے ۔ آگے چل کر شاعر کہتا ہے کہ آج میرا بچہ مجھ سے چاند کی فرمایش کرے تو میں کیسے ٹال سکوں گا ـــــ ہے نا دلچسپ بات ۔ لیکن شاعر یہ کہنا بھول گیا کہ اگر آدمی خود چاند پر رہنے لگا تو بچے کس چیز کی فرمایش کریں گے ـــــ معلوم نہیں بچوں کے لیے وہاں اِملی کے پیڑ ہیں بھی یا نہیں ۔

ہماری رائے ہے کہ اب اگر تمھارے اسکول سے باہر جانے کا پروگرام بنے تو تم چاند کا نام لکھوا دینا ۔ اور ٹیچر چاہیں کتنا ہی منع کریں ہرگز نہ ماننا ـــــ اتنا البتہ یاد رکھو کہ چاند پر جانے کے لیے امریکہ اب تک ٢٤ ہزار کروڑ ڈالر خرچ کر چکا ہے ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمھارا خرچ بھی اتنا ہی آئے گا ۔ ہمارا خیال ہے ایک آدمی کا ٹکٹ دس بیس کروڑ روپے میں تو آ ہی جائے گا ۔ اس کے علاوہ تمھیں اسکول کی طرف سے کنسیشن بھی ملے گا ۔ پھر کیا رہا ۔ اتنی رقم کا بندوبست تو تم کر ہی لوگے ۔

یہ بات ہمیں بہت پسند آئی کہ راکٹ نے بالکل

ٹائم ٹیبل کے مطابق کام کیا ورنہ تم جانتے ہو آج کل دنیا میں کون وقت کی پابندی کرتا ہے۔ جلسہ اور مشاعرہ تو چھوڑو کھانے کی دعوت بھی دو تو لوگ وقت پر نہیں آتے۔ تین تین وقت تو ان کے لیے کھانا گرم کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے کام بھی بس یونہی اللہ کے بھروسے پر ہو جاتے ہیں۔ لائٹ کا ایک آدھ گھنٹے کے لیے فیل ہو جانا ٹرین کا ایک دو گھنٹے لیٹ ہو جانا۔ بس کا سرے سے غائب ہو جانا۔ الارم گھڑی کا وقت پر نہ بجنا۔ اچھے اچھے رسالوں کا وقت پر نہ چھپنا یہ ساری باتیں کتنی عام ہیں لیکن یہ راکٹ تو غضب کا نکلا۔ منٹ منٹ کی پابندی! پروگرام ہو تو ایسا پکا" یہ نہیں کہ بتایا ایک اور کیا ایک۔ بعض لوگ تو صرف ٹیبل رکھتے ہیں ٹائم رکھتے ہی نہیں۔ ہاں کھانے کے ٹیبل پر البتہ ٹائم کی پابندی ضروری ہے۔ یہ راکٹ جب زمین سے اڑا تو دس سکنڈ تو سمجھو یوں ہی گزر گئے لیکن ۱۵۰ سکنڈ میں یہ زمین سے ۴۴ میل اونچا چلا گیا اور فوراً ۶ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑنے لگا۔ اور دو گھنٹے ۴۴ منٹ ۱۸ سکنڈ گذرے تھے کہ اس کی رفتار ۲۴ ہزار میل فی گھنٹہ ہو گئی۔ ان لوگوں کو آخر اتنی جلدی کیا تھی۔ چاند کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا تھا۔ کمال یہ ہے کہ جب یہ کشتی چاند پر پہنچ گئی تو آرم اسٹرانگ دس گھنٹے تک اس میں بیٹھا رہا۔ چاند پر اترا نہیں —— چاند پر یہ لوگ کوئی ۲۲ گھنٹے رہے۔ اور وہاں کی مٹی اپنے ساتھ لائے۔ اب اس مٹی کو پرکھا جا رہا ہے۔ زمین پر کتنے ہی مٹی کھاتے ہیں۔ کیا چاند کی مٹی بھی اتنی ہی سوندھی ہوگی اور کیا اس کے بھی کھلونے بن سکیں گے۔

جب تک آرم اسٹرانگ اور آلڈرین چاند پر ٹہلتے رہے۔ بے چارہ کالنس تنہا اپنے راکٹ میں بیٹھا رہا۔ ہم تو اس کی ہمت کی داد دیتے ہیں۔ نکسن صاحب نے جب ٹیلیفون پر آرم اسٹرانگ اور آلڈرین سے بات کی تو اس بے چارے کو یوں بھول گئے جیسے وہ ان کا بھیجا ہوا آدمی ہی نہ تھا۔ حالاں کہ کالنس کا کارنامہ بھی کچھ کم بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ اتنی بلندی پر تنہا رہنا کیا معمولی بات ہے۔ کوئی اور ہوتا تو اس کا دم نکل جاتا۔

جنگل میں مور ناچتا ہے تو کوئی دیکھ نہیں پاتا لیکن یہ تینوں چاند پر گئے تو سب کی نظروں کے سامنے آ گئے۔ وہ وہاں کیا کر رہے ہیں۔ زمین پر دیکھنے والوں کو سب کا سب دکھائی دیا۔ اُن کے دل کی حرکت، نبض کی رفتار سبھی زمین پر لکھی گئی۔ اسے کہتے ہیں سائنس کا کمال۔ یہ بنگال کا کالا جادو ہے نہ آندھرا کا بھان متی یہ سب کی سمجھ میں آنے والی سائنس ہے۔

کیا عجب جو چاند پر کوئی سینی ٹوریم بن جائے جہاں کسی لاعلاج مرض کا علاج ہو سکے۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بس اڑان ہی اڑان ہے صرف ایک تجربہ —— دیکھیں اگلے نومبر میں کیا خبر آتی ہے۔ اگلے نومبر میں تو تین سے زیادہ آدمی بھیجے جانے والے ہیں —— ہمارا نمبر پتہ نہیں کب آئے گا۔

چاند پر جانے والوں کی کیو تو زیڈ تک پہنچ کر بھی ختم نہ ہوگی۔

جناب غلام حیدر

نیلم اور فرخ

کچھ دن پہلے کی بات ہے کہ کسی ملک میں ایک ملکہ راج کرتی تھی۔ وہ بڑی بے رحم اور سنگدل تھی لوگوں کو مصیبت اور پریشانی میں دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ اس کی ایک لڑکی تھی۔ یہ لڑکی بہت خوب صورت تھی اپنی خوب صورتی میں ساری دنیا میں مشہور تھی۔ لوگ تو کہتے تھے کہ اتنی خوب صورت کوئی اور لڑکی دنیا میں ہے ہی نہیں۔ اس لڑکی کا نام نیلم تھا۔

دور و نزدیک کے ملکوں کے شہزادے یا بادشاہ شہزادی نیلم کی خوب صورتی کا چرچا سنتے اور اس سے شادی کا پیغام لے کر اس کے ملک میں آتے پر ملکہ ان کے سامنے بہت مشکل شرطیں رکھتی جو انھیں شادی سے پہلے پوری کرنی ہوتیں، اگر ملکہ کا بتایا ہوا کوئی کام شہزادے سے پورا نہ ہوتا تو اسے فوراً قتل کروا دیا جاتا۔

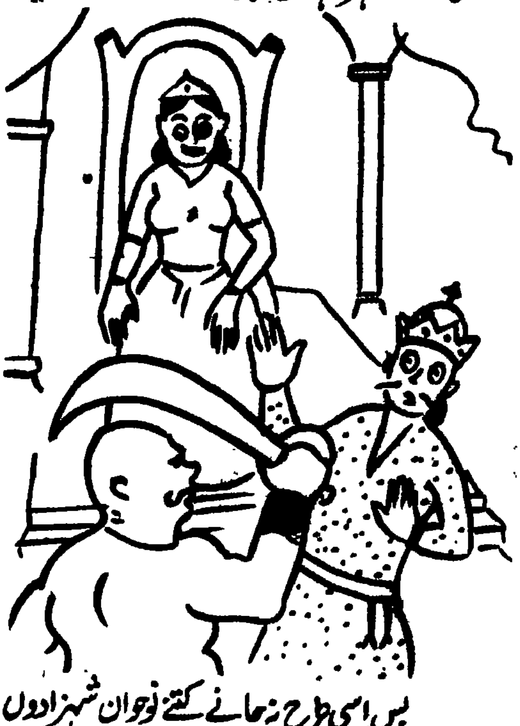




اس طرح نہ جانے کتنے بادشاہ اور شہزادے اس بے رحم ملکہ کے حکم سے قتل کروا دیے گئے۔ وہ انھیں کام ہی اتنے مشکل بتاتی اتنے مشکل کہ کوئی بھی ان کاموں کو پورا نہ کر سکتا۔ ایک شہزادے سے اس نے کہا کہ وہ ایک میل دوری پر ایک دریا سے شہزادی کے پینے کے لیے چھلنی میں ٹھنڈا پانی بھر کر لائے، شرط یہ ہے کہ پانی گرم بالکل نہ ہونے پائے۔ اب بتائیے کہ چھلنی میں پانی کون لا سکتا ہے۔ اور پھر وہ غریب شہزادہ قتل کروا

الی تھے۔ اور یہ تین حضرات مرنے سے ہوئے

اسی طرح ایک بادشاہ کو حکم دیا گیا کہ وہ ایک رات میں شہر کے باہر ایک بڑا سا محل بنوا دے جس میں شہزادی کی شادی ہو سکے، اب وہ بے چارا اگر اپنے ملک میں ہوتا تو شاید وہاں کے سارے راج مزدوروں سے یہ کام ایک رات میں کروا بھی لیتا مگر اس وقت تو وہ دوسرے ملک میں تھا۔ یہاں اسے ایک بھی مزدور نہ مل سکا۔ ظاہر ہے محل نہ بن سکا اور وہ قتل کروا دیا گیا

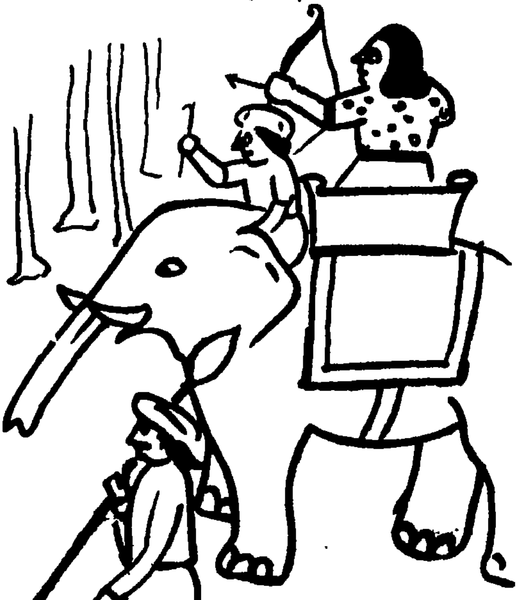


بس اسی طرح نہ جانے کتنے نوجوان شہزادوں اور بادشاہوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ ملکہ اتنی سنگ دل اتنی مغرور ہو گئی تھی کہ اسے کسی پر رحم نہ آتا۔ بس جو بھی اس کے ملک میں شہزادی سے شادی کرنے کے خیال سے آیا اور اُس نے اپنی جان سے ہاتھ دھوئے۔

اُسی زمانہ میں کہیں بہت دور کے ملک میں ایک شہزادہ تھا یہ بڑا ضدی تھا۔ اس کا نام فرخ تھا اس کے ماں باپ اس سے پیار بھی بہت کرتے تھے اور وہ لاڈلا بھی بہت تھا۔ فرخ کا کام تھا دن بھر شکار کھیلنا اور گھوڑ دوڑوں میں حصہ لینا۔ بس یہی اس کا دن رات کا شغل تھا۔

پر شہزادہ فرخ بڑا بہادر بھی تھا۔ کتنی ہی بار شکار کھیلتے کھیلتے اسے جنگل میں رات ہو ہو گئی، وہ رات بھر جنگلی جانوروں سے اکیلا لڑتا بھڑتا صبح کو گھر لوٹتا۔ اُس کے ماں باپ اپنے لڑکے کی اِن بہادری کے کارناموں سے پریشان بھی رہتے تھے۔ مگر فرخ ضدی اتنا تھا کہ وہ کسی کی بات ہی نہ سُنتا تھا۔ ایک بار ایسے ہی شکار پر وہ اکیلا ایک آدم خور شیر سے بھڑ گیا۔

ہوا یہ کہ وہ ہاتھی پر بیٹھا جنگل میں شیر کی



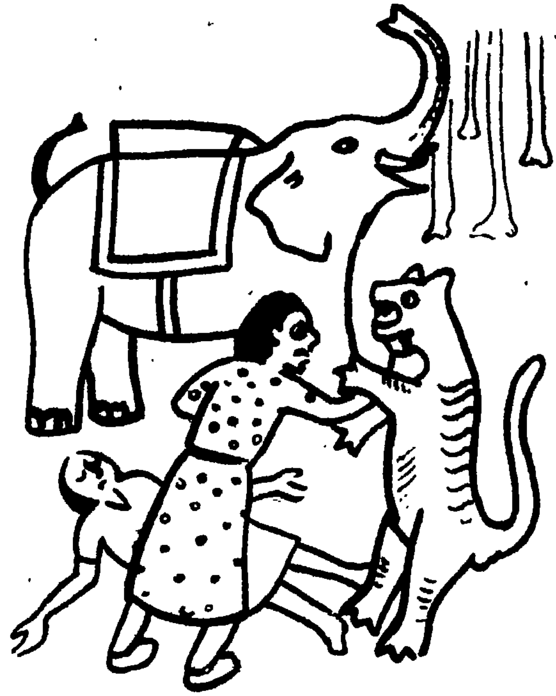
تلاش میں گھوم رہا تھا کئی اور شکاری اس کے ساتھ تھے

فوج کے سپاہی بھی تھے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، مگر تھوڑی دیر میں، اسی شیر کی کھوج میں سب جنگل میں ادھر اُدھر بکھر گئے۔ گھومتے گھومتے ایک دوسرے سے بہت دور نکل گئے۔ بس ایک دم وہ شیر ایک جھاڑی سے نکل کر شہزادے کے ہاتھی جھپٹ پڑا۔ آپ جانیئے شہزادہ تو بڑا باہمت تھا۔ وہ بھاگا نہیں، فوراً اپنی تلوار کھینچ کر ہاتھی پر سے کود پڑا، پھر کیا تھا دونوں



ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔ دونوں بڑی دیر تک لڑتے رہے۔ فرخ کی تلوار سے شیر کا اگلا پنجہ زخمی ہو گیا بس اس سے شیر غصہ میں بالکل پاگل ہو گیا۔ اس نے فرخ کو اپنی دونوں باہوں میں جکڑ کر کچل ڈالنے کی کوشش کی، فرخ نے بڑی پھرتی سے اپنے بائیں ہاتھ میں اپنا خنجر سنبھال لیا اور دایاں ہاتھ جس میں تلوار تھی بالکل

تیار رکھا۔ شیر جیسے ہی غصہ میں منھ پھاڑ کر دہاڑا، فرخ نے اپنا بایاں ہاتھ خنجر سمیت اُس کے منھ میں ٹھونس دیا،



شیر نے غصہ میں اس کے ہاتھ کو چبا ڈالنا چاہا، مگر جیسے ہی اس نے اپنا جبڑا بند کیا خنجر اس کے منھ میں پھنس گیا، اب وہ اپنے منھ کو نہ اور زیادہ کھول سکتا تھا نہ بند کر سکتا تھا۔ اتنی دیر میں فرخ نے اپنی تلوار سے کئی وار کر ڈالے اور شیر کی کمر اور پیٹ کو تلوار کے زخموں سے چھلنی کر دیا۔ آخر شیر گر پڑا۔ شیر کی ہولناک آوازیں جنگل میں گونج رہی تھیں اور پورے جنگل کے چوپائے اور پرندے ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ بندر یہ آوازیں سن سن کر درختوں پر سے بے ہوش ہو ہو کر ایسے گر رہے تھے جیسے پکے آم ٹپکتے ہیں۔ ان آوازوں کو شہزادے کے ساتھیوں نے بھی سنا اور وہ سب کے سب اس کی طرف دوڑ پڑے





جب انھوں نے آکر دیکھا ہے تو شیر زمین پر پڑا ہوا تڑپ رہا تھا، شہزادہ زخمی ضرور ہو گیا تھا مگر ہوش میں تھا، ایک طرف ہاتھی کا مہاوت بے ہوش پڑا تھا اور ہاتھی بھاگ چکا تھا۔

شہزادہ فرخ کے باپ کو شہزادے کی طرف سے بڑی فکر تھی، شہزادہ اپنی جوانی کے جوش میں ہر خطرہ میں بے دھڑک کود پڑتا تھا شہزادی نیلم کی خوب صورتی کی بات شہزادے فرخ کے کانوں میں بھی پڑی۔ اس کے دوستوں نے شہزادی کی خوب صورتی کی کچھ اس طرح تعریف کی کہ اس نے طے کر لیا کہ وہ ضرور اس سے شادی کرے گا۔ آخر ایک دن فرخ کی ماں اور باپ بیٹھے خود کے بارے میں باتیں کر رہے تھے اتنے میں فرخ

ان کے پاس آیا۔

بادشاہ:۔ میں کہتا ہوں یہ لڑکا اتنا نڈر ہے کہ یہ کسی نہ کسی دن ضرور اپنے آپ کو کسی بہت سخت مصیبت میں پھنسائے گا۔

ماں:۔ میں تو تم سے پہلے ہی کہتی تھی کہ تم اس کو اتنا آزاد مت چھوڑو۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ شہزادہ بھی کمرے میں داخل ہو گیا



فرخ:۔ ابا! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

بادشاہ:۔ ہوں! کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔

فرخ:۔ ابا، میں نے طے کر لیا ہے کہ میں شہزادی نیلم سے شادی کروں گا، چاہے کچھ ہو جائے

میں اس کے ملک جانا چاہتا ہوں۔

یہ کہہ کر فرخ کمرے سے چلا گیا۔ فرخ کی ماں اس خیال سے ہی پریشان ہو گئی کہ اس کا لڑکا اتنے خطرناک کام کا ارادہ کر رہا ہے خود بادشاہ یہ بات سن کر بہت پریشان ہوا۔ شروع میں اس نے سمجھانے کی کوشش کی، فرخ نہ مانا تو وہ ناراض ہو گیا۔

بادشاہ:۔ تم نہیں جانتے کہ آج تک شہزادہ زندہ نہیں لوٹا۔

فرخ:۔ جی، میں خوب جانتا ہوں

بادشاہ:۔ تم بچے ہو، وہ ملکہ بہت بے رحم ہے، تمھیں ضرور قتل کروا دے گی۔

فرخ:۔ مگر میں شادی کروں گا تو نیلم ہی سے کروں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو۔

بادشاہ:۔ تو میں تمھیں اجازت نہیں دیتا تم کہیں نہیں جا سکتے

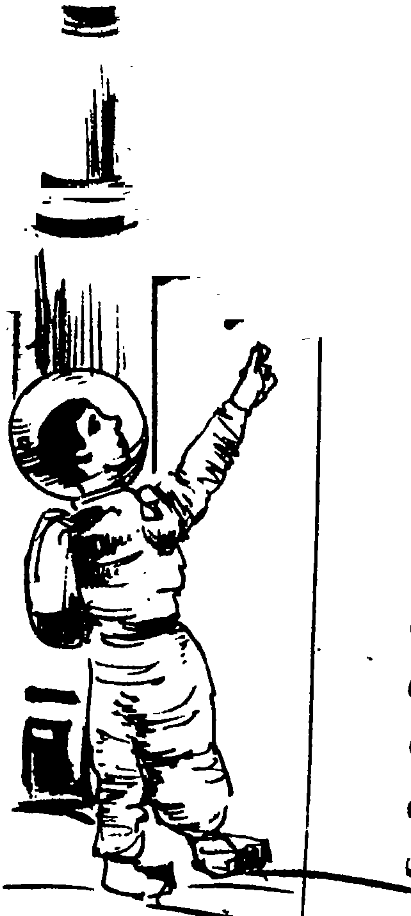
اور بادشاہ غصہ میں وہاں سے چلا گیا۔ (باقی آئندہ)





حافظ باقوی

چندا ماموں



چندا ماموں، چندا ماموں!
آخر کب تک گھورو گے یوں

بات کرو تم مجھ سے ورنہ
پھر نہ منوں گا میں جو روٹھوں

ہنس کر بات کو ٹال رہے ہو
جاؤں میں نہیں سنتا "اوں ہوں"

کوئی گیت ہی آج سناؤ
جس کو سن کر میں جھوم اٹھوں

کل رات ایک سُنا ہے قصّہ
دادی اماں کہتی تھیں یوں

وہ جو نظر آتی ہے تم پر
پرچھائیں سی چندا ماموں

ہیں وہ تمھاری دادی اماں
چرخہ چلاتی گاتی ہیں یوں

چندا میرا پیارا پوتا
اس کی دادی اماں میں ہوں

میری خدمت یہ کرتا ہے
اپنی جان میں اس پر واروں

رہتی دنیا تک یہ چمکے
چمکے زمانہ گذرے جوں جوں

آہا! کتنی پیاری دعا ہے
خوش قسمت ہو چندا ماموں

انساں ڈال رہا ہے ڈورے
پہنچے گا تم پر اک دن جوں توں

جی میں ہے اک راکٹ پر میں بھی
اُڑ کے تمھارے دیس میں پہنچوں

پہلے تو دادی سے ملوں گا
تاکہ انھیں میں دیکھوں بھالوں

اپنی دادی اماں کی بھی
خدمت کر کے دل کی دعا لوں

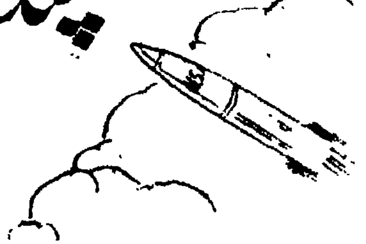
دنیا والوں کے دلوں میں
چندا بن کر میں بھی چمکوں

جناب دینا ناتھ گردھر



چند دلچسپ جھلکیاں

چاند کی سیر



جب ۱۹۵۹ء میں پہلی بار خلا باز خلا میں بھیجے گئے تھے تو امریکہ کے اس وقت کے صدر کنیڈی نے کہا تھا کہ امریکہ کو دس سال کے اندر اندر انسان کو چاند پر اتارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں اس وقت زندہ نہ رہا تو بہشت ہی سے انسان کو چاند پر اترتے دیکھ سکوں گا۔ اور سچ مچ امریکہ کے سائنس دانوں نے دس سال کے اندر ہی انسان کو چاند پر اتار دیا۔ کنیڈی کی بات سچی کر دی۔ غالباً آنجہانی صدر کنیڈی نے یہ منظر بہشت سے دیکھا ہوگا۔

وہ راکٹ جس میں تین خلا باز چاند کے سفر پر روانہ کیے گئے تھے ۱۶ جولائی (ہندوستانی وقت کے مطابق) شام کو سات بج کر ۲ منٹ پر چھوڑا جانے والا تھا۔ لیکن اس میں کچھ دیر ہوگئی۔ آپ جانتے ہیں کتنی؟ صرف ۷۲۴ء سیکنڈ یعنی پون سیکنڈ سے بھی کچھ کم۔ جن ہزاروں لاکھوں لوگوں نے یہ راکٹ زمین سے اٹھتے دیکھا ان میں امریکہ کے سابق صدر لنڈن جانسن اور ہندوستان کے وزیر خارجہ شری دنیش سنگھ بھی تھے۔

خلا باز اپنے ساتھ دنیا کے ملکوں کے ایک سو چھتیس ملکوں کے قومی جھنڈے لے گئے تھے۔ ان میں ہمارے ملک کا ترنگا جھنڈا بھی تھا۔ وہ امریکہ کے تین جھنڈے لے گئے تھے۔ ان میں سے ایک کو چاند پر گاڑ گیا۔ دو واپس لے آئے جو اب امریکہ کی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں لہراتے رہیں گے۔

اٹلی کے ایک پینٹر نیلو گیلی نے اعلان کیا ہے کہ اپولو گیارہ (جس میں چاند پر جانے والے خلا بازوں نے اڑان کی تھی) کے ڈیزائن کی منظوری دینے کے لیے صدر نکسن کے خلاف ساڑھے دس لاکھ ڈالر کا دعوے دائر کریں گے۔ ان کا دعوے ہے کہ اپولو گیارہ ان کی ایک پینٹنگ کی نقل کر کے بنایا گیا ہے۔

اٹلی کے ہی نوجوان مردوں اور عورتوں نے چاند پر انسان کے اترنے پر امریکہ سے زوردار احتجاج کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ چاند دراصل ایک حسین دوشیزہ ہے جس پر نوجوان مردوں کا حق ہے۔

آئی ہے۔ اور یہ مین حضرات مزے سے سوئے

خلاباز جو چیزیں نشانی کے طور پر اپنے ساتھ لے جانے والے تھے، ان میں انجمن اقوام متحدہ کا ایک پوسٹ کارڈ بھی تھا۔ مگر یہ کارڈ نہیں لے جایا جا سکا ایک تو اس لیے کہ یہ کارڈ ایسے وقت کیپ کینیڈی پہنچا جب اسے پوری طرح جراثیم سے پاک کرنا ممکن نہیں تھا۔ دوسرے اس وقت راکٹ کا وزن اس قدر صحیح طور پر پورا کیا جا چکا تھا کہ اب اس میں ایک گرام کے ہزارویں حصے کی بھی مزید بوجھ کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ کارڈ کا وزن نو گرام ہوتا ہے۔

خلاباز آرمسٹرانگ اور ایلڈرین نے چاند پر اترنے سے پہلے انجیل میں سے ایک دعا پڑھی جو ایلڈرین کے باپ نے خاص طور پر منتخب کی تھی۔ یہی دعا دونوں نے چاند پر اتر کر چاند کی سطح پر لکھی بھی تھی۔ اتفاق کی بات کہ یہی دعا پوپ پال نے ایک کپڑے پر اپنے دستِ مبارک سے لکھ کر امریکہ بھیجی جو ان دوسری چیزوں کے ساتھ محفوظ کی گئی ہے جو چاند کے سفر سے متعلق ہیں۔

ایک سولونا ہی بیمہ کمپنی نے اپنی طرف سے اپولو گیارہ کے تینوں خلابازوں کا دس دس ہزار ڈالر کا بیمہ کیا تھا۔

اپولو گیارہ کی اڑان سے پہلی رات کو صدر نکسن نے تینوں خلابازوں کے ساتھ کھانے کا پروگرام بنایا تھا لیکن کیپ کینیڈی کے سائنس والوں نے اس پروگرام کی مخالفت کی اور کہا۔ ان خلابازوں کو پوری طرح جراثیم سے پاک صاف کر لیا گیا ہے، اس دعوت کے بعد پھر جراثیم کے اثرات کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا اور صدر نکسن کو اپنا پروگرام منسوخ کرنا پڑا۔

امریکہ کے صدر نکسن نے ہندوستان سمیت دنیا کے آٹھ دس ملکوں کا طوفانی دورہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ شرط یہ تھی کہ تینوں خلاباز خیریت سے واپس زمین پر اتر آئیں۔ چنانچہ خلابازوں کا راکٹ جب بحرالکاہل میں اترا تو صدر نکسن خود ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ اور اس کے فوراً بعد ان کا لمبا دورہ شروع ہوا۔ اس دورے کے درمیان وہ نئی دہلی میں ۲۳ گھنٹے رہے۔

اپولو گیارہ کی اڑان کے ایک گھنٹہ بعد ۱۶ جولائی کی رات میں ڈھاکہ (پاکستان) کے ریڈ کراس زچہ ہسپتال میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا وزن پونے نو پونڈ تھا۔ بچے کے والدین کی اجازت لے کر ہسپتال کے ڈاکٹروں اور نرسوں نے اس بچے کا نام اپولو رکھا۔ چاند کے اترنے کے تین گھنٹے کے اندر ناگالینڈ اسمبلی کے صدر کے گھر ایک لڑکی پیدا ہوئی تو اس لڑکی کا نام اپولی رکھا گیا۔ ناگالینڈ میں لڑکیوں کے نام کے آخر "لی" ہوتا ہے اسی طرح بیروت کے ایک گاؤں میں ماں باپ نے بچے کا نام اپالو سلیم رکھا۔

اپولو گیارہ ہندوستانی ٹائم کے مطابق ۱۶ جولائی کو سات بج کر دو منٹ پر چھوڑا گیا اور اس کا وہ حصہ جسے چاند پر اترنا تھا۔ ۲۱ جولائی کی رات کو ایک بج کر

۴۹ منٹ پر چاند کی سطح پر اترا۔ اس طرح اس سفر میں آنے
کل ایک سو تین گھنٹے سے کچھ کم وقت لگا۔ لگ بھگ
بائیس گھنٹے کے بعد خلا باز چاند سے اپنے چھوٹے راکٹ
میں واپس چلے اور ساڑھے تین گھنٹے کے بعد اپنے اصل
اپولو گیارہ سے ان کا چھوٹا راکٹ جڑ گیا۔ ۲۴ جولائی کی رات
کو دس بج کر بیس منٹ کے لگ بھگ یہ خلا باز بخیریت زمین
پر واپس آگئے۔

خلا بازوں کے چاند پر جانے کے سلسلے میں صدر
نکسن ایک پریشانی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ چاند پر اترنے کے
بعد صدر نکسن نے خلا بازوں کو وائٹ ہاؤس سے ٹیلی فون
کیا۔ اس وقت خلا باز لگ بھگ چار لاکھ کیلو میٹر دور تھے۔
اب سوال یہ پیدا ہو گیا ہے کہ اس ٹیلی فون کا بل کہاں سے
ادا ہوگا۔ امریکہ کے صدر کے سرکاری اخراجات میں کسی
دوسرے سیارے کو فون کرنے کی اجازت شامل نہیں ہے۔

۱۹۶۱ء میں روس نے چاند پر انسان کو اتارنے
کی کوشش کی تھی جو ناکام رہی تھی۔ اس وقت دہلی کے
ایک نوجوان ستیہ درشن نے قسم کھائی تھی کہ وہ اس وقت
تک اپنے بال اور داڑھی نہیں کٹوائے گا جب تک انسان
چاند پر قدم نہ رکھے گا۔ چنانچہ جیسے ہی اس نے یہ خبر سنی
کے دو امریکی چاند پر اتر گئے ہیں۔ اس نے ۲۱ جولائی کی
صبح کو داڑھی منڈوا دی۔ ۲۵ جولائی کی صبح کو ان کی
بخیریت زمین پر واپسی پر اس نے سر کے بال بھی کٹوا لیے۔

آج سے لگ بھگ ۴۹ سال پہلے (۱۹۲۰ء)
اس وقت کے ایک مشہور سائنس داں پروفیسر رابرٹ
ایچ گوڈرڈ نے پورے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ راکٹ خلا میں
اڑ سکتا ہے۔ نیویارک کے مشہور اخبار نے ۱۳ جنوری
۱۹۲۰ء کے اس سائنس داں کا خوب مذاق اڑایا تھا۔
اور کہا تھا کہ اس سائنس داں کو علم کی اتنی شد بد بھی
نہیں ہے جتنی ہائی اسکول کے لڑکوں کو ہوتی ہے۔
پر اب نیویارک ٹائمس کو اپنی غلطی کا افسوس
ہے اور کھلے دل سے اس اخبار نے اپنی غلطی کا اعتراف
کیا ہے۔

لندن میں ایک مشہور جوہری ہیں مسٹر الوئس عثمان
پرنس آف ویلیز کا تاج انہی نے تیار کیا تھا مسٹر لوئس
عثمان نے اعلان کیا ہے کہ وہ مسز کینیڈی مرحوم کینیڈی
صدر امریکہ کی والدہ کی خدمت میں سونے کا گلوب تحفے
کے طور پر پیش کریں گے۔ ان کے صاحبزادے صدر کینیڈی
نے اعلان کیا تھا کہ ۱۹۷۰ء سے پہلے انسان چاند پر
اتر جائے گا۔

چاند پر جس جگہ خلا بازوں نے قدم رکھا ہے
وہاں گلوب میں ایک ہزار پونڈ کی قیمت کا ایک ہیرا
جڑا ہوگا۔

چاند کی مہم کی اس شاندار کامیابی نے لوگوں
میں بڑا جوش، شوق، امنگ اور ولولہ پیدا کر دیا ہے۔
اور وہ چاند تک پہنچنے کی سوچ رہے ہیں۔ امریکہ کی

ہوائی جہازوں والی مشہور کمپنی پان امریکن کے دفتر میں ان لوگوں نے اتنی بھیڑ لگا دی کہ کمپنی کو ایک چاند بکنگ آفس کھولنا پڑا۔ ا

اب تک ۱۰ ہزار آدمی چاند کے سفر کے لیے اپنی سیٹیں بک کرا چکے ہیں۔ کمپنی کے ڈائرکٹر کا خیال ہے کہ اس صدی کے آخر تک یہ بات ممکن ہو جائے گی۔ کہ عام لوگوں کے لیے بھی اڑان کا انتظام کیا جا سکے۔

اور جب انسان چاند پر رہنے بسنے کا ارادہ کرے گا تو شروع میں بنے بنائے مکان زمین ہی سے لے جانا پڑیں گے۔ یہ ایک ڈھانچے جیسے ہوں گے۔ انھیں ہوا بھر کر پھیلایا جا سکے گا۔ آکسیجن بھی بھری جا سکے گی۔ ایسے مکان بنانے کی تیاری شروع ہو گئی ہے۔ جسے ہوا نکال کر اور پیک کر کے خلائی جہاز کے ذریعے چاند تک پہنچا دیں گے۔ وہاں آکسیجن اور ہوا وغیرہ بھر کر اسے پھیلایا جائے گا۔ اس گھر میں سردی گرمی کو معمول پر رکھنے کا خاص قسم کا سامان لگا ہوگا۔ اس کے اندر انسان ایسے ہی رہ سکے گا جیسے زمین پر رہتا ہے۔ خیال ہے کہ ایسے مکان ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۵ء کے درمیان تیار ہو جائیں گے۔

(باقی مضمون "خلا کے مسافر" صفحہ ۱۴)

آج رات خلا کے مسافر چاند کی مہم سر کر کے خیریت کے ساتھ لوٹ آئے۔ ابھی ابھی ریڈیو نے یہ خبر سنائی ہے اور ہاں ریڈیو نے یہ بھی بتایا کہ اس خوشی میں سارے اسکولوں میں چھٹی ہے۔





جناب عبدالحق پرنسپل جامعہ ہائر سکنڈری اسکول

رابندر ناتھ ٹیگور

۱۴ نومبر ۱۹۱۳ء کو نوبل پرائز کمیٹی نے رابندر ناتھ ٹیگور کے لاثانی شاہکار "گیتانجلی" کو نوبل پرائز کے لیے منتخب کیا۔ کمیٹی کے اس اعلان نے مغرب میں تہلکہ مچا دیا یہ اعزاز اب تک یورپ اور امریکہ والوں ہی کے حصّے میں آیا تھا۔

گیتانجلی کا انگریزی ترجمہ خود ٹیگور نے کیا تھا۔ یہ انگریزی ترجمہ پہلی مرتبہ لندن کی انڈیا سوسائٹی نے شایع کیا تھا۔ کتاب کا مقدمہ آئرلینڈ کے مشہور شاعر ایٹ نے لکھا تھا۔ ایٹ نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے۔

"میں کئی دنوں تک ان نظموں کے انگریزی نسخے کو اپنے ساتھ لیے ریل گاڑیوں، بسوں اور ہوٹلوں میں پڑھتا پھرا۔ بعض وقت مجھے کتاب اس لیے بند کر دینا پڑتی تھی کہ دوسرے اجنبی کیا خیال کریں گے۔ کہ بھلا میں اس کتاب سے اتنا متاثر ہوا ہوں۔

آئیے آج آپ کو اس غیر فانی شاہکار کے خالق ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی زندگی کے کچھ حالات سنائیں۔

رابندر بابو ۷ رمئی ۱۸۶۱ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے آپ اپنے والد بزرگوار مہارشی دیویندر ناتھ ٹیگور۔ چودہویں بچے تھے اور سب سے چھوٹے تھے۔ گھر والے محبت سے انھیں "رابی" کہتے تھے۔

آپ کے والد مہارشی ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ ان کی ساری زندگی ایشور بھگتی اور غریبوں کی مدد کرنے میں گذری۔ اپنے زمانہ کے مشہور عالم تھے بنگالی سنسکرت اور ہندی کے ساتھ ساتھ اُردو اور فارسی زبانیں بھی اچھی خاصی جانتے تھے۔ سچے دیش بھگت اور شب و روز قوم و ملک کی بہبودی کی فکر میں لگے رہتے تھے۔

آپ جانیے زندگی کا سب سے قیمتی زمانہ بچپن ہے جو پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ ٹیگور اسے کبھی نہیں بھلا سکے۔ اور اسّی برس کی عمر میں انھوں نے اپنے بچپن کے حالات ایسے بھولے بھالے اور معصومانہ انداز میں لکھے ہیں جیسے کوئی بچہ اپنی آپ بیتی سنا رہا ہو۔ آپ کی یہ آپ بیتی — "چھیلے بیلا" کے نام سے شایع ہو چکی ہے۔

ٹیگور کے خاندان میں بچوں کی تعلیم و تربیت اسی مخصوص ڈھنگ سے دی جاتی تھی جس . .

آتی ہے ۔ اور یہ تین حضرات مزے سے سوتے

صدیوں ہندوستان کی تہذیب وتمدن کو فخر رہا ہے۔
صبح سویرے اٹھنا۔ منہ ہاتھ دھو کر درشن کے لیے اکھاڑے پہنچ جانا۔ اکھاڑے سے نکلتے ہی اسکول چلے جانا۔

تمام دن اسکول میں گذار کر سہ پہر کو جب یہ بچے واپس آتے تو گھر پر پڑھانے والوں ——— کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور رات کو ۹ بجے انھیں قیدیوں کی طرح سونے پر مجبور کر دیا جاتا۔

ٹیگور بنگال کے ممتاز ترین امیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر اس خاندان میں اپنے بچوں کی تربیت کا ڈھنگ بھی بس نمونے کا تھا۔ بچوں کے لیے نہ تو قیمتی کپڑوں کا اہتمام تھا نہ اچھے اچھے مرغن کھانوں کا نہ عیش و آرام کا وہ تمام سامان فراہم کیا گیا تھا جس نے آج کی نسلوں کو برباد کر دیا ہے۔ خود ٹیگور معمولی قمیص اور پاجامہ پہنتے عام طور سے سلیپروں کا ایک جوڑا ملا کرتا تھا۔ گھر پر زیادہ تر ننگے پاؤں رہتے تھے۔

ٹیگور کی ماں کا انتقال ان کی کم عمری میں ہو گیا۔ ان کے باپ زیادہ تر باہر رہتے تھے۔ خاندان کے تمام بچے گھریلو نوکروں کے رحم و کرم پر رہتے تھے ان نوکروں کو وہ تمام اختیارات حاصل تھے جو اس خاندان کے کسی بزرگ کو حاصل ہو سکتے تھے۔ کیا مجال کہ کوئی بچہ ان کے حکم کے خلاف ایک قدم بھی اٹھا سکے۔ پھر استاد بھی ایسے سخت تھے جن سے بچے کانپتے تھے۔

ٹیگور کی تعلیمی زندگی کا یہ ابتدائی دور تھا جب پہلی بار ان کا دل کتابوں سے اچاٹ ہو گیا اور وہ اپنے کو تنہا محسوس کرنے لگے۔ وہ خود لکھتے ہیں۔

"میں تنہا تھا۔ یہ میرے بچپن کا اہم واقعہ ہے۔ روزانہ دریچہ کے سامنے بیٹھا کرتا تھا اور اس تصور میں کھو جاتا تھا کہ باہر کی دنیا کیا ہوگی۔

مجھے خوب یاد ہے کہ اس پہلے ہی دن سے مجھے فطرت سے بے انتہا لگاؤ بے انتہا انس پیدا ہو گیا تھا۔ میں خوشی سے دیوانہ ہو جاتا تھا۔ جب دیکھتا کہ آسمان پر بادل ایک کے بعد ایک گذرتے چلے جاتے ہیں۔ بچپن کے اس ابتدائی دور میں کچھ ایسا لگتا تھا جیسے میں ایک گہرے اور بہترین مخلص دوست کی رفاقت میں ہوں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کو کس نام سے پکاروں؟ مجھے فطرت سے اتنی شدید اور والہانہ محبت تھی کہ بیان نہیں کر سکتا فطرت ایک غمگسار دوست کی طرح ہمیشہ ساتھ رہتی تھی۔ اور تازہ حسن کا انکشاف کرتی تھی۔"

ابھی ٹیگور آٹھ ہی برس کے تھے کہ ان کے بڑے بھائی "جیوتی ناتھ" نے ان سے کہا۔
"رابی تم شعر کیوں نہیں کہتے"۔

ٹیگور نے پہلی نظم "کنول" پر لکھی۔ نظم کیسی تھی کچھ پتہ نہیں لیکن ایسا ضرور تھا کہ اسے دیکھ کر جیوتی ناتھ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک آئے۔ انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی کی ہمت بڑھائی اور سب سے پہلے بنگالی بحروں کے اتار چڑھاؤ پر تعلیم دی۔

ٹیگور کی شاعری کی یہ ابتدا تھی۔ اس کے بعد جب نارمل اسکول پہنچے تو باقاعدہ سرخ رنگ کی کاپی پر شعر لکھنے لگے۔ اکثر فرصت کے وقت یہ اپنے

شعر جیوتی بابو کو سنایا کرتے تھے۔ جیوتی، جب انھیں اپنے دوستوں سے ملاتے تو ہمیشہ شاعر کی حیثیت سے تعارف کراتے۔ اس ہمت افزائی کا یہ نتیجہ نکلا کہ یہ بہت جلد شاعر کی حیثیت سے روشناس ہو گئے۔

بات کچھ اور آگے بڑھی ٹیگور کی شہرت نارمل اسکول کے سپرنٹنڈنٹ تک پہنچی، انھوں نے ٹیگور کے شعر سن کر انھیں اپنے خاص شاگردوں میں شامل کیا۔ ٹیگور کے والد نے جب ان کے اشعار سنے تو بے قابو ہو گئے۔ اور کہنے لگے۔

"اگر اس ملک کا بادشاہ اس شاعر کی زبان اور ادب کو سمجھتا تو ضرور انعام دیتا۔ چونکہ ایسا نہیں۔ اس لیے میں یہ خدمت انجام دوں گا۔"

مہارشی نے 'رابی' کی طرف ایک چیک بڑھا دیا جس کی قدر وقیمت اس نوبل پرائز سے کہیں زیادہ تھی جو انھیں گیتا نجلی پر ملا تھا۔

ٹیگور کی زندگی جس ادھوری تعلیم کے دور سے گذر رہی تھی وہ ٹیگور کے خاندان کے لیے کسی طرح اطمینان بخش نہ تھی۔ اپنے بڑے بھائی۔ جیوتی ناتھ کے ساتھ انھیں انگلستان تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ یہ ۱۸۷۸ء کی بات ہے۔ ٹیگور کو پہلے تو ایٹن کالج پھر یونیورسٹی کالج لندن میں داخل کرا دیا گیا۔ جہاں وہ کئی مہینے پڑھتے رہے۔

لیکن جلد ہی ان کا دل اچاٹ ہو گیا نسلی تعصب کالے گورے کا فرق۔ غلام اور آقا کا امتیاز۔ ان سب باتوں کو ان کا دل برداشت نہ کر پایا اور ایک مرتبہ پھر انھوں نے اپنا سارا دھیان شعر و شاعری اور ادبی مشغلوں کی طرف لگا دیا۔ اس زمانہ میں انھوں نے نظم سے زیادہ نثر لکھنے کی کوشش کی اور خط لکھنے کا ایک مستقل سلسلہ شروع کیا۔ یہ خط رسالہ 'بھارتی' میں چھپتے رہے۔

انگلستان میں کچھ دن ٹھہرنے کے بعد جیسے گئے تھے ویسے واپس آئے کوئی ڈگری ساتھ نہ لائے۔ خاندان کے لوگ ناراض تھے اس لیے ان کو حکم ملا کہ شیلدان پہنچ کر جاگیر کا انتظام کریں۔

شیلدان کلکتہ کے پاس ٹیگور خاندان کی جاگیر کا ایک گاؤں تھا یہ ان کاموں سے گھبراتے تھے مگر باپ کا حکم تھا۔ مجبوراً شیلدان پہنچے۔ یہاں انھوں نے پہلی بار اس ہندوستان کی غریبی اور افلاس گاؤں والوں کا بھی استحصال اور انسانیت کو گہری نظر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہاں انھیں غریب کاشتکاروں کی سادہ زندگی سے سابقہ پڑا یہاں وہ غریبوں اور مزدوروں کے دکھ درد میں شریک رہے۔ اور جاگیر کا انتظام اتنا اچھا کیا کہ سبھی مطمئن ہو گئے۔ یہاں ان کی شاعری کو نئی زندگی ملی ان کے بہت سے ڈرامے اور گیتوں کے مجموعے اسی شیلدان کی پیداوار ہیں۔

ٹیگور کو موسیقی سے بھی قدرتی لگاؤ تھا۔ آپ نے بچپن سے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ انھوں نے نہ صرف گیت لکھے بلکہ انھیں دلکش دھنوں پر گا کر سنایا۔ انھوں نے اپنے گیتوں کی دھنیں خود بنائیں اُن کی بنائی ہوئی یہ دھنیں رفتہ رفتہ بنگال کی سب سے زیادہ مقبول سنگیت بن گئیں۔ انھیں رابندر سنگیت کا

نام دیا گیا۔ بنگال کی موسیقی میں رابندر سنگیت کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔

ٹیگور کی ایک اور بات سُن کر آپ کو سچ مچ بڑا اچنبھا ہوگا۔ انھوں نے ساٹھ سال سے زیادہ کی عمر میں مصوّری (چترکاری) سیکھی۔ بھلا اتنی عمر کو پہنچ کر انسان کسی نئے فن کو تو کیا سیکھتا اپنے اس فن سے بھی اکتا جاتا ہے جس کا وہ ماہر ہوتا ہے۔ لیکن ٹیگور نے عمر کے اسی حصّے میں ایک نئے فن کو سیکھا، پوری توجہ اور محنت سے سیکھا اور جناب ابھی اسے سیکھے دس بارہ سال بھی نہ ہوئے تھے کہ مصوری کے ماہروں نے انھیں مصوری کے پیغمبر کا درجہ دیا۔ ٹیگور کی تصویریں زیادہ تر قدرتی مناظر پر ہیں جنگل کے جانوروں پر ہیں اور پرندوں پر ہیں۔ ان تصویروں کی تعداد لگ بھگ تین ہزار ہے

ٹیگور ہندوستان کے نہیں دنیا کے بہت بڑے شاعر تھے۔ بہت بڑے سنگیت کار تھے بہت بڑے مصور تھے سب باتوں کے ساتھ ساتھ انسان بھی تھے۔ بہت بڑے انسان، جس سے ملتے برابری سے ملتے۔ بہت اخلاق سے ملتے۔ جس کسی سے ملتے اس کی حیثیت کے مطابق باتیں کرتے۔

انھوں نے ایک زمیندار یا جاگیردار کے گھر میں آنکھ کھولی تھی۔ لیکن ان کی سادہ مزاجی قابلِ رشک تھی۔ سادہ لباس پہنتے تھے کھانے میں کسی قسم کا تکلف نہیں تھا۔ ہمیشہ سادہ غذا کھاتے تھے۔ اپنے شاگردوں کو بھی یہی مشورہ دیتے تھے "سادہ اور قدرتی اصولوں پر زندگی بسر کرو۔"

بہت مہمان نواز تھے گھر پر جو مہمان بھی آتا خواہ کوئی بھی کیوں نہ ہو آپ اس کی طرف بھرپور توجہ دیتے اور آنے والے کو ان سے کبھی شکایت پیدا نہ ہوتی بنگال کے ایک ادیب نے سچ کہا تھا کہ ٹیگور سے ملتے وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس ضائع کرنے کے لیے بے شمار وقت ہے ان کے دروازے ملنے جلنے والوں کے لیے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔

ٹیگور کوئی نیتا قسم کے یا سیاسی آدمی نہیں تھے لیکن انھیں ہندوستان کی آزادی کی اتنی ہی فکر تھی جتنی گاندھی جی کو تھی۔ وہ گاندھی جی کی پرامن سیاسی تحریک کے بہت بڑے حامی تھے۔ اور اس کا اظہار انھوں نے اپنی ایک نظم میں بھی کیا ہے۔

"مہاتما گاندھی کو اس راہ کا سچا رہبر
بننے دو۔ انھیں حقیقی خدمت کے لیے
بلانے دو، قربانی اور ایثار کا خراج
طلب کرنے دو جس کی انتہا محبت اور
تخلیق ہے۔ میں نہایت خوشی سے
ان کے قدموں میں گر جاؤں گا اور ان
کا ہر حکم بجا لاؤں گا۔"

ٹیگور کو معلم (استاد) کی حیثیت سے بہت اونچا مقام حاصل ہے۔ ہندوستان کے پُرانے رشیوں کی طرح انھوں نے ہمارے لیے ایک لازوال ترکہ چھوڑا ہے اور وہ ہے شانتی نکیتن۔ انھوں نے کلکتہ سے نوّے میل کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے اسکول

کی بنیاد ڈالی ۔ یہاں بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی اس اسکول کو چلانے میں انھیں بڑی مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ۔ پوری کا گھر بیچا ۔ بیوی کے زیور فروخت کیے اور تھوڑی بہت امداد باہر سے حاصل کی۔ خدا خدا کر کے اسے دشوا بھارتی کی شکل دی اور اب اس ادارے کو یونی ورسٹی کا درجہ حاصل ہے ۔

ٹیگور نے جن تعلیمی اصولوں پر اس ادارے کی بنیاد رکھی اس کا اندازہ ان کی ایک تحریر سے ہوتا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں ۔

"ہماری تعلیم کا بہترین ادارہ وہ ہوگا جو شہر کے ہنگاموں سے دور پُر امن مقامات پر درختوں کے سایے میں تعلیم دینے کا انتظام کر سکے ۔ استاد پڑھتے رہیں گے اور پڑھاتے رہیں گے ۔ اور شاگرد سکون اور خاموشی کی فضا میں پروان چڑھیں گے ۔ اگر ہو سکا تو باغ اور کھیتیاں بھی ودّیالے کے ساتھ ملحق کر لی جائیں گی ۔ شاگرد کھیتی باڑی میں مدد کریں گے مویشیوں کی دیکھ بھال کریں گے ۔ گائیں دوہنا بھی ان کے فرائض میں داخل ہوگا ۔ فالتو وقت میں وہ زمین کھودیں گے، پیڑ لگائیں گے اور انھیں سینچیں گے ۔ درختوں کے سایے میں کلاسیں لگا کریں گی اور بچوں کو اپنے استادوں کے ساتھ کھلے میدانوں میں پھرنے اور تعلیم حاصل کرنے کا طریقہ بتایا جائے گا ۔ اور اس طرح فطرت کے ساتھ ایک گہرا لگاؤ قایم ہو جائے گا اس میں صرف جذبات کو نہیں بلکہ کام اور محنت کو بھی دخل ہوگا ۔"

لازوال ترکہ کا بانی' لافانی شاہکار گیتانجلی کا خالق اور قومی ترانہ کا جنم داتا ۷ر اگست ۱۹۴۱ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا ۔ ارتھی کے ساتھ کئی میل لمبا جلوس تھا ۔ اس جلوس میں ہندو بھی تھے مسلمان بھی تھے عیسائی بھی تھے اور سکھ بھی تھے ۔ دوسرے ملکوں کے وہ لوگ بھی تھے جو کلکتہ میں رہتے تھے ۔ اور یہ سب شاعر اعظم کے آخری درشن کے لیے بے تاب تھے، بے قرار تھے ۔

موت کی آخری رسمیں آدھی رات کے قریب اس وقت ختم ہوئیں جب آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے زمین کے اس المیہ سے متاثر ہو کر آنسو پونچھتے ہوئے رخصت ہو رہے تھے وہ شاید سوچ رہے تھے کہ

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا ۔

ٹیگور نے زندگی کے آخری سفر کو گیتانجلی میں اس الفاظ میں بیان کیا ہے ۔

"مجھے چھٹی مل گئی ہے ——!

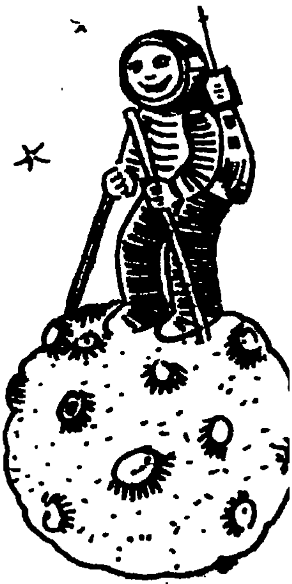
اے بھائیو ۔ مجھے الوداع کہو ۔ میں تم سب کو نمسکار کرتا ہوا رخصت ہوتا ہوں ۔

لیجیے میں اپنے مکان کے سب دعوے چھوڑ کر چابیاں واپس کرتا ہوں ۔ اب ! میں تم سے صرف مہربانی کے آخری الفاظ چاہتا ہوں ۔ ہم مدتوں پڑوسی رہے ۔ مگر میں نے جو کچھ دیا اس سے کہیں زیادہ لے لیا ۔

دن نکل آیا ۔ وہ لیمپ جو میرے اندھیرے کمرے کو روشن کیے ہوئے تھا بجھ چکا ہے ۔ سفر کا پیام آگیا اور میں اپنے آخری سفر کے لیے تیار ہوں ۔"

جناب کیف احمد صدیقی

مبارک باد



مبارک باد تم کو اے امریکن خلا بازو
حقیقت چاند کی تم سے ہوئی روشن خلا بازو

پہنچ کر چاند پر کارِ نمایاں کر دیا تم نے
حقیقت میں ہر اک انساں کو حیراں کر دیا تم نے

بظاہر چاند کی مٹی کی دولت لے کے آئے ہو
مگر باطن میں بے پایاں مسرت لے کے آئے ہو

تمھارے ساتھ ہر انسان کے دل کی دعائیں تھیں
تمھاری کامیابی پر زمانے کی نگاہیں تھیں

ہمیشہ یاد آئے گی تمھاری یہ جواں مردی
تجسس کے لیے تم نے لگا دی جان کی بازی

عجیب انداز سے کی خدمت انسانیت تم نے
بڑھا دی آسماں تک عظمتِ انسانیت تم نے

قیامت تک تمھارا کارنامہ یاد آئے گا
ہر اک انساں تمھارے حوصلوں کے گیت گائے گا

ہر اک انساں تمھاری ہمتوں کی داد دیتا ہے
[illegible]

جناب محمد امین

گھمنڈی اونٹ



"بھائی بندر! کچھ انجیر مجھے بھی دو"

ایک دن کی بات سنیے۔ مغربی افریقہ میں ایک بڑا میدان تھا۔ میدان کے کنارے ایک گیدڑ انگور کی بیلوں میں پھنس گیا۔ یہ گیدڑ ایک چوہے کا پیچھا کر رہا تھا اور وہ اپنی رو میں دیکھ نہیں سکا۔ سیدھا جھاڑی میں گھس گیا۔ جتنا چھڑانے کی کوشش کی اتنا ہی اس میں وہ اور الجھتا گیا۔ آخر بُری طرح پھنس گیا۔ "ہا ہو، ہا ہو، ہا ہو" گیدڑ بری طرح چیخنے چلانے لگا اس کی آواز میدان میں گونج اٹھی۔

دوسرے جانور جانتے تھے کہ گیدڑ ہمیشہ رات میں آوازیں نکالتا ہے لیکن آج دن میں چیخ رہا ہے نہ جانے کیا بات ہے۔ اتفاق کی بات ایک بندر ادھر سے گزر رہا تھا۔ یہ تماشا دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ گیدڑ نے اُسے آواز دی "مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ، اے اچھے بندر میری مدد کرو، اس جھاڑی سے مجھے نجات دلاؤ میں بھی کسی دن تمھاری مدد کروں گا۔"

اپنی تیز نگاہوں سے دیکھ کر بندر فوراً سمجھ گیا کہ کون سی بیل کو کھینچنا ہے۔ انگلیوں سے اس نے راستہ صاف کر دیا اور گیدڑ مزے سے باہر نکل آیا لیکن آزاد ہونے کے بعد اس نے شکریہ بھی ادا نہیں کیا سیدھا بھاگ کھڑا ہوا۔

دوسرے دن بھی بندر ایک درخت پر بیٹھا ہوا پکے پکے انجیر کھا رہا تھا۔ ادھر سے ایک اونٹ گزرا۔ آپ جانیں اونٹ کچھ گھمنڈی ہوتا ہے وہ بندر کی پرواہ بھی نہیں کرتا، سلام کرنا تو بڑی بات ہے۔ اسے تو بس گردن ہلاتا ہوا گزر جاتا ہے ایسے چھوٹے چھوٹے جانوروں کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔

لیکن آج کے دن بندر اپنا سر ہلا ہلا کر میٹھے میٹھے انجیر کھا رہا تھا اونٹ نے سر اٹھا کر شاخوں کو دیکھا۔ منھ میں پانی بھر آیا۔ سوچنے لگا ایک دو ہی انجیر مل جائیں تو منھ ذرا میٹھا ہو جائے گا۔

"بھائی بندر کچھ انجیر مجھے بھی دے دو" اونٹ نے منت سماجت کی۔

بندر نے لپک کر کچھ پکے پکے انجیر توڑے اونٹ نے منھ اوپر اٹھایا اور میٹھے انجیر کھا لیے۔ پھر وہ اپنے راستہ پر چلتا بنا۔ لیکن تھوڑی دیر میں واپس آگیا ایک بار پھر بندر سے اس نے کہا "کچھ انجیر مجھے بھی کھلاؤ"

یہ بات اس نے شریفانہ انداز میں اور نرمی کے ساتھ نہیں کہی۔ یہ نہیں کہا کہ مہربانی کر کے مجھے کچھ انجیر دے دیجیے۔ اس کے باوجود بندر نے بُرا نہ مانا اور پکے پکے انجیر مٹھی بھر اسے دے دیے۔ اس کے بعد اونٹ چلا گیا۔

اے لیجیے تیسری بار وہ پلٹ کر پھر آیا اس نے مطالبہ کیا کہ اور انجیر کھلاؤ۔ اب تو بندر بھی خفا ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ یہ کتنا تو گھمنڈی ہے اور بار بار مجھ سے انجیر مانگتا ہے۔ اس کو شرم نہیں آتی۔ ویسے تو یہ کبھی سلام دعا بھی نہیں کرتا اور آج یہ ضد کر رہا ہے۔

"اب میں تمھارے لیے انجیر نہیں توڑوں گا بس کافی دے دیے۔" لیکن اونٹ پر کوئی اثر نہیں ہوا جیسے چکنا گھڑا ہو۔ اب وہ منت سماجت پر اتر آیا۔

بندر بھی بدتمیزی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔

شرارت پر اُتر آتے ہیں تو دوست میں فرق نہیں کرتے۔ اگر ایک بار ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو پھر خیریت نہیں۔

"بدشکل کہیں کا، چل یہاں سے ذرا اپنی پیٹھ تو دیکھ کیا کُلڑھ سا نکلا ہوا ہے۔ میں تو میاں تمھاری بھدی بھدی صورت دیکھتے دیکھتے تنگ آگیا ہوں" بندر نے حقارت سے اسے دیکھ کر طنزیہ جملوں کی اس پر بوچھار کر دی۔

گھمنڈی اونٹ کا بھی صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ ویسے وہ خود بھی اپنی کُلڑھ سی پیٹھ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ بلکہ اسے شرم آتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کاش اس کی شکل بھدی نہ ہوتی گھوڑے جیسی ہوتی۔

"تم بہت بدشکل ہو" وہ بندر کی بدتمیزی پر بولا "اپنی شکل تو دیکھو۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور وہ بھی سر میں اتنی گڑی ہیں کہ تم کاٹھ کے الو معلوم ہوتے ہو۔ تمھاری ناک تو دکھائی بھی نہیں دیتی پھر بھی سمجھتا ہے کہ تو بڑا خوب صورت ہے؟"

اونٹ کی باتیں بندر کو بہت کھلیں دل میں تو واقعی اسے یہ سوچ کر شرم آئی کہ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں اور کتنی چھوٹی ہیں اور ناک بھی اس کی بیسے نہیں کے برابر ہے۔ پر اب یہی ترکیب تھی کہ وہ بھی اونٹ کو برا بھلا کہے۔ اس نے چڑچڑاتے ہوئے کہا "چل بدشکل! اپنی دم کو تو دیکھو! کیسی چھوٹی کتنی بھونڈی ہے۔ گھوڑے جیسی لمبی اور مضبوط دم تمھیں خدا نے کیوں نہیں دی؟ اور پیچھے کے کوہلے بھی تو غائب ہیں۔ ایسا بھدا جانور تو میں نے دیکھا نہیں۔ بھلا تیری بھی کوئی حیثیت ہے، تو تو بس گھوڑے کی نقل ہے۔ بھدی بہت بھدی سی نقل!

افریقہ کے خشک میدانوں میں گھوڑے اور اونٹ میں بھی بنتی نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو مدمقابل سمجھتے ہیں۔ اس لیے بندر نے آخری بات کہہ کر اونٹ کی جو بے عزتی کی تو یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔

اس نے اپنی لمبی گردن اوپر اٹھائی اور بڑھ کر اپنے منھ میں بندر کی دو پچھلی ٹانگیں پکڑ لیں۔ گرفت مضبوط تھی اور اس کے جبڑے سے کسی طرح وہ نکل نہیں سکتا تھا۔ بدتمیز بندر کو اس نے شاخوں سے نیچے گھسیٹ لیا۔

"چلو ہم اب ایک قاضی کے پاس چلیں جو جو ہمارا جھگڑا چکائے گا۔ تم نے بڑی گستاخی کی ہے اور اور تم کو سزا دینی ضروری ہے" اونٹ نے اپنے قیدی سے کہا۔ اس نے اسے اٹھا کر اپنی پیٹھ پر پڑی ٹوکری میں رکھ لیا تھا۔ ڈگ ڈگ کرتا ہوا وہ آگے بڑھا تاکہ کوئی تیسرا جانور مل جائے تو اس سے سارا ماجرا کہہ سنائے۔

سب سے پہلے ان کو ایک مکڑا ملا اور مغربی افریقہ کے مالی اور نائجیریا کے علاقے میں جو مکڑے ملتے ہیں وہ کافی ہوشیار سمجھے جاتے ہیں "مکڑے! تم ہمارا فیصلہ کرو" اونٹ نے مقدمہ پیش کیا "پہلے تم اس بندر کی کہانی سنو اور تمھیں بتاؤ کہ میں اس کو کیا سزا دوں"

"میں انجیر کے درخت پر بیٹھا ہوا تھا" مکڑے بندر نے اپنی کہانی شروع کی۔ "اونٹ نے انجیر مانگے۔ میں نے اس کو دے دیے۔ دوسری بار اس نے پھر مانگے۔ دوسری بار بھی میں نے انکار نہیں کیا تیسری بار اس نے پھر اصرار کیا۔ میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ مجبوراً مجھے اس کو گالیاں دینی پڑیں۔"

اونٹ نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا "گُل لِڑ جیسی پیٹھ کس نے کہا تھا۔ پھر اس بندر نے کہا تمہاری حیثیت ہی کیا ہے۔ تم تو محض گھوڑے کی نقل ہو۔"

"لیکن اونٹ نے بھی میری کم بے عزتی نہیں کی" بندر نے جواب میں کہا۔ "اس نے مجھے بھی کہا۔ تو اپنی شکل تو دیکھ۔ کیسا بھدا ہے آنکھیں چھوٹی اور سر میں گڑھی ہوئیں۔ پھر اس نے کہا کہ ناک تو تیری غائب ہے۔ کیا یہ بڑے تمیز کی بات تھی؟"

مکڑا بندروں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ کبھی کبھار کیڑوں مکوڑوں کو بھی کھا جاتے ہیں۔ اس نے آگے کی ٹانگ ہلاتے ہوئے کہا۔ "بندر نے سخت بدتمیزی کی ہے۔ اسے جانے نہ دینا۔"

"ایک جج کافی نہیں" بندر نے کہا "چلو کوئی دوسرا جج تلاش کریں۔" اب جو دوسرا جانور ملا وہ ایک شیر تھا۔

"ہمارے درمیان ایک جھگڑا ہے۔ شیر میاں فیصلہ کرو۔ پہلے بندر اپنی بات بتائے گا" اونٹ نے میں سے اپنے قیدی کو دکھاتے ہوئے کہا۔

بندر نے جو کچھ کہ مکڑے سے کہا تھا وہی سب دہرا دیا۔

"اگر میں نے تمیز سے کام نہیں لیا تو اونٹ نے بھی تو بدتمیزی کی" بندر نے دعویٰ کیا "اور پھر یہ کہ میں بہت سے انجیر اسے دے چکا تھا۔ اس کو یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ میری آنکھیں چھوٹی ہیں اور ناک غائب ہے۔ اس کی پیٹھ میں بھی تو کوبڑ نکلا ہوا ہے۔ وہ کیسا عجیب لگتا ہے اور یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ دیکھنے میں اونٹ گھوڑے سے اچھا نہیں لگتا۔"

مکڑے کی طرح شیر بھی بندر کو پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ درخت سے اخروٹ گرا گرا کر اس کے سر پر مارتے تھے۔ لہٰذا اس نے گردن کے بالوں کو ہلاتے ہوئے فیصلہ دیا "بندر نے سخت بدتمیزی کی ہے۔ اسے پکڑے رکھو۔ جانے نہ دینا۔"

اب تو بندر میاں کا برا حال تھا۔ دو جج ان کے خلاف فیصلہ دے چکے تھے۔ انھیں خدشہ تھا کہ شاید اب وہ کبھی بھی آزاد نہ ہو پائے گا "اونٹ بھیا دیکھو تین ججوں کا فیصلہ زیادہ اچھا رہے گا۔ بہ نسبت دو کے" اس نے چالاکی سے کہا۔

"لو دیکھو! یہ سامنے سے ایک گیدڑ آرہا ہے چلو اس کے سامنے مقدمہ پیش کریں" بندر نے جب دیکھا کہ یہ تو وہی گیدڑ ہے جس کو اس نے جھاڑیوں سے نکالا تھا تو خوشی ہوئی۔

"مجھے کوئی انکار نہیں! اونٹ میاں کیا معاملہ ہے۔ میں تمہارا فیصلہ کروں گا" گیدڑ نے کہا اور یہ بات اس نے ظاہر نہ ہونے دی کہ یہ بندر اس کا دوست ہے۔

شرارت پر اُتر آتے ہیں تو دوست میں فرق نہیں کرتے۔ اگر ایک بار ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو پھر خیریت نہیں۔

"بدشکل کہیں کا، چل یہاں سے ذرا اپنی پیٹھ تو دیکھ کیا کُلّڑھ سا نکلا ہوا ہے۔ میں تو میاں تمھاری بھدی بھدی صورت دیکھتے دیکھتے تنگ آگیا ہوں۔" بندر نے حقارت سے اسے دیکھ کر طنزیہ جملوں کی اس پر بوچھار کر دی۔

گھمنڈی اونٹ کا بھی صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ ویسے وہ خود بھی اپنی کُلّڑھ سی پیٹھ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ بلکہ اسے شرم آتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کاش اس کی شکل بھدی نہ ہوتی گھوڑے جیسی ہوتی۔

"تم بہت بدشکل ہو" وہ بندر کی بدتمیزی پر بولا "اپنی شکل تو دیکھو۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور وہ بھی سر میں ایسی گڑی ہیں کہ تم کاٹھ کے اُلّو معلوم ہوتے ہو۔ تمھاری ناک تو دکھائی بھی نہیں دیتی پھر بھی سمجھتا ہے کہ تو بڑا خوب صورت ہے؟"

اونٹ کی باتیں بندر کو بہت کھلیں دل میں تو واقعی اسے یہ سوچ کر شرم آئی کہ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں اور کتنی چھوٹی ہیں اور ناک بھی اس کی جیسے نہیں کے برابر ہے۔ پر اب یہی ترکیب تھی کہ وہ بھی اونٹ کو برا بھلا کہے۔ اس نے چڑچڑاتے ہوئے کہا "چل بدشکل! اپنی دم کو تو دیکھو کیسی چھوٹی کتنی بھونڈی ہے۔ گھوڑے جیسی لمبی اور مضبوط دم تمھیں خدا نے کیوں نہیں دی؟ اور پیچھے کے کوہے بھی تو غائب ہیں۔ ایسا بھدا جانور تو میں نے دیکھا نہیں۔ بھلا تیری بھی کوئی حیثیت ہے، تو، تو بس گھوڑے کی نقل ہے۔ بھدی بہت بھدی سی نقل!

افریقہ کے خشک میدانوں میں گھوڑے اور اونٹ میں بھی بنتی نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو مدمقابل سمجھتے ہیں۔ اس لیے بندر نے آخری بات کہہ کر اونٹ کی جو بے عزتی کی تو یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔

اس نے اپنی لمبی گردن اوپر اٹھائی اور بڑھ کر اپنے منھ میں بندر کی دو پچھلی ٹانگیں پکڑ لیں۔ گرفت مضبوط تھی اور اس کے جبڑے سے کسی طرح وہ نکل نہیں سکتا تھا۔ بدتمیز بندر کو اس نے شاخوں سے نیچے گھسیٹ لیا۔

"چلو ہم اب ایک قاضی کے پاس چلیں جو ہمارا جھگڑا چکائے گا تم نے بڑی گستاخی کی ہے اور تم کو سزا دینی ضروری ہے۔" اونٹ نے اپنے قیدی سے کہا۔ اس نے اسے اٹھا کر اپنی پیٹھ پر پڑی ٹوکری میں رکھ لیا تھا۔ ڈگ ڈگ کرتا ہوا وہ آگے بڑھا تاکہ کوئی تیسرا جانور مل جائے تو اس سے سارا ماجرا کہہ سنائے۔

سب سے پہلے ان کو ایک مکڑا ملا اور مغربی افریقہ کے مالی اور نائجیریا کے علاقے میں جو مکڑے ملتے ہیں وہ کافی ہوشیار سمجھے جاتے ہیں۔ "مکڑے! تم ہمارا فیصلہ کرو۔" اونٹ نے مقدمہ پیش کیا "پہلے تم اس بندر کی کہانی سنو اور تمھیں بتاؤ کہ میں اس کو کیا سزا دوں؟"

"میں انجیر کے درخت پر بیٹھا ہوا تھا" لے کرٹے بندر نے اپنی کہانی شروع کی۔" اونٹ نے انجیر مانگے۔ میں نے اس کو دے دیے۔ دوسری بار اس نے پھر مانگے۔ دوسری بار بھی میں نے انکار نہیں کیا تیسری بار اس نے پھر اصرار کیا۔ میں نے اس پر کوئی توجہ نہ کی۔ وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ مجبوراً مجھے اس کو گالیاں دینی پڑیں۔"

اونٹ نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا "گُل لڑھ جیسی پیٹھ کس نے کہا تھا۔ پھر اس بندر نے کہا تمہاری حیثیت ہی کیا ہے۔ تم تو محض گھوڑے کی نقل ہو۔"

"لیکن اونٹ نے بھی میری کم بے عزتی نہیں کی" بندر نے جواب میں کہا۔" اس نے مجھے بھی کہا۔ تو اپنی شکل تو دیکھ۔ کیسا بھدا ہے آنکھیں چھوٹی اور سر میں گڑھی ہوئیں۔ پھر اس نے کہا کہ ناک تو تیری غائب ہے۔ کیا یہ بڑے تمیز کی بات تھی؟"

مکڑا بندروں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ کبھی کبھار کیڑوں مکوڑوں کو بھی کھا جاتے ہیں۔ اس نے آگے کی ٹانگ ہلاتے ہوئے کہا۔" بندر نے سخت بدتمیزی کی ہے۔ اسے جانے نہ دینا۔"

" ایک جج کافی نہیں" بندر نے کہا۔" چلو کوئی دوسرا جج تلاش کریں۔" اب جو دوسرا جانور ملا وہ ایک شیر تھا۔

"ہمارے درمیان ایک جھگڑا ہے۔ شیر میاں فیصلہ کرو۔ پہلے بندر اپنی بات بتائے گا۔" اونٹ نے ٹوکری میں سے اپنے قیدی کو دکھاتے ہوئے کہا

بندر نے جو کچھ کہ مکڑے سے کہا تھا وہی سب دہرا دیا۔

"اگر میں نے تمیز سے کام نہیں لیا تو اونٹ نے بھی تو بدتمیزی کی۔" بندر نے دعویٰ کیا۔" اور پھر یہ کہ میں بہت سے انجیر اسے دے چکا تھا۔ اس کو یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ میری آنکھیں چھوٹی ہیں اور ناک غائب ہے۔ اس کی پیٹھ میں بھی تو کوبڑ نکلا ہوا ہے۔ وہ کیسا عجیب لگتا ہے اور یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ دیکھنے میں اونٹ گھوڑے سے اچھا نہیں لگتا۔"

مکڑے کی طرح شیر بھی بندر کو پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ درخت سے اخروٹ گرا گرا کر اس کے سر پر مارتے تھے۔ لہٰذا اس نے گردن کے بالوں کو ہلاتے ہوئے فیصلہ دیا۔" بندر نے سخت بدتمیزی کی ہے۔ اسے پکڑے رکھو۔ جانے نہ دینا۔"

اب تو بندر میاں کا برا حال تھا۔ دو جج ان کے خلاف فیصلہ دے چکے تھے۔ انھیں خدشہ تھا کہ شاید اب وہ کبھی بھی آزاد نہ ہو پائے گا۔ " اونٹ بھیا دیکھو تین ججوں کا فیصلہ زیادہ اچھا رہے گا۔ بہ نسبت دو کے" اس نے چالاکی سے کہا۔

"لو دیکھو! یہ سامنے سے ایک گیدڑ آ رہا ہے چلو اس کے سامنے مقدمہ پیش کریں۔" بندر نے جب دیکھا کہ یہ تو وہی گیدڑ ہے جس کو اس نے جھاڑیوں سے نکالا تھا تو خوشی ہوئی۔

"مجھے کوئی انکار نہیں! اونٹ میاں کیا معاملہ ہے۔ میں تمہارا فیصلہ کروں گا۔" گیدڑ نے کہا اور یہ بات اس نے ظاہر نہ ہونے دی کہ یہ بندر اس کا دوست ہے۔

اس لیے اب اونٹ کو کیا پتہ کہ جج معتبر بھی ہے یا نہیں ؟

" جھگڑا ہمارا یہ ہے کہ بندر نے میرے ساتھ سخت بدتمیزی کی ہے" اونٹ نے مقدمہ پیش کیا "بندر پہلے بتائے گا۔ پھر تم کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کتنا سر پر چڑھ گیا تھا۔ دو جج پہلے فیصلہ کر چکے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کی طرح تم بھی یہی کہو گے کہ میں بندر کو رہا کروں"

" میں انجیر کے درخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اونٹ تین بار میرے پاس آیا۔ دو بار میں نے توڑ توڑ کر اس کو انجیر دیئے۔ اس کے بار بار مانگنے سے میں بھی تنگ آ گیا۔ میں نے کہا میں اب نہیں دیتا۔ لیکن اونٹ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ اپنی ضد پر اڑا رہا، اس لیے مجبور ہو کر میں نے اس کو کھری کھری سنائیں" اس نے ایک بار پھر وہی الفاظ دہرا دیے۔ اب اونٹ کی باری تھی۔

اتنے میں گیدڑ کو وہ واقعہ یاد آ گیا۔ جب بندر نے اس کے ساتھ شرافت کا سلوک کیا تھا اور اسے انگور کی بیلوں سے رہا کرایا تھا اس کو فکر تھی کہ اپنے محسن کی کسی طرح ضرور مدد کرنی چاہیے۔

" تمھارے مقدمہ کا فیصلہ کرنے سے پہلے" گیدڑ نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ کہ تم دونوں کہاں کہاں تھے۔ اس سرزمین پر فیصلہ کرنے کا یہی طریقہ ہے"

گیدڑ کی بات ٹھیک تھی۔ اس لیے اونٹ نے بندر کو ٹوکری سے باہر نکالا۔ گیدڑ نے بندر سے کہا کہ تم سیدھے بیٹھ جاؤ۔ اونٹ سے اس نے کہا۔ کہ تم ادھر بائیں طرف کھڑے ہو جاؤ۔

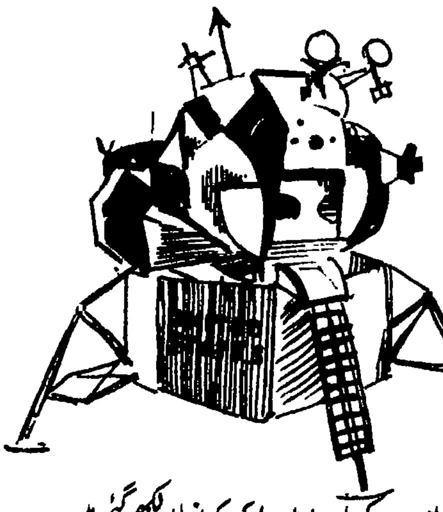
" میرا فیصلہ یہ ہے کہ بندر نے بدتمیزی کی اور اس کی سزا یہ ہے کہ وہ اس درخت کی سب سے اونچی شاخ پر چڑھ جائے۔ اونٹ اپنے راستے پر جا سکتا ہے۔ جہاں تک میرا اپنا معاملہ ہے میں سیدھے اپنے سوراخ میں جاتا ہوں"

بندر آزاد ہو گیا۔ وہ اوپر درخت پر جا بیٹھا۔ اونٹ کتنا ہی خفا ہوا ہے پا نہیں سکتا۔ گیدڑ خود زمین کے اندر اپنی ماند یعنی گہرے سوراخ میں غائب ہو چکا تھا۔ اونٹ اسے بھی نہیں پکڑ سکتا تھا اور ظاہر ہے کہ اب کوئی چارہ نہیں تھا۔ اونٹ تنہا وہاں کھڑا تھا۔

اونٹ کا شمار جانوروں میں کچھ بہت اچھا نہیں۔ اس اونٹ کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ آخر یہ کیا ہو گیا۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ وہ اس بکھیڑے سے تنگ آ چکا تھا۔ اس لیے وہ خاموشی سے میدان کی طرف چلا گیا۔ اسے امید یہ تھی کہ انشاء اللہ آئندہ ایسے بے عزتی کے الفاظ نہیں سنے گا۔ جو اس بندر نے چڑچڑا کر اس کو سنائے تھے۔

حسین حسان ندوی

چاند کی مہم



کئی ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ یونان میں ایک مشہور فلسفی تھا۔ سقراط نام تھا۔ اس نے ایک بار کہا تھا ہماری دنیا کا انسان کنوئیں کا مینڈک ہے۔ ایسا مینڈک جو کنوئیں کی بالکل نیچے کی تہہ میں رہتا ہے۔ پر اب ہمارے سائنس دانوں نے ہمارے خلا بازوں نے سقراط کی اس بات کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ کنوئیں کے اس مینڈک نے بڑی لمبی چھلانگ لگائی ہے۔ چاند تک پہنچ گیا ہے۔ مگر یہ اس کی آخری چھلانگ نہیں ہے۔ وہ اور آگے چھلانگیں لگائے گا۔ زہرہ اور مریخ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ اس سے بھی آگے اور آگے۔

چاند ہمارا پرانا دوست:۔ چاند سے ہماری دوستی ہمارا لگاؤ بہت پرانا ہے۔ ہزاروں سال پہلے جب لوگ یہ بھی نہ جانتے تھے کہ آگ بھی کوئی چیز ہے۔ اس وقت رات کی اندھیاری کو دور کرنے والی چاندنی انھیں کیسی بھلی کتنی غنیمت معلوم ہوتی ہوگی۔ جبھی تو انھیں اس سے اتنا لگاؤ، اتنی محبت ہو گئی۔ اسے دیوی دیوتاؤں کی طرح پوجنے لگے۔ ملکوں ملکوں کے شاعروں نے اپنے گیتوں اپنی نظموں میں ان کے گن گائے ہیں۔ ملکوں ملکوں میں چندا ماموں کے بارے میں لوک کہانیاں لکھی گئی ہیں۔

خود اپنے دیس میں یہ چندا ماموں کتنے پیارے ہیں۔ جب آپ ننھے سے تھے آپ نے امی، دادی یا نانی سے یہ گیت ضرور سنا ہوگا۔

چندا ماموں دور کے — بڑے پکائیں بور کے
آپ کھائیں تھالی میں — ہمیں دیں پیالی میں
پیالی گئی ٹوٹ — چندا ماموں گئے روٹھ

تو آپ کو کیسا اچھا لگتا ہوگا۔ اور کبھی چودھویں رات کے چاند میں کچھ دھبے دھبے سے نظر آتے ہیں۔ ہماری آپ کی بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں "وہ دیکھو چاند میں بڑھیا بیٹھی چرخہ کات رہی ہے۔ کچھ لوگ اسے خرگوش سمجھتے تھے یعنی خرگوش صاحب چاند پر دندنا رہے ہیں۔ چین کے پرانے بہت پرانے لوگوں کے خیال میں تو ان کے دیس کی ایک راج کماری کو دیس نکالا ملا تھا۔ اس نے چاند میں پناہ لی۔ یہ راج کماری آج بھی بیٹھی آنسو بہا رہی ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں جو جس کی سمجھ میں آیا کہہ دیا۔

تو بھئی اور سب سیاروں اور ستاروں کے مقابلے میں ہم سب کی توجہ چاند ہی پر تھی۔ چندا ماموں ہی ہیں ان

سب سے بڑے نظر آتے تھے۔

مگر جوں جوں انسان کا علم بڑھا، عقل بڑی ٹھیک ٹھیک سوچنے کا ڈھنگ پیدا ہوا، چاند تاروں کے بارے میں بھی ان کی معلومات بڑھتی گئیں۔ یہ معلوم ہوا کہ جہاں اور ستارے یا سیارے زمین سے کروڑوں میل دور ہیں۔ چندا ماموں ہم سے (لگ بھگ) کل ڈھائی لاکھ میل دور ہیں۔ اسی لیے اور ستاروں سیاروں کے مقابلے میں اتنے بڑے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر بھی ان تک پہنچنے کی آرزو نہ جانے کب سے آپ انسان کے دلوں میں چٹکیاں لیتی رہی۔

لگ بھگ سو برس پہلے تو سائنسی معلومات اور سائنسی اصولوں کی بنیاد پر چاند پر پہنچنے کے فرضی اور خیالی سفرنامے بھی گھڑ لیے گئے اور پھر بعد میں بہت سے بڑے بڑے سائنس داں تو چاند پر پہنچنے کی پیشین گوئیاں بھی کرنے لگے مگر عام طور پر لوگ اسے خواب و خیال ہی سمجھتے رہے۔

ہوتے ہوتے راکٹ ایجاد ہوا۔ سائنس والوں کی امیدوں کو ایک اور سہارا ملا۔ ایک مشہور سائنس داں نے تو یقین کے ساتھ یہ پیشین گوئی کر دی کہ اب چند ہی دنوں بعد راکٹ خلا کا چکر لگانے لگیں گے۔ یہ اب سے پچاس سال پہلے (۱۹۲۰ء) کی بات اس وقت نیویارک کے مشہور اخبار نے اس بے چارے سائنس داں کا مذاق اڑایا تھا۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ اس وقت کے اچھے پڑھے لکھے لوگوں کا اس کے بارے میں کیا خیال تھا۔ وہ اسے ایک طرح سے دماغ کا خلل سمجھتے تھے۔ مگر سائنس والوں نے ان باتوں سے ذرا بھی اثر نہ لیا۔ بلکہ ان کی کوششوں کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔

روس اور امریکہ کے سائنس داں اِن کوششوں میں خاص طور پر پیش پیش تھے۔ پہلا راکٹ یا اسپتنک بارہ سال (۱۹۵۷ء) پہلے روس ہی نے خلا میں چھوڑا تھا۔ تو یوں کہیے کہ روس اور امریکہ میں ایک طرح سے خلائی دوڑ شروع ہو گئی۔

خلائی پہل:- خلا میں پہلا راکٹ — روسی اسپتنک نمبر ۱
۱۴ اکتوبر ۱۹۵۷ء خلا میں پہلا انسان روسی خلاباز یوری گگارن - ۱۲ اپریل ۱۹۶۱ء خلائی جہاز وستوک -
سیارہ وینس کے مدار میں پہنچنے والا پہلا خلائی جہاز -
امریکی خلائی جہاز میرینر
۱۴ دسمبر ۱۹۶۲ء (تین مہینے کا سفر)
سات مہینے کا سفر طے کر کے سیارہ مارس کے مدار میں پہنچنے والا پہلا خلائی۔ امریکی خلائی جہاز میرینر
۲۸ نومبر ۱۹۶۴ء
چاند کے قریب سے گزرنے والا پہلا راکٹ لونا ۱ روسی ۱۹۵۹ء -
چاند پر پہلا راکٹ جو آہستہ سے اترا۔ لونا ۹
سیارہ وینس پر پہلا راکٹ جو آہستہ سے اترا۔
روسی وینس ۵ اور وینس ۶ - ۱۶ مئی اور ۱۷ مئی ۱۹۶۹ء -
خلا میں پہلی بار دو مصنوعی سیاروں کو ایک ساتھ جوڑنے کا کام بھی روس نے ہی کیا -

چاند پر پہنچنے والا پہلا انسان آرم سٹرانگ (امریکی) بذریعہ اپولو ۱۱ء

اور اب ان خلائی راکٹوں میں خلاباز بھی بھیجے جانے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ دونوں ملکوں کے سائنس دانوں نے اپنی پوری توجہ اس طرف لگا دی ہے۔ دونوں اپنی اڑان سے نئے تجربے حاصل کرتے رہے اور ان تجربوں کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔

غالباً ۱۹۶۱ء میں آں جہانی صدر کینیڈی نے ایک عجیب بات کہی: "دس برس کے اندر امریکی خلاباز چاند پر پہلا قدم رکھیں گے اور میں اگر مر گیا تو بہشت سے اس منظر کو دیکھوں گا۔" یہ بہت بڑا دعویٰ تھا۔ بھلا صدر کینیڈی نے یہ بات کیسے کہہ دی باوجود سائنس اور ٹیکنالوجی کی انتہائی ترقی کے ابھی قدم قدم پر مشکلیں تھیں رکاوٹیں تھیں۔ ایک تو زمین کی کشش آگے بڑھنے میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ دوسرے ہمارے چندا ماموں کی فضا، جانتے ہیں زندگی کے نام سے جلتی ہے۔ پھر زمین چاند کے درمیان دو ڈھائی لاکھ میل کا جو خلائی فاصلہ ہے اس میں سخت زہریلی کائناتی شعاعوں کا اور شہاب ثاقب کی بوچھار کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے سب حیرت میں تھے ڈگدے میں تھے کہ صدر کینیڈی نے یہ مدت کیا جان کر متعین کر دی۔

مگر جناب سائنس دانوں نے بھی گویا قسم کھالی کہ صدر کینیڈی کی بات پوری کر کے دم لیں گے۔ اس موقع پر یہ بھی جان لیجیے کہ صدر کینیڈی نے اتنی بڑی بات یوں ہی نہیں کہہ دی تھی، خوب سوچ سمجھ کر کہی تھی۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ چاند پر پہنچنے کی کوششوں میں روس اور امریکہ دونوں ملک آگے آگے ہیں۔ روس کی طرح امریکہ نے بھی سب سے پہلے چاند کی مہم کو سر کرنے کے لیے قدم اٹھایا۔ اس نے بنیادی کام یہ کیا کہ ۱۹۵۸ء میں خلا کے بارے میں تحقیق چھان بین اور جستجو کے لیے ایک ادارہ قایم کیا۔ اس ادارے کا نام نیشنل ایرو ناٹکس اسپیس ایڈمنسٹریشن رکھا گیا۔ اس ادارے کے ماتحت تین منصوبے تیار کیے گئے۔ مرکری، جیمنی، اپالو۔

مرکری منصوبے کا مقصد ایسے خلائی جہاز یا راکٹ تیار کرنا تھا جو ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ خلا میں اڑ سکیں اور زمین کی کشش کے حلقے سے آسانی سے نکل کر آزادی کے ساتھ فضا میں اڑ سکیں۔ فضا یا خلا کی تمام رکاوٹوں کو دور کر کے سلامتی کے ساتھ فضا میں سفر کر سکیں، انھیں زمین پر واپس لانے کے لیے راکٹ انجن لگے ہوں۔ زمین سے تعلق اور رابطہ قایم رکھنے کے لیے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا معقول انتظام ہو۔ سورج کی شعاعوں سے بجلی حاصل کرنے کے لیے مشینیں لگی ہوں اور اس خلائی جہاز کے اندر کی فضا ایسی ہو کہ خلا باز زندہ رہ سکیں۔ خلا بازوں کی تربیت بھی اس منصوبے میں شامل تھی۔

اس مرکری منصوبے کے ماتحت امریکہ کا خلائی جہاز پہلی بار خلا بازوں کو لے کر اڑا۔ یہ اڑان کل ۱۵ منٹ کی تھی مگر اس نے آگے کے لیے جیسے دروازہ کھول دیا۔ جنوری ۶۲ء میں خلا باز زمین کے مدار میں تین بار چکر لگا کر اپنا خلائی جہاز سلامتی کے ساتھ

زمین پر آنے۔ یہ خلائی جہاز کل نو فٹ لمبا اور ڈیڑھ ٹن وزنی تھا۔ ۱۹۶۴ء میں چار کامیاب اڑانیں ہوئیں۔ اس طرح خلا باز مجموعی طور پر ۵۴ گھنٹے خلا میں گذار چکے تھے۔

مرکری منصوبہ کی اس کامیابی سے امریکہ کے سائنس دانوں کی ہمتیں بڑھیں، حوصلے بڑھے۔ انھوں نے جیمنی نام کا منصوبہ بنایا۔ اس نے پچھلے کاموں کو آگے بڑھایا۔ ایسے راکٹ یا خلائی جہاز تیار کیے جن کی اڑنے کی طاقت پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ ان کو اور بھی آرام دہ اور بہتر ساز و سامان سے لیس کیا۔ خلائی جہازوں کو زمین سے کنٹرول کرنے کے انتظام کو اور بہتر بنایا گیا۔

یہ خلائی جہاز ساڑھے گیارہ فٹ اونچے اور ساڑھے تین ٹن وزنی تھے۔ ان کے اندر ایسی مشینیں لگائی گئیں جن کی مدد سے خلا باز اپنی مرضی کے مطابق جہاز کے رخ یا سمت اور رفتار میں تبدیلی کر سکتے تھے۔ اس طرح مدار کا بدلنا اور اڑتے میں دوسرے خلائی جہاز سے جڑنا ممکن ہو گیا۔

جون ۱۹۶۵ء میں ایک خلا باز ایڈورڈ وہائٹ نے اپنے خلائی جہاز جیمنی ۴ سے باہر نکل کر خلا میں چہل قدمی کی۔ یہ ایک نئی بات تھی، دنیا حیرت میں رہ گئی۔ چھ مہینے بعد (دسمبر ۱۹۶۵ء) کیپ کینیڈی سے دو خلائی جہاز دو مختلف مداروں میں چکر لگانے کے لیے روانہ ہوئے اور اوپر پہنچ کر ان دونوں نے اپنے مدار بدلے۔ ۲ گھنٹے بائیس منٹ ایک دوسرے کے ساتھ اڑان کی۔ کبھی کبھی تو ان دونوں کے درمیان بس ایک فٹ کا فاصلہ رہ جاتا تھا۔ خلائی جہاز جیمنی ۷ نے چودہ دنوں میں دنیا کے چاروں طرف دو سو چھ بار چکر لگائے اور ریکارڈ قائم کیا۔

جیمنی منصوبے کے تحت بارہ خلائی پروازیں ہوئیں ان میں سولہ خلا بازوں نے حصہ لیا۔ اور مجموعی طور پر ایک ہزار نو سو چالیس گھنٹے خلا میں گزارے۔

جیمنی منصوبے کی اس کامیابی سے سائنس داں اس نتیجے پر پہنچے کہ (۱) انسان بے وزنی کی حالت میں زندہ رہ سکتا ہے۔ (۲) ۳۳۰ گھنٹے تک پائلٹ، انجینر اور سائنس داں کے کام اچھی طرح انجام دے سکتا ہے اور

چاند کے مسافر

نیل اے آرمسٹرانگ: ۳۸ سالہ فلائٹ کمانڈر ایک شہری خلا باز ہے۔ خلا میں آزمائشی پروازوں کے دوران اس نے ایکس ۱۵ طیارے کو چالیس میل کی بلندی پر چار ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑایا تھا۔ جیمنی ۸ کے مشن کا کمانڈر بھی آرم اسٹرانگ تھا جس کے دوران ۱۶ مارچ ۱۹۶۶ء کو پہلی بار خلا میں تیرتے ہوئے دو جہاز ایک دوسرے سے ملے تھے۔ آرمسٹرانگ دو بیٹوں کا باپ ہے۔

مائیکل کولنس: ۳۸ سالہ کمانڈ ماڈیول پائلٹ جیمنی ۱۰ کی پرواز میں پائلٹ تھا۔ اس خلائی جہاز نے ۴۷۵ میل کی بلندی پر پرواز کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ اس مشن کے دوران وہ "خلا میں چلا تھا"۔ کولنس چار بچوں کا باپ ہے۔

ایڈون آیلڈرین: ۳۹ سالہ لونر ماڈیول پائلٹ میساچوسیٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی سے خلا بازی میں ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کر چکا ہے۔ جیمنی ۱۲ کی پرواز کے پائلٹوں میں وہ بھی شامل تھا۔ اپنی پرواز کے دوران اس نے تین مرتبہ اپنے جہاز سے نکل کر چہل قدمی اور کام کیا۔ ایلڈرین تین بچوں کا باپ ہے۔

(۳) چاند پر سفر کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس سفر کے لیے کل آٹھ دن درکار ہوں گے۔ غرض امریکی سائنس دانوں کا یہ منصوبہ بھی بہت کامیاب رہا۔

ان دونوں منصوبوں کی روشنی میں نیشنل ایروناٹکس اسپیس ایڈمنسٹریشن کے ادارہ نے تیسرا عظیم الشان منصوبہ بنایا۔ چاند پر انسان کو خیریت اور سلامتی کے ساتھ اتارنا اس منصوبے کا بنیادی مقصد تھا۔

اس منصوبے کے تحت اربوں روپے کا بجٹ منظور کیا گیا اور اب جناب ایک دیوہیکل راکٹ تیار کرنا تھا۔ یوں تو خود اس ادارے میں سینکڑوں سائنس داں سینکڑوں انجینیئر، ڈاکٹر، نفسیات کے ماہر خلاباز ہزاروں مزدور کام کرتے ہیں۔ اس کی مختلف تجربہ گاہیں اور ورکشاپ ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پھر بھی اتنا بڑا کام اس کے بس کا نہ تھا۔ اسی لیے اس نے مختلف کاموں کو انجام دینے کے لیے دوسری فرموں کو ٹھیکے دیے۔ مثلاً خلائی کنٹرول روم، انجن روم تیار کرنے کا کام ایک فرم کو دیا گیا، چاندگاڑی تیار کرنے کا کام ایک دوسری فرم کو دیا گیا۔ چاند پر خلابازوں کو زندہ رکھنے کے آلات تیار کرنے کا کام ایک دوسری فرم کو دیا گیا اور ان بڑی فرموں نے چھوٹے چھوٹے پرزے تیار کرنے کا ٹھیکا بہت سی چھوٹی فرموں کو دیا۔ غرض اس طرح ہزاروں لاکھوں لوگ اس منصوبے کو آخری منزل تک پہنچانے کے کام میں لگے رہے۔

دوسری طرف امریکی یونی ورسٹیاں بھی اس کام میں پورا پورا ہاتھ بٹا رہی ہیں۔ ان یونی ورسٹیوں کے ہزاروں ... دن رات تحقیق میں لگے ہیں یوں سمجھے کہ اس منصوبہ کی کامیابی امریکی سائنس دانوں حکومت کے اداروں صنعتی فرموں اور یونی ورسٹیوں کے مل جل کر کام کرنے کا ایک مثالی نمونہ ہے۔

اچھا اب اس خلائی جہاز کی بھی سن لو۔ اس کے تین حصّے ہیں۔ ایک حصّہ کنٹرول روم ہے۔ اس میں تین خلابازوں کے رہنے اور آرام کرنے کی گنجائش ہے۔ دوسرا انجن روم ہے۔ اس میں مشینیں ہیں، الیکٹرانک آلات ہیں راکٹ انجن ہیں۔ تیسری چاندگاڑی ہے۔ یہ ایک خول جیسا ہے اور اس کے نیچے کی طرف کڑی کی سی ٹانگوں کا اسٹینڈ ہے یہ چاندگاڑی دو خلابازوں کو چاند پر اتارنے اور انھیں خلائی جہاز پر واپس لے جانے کے لیے ہے اس میں بھی راکٹ انجن اور ٹیلی ویژن وغیرہ کا پورا انتظام ہے۔ یہ پورا خلائی جہاز چوراسی فٹ اونچا ہے۔

اور اس خلائی جہاز کو اوپر لے جانے کے لیے سچ مچ دیوہیکل راکٹ تیار کیا گیا۔ سیٹرن ۵ اس کا نام رکھا گیا۔ اس ۳ منزل والے راکٹ کی اونچائی تین سو تریسٹھ فٹ اور کل وزن تین ہزار ٹن سے بھی زیادہ تھا۔

اس اپالو منصوبے کے سلسلے میں ایک بڑا حادثہ بھی پیش آگیا جنوری ۶۷ء میں تجربے کے لیے پہلی اڑان ہونے والی تھی۔ اچانک بجلی کے تاروں میں آگ لگی اور تین خلاباز بے چارے راکٹ کے اندر ہی ختم ہو گئے۔ سائنس دانوں کو بڑا صدمہ ہوا۔ مگر ہمت نہیں ہاری۔ ہاں چوکنّے ہو گئے اور بھی زیادہ احتیاط سے کام کرنے لگے۔ خلائی جہاز میں جو چھوٹی موٹی کمی یا خامیاں نظر آئیں انھیں دور کیا اور ہوابازوں کی حفاظت کے اور بھی بہتر طریقے اختیار کیے۔

پھر اکتوبر ۶۸ء سے مارچ ۶۹ء تک اس منصوبے کے تحت تین اڑانوں کا انتظام کیا گیا۔ یہ اڑانیں بہت کامیاب رہیں۔ ان کی کامیابی سے سائنس دانوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ انسان کو چاند پر اتارنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مئی ۶۹ء کو اپالو ۱۰ چاند کے مدار تک پہنچ گیا۔ خلابازوں نے چاند کے سفر میں پیش آنے والے سارے مرحلوں کا تجربہ کیا اور چاند کے بالکل قریب پہنچ کر چاندگاڑی اتارنے کے لیے تین جگہیں بھی منتخب کر آئے۔ یوں سمجھیے کہ یہ مہم انسان کو چاند پر اتارنے کی ریہرسل تھی انتہائی کامیاب ریہرسل۔

اور اب جناب اپالو ۱۱ کو خود چاند پر لے جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس تاریخی سفر کے لیے ۱۶ر جولائی مقرر ہوئی۔ دنیا کی اہم سے اہم خبروں سے بھی یہ سب سے زیادہ اہم خبر تھی۔ ساری دنیا کے اخباروں میں اسے اہم جگہ دی گئی۔

آخر خدا خدا کر کے ۱۶ر جولائی بھی آگئی۔ کیپ کینیڈی چھوٹا سا شہر ہے مگر یہاں لوگوں کا سیلاب امنڈ آیا۔ دوسرے ملکوں کے مہمانوں کے علاوہ لگ بھگ دس لاکھ آدمی خود امریکہ کے تھے۔ انتظام کرنے والوں کے لیے اتنی بھیڑ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ لوگوں میں بے پناہ جوش و خروش تھا۔ یہ انتظام پہلے سے کر لیا گیا تھا کہ اتنا بڑا مجمع خلائی جہاز کو زمین سے اوپر اٹھتے ہوئے آسانی سے دیکھ سکے۔ جوں جوں روانگی کا وقت آتا جاتا تھا لوگوں کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ اسے لیجیے وہ تینوں خلاباز روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔ پہلے آرم اسٹرانگ جہاز میں داخل ہوئے پھر کولنس اور پھر ایلڈرین اور دو پہر پہلے خلائی جہاز کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ دروازہ بند ہوتے وقت تماشائیوں کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔

آخر ہندوستانی وقت کے مطابق ۷ بجے اربوں کھربوں روپے کی لاگت سے تیار کیا ہوا خلائی جہاز اپنے تاریخی سفر پر روانہ ہوا۔ پہلے جہاز کے نچلے حصے سے سفید اور نارنجی شعلے بلند ہوئے اور پھر ایک ہیبت ناک گرج ہوئی۔ ایسی ہیبت ناک کہ کانوں کے پردے پھٹ جائیں۔ اس وقت تماشائیوں کے دلوں پر کچھ ڈر سا طاری تھا۔ جہاز ایک دم اوپر اٹھا اور پھر اوپر اور اوپر اور پھر نظروں سے غائب!

زمین کے مدار سے نکلتے ہی خلائی جہاز کی رفتار ۲۴۲۵۰ میل فی گھنٹہ ہو گئی۔ اپالو جہاز اڑتا رہا اور اڑتے اڑتے چاند کے مدار میں داخل ہو گیا گویا اس کی گود میں چکر لگانے لگا۔ چاند پر اترنے کا وقت قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اب آرم اسٹرانگ اور ایلڈرین کو خلائی جہاز سے جڑی ہوئی چاندگاڑی

خلاباز چاند کی فضا کو گندا کر دیں گے

انسان اب تک دنیا کی فضا کو گندا ہی کرتا رہا ہے لیکن اب وہ چاند کی فضا کو بھی خراب کر دے گا۔ چاند پر اترنے والے دو انسانوں نے ہی مل کر چاند کی فضا کو کافی حد تک گندا کر دیا ہے۔ لونر ماڈل ایگل نے چاند کی فضا میں پانچ ٹن سے زائد گیس خارج کی ہے۔ یہ گیس چاند کی کل گیس کی پانچ فی صد ہے۔ چاند پر جانے والے دونوں انسانوں نے ایک ہزار کیڑے فی منٹ کے حساب سے چھوڑے ہیں۔ اسی حساب سے آرم اسٹرانگ اور ایلڈرین کل ملا کر تین لاکھ بیماری پھیلانے والے جراثیم چاند کی فضا میں چھوڑ آئے ہیں۔

میں پہنچ کر دونوں نے مشینوں کی بہت احتیاط سے جانچ کی اور انھیں اچھی طرح دیکھا بھالا۔ اور پھر اسے خلائی جہاز سے الگ کر لیا۔ اور آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگے۔ اس وقت چاندگاڑی کے پانچ فٹ لمبے پیر باہر نکلے ہوئے تھے اور جیسے ہی انھوں نے چاند کو چھوا چاندگاڑی پر سگنل نے انھیں بتا دیا کہ ایگل چاند پر پہنچ گیا ہے یہ ۲۱ جولائی کی بات ہے۔ ایک بج کر ۴۹ منٹ کا وقت تھا۔

مگر اس وقت یہ اپنی گاڑی سے باہر نہیں نکلے۔ دونوں نے گاڑی کی مشینوں کی پھر سے جانچ کی اور پروگرام کے مطابق سو گئے، مسلسل آٹھ گھنٹے سوتے رہے۔ آٹھ گھنٹے آرام کے بعد صبح کو آرم اسٹرانگ چاند گاڑی کا دروازہ کھول کر ایک پلیٹ فارم پر آگئے۔ یہ چاندگاڑی کے پیر پر بنا تھا۔ اس پلیٹ فارم سے سیڑھی کے ذریعے چاند پر یا چاند کی سطح پر اتر آئے صدر کینڈی کی بات پوری ہو گئی۔

آرم اسٹرانگ اس وقت بھاری لباس پہنے ہوئے تھے اور جیسے اچھلتے ہوئے چل رہے تھے۔ یہ بات اس لیے تھی کہ چاند کی کشش زمین کے مقابلے میں کل $\frac{1}{6}$ ہے۔ اسی تناسب سے ہر چیز کا وزن بھی زمین کے وزن کے مقابلے میں $\frac{1}{6}$ ہے۔

آرم اسٹرانگ نے چاند پر اترتے ہی ایک پتھر اٹھا لیا تاکہ انھیں واپس جانا ہو تو یہ نمونہ ان کے ساتھ رہے۔ اور پھر انھوں نے مختلف کام شروع کر دیے۔ امریکہ کا جھنڈا گاڑا، ریفلیکٹر نصب کیا۔ ایریل لگایا تاکہ چاند کی تصویریں زمین پر بھیجی جاسکیں۔

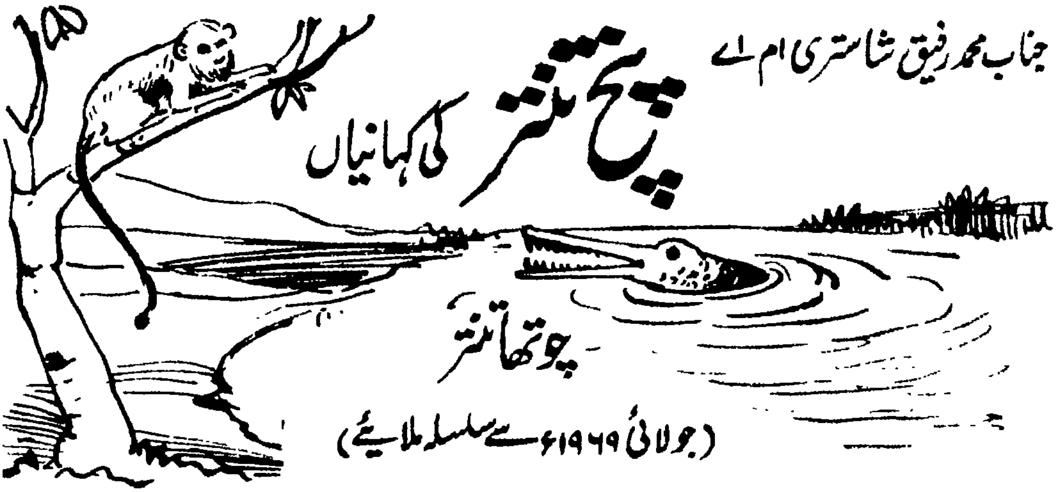
ایلڈرین ابھی اندر ہی تھے اور ٹیلی ویژن سے آرم اسٹرانگ کی تصویریں لے رہے تھے۔ اب وہ بھی باہر آگئے۔ انھوں نے چاندگاڑی کی تصویریں لیں چاند کی مٹی اور پتھر ایک خاص ڈبے میں جمع کیے اور لگ بھگ دو گھنٹے سے زیادہ چاند پر گھوم پھر کر چاندگاڑی میں لوٹ آئے۔

اب یہاں سے واپس بھی تو جانا تھا۔ انھوں نے پھر مشینوں کو دیکھا بھالا اور چاندگاڑی کو چالو کر دیا۔ چاند گاڑی ان کی منشا کے مطابق چل پڑی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی ۲۲ جولائی کی رات دو بج کر ۴۴ منٹ پر چاند گاڑی اصلی خلائی جہاز سے جڑ گئی۔ یہ دونوں اس سرنگ کے راستے سے اصلی جہاز میں داخل ہو گئے اور اپنے تیسرے ساتھی کولنس سے مل گئے۔ کولنس اس تمام مدت میں چکر لگاتے رہے۔ اصلی خلائی جہاز میں داخل ہونے کے بعد چاندگاڑی کو وہیں فضا میں بھٹکتا چھوڑ دیا گیا۔

خلائی جہاز نے اب تیزی سے زمین کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ۲۴-۲۵ جولائی کی درمیانی رات میں تینوں خلا بازوں نے رات کے دس بج کر دس منٹ پر سفر مکمل کر لیا۔ سمندر میں طوفان کی وجہ سے مقررہ جگہ سے چار سو میل دور اترے خیریت اور سلامتی کے ساتھ۔

ان کے کامیاب سفر نے ساری دنیا میں خوشی کی ایک لہر دوڑا دی۔ ساری دنیا کے ملکوں نے مبارکباد کے تار بھیجے۔ بہت سے ملکوں کے اسکولوں میں اس دن چھٹیاں کر دی گئیں۔

ہاں بھئی یہ سفر تو تمام ہوا مگر انسان کی بے چین



جناب محمد رفیق شاستری ایم اے

پنچ تنتر کی کہانیاں

چوتھا تنتر

(جولائی ۱۹۶۹ء سے سلسلہ ملائیے)

ایک بڑی جھیل کے کنارے جامن کا ایک پیڑ تھا۔ اس پیڑ پر لُل مُنّھا نام کا ایک بندر رہتا تھا۔ ایک دن ایک مگر مچھ جھیل کے کنارے آیا۔ بندر نے پیڑ سے کچھ جامنیں توڑ کر نیچے پھینکیں۔ مگر مچھ نے انھیں کھا لیا۔ جامنیں بہت مزے دار تھیں۔ مگر مچھ کو بہت اچھی لگیں۔ پھر تو اس نے کنارے آکر جامنیں کھانا اپنا روز کا معمول بنا لیا۔

دھیرے دھیرے بندر اور مگر مچھ کی دوستی بڑھتی گئی۔ مگر مچھ میٹھی میٹھی جامنیں کھا کر بندر سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا۔ پانی کی زندگی کے حال سناتا۔ بندر بھی اس کی باتوں میں لطف لیتا۔ جامنیں توڑ توڑ کر مگر مچھ کے قریب گراتا رہتا۔ مگر مچھ خوب جی بھر کر جامنیں کھا لیتا تو پھر تھوڑی سی اپنی گھر والی کے لیے لے جاتا۔

ایک دن مگر مچھنی نے پوچھا "میاں مگر مچھ تم اتنے بہت سے میٹھے پھل کہاں سے لاتے ہو؟" مگر مچھ نے یہ سن کر بندر کی اور اپنی دوستی کا قصہ سنایا اور بتایا کہ وہی بندر مجھے اتنے بہت سے پھل دیتا ہے۔

مگر مچھنی اس پر بولی "ذرا تم نے یہ بھی سوچا جو اتنے میٹھے میٹھے پھل ہر وقت کھاتا رہتا ہو اس کا دل گردہ کتنا میٹھا ہوگا۔ تو مگر مچھ میاں مجھے تو تم اس کا دل گردہ لا کر دو۔ ایک ہی دفعہ میں سارا مزا لے لوں۔"

مگر مچھ نے کہا "ایسی بات نہ کہو۔ اب تو وہ میرا منہ بولا بھائی بن چکا ہے۔ میں اس کا دل گردہ حاصل کرنے کے لیے اس کی جان نہیں لے سکتا۔"

مگر مچھنی اس پر بہت خفا ہوئی۔ کہنے لگی "آج تک تم نے میری کوئی بات نہیں ٹالی۔ آج یہ کیا نئی بات کر رہے ہو۔ کیا مجھ سے زیادہ تمھارا اس سے لگاؤ ہے۔ مجھے تو کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے۔"

مگر مچھ مجبور ہو گیا۔ اس نے مگر مچھنی کو پاس بلا کر کہا۔ "میں تم سے زیادہ اس دنیا میں کسی سے محبت نہیں کرتا۔ تم کو اس طرح سے بدگمان نہیں ہونا چاہیئے۔"

مگر مچھنی روہانسو ہو کر بولی۔ "یہ سب بناوٹ کی باتیں ہیں۔ اگر تمھیں مجھ سے سچ مچ اتنا پیار ہوتا تو ایک لنگوٹے بندر کا دل گردہ لانے کی ذرا سی فرمائش تم اس کے

کبھی نہ ٹالتے ۔ میں بھی اپنی ضد کی پکی ہوں ۔ جب تک تم مجھے اس بندر کا دل گردہ لاکر نہیں دیتے میں قسم کھاتی ہوں کہ اس وقت تک ایک بھی دانا منہ میں نہ ڈالوں گی چاہے اسی طرح بھوکی کیوں نہ مرجاؤں۔"

مگرمچھنی کی اس دھمکی کے بعد مگرمچھ پس وپیش میں پڑگیا ۔ دوسرے دن وہ بہت اداس دل سے بندر کے پاس پہنچا۔ بندر نے مگرمچھ کو اداس دیکھ کر پوچھا ۔ "کیا بات ہے دوست آج کچھ خوش نہیں دکھائی دے رہے ہو۔"

مگرمچھ ۔بولا ۔" کیا بتاؤں دوست آج تمھاری بھابی نے بہت ملامت کی ہے۔ کہتی ہے "تم روز روز جامنیں لے آتے ہو اور کبھی اپنے دوست کو گھر نہیں لاتے ۔ دوست کی خاطر نہ کرنا وہ گناہ سمجھتی ہے۔ اس نے آج ضد کی ہے کہ میں تمھیں آج اپنے گھر لے چلوں۔ وہ آج گھر پر تمھارا انتظار کر رہی ہے۔" بندر بولا ۔" دوست مجھے جانے سے انکار نہیں ۔ مگر میں تو زمین پر ہی چل سکتا ہوں ۔ پانی میں تیرنا میرے بس کا نہیں۔ تم پانی میں رہنے والے میں تمھارے گھر جاؤں گا کیسے ؟"

مگرمچھ نے کہا ۔" بھلا یہ بھی کوئی مشکل بات ہے ۔ تم میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ ۔ میں تمھیں جھیل کی سیر کراتا ہوا گھر پہنچا دوں گا۔"

یہ سنتا تھا کہ بندر اچھل کر مگرمچھ کی پیٹھ پر بیٹھ گیا ۔ مگرمچھ پانی کاٹتا ہوا بیچ دھارے میں پہنچ گیا جھیل کی سیر کا بندر کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ ہر دل کے تھپیڑوں کے درمیان اس طرح گھومنے سے بندر بہت خوش ہوا ۔ وہ مگرمچھ سے کہنے لگا ۔" بھائی مزہ آگیا ۔ مگر تم ذرا اور آہستہ چلو تاکہ میں پانی کے تھپیڑوں سے بھیگوں نہیں ؟

مگرمچھ بولا ۔" بھئی ابھی کیا مزہ آیا ہے ۔ مزہ تو اب آنے والا ہے ۔ اللہ کو یاد کرو ۔ تمھارا آخری وقت قریب آرہا ہے۔"

بندر بولا ۔" بھئی یہ اس طرح کے مذاق کا وقت نہیں ۔ آج میں پہلی بار جھیل کی سیر کو نکلا ہوں ۔ ذرا اچھی طرح سیر کراؤ۔"

مگرمچھ نے کہا ۔" میاں میں مذاق کب کر رہا ہوں ۔ بس اب چند لمحے کی بات ہے ۔ خوب جی بھر کر لطف لے لو ۔ پھر کہاں موقع رہے گا ۔ میں ایک بار ڈبکی لگاؤں گا اور تم سدا کے لیے سو جاؤ گے۔"

اب تو بندر میاں سچ مچ گھبرا گئے ۔ کہنے لگے ۔" مگر بھائی تم ایسا کیوں کرو گے ۔ میں نے تمھارے ساتھ کیا برائی کی ہے جو تم اس طرح دغا کر رہے ہو ۔ تم مجھے کیوں جان سے مارنا چاہتے ہو۔"

مگرمچھ بولا ۔" کیا بتاؤں دوست ۔ میری گھروالی تمھارے میٹھے دل گردے کھانا چاہتی ہے ۔ اب میں تمھیں جان سے مار کر دل گردہ نکال لوں گا ۔ اسے کھا کر میری گھروالی مجھ پر پھر سے مہربان ہو جائے گی۔"

بندر تھا عقل مند ۔ یہ بات سن کر وہ بالکل نہیں گھبرایا ۔ اور بہت اطمینان سے کہنے لگا ۔" مگر بھائی مگرمچھ تمھیں تو یہ بات مجھے پہلے بتانی چاہیے تھی ۔ میں

تو ہمیشہ اپنے دل گردے پیڑ کی شاخ کی ایک کھوہ میں رکھتا ہوں۔ تم نے کہا ہوتا تو میں یہ دل گردے اپنی بھابی کے لئے تمھیں وہیں دے دیتا۔ اس وقت تو میرے پاس دل گردہ ہے نہیں۔ تم بھابی کو آخر دو گے کیا"

مگرمچھ تھا بے وقوف بندر کی بات سن کر وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا کہنے لگا "چلو واپس چلتے ہیں تم جامن کے پیڑ پر سے لاکر اپنا دل گردہ مجھے دے دینا۔ میری گھر والی اسے کھالے گی تو اسے چین آجائے گا۔"

یہ کہہ کر مگرمچھ کنارے کی طرف لوٹ پڑا اور جیسے ہی پیڑ کے قریب پہنچا۔ میاں بندر تیزی سے دوڑ کر پیڑ کے اوپر چڑھ گئے۔ خیر سے بدھو گھر کو آئے۔ پیڑ پر چڑھ کر جیسے نئی زندگی پائی ہو۔ میاں بندر پیڑ پر بیٹھ کر مگرمچھ کو انگوٹھا دکھانے لگے۔

مگرمچھ میاں سمجھے کہ بندر مذاق کر رہا ہے۔ کہنے لگے "بھائی بندر جلدی آؤ گھر پر تمھاری بھابی انتظار کر رہی ہوگی۔"

بندر نے اسی طرح انگوٹھا دکھا کر کہا "بیوقوف کہیں کا۔ دھوکا دینے چلا تھا۔ بھلا تو نے یہ نہیں سوچا کہ کسی کا دل گردہ کہیں باہر نہیں رکھا ہوتا۔ جسم کے اندر ہی رہتا ہے۔ اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو یہاں سے واپس چلے جاؤ۔ اور پھر کبھی ادھر نہ آنا۔"

مگرمچھ بہت شرمندہ ہوا۔ کہنے لگا "بھائی وہ تو مذاق کی بات تھی۔ تم بُرا مان گئے۔ خیر ہماری تمھاری دوستی میں فرق نہیں آنا چاہیے۔ تم اطمینان سے ہمارے گھر مہمان بن کر چلو۔ تمھاری بھابی وہاں تمھاری بہت خاطر کرے گی۔"

مگر بندر نے مگرمچھ کی ایک نہ سنی کہنے لگا۔ "میں ایک بار بہلاوے میں آگیا۔ بار بار نہیں آنے والا ہوں۔"

بندر کے اس انکار سے مگرمچھ بہت دکھی ہوا۔ کہنے لگا "بھئی اگر میرے ساتھ نہیں چلنا چاہتے ہو تو نہ چلو مگر دو چار میٹھی جامنیں تو پھینک دو۔ تمھاری طرف سے سوغات سمجھ کر وہی لیتے گھر لے جاؤں گا۔"

مگر بندر نے پھر انگوٹھا دکھا دیا اور کہنے لگا۔ "اب ہماری تمھاری دوستی ختم۔ جھوٹے آدمی کا کوئی بھروسا نہیں۔ ایک بار دھوکا کھانے کے بعد دوبارہ تم پر بھروسا نہیں کروں گا، جس طرح گنگادت مینڈک نے نہیں کیا تھا۔"

مگرمچھ تھا تو اداس مگر بندر سے کچھ دیر بات چیت جاری رکھنے کی خاطر پوچھ بیٹھا "بھائی بندر یہ گنگادت کی کیا بات کہی تم نے۔"

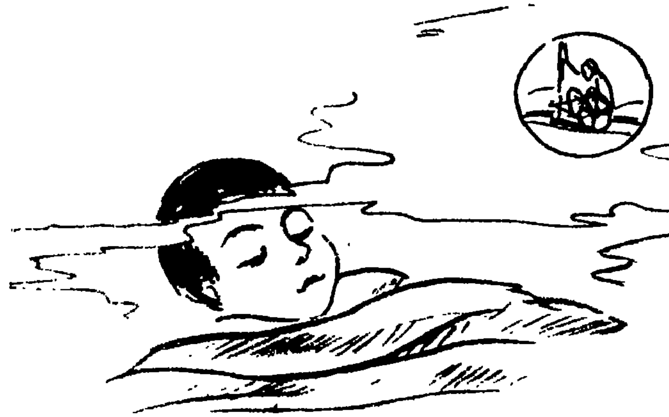
بندر نے کہا "سنو گے؟"

مگرمچھ نے کہا "کیوں نہیں۔"

تب بندر نے مینڈک کی یہ کہانی سنائی۔

(گنگادت مینڈک کی دلچسپ کہانی اگلے پرچے میں پڑھیے)

محترمہ دردانہ وقار



خلا کا مُسافر

شکیل روز آسمان پر بکھرے ہوئے چمکتے ستاروں کو دیکھا کرتا، اور اکثر جی میں سوچا کرتا کہ کسی طرح آسمان کی سیر کرنے کو مل جائے، تو کیسا مزہ آئے۔ اس کی امی نے اُسے بتایا تھا کہ آج کل لوگ چاند پر جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور بڑی امی کا کہنا تھا کہ چاند میں ایک بڑھیا رہتی ہے اور یہ بڑھیا وہاں بیٹھی بیٹھی چرخہ کاتا کرتی ہے۔

ایک روز شکیل اپنے بستر سے اٹھا اور کہیں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس کی بہن ثریا نے دیکھا تو وہ بھی جلدی سے اٹھی اور شکیل سے پوچھنے لگی:۔

"بھائی جان! آج آپ اس قدر سویرے سویرے کہاں جانے کی تیاری کر رہے ہیں؟"

شکیل نے کہا :" وہ دیکھو وہ جو آسمان میں ایک سفید لکیر سی نظر آ رہی ہے نا وہ ہوا کا ایک غبارہ ہے یہی میرا راکٹ ہے۔ میں اس میں سوار ہو کر خلا کے سفر پر جا رہا ہوں۔ چلو! تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

چند لمحوں بعد خلا کا مسافر فضا میں اُڑ رہا تھا۔ وہ اس طرح سوار ہوا جیسے اپنے ہاتھ پاؤں سے چل رہا ہو، بلکہ کسی نے اسے اٹھا کر جیسے راکٹ میں رکھ دیا ہو۔ وہ اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ بھلا اس ننھی کرن میں اس قدر طاقت کہاں سے آتی ہے جو ایک بھاری بھرکم انسان کو اوپر اڑا لے جائے۔

اور اب جو شکیل نے سر جھکا کر دیکھا تو پہاڑ کے دامن سے سورج نکل رہا تھا۔ شکیل میاں خوشی کے مارے پھولے نہ سمائے۔ جیسے سائنس کی دنیا میں کوئی بہت بڑی دریافت کر لی ہو۔

"اچھا تو سورج دادا یہاں رہتے ہیں۔" ثریا نے بھی جھانک کر دیکھا، اودی اودی جھیلیں اونچے اونچے پربت اور ایک بہت بڑا میدان دکھائی دیا۔ اوپر کی طرف خلا میں کئی رنگوں کی روشنیاں تھیں۔۔

ان ظاہری شکلوں میں ایک "بڑے بھالو" کی شکل کا بھی تھا۔ "بڑا بھالو" قطب تارے کے قریب تھا۔ بڑے بھالو کے متعلق ان دونوں نے طرح طرح کی کہانیاں سن رکھی تھیں اور وہ جو کئی رنگوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں، وہ کہکشاں تھی۔

اسے روسی کہانیوں میں سے، تین بھالوؤں

والی کہانی یاد آ گئی۔ ایک بچی اپنے گھر سے جنگل کی طرف نکل جاتی ہے۔ جنگل میں راستہ بھٹک جاتی ہے۔ اور گھر کی طرف جانے والی سڑک ڈھونڈھنے لگتی ہے۔ بے چاری کو راستہ نہیں ملتا۔ اور وہ جنگل میں ایک چھوٹے سے مکان کی طرف چلی جاتی ہے۔ دروازہ کھلا ہوتا ہے بچی دروازے میں سے اندر کی طرف جھانکتی ہے۔ مکان میں کوئی بھی نہیں تھا وہ اندر چلی جاتی ہے اصل میں یہ مکان تین بھالوؤں کا تھا۔ اس وقت وہ تینوں جنگل کی سیر کو گئے تھے۔

مکان میں دو کمرے تھے۔ ایک کھانے کا دوسرا سونے کا۔ بچی کھانے کے کمرے میں گئی اور وہاں رکھی ہوئی کھانے کی ساری چیزیں چٹ کر گئی۔ پھر سونے کے کمرے میں جاکر سو گئی۔ تھوڑی دیر میں تینوں بھالو آئے اور انھوں نے شور مچایا "میرے پیالے میں کس نے کھایا؟" چھوٹے بھالو نے کہا۔ میری کرسی پر کون بیٹھا اور کس نے اسے جگہ سے بے جگہ کیا؟" تیسرے بھالو نے کہا "میرے بستر پر کون لیٹا اور کس نے اسے خراب کیا؟" ایک دم ان کی نظر بچی پر پڑی اور وہ بری طرح چیخے جیسے کوئی انھیں مارے ڈال رہا ہے۔ اتنے میں بچی کھڑکی میں سے کود کر یہ جا وہ جا۔

اس کا دھیان ابھی اسی کہانی کی طرف تھا کہ اچانک خلا کی شہزادی نمودار ہوئی۔ وہ پوچھنے لگی "تم دونوں کون ہو کہاں جا رہے ہو؟" اس کے مسکراتے ہونٹوں سے جیسے پھول جھڑ رہے تھے۔

شکیل نے سہمے ہوئے لہجہ میں کہا "میں خلا کا مسافر ہوں۔ چاند کی سیر کرنے جا رہا ہوں"

کھر مہمان بن کر چلو۔ ہماری بھابی وہاں [illegible]

شہزادی پیار بھرے لہجہ میں بولی "یہ تو بڑا اچھا ارادہ ہے۔ اچھا تو بھئی وہ دیکھو! وہ جو اونچا سا ٹیلہ نظر آتا ہے یہی چاند ہے۔ یہ ایک بہت بڑا گولہ ہے سدا کے وقت جب اس پر سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو کچھ گرم ہو جاتا ہے۔ تمہاری زمین کی طرح چاند کے گولے کے چاروں طرف ہوا کا حلقہ تو ہے پر بہت کم زور ہے اتنا طاقت ور نہیں ہے جو اس گرمی کو روک لے یا کم کر دے۔ اس لئے اتنا تپتا ہے اتنا تپتا ہے کہ آگ بن جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے دہکتی ہوئی آگ کا ڈھیر ہو۔ ان کرنوں کی بدولت یہ روشن بھی ہو جاتا ہے۔ تم زمین والوں سے دور ہے اس لیے تم لوگوں کو اس کی صرف روشنی نظر آتی ہے۔ لیکن تم گھبراؤ نہیں۔ اس آگ سے تم جلو گے نہیں۔ چاند کی روشنی بڑی روپہلی اور ٹھنڈی ہوتی ہے۔"

یہ سن کر شکیل مسکرایا اور بولا "ہاں سورج سے تو ہمارے چندا ماما ہی بھلے۔ سورج دادا کی گرم گرم دھوپ سے تو خدا بچائے۔ ذرا گھر سے نکلے، میدان میں آئے اور پسینے میں نہا گئے۔"

پھر شہزادی نے خلا میں نیلے ساگر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ دیکھو یہ آسمان ہے۔ یہ آسمان ایک بڑا اور ٹھوس گنبد ہے جس میں چاروں طرف ستاروں کو جڑ دیا گیا ہے اور شاید تم زمین والوں کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ یہ ستارے دراصل وہ نیک انسان یا جانور ہیں جنھوں نے زمین پر اچھے کام کیے تھے۔ مرنے کے بعد انھیں ستاروں کا روپ دے دیا گیا۔ اور یہ آسمان پر

ہمیشہ یونہی چمکتے رہیں گے۔

شکیل نے مڑکر دیکھا تو شمسی، کمال اور گڈو بھی چاند میں موجود تھے۔ ان سب کو دیکھ کر شکیل نے چاند سے کہا۔

"اے چاند! تیری دنیا کتنی خوب صورت ہے اور اس سے بھی خوب صورت تیری زمین ہے۔ تیرے یہاں کے بچے من کے سچے ہوتے ہیں۔ اور یہاں کی ہر ننھی منی بچی ایک خوب صورت شہزادی ہے۔"

"اے چاند! تیری دنیا کتنی اچھی ہے۔ نہ یہاں ایٹم بموں کا دھماکا ہے نہ انسانی خون کا کوئی قطرہ بہتا ہے۔ تیری زمین سچ مچ امن کی جنت ہے۔ یہاں ظلم وستم سے کوئی تنگ نہیں۔ ہر شخص لڑائی سے بے زار ہے اور ہر دل میں یقین کی شمع روشن ہے۔"

چاند نے دھرتی کی کوکھ سے پیدا ہونے والے بچوں کی آواز سنی کہنے لگا۔

"بچو! تمھاری دنیا کا انسان ابھی ظالم ہے۔ ظلم اور سرکشی بڑھتی جا رہی ہے اس کے دل میں نفرت ہے۔ وہ پیار اور دوستی کو بھول چکا ہے۔ جب وہ اپنے دل کی کتاب پڑھے گا تو دوستی اور محبت کی حقیقت سمجھے گا۔ اور ہمارے ساتھ، نیکی، سچائی اور انسانیت کی راہ پر قدم بڑھا سکے گا۔ تم زمین والوں سے جا کر کہنا کہ جب تک وہ اپنے اندر یہ خوبیاں پیدا نہ کریں گے۔ چاند کو فتح کرنے کی ان کی ساری کوششیں ناکام رہیں گی۔"

"دو بچو! وطن کا مستقبل تمھارے شانوں پر ہے۔

تم میں سے ہر ایک اپنے وطن کے لیے، قوم کے لیے، آنے والے کل کے لیے، بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان ذمہ داریوں کے لیے اگر تم ابھی سے اپنے آپ کو تیار نہ کرو گے، تو تمھیں قوم و وطن کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔"

"مجھے یقین ہے تم اپنی نیکی اور سچائی کے اصولوں پر قائم رہ کر اپنے ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لو گے۔ اور زمین سے ظلم اور ناانصافی کے اندھیروں کو دور کرو گے۔"

اتنے میں جہاز سے زمین کے وائرلیس کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ شکیل نے نیچے جھانک کر دیکھا تو تمام لوگ، بچے اور بوڑھے اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر چڑھے ہوئے فضا میں راکٹ کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ وائرلیس والے پوچھ رہے تھے "تم کون ہو، کہاں سے آ رہے ہو؟" "خطرہ خطرہ"

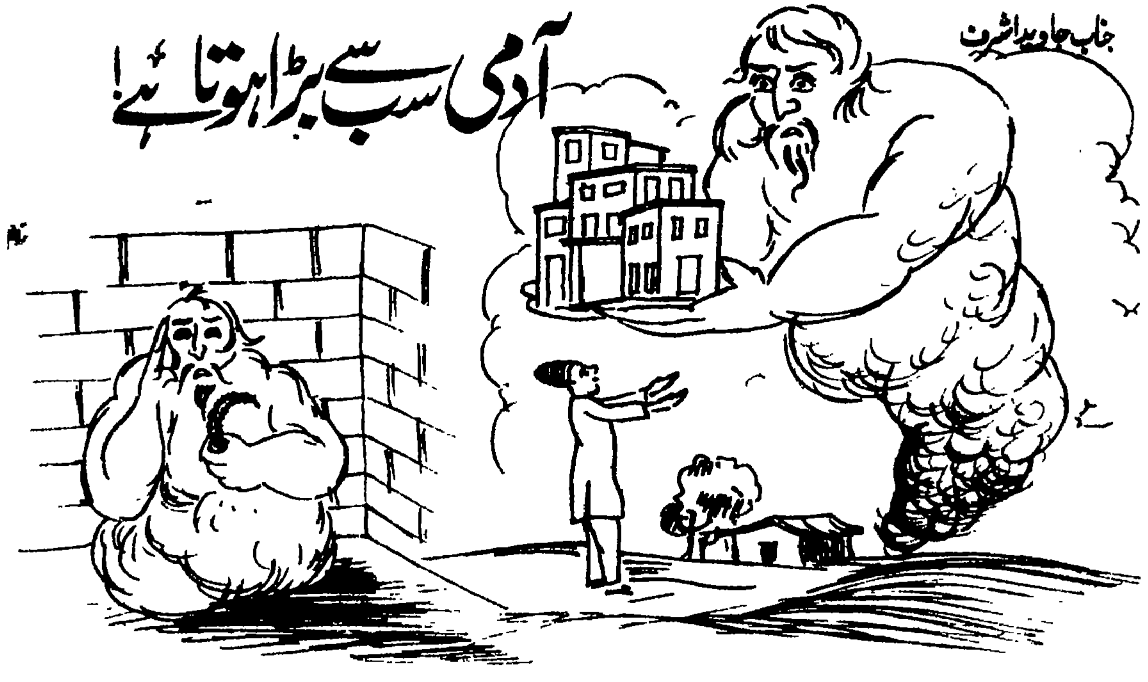
شکیل نے گھبرا کر اپنی سیٹ کی طرف دیکھا تو جہاز کا راڈر سسٹم خراب ہو چکا تھا۔ خلا کی شہزادی غائب ہو چکی تھی۔ اور جہاز زمین کی طرف گر رہا تھا۔ یہ راکٹ اوندھا ہو کر زمین پر گرنے والا تھا کہ یک بہ یک گھبرا کر شکیل کی آنکھ کھل گئی۔

صبح ہو گئی تھی۔ سورج کی سنہری کرنیں پہاڑ کی چوٹیوں کو سونے کا تاج پہنا رہی تھیں۔ ہر چیز میں ایک نئی خوشی نظر آ رہی تھی۔ اور پرندوں کے نغمے فضا میں گونج رہے تھے۔ اور پہاڑ کی ڈھلانوں سے روشنی کے آبشار بہہ رہے تھے۔ اس کے سرہانے کھڑی امی کہہ رہی تھیں "شکیل اٹھو!

کچھ مہمان آئے ہیں گھر چلو۔ تمہاری بھابی وہاں تمہاری |

جناب جاوید اشرف

آدمی سب سے بڑا ہوتا ہے!



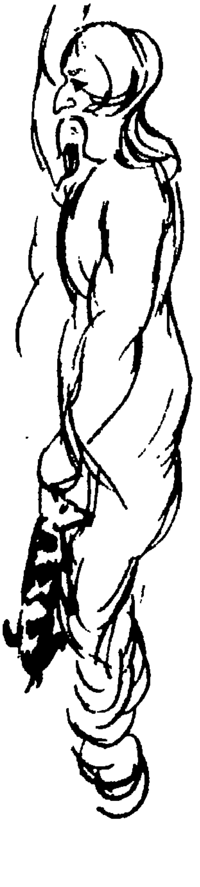
میستا نام کا اِک آدمی رہتا تھا دِلّی میں — کیا کرتا تھا مزدوری گزر ہوتی غریبی میں
بڑا ہی سست تھا وہ شیخ چلّی سے نہ کچھ کم تھا — اسے دن رات اپنے کام کرنے کا بہت غم تھا
یہی تھا سوچتا ترکیب کوئی ایسی ہو جائے — کہ جس سے میرے قبضے میں کوئی جن بھوت آ جائے
مزے آ جائیں میرے، کام سارا جن کرے میرا — اُڑاؤں خوب دعوت ڈٹ کے، سارا غم مٹے میرا
یہی رہتا تھا اس کو دھیان، ہر دم ہر گھڑی ہر پل — اسی اُلجھن میں رہتا تھا ہوا تھا وہ بہت بے کل
بہت چھانی فقیروں کے دروں کی خاک بھی اُس نے — نہ چھوڑا کوئی بھی سادھو اگر پایا پتا اس نے
مِلا وہ مولوی صاحب سے بھی حال ان کو بتلایا — مگر منتر نہ کوئی بھی اُسے ایسا بتا پایا
کہ جس منتر سے جن قبضے میں آ جائے میستا کے — دِلدّر دور ہو جائیں مٹیں سب غم میستا کے

خدا کی شان اِک دن ان میستا کو مِلا سادھو — بتایا جس نے جن قبضے میں کرنے کا انھیں جادو
مگر یہ بھی کہا مت یہ جن بڑا سرکش ہے ضدی ہے — اسے بس کام سے مطلب اسے دھن کام ہی کی ہے
کوئی بھی کام ہو، جو کچھ بھی کروانا ہو، کروالو — ذرا سی دیر میں کر دیتا ہے، کیسا ہی مشکل ہو
اگر تم نے نہ کوئی کام بتلایا تو پھر تم کو — ہڑپ کر جائے گا یہ جن تمھیں یہ بھی سمجھ رکھو



مسیتا تو خوشی کے مارے جامے میں نہ تھے اس دم   بلا کچھ سوچے سمجھے کہہ دیا سادھو سے یہ فوراً
کہ "میرے پاس بے حد کام ہیں کچھ فکر مت کیجے   مجھے تو بس وہی جادو وہی منتر بتا دیجے"

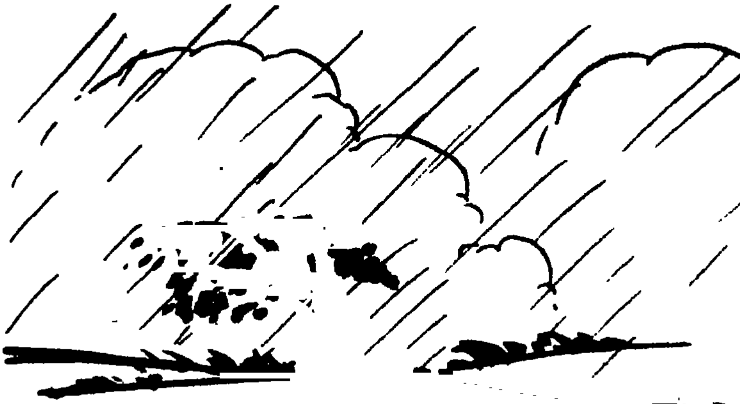
مسیتا آگئے گھر سیکھ کر جادو بھرا منتر   اِدھر حاضر ہوا جن جب مسیتا نے پڑھا منتر
کڑک کر بولا: "کیا تکلیف ہے تم کو سناؤ تو   پڑا ہے کام ایسا کونسا مشکل بتاؤ تو"
مسیتا بولے: "میرے واسطے کھانا کرو حاضر"   ابھی منھ سے نہ نکلا تھا کہ کھانا ہوگیا حاضر
مسیتا نے کہا: "اِک گھر بھی عالیشان بنا لاؤ   اور اس کو قیمتی سامانِ زینت سے سجا لاؤ
نہ ہو ہرگز کسی شے کی کمی میرے لیے اس میں   نہ ہو تکلیف اِک رتّی برابر بھی مجھے اس میں
ذرا سی دیر میں جن نے کیا حاضر مکاں لاکر   مسیتا ہوگئے خوش جس گھڑی دیکھا انھوں نے گھر
وہ جن کہنے لگا ان سے مسیتا جب گھسے گھر میں   اِدھر جاتے کہاں ہو؟ یہ بتاؤ کیا کروں اب میں
اور اب جن کہہ رہا تھا میں ابھی تم کو بتاتا ہوں   بتاؤ کام اب مجھ کو، نہیں تو تم کو کھاتا ہوں
مسیتا کی تو سٹّی ہوگئی گم سٹپٹائے وہ   نہ تھا اب کام کوئی پاس انکے کیا بتائیں وہ



یہی دو کام تھے جن کے لیے جادو یہ سیکھا تھا   کہ رہنے کو ملے عمدہ مکاں کھانے کو تر لقمہ
یہ دونوں کام جن نے کر دیے اِک آن واحد میں   مسیتا سوچتے ہی رہ گئے اب کیا بتاؤں میں
مگر تھے آدمی چالاک، یہ ترکیب کر بیٹھے   کہا جن سے کہ اِک کتا پکڑ لا جا کے جلدی سے
ہوئی تھی دیر کچھ نے کی کہ جن کتا بھی لے آیا   مسیتا سے سوال اپنا وہی پھر اس نے دہرایا
مسیتا ہنس کے یہ بولے: "ٹھہر جاؤ بتاتا ہوں   ابھی تم کو میں اِک بے حد ضروری کام دیتا ہوں"
کہا یہ اور دُم کتے کی جھٹ سے کاٹ لی اُس نے   کٹی دم دے کے کتے کی مسیتا نے کہا جن سے
"سنو تم! کام یہ بے حد ضروری ہے، اِدھر آؤ   یہ دُم کتے کی ٹیڑھی ہے ذرا سیدھی تو کر لاؤ
یہ جب ہو جائے سیدھی تب اِسے تم مجھ کو دے دینا   میں اس کے بعد تم کو کام دوں گا اس کو تم کرنا"
کہا جن نے ابھی کرتا ہوں یہ بھی کام ہے کوئی   بھلا اِک دم کو سیدھا کرنا مشکل کام ہے کوئی
یہ کہہ کر اس نے دم کو دوسری جانب سے کچھ موڑا   سرے دونوں پکڑ کر یوں مسیتا سے وہ جن بولا
کہ لیجے ہوگئی سیدھی یہ دُم، کیا کام مشکل تھا   ذرا سا کام تھا یہ بھی کوئی کرنے کے قابل تھا
مگر جیسے ہی دُم اس نے تھی اپنے ہاتھ سے چھوڑی   تو وہ پھر ہوگئی ٹیڑھی کہ جیسے پہلے تھی ٹیڑھی
گرج کر یہ مسیتا نے کہا: "ہم سے مذاق! اچھا   ابھی تجھ کو چکھاتا ہوں مزا۔ تو پاس کو تو آ"

بہت اب تو ڈرا جن اس نے جب یہ ماجرا دیکھا   خوشامد سے وہ یوں کہنے لگا: "مالک بہت اچھا
میں دم جب سیدھی ہو جائے گی تب ہی آپکو دونگا   نہ ہرگز اس سے پہلے اک گھڑی آرام میں لوں گا
مسیتا بولے غصّہ سے کہ کرتا ہے ہنسی مجھ سے   خبردار ایسی حرکت پھر نہ سرزد ہو کبھی تجھ سے
بڑا کاہل ہے تو، لگتا نہیں دل کام میں تیرا   ذرا دُم سیدھی کر دے یہ ضروری کام ہے میرا
بیچارہ جن گیا پھر بیٹھ چپ چاپ ایک کونے میں   اور اس کے بعد پھر سے لگ گیا دُم سیدھی کرنے میں
وہ جب تک دم کو پکڑے رہتا تب تک سیدھی رہتی تھی   مگر جوں ہی وہ اس کو چھوڑتا پھر ٹیڑھی ہو جاتی
کئی دن تک وہ اپنے ہاتھ سے تھامے رہا دُم کو   مگر جب چھوڑ کر دیکھا تو ٹیڑھا پایا اُس دُم کو
بہت گھبرایا اب تو جن، لگا خود سے وہ یوں کہنے   بڑی مشکل میں، مَیں تو پڑ گیا۔ یہ کیا کیا میں نے
خدا معلوم دم سیدھی بھی ہوگی یا نہیں ہوگی   مجھے تو ایسا لگتا ہے میری چھٹی نہیں ہوگی
رہا بھوکا پیاسا، اِک مہینے کچھ نہیں کھایا   مگر جب چھوڑ کر دیکھا تو دم کو ٹیڑھا ہی پایا
بالآخر تھک گیا وہ بھوک سے آنکھوں میں دم آیا   تو پھر ناچار ہو کے وہ مسیتا کے قریب آیا
اور اس سے سر جھکا کر یہ کہا مالک۔ میرے آقا   میں اس کتے کی دُم کو سیدھی کرنے سے تو باز آیا
یہی وہ کام ہے مجھ سے جو ہرگز ہو نہیں سکتا   میں ورنہ کون کام ایسا ہے جو کر نہیں سکتا
مسیتا نے کہا بس بس، نہ تو باتیں بنا بڑھ کے   بہت ہے کام چور اب دور ہو جا میری نظروں سے
بہت شرمندہ ہو کے جن یہ بولا اب میں جاتا ہوں   یہ جتنا مال و دولت ہے سبھی کچھ نذر کرتا ہوں
اگر مجھ سے یہ دُم والا بھی پورا کام ہو جاتا   تو اس کے بعد میں کچھ اور کرنے کے لیے کہتا
مقدر سیدھا گر ہوتا ہرا سکتی نہ دم مجھ کو   ہڑپ کر جاتا اِک پل میں نہ دیتا وقت میں تم کو
مگر میں کیا کروں تقدیر ہی میری بنی کھوٹی   مہینا بھر رہا بھوکا، نہیں اک کھیل بھی پہنچی
گرہ سے اِک مکاں دینا پڑا تم کو الگ وہ ہے   اور اتنا ڈھیر سا غلّہ ہزاروں ہی روپے پیسے
خدارا اب اجازت دیجیے مجھ کو میں جاتا ہوں   یہ اپنی ٹیڑھی دم لے لیجیے مجھ سے میں جاتا ہوں
پکڑتا ہوں میں اپنے کان اب واپس نہ آؤں گا   نہ آئندہ کبھی آ کے تمھیں ہرگز ستاؤں گا
مسیتا نے کہا جاتا تو ہے اِک بات سنتا جا   ہڑپ کر جائے تو انساں کو ایسا ہو نہیں سکتا
چلا جا، دور ہو جا، تو مری نظروں سے اے ناداں   مگر اتنا سمجھ لے تو، بڑا جلاّد ہے انساں

زیادہ ہر کسی سے تین پانچ اچھی نہیں ہوتی
کوئی چانٹا جما دے گا تو گر جائے گی بتیسی



ناب فرحت قمر

بارش

مئی اور جون کے تپتے ہوئے دنوں کے بعد جب
ندا باندی ہوتی ہے یا خوب کھل کے بارش ہوتی ہے
زمین کو شاید ایسا ہی لگتا ہوگا جیسے آپ کو پیاس کی
الت میں ٹھنڈا میٹھا شربت! بارش سے پہلے زمین کیسی
کھی پھیکی سی لگتی ہے اور آسمان پر کتنا غبار کتنی دھول
ائی رہتی ہے۔ لیکن بارش ہوتے ہی سب کچھ نکھر جاتا
ہے۔ زمین جیسے سنور جاتی ہے۔ چاروں طرف ہریالی
ر جاتی ہے۔

اور آسمان ——! آسمان کی تو بات ہی
پوچھیے۔ بارش کے دنوں میں بادلوں سے گھرا آسمان
تنا پیارا لگتا ہے۔ اور یہی بادل جب پانی کی بوندیں
ین پر برسانے لگتے ہیں تو یہی جی چاہتا ہے کہ بارش
ں بھیگتے رہیں۔ سڑکوں پر پھیلے پانی میں کھیلتے رہیں۔
رش کا وہ پانی جو بادلوں سے گرتا ہے خوب صاف ہوتا
پر جب زمین پر گرتا ہے تو مٹی میں مل کر گدلا ہو جاتا ہے۔

اُتّر بھارت میں برسات کا موسم پندرہ جون
ے شروع ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ پندرہ جون کو بارش
ہی جائے۔ بارش تو بھی جبھی ہوگی جب مانسون آئے گا۔
بنگال، بہار، اڑیسہ، اتر پردیش، دہلی، پنجاب
مدھیہ پردیش، اور تمام پہاڑی علاقہ میں اسی مانسون
سے بارش ہوتی ہے۔

یہ مانسون بنگال کی کھاڑی سے اٹھتا ہے۔
ہمالیہ پہاڑ سے ٹکرا کر واپس ہوتا ہے اور سب جگہ جل تھل
کر دیتا ہے۔ بنگال، بہار، آسام وغیرہ بنگال کی کھاڑی
کے بالکل قریب ہیں۔ اس لیے وہاں سے شروع ہونے
والے مانسون بادل اس علاقہ میں خوب برستے ہیں۔

آسام میں ایک جگہ چراپونجی ہے —— پورے
دیس میں سب سے زیادہ بارش اسی چراپونجی میں ہوتی
ہے۔ سال میں ۵۰۰ انچ یعنی ۱۲۵۰ سینٹی میٹر سے زیادہ
بارش کا اوسط ہے۔ اور اس کے بالکل الٹ، راجستھان
کے علاقہ میں سال بھر میں بیس انچ بھی بارش نہیں
ہوتی۔ بارش کی کمی کی وجہ سے ہی راجستھان ریگستان
بن گیا ہے۔ اگر کسی علاقہ میں بارش کی مسلسل کمی رہے تو
چاہے وہ علاقہ کتنا ہی ہرا بھرا اور اُپجاؤ ہو، دھیرے
دھیرے ریگستان بن جاتا ہے۔ اسی طرح کسی ریگستان
میں لگاتار بارش ہونے لگے تو وہ دھیرے دھیرے لہلہاتے
کھیتوں میں بدل جاتا ہے۔

ہمارے دیس میں عرب ساگر سے آنے والی

مانسونی ہواؤں سے بھی بارش ہوتی ہے۔ مہاراشٹر، گجرات، میسور اور دکھنی بھارت میں اسی عرب ساگر سے اٹھنے والے مانسون سے بارش ہوتی ہے اور اتری بھارت کے مقابلے میں دو تین ہفتے پہلے ہی شروع ہو جاتی ہے۔

تو جناب چراپونجی میں تو لگ بھگ ۵۰۰ انچ بارش ہوتی ہے اور راجستھان میں بیس انچ سے بھی کم۔ شاید آپ سوچتے ہوں یہ کیا معاملہ ہے۔ بھلا بارش بھی انچوں میں ناپی جا سکتی ہے۔ ہاں بھئی ناپی جا سکتی ہے اور ناپی جاتی ہے۔ بارش کو ناپنے کے لیے ایک بوتل سی ہوتی ہے۔ اس کو انگریزی میں رین گیج کہتے ہیں۔ اس بوتل کے منھ اور نلی کی گولائی برابر ہوتی ہے۔ بارش کے وقت اس بوتل میں پانی اکٹھا ہوتا رہتا ہے اور بوتل پر لگے نشانوں سے پتہ لگایا جاتا ہے کہ کتنی بارش ہوئی۔ سال بھر ہونے والی بارش کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے اور ان کو جوڑ کر معلوم کیا جاتا ہے کہ سال بھر میں کتنی بارش ہوئی۔ آسان طریقے سے یوں سمجھیے کہ سال بھر میں تیس انچ بارش کا مطلب یہ ہے کہ اگر سال بھر ہونے والی بارش کا پانی نہ تو بھاپ بن کر اڑے نہ زمین میں سمائے بلکہ ٹھہرا رہے تو سال بھر میں زمین پر تیس انچ پانی پھیل جائے۔

بارش کے دنوں میں آپ خبریں سنتے یا پڑھتے ہوں گے کہ دیس کے مختلف علاقوں میں باڑھ آ گئی یا سیلاب آ گیا ہے اور اس سے بھاری نقصان ہوا ہے اور آپ جی میں کہتے ہوں گے کہ بارش تو بڑے نقصان کی چیز ہے۔ لیکن بارش سے ہونے والا یہ نقصان، بارش سے ہونے والے فائدے کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

جو سچ پوچھیے تو بارش کی وجہ سے ہی ہم کو کھانے پینے کو ملتا ہے ——— جی ہاں ——— مطلب یہ کہ ہمارے دیس میں زیادہ تر کھیتی بارش کے سہارے ہی ہوتی ہے۔ سینچائی کے لیے ندیوں اور تالابوں میں پانی بھی بارش کی وجہ سے رہتا ہے اور دھرتی کی زمین بارش کی بدولت اپجاؤ رہتی ہے۔ پینے کا پانی چاہے وہ ہمارے نلوں میں کسی ندی سے آئے یا کنوئیں سے نکالا جائے بارش ہی کا ہوتا ہے۔ بارش ہوتی ہے تو پانی زمین میں سماتا رہتا ہے اور زمین کے نیچے رہنے والا پانی آسانی سے ہم کو کنوؤں اور ہاتھ کے نلوں کے ذریعے مل جاتا ہے۔ ریگستانی علاقوں میں تو پانی زمین کے نیچے اتنی دور ہوتا ہے کہ اس کو نکالنا آسان نہیں۔

اب آپ کے دل میں یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ بارش ہوتی کیسے ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ زمین پر پھیلا ہوا پانی بھاپ بن کر اڑتا رہتا ہے اور وہ بھاپ اوپر اٹھ کر اوپر کی ہوائیں ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے جم کر بادلوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے پھر انھی بادلوں سے بارش ہوتی ہے۔

بادل کئی قسم کے ہوتے ہیں اور سال بھر دیکھے جا سکتے ہیں۔ آندھی کے ساتھ یا آندھی سے پہلے ایسے بادل آتے ہیں جو گرجتے بہت ہیں برستے کم ہیں، لیکن برسات کی لگاتار بارش ان مانسونی بادلوں سے ہوتی ہے جو سمندر سے اٹھتے ہیں اور ہواؤں کے کندھے پر سوار ہو کر [illegible]

دیکھا ہوگا کہ برسنے والے یہ بادل بہت کم گرجتے ہیں۔

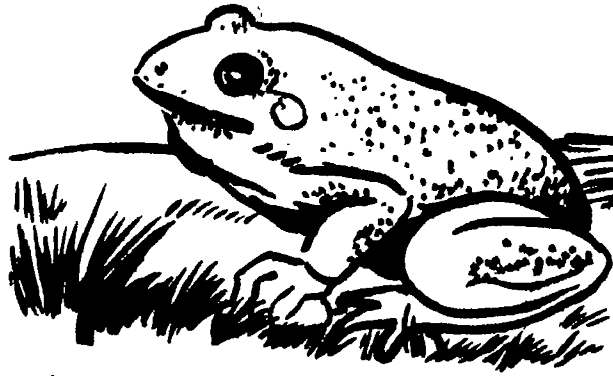
غرض سمندر سے اٹھنے والے بادلوں سے بارش ہوتی ہے، یا بارش کا پانی زمین پر پھیلتا ہے اور ندی نالوں میں ہوتا ہوا پھر سمندر میں پہنچ جاتا ہے۔ بارش کا چکر ہمیشہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔

آج کل بارش کے دن ہیں کبھی کبھی آپ کو بارش کی وجہ سے اسکول جانے میں دیر بھی ہو جاتی ہوگی اور کبھی کبھی راستے میں کیچڑ ہونے کی وجہ سے پیر پھسل جاتا ہوگا، آپ اپنے کو سنبھال نہیں پاتے اور گر جاتے ہیں۔ کپڑے سب خراب ہو جاتے ہیں۔ چوٹ بھی لگتی ہے۔ آپ کو بارش پر غصہ آتا ہے لیکن غصہ کرنے کی بات نہیں بارش آتی ہے تو اپنے ساتھ میں لاتی ہے رم جھم کا سنگیت، ہلکی ہلکی پھوار، سہانا موسم، کالے بادل، ٹھنڈی ہوائیں، چمک دار تاروں والی راتیں، رنگین شام سویرے، پکنکیں، پکوان اور چھٹیاں، اور میٹھے میٹھے آم!

(بقیہ چاند کی مہم ص۲۹ کا)

طبیعت کو چین کہاں۔ وہ تو اب اور آگے جانا چاہتی ہے اور آگے۔ امریکہ نے اپالو ۱۲ اور ۱۳ کو چاند پر بھیجنے کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ یہ جہاز وہاں کی مٹی کا پتھروں کا جغرافیائی حالات کا معائنہ کریں گے۔ اور وہاں سے آگے فی الحال زہرہ اور مریخ تک جانے کے لیے خلائی اسٹیشن بنائیں گے۔ یوں سمجھئے کہ اس کامیابی نے انسان کی کوششوں کو آگے بڑھانے کے دروازے کھول دیے ہیں۔

...اب جاوید پریمی



مینڈک

برسات آئی اور مینڈکوں نے ٹرانا شروع کیا۔
...ہ شور مچاتے ہیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی برسات
...ے پہلے تو کہیں اِکا دُکا نظر آجاتے ہیں۔ پر پانی کی پھوار
...ڑتے ہی نہ جانے کہاں سے اُبل پڑتے ہیں۔

کہتے ہیں سردی کے موسم میں جوہڑوں تالابوں
...جیرہ کی تہہ میں بل بنا کر رہتے ہیں پورا موسم وہیں گذار دیتے
...یں۔ بہار کا موسم شروع ہوتے ہی باہر آجاتے ہیں۔

اپریل کے آخر میں یا مئی اور جون کے مہینے میں ہر
...رف پھدکتے نظر آتے ہیں۔ اور ٹرانا شروع کردیتے ہیں۔
بہت نازک مزاج بھی ہیں۔ زیادہ گرمی یا زیادہ
...ردی کی برداشت نہیں ہے۔ گرمیاں ختم ہونے کو آئیں
...ر انھوں نے ٹرانا شروع کیا۔ کسان کے لیے تو یہ جیسے
...رسات کا سگنل ہے۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ اب برسات
شروع ہونے والی ہے۔

ذرا ان کی شکل تو دیکھیے کیسی بھدی کیسی گھناؤنی
ہے۔ ذرا ہاتھ پیر سے چھو جائیں تو پھریری سی آنے لگتی
ہے۔ خرگوش اور اونٹ کی طرح اپنی پچھلی ٹانگوں پر بیٹھتے
...یں۔ اپنی پچھلی ٹانگوں سے چلتے کیا ہیں پھدکتے ہیں۔

ان کے کھانے کا وقت تو یوں سمجھیے کہ رات
...اور سحری ہی میں

کو ہوتا ہے۔ ذرا انھیں شکار کرتے وقت غور سے دیکھیے۔
تتلی مچھر اور بھونرا ان کی مرغوب غذا ہے۔ جیسے ہی ان
تینوں میں سے کوئی اڑتا نظر آتا ہے۔ یہ دم سادھ کر اسے
ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے ہیں۔ اس وقت ان کی بڑی
بڑی گول گول آنکھیں شکار پر جمی ہوتی ہیں۔

شکار کے وقت مینڈک اپنی زبان سے کوٹے
کا کام لیتا ہے۔ شکار کو دیکھتے ہی یہ اپنے پھیپھڑے میں
ہوا بھر لیتا ہے اور پھول کر کپا ہو جاتا ہے جسم کے پھولنے
سے اور ہوا کے دباؤ سے اس کی زبان باہر آجاتی ہے۔
زبان کے آخری سرے پر ایک عجیب طرح کا لیسدار مادہ
ہوتا ہے۔ اور شکار اس مادے سے چپک جائے تو پھر
چھوٹ نہیں سکتا۔ اس لیسدار مادہ میں شکار
چپک جاتا ہے۔ تو مینڈک صاحب ہوا خارج کرکے جسم
کو معمولی حالت میں لے آتے ہیں اور ہوا کے نکلتے ہی
شکار زبان سے چھوٹ کر حلق میں پہنچ جاتا ہے۔

شکار کے وقت صرف اس کی زبان مدد کرتی
ہے۔ اگلی ٹانگیں اس وقت کام میں لاتا ہے جب تتلی یا
مچھر اس کے منہ میں داخل ہونے میں مزاحم ہو۔ شکار کے
وقت مینڈک کی زبان اتنی تیزی سے اپنا کام کرتی ہے کہ

آپ دیکھ نہیں سکتے۔ مینڈک صرف ان ہی جانوروں کو شکار کرتا ہے جنھیں وہ ایک ہی وقت میں نگل سکے۔

مینڈک کی کئی قسمیں ایسی بھی ہیں جنکی مرغوب غذا چیونٹی ہے۔ انھیں یہ ان کے بلوں میں گھس کر کھاجاتے ہیں۔ اکثر تو یہ اپنے ننھے ننھے بچوں کو بھی بڑے اطمینان سے کھا لیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو بڑے مینڈک اپنے سے چھوٹے مینڈکوں کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔

مینڈک کبھی بھی مرے ہوئے جانور کو نہیں کھاتا چاہے کتنی ہی بھوک لگی ہو۔ اور ایسے کیڑوں کو کھاتا ہے جو نقصان پہنچاتے ہیں۔

زمینداروں اور کاشتکاروں کا تو وفادار ساتھی ہے۔ ان کی فصلوں ان کیڑوں سے پاک کردیتا ہے جو تیار فصلوں کو برباد کردیتے ہیں۔ کہیں کہیں تو یہ شہد کی مکھیوں کو بھی اپنی غذا بنا لیتا ہے۔ آسٹریلیا میں ایک سائنس داں نے تجربے کے سلسلے میں ایک مینڈک کا پیٹ چاک کیا تو ۳۰۰ شہد کی مکھیاں نکلیں۔

مینڈک اتنا ذہین ہوتا ہے کہ اگر اسے سدھایا جائے تو یہ اپنے کھانے کے وقت کو ذہن نشین کر لیتا ہے۔

اچھا آیئے ذرا اس کی آنکھیں غور سے دیکھیں۔
بھئی انھیں عجوبہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کے بھدے جسم سے ان آنکھوں کو ذرا سی بھی مناسبت نہیں۔ اس کے سارے جسم میں یہ ایک الگ حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر اتنی بڑی اور خوبصورت آنکھوں میں روشنی بہت کم ہے۔ مینڈک تیز روشنی میں اتنا صاف نہیں دیکھ سکتا جتنا مدھم روشنی میں دیکھ سکتا ہے۔

جانور اور انسان سب کے سب منھ سے پانی پیتے ہیں۔ مگر مینڈک منھ سے نہیں پیتا۔ قدرت نے اس کا جسم کچھ ایسا بنایا ہے کہ جتنا پانی چاہے وہ اپنے جسم کے مساموں کے ذریعہ اپنے بدن کے اندر داخل کر لیتا۔ آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ سردیوں کے موسم کے یہ پانی کافی ہوتا ہے۔

آپ سے کوئی شخص سوال کرے کہ مینڈک جب ٹرّاتا ہے تو آواز اس کے جسم کے کون سے حصے سے آتی ہے؟ میرا خیال ہے کہ آپ فوراً جواب دیں "منھ سے"۔ مگر آپ کو تعجب ہوگا کہ یہ آواز اس کے گلپھڑوں سے آتی ہے جو ٹرّاتے وقت نیلے رنگ کے غباروں کی طرح پھول جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات ان کے پھولنے سے گلپھڑوں کی جسامت اس کے سر سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ مینڈک ہوا میں سانس نہیں لیتا ہے یوں کہئے کہ ہوا کو نگلتا ہے۔ اسی طرح ہوا کو اپنے جسم میں بھر لینے سے مینڈک کو اپنے سب سے بڑے دشمن سانپ سے اپنے کو بچانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ سانپ کو دیکھتے ہی وہ جسم میں ہوا بھر لیتا ہے تاکہ سانپ کے منھ میں نہ آسکے۔

مینڈک کا جسم بہت چکنا ہوتا ہے اسے تم آسانی سے پکڑ نہیں سکتے اگر کبھی تم اسے زیادہ تنگ کروگے تو وہ جھلاہٹ میں تمھارے اوپر ایک قسم کا لیس دار مادّہ چھوڑ دے گا۔ کہتے ہیں اس میں تیزابیت ہوتی ہے اور جسم پر جہاں بھی لگ جائے وہاں ورم آجاتا ہے یا پھوڑے پھنسیاں نکل آتی ہیں۔

مینڈک مئی جون اور جولائی کے مہینوں میں انڈے دیتا ہے۔ بی مینڈکی ۲۰۰۰ سے لے کر ۳۰۰۰ تک انڈے دیتی ہیں۔ یہ انڈے لچک دار اور لیس دار "جیلی" جیسی دو نالیوں میں ہوتے ہیں۔ ہر انڈے کی شکل کرے کی مانند ہوتی ہے اوپر سے سیاہ اور نیچے سے کچھ کچھ سفید۔ دو تین ہفتوں بعد انڈوں سے کالے کالے بچے نکل آتے ہیں۔ تقریباً دس ہفتوں میں یہ بچے پورے مینڈک بن جاتے ہیں۔

کہتے ہیں دنیا میں مینڈکوں کی ۲۰۰۰ قسمیں پائی جاتی ہیں۔

امریکہ میں ایک ایسا مینڈک پایا جاتا ہے جس کی آواز گدھے کی آواز کی طرح ہوتی ہے۔ اس لیے اس کو "ریکنے والا" مینڈک کہتے ہیں۔ یہ انڈوں کو اپنی پیٹھ پر اٹھائے گھومتا ہے۔ انڈے دے کر مادہ کو آزادی ہوجاتی ہے۔ اب انڈوں سے بچے نکالنا نر کا کام ہے۔

ایک اور عجیب مینڈک چلی کی ایک ریاست میں پایا جاتا ہے۔ یہ اپنی مادہ کے کچھ انڈے تو کھا جاتا ہے باقی اپنے گلے کی تھیلی میں بھر لیتا ہے۔ وہیں بچے نکلتے ہیں اور دو چار دن میں ان بچوں کو گلے کی تھیلی سے باہر نکال دیتا ہے۔

وسطی یورپ کے ایک مینڈک نے تو تحقیق کرنے والوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ ایک مینڈک کی نسل کی مادہ کے پیٹھ پر ایک تھیلی ہوتی ہے جس میں وہ انڈوں کو لیے پھرتی ہے۔ ۱۸۹۶ء میں لندن کے چڑیا گھر میں یہ تحقیق ہوا کہ نر مینڈک اپنے پیروں کی مدد سے وہ انڈے مادہ مینڈک کی تھیلی میں ڈالتا ہے۔

جنوبی افریقہ میں ایک قسم کے مینڈک کے جسم پر بال بھی ہوتے ہیں۔ افریقہ میں مینڈک کی ایک اور قسم درختوں پر بھی چڑھ جاتی ہے۔ انھی مینڈکوں کے بارے میں یہ بات بھی مشہور ہے کہ انھیں غمناک گانوں سے بڑی دل چسپی ہے۔

جنوبی امریکہ میں ایک مینڈک ٹرّاتے وقت ایسی آواز نکالتا ہے جیسے کوئی سانڈ ڈکار رہا ہو۔ امریکہ کا ایک مینڈک سچ مچ چیتے کی طرح چتکبرا ہوتا ہے بڑا پھرتیلا اور چالاک۔ اسی لیے اسے چیتا مینڈک کہتے ہیں۔ جنوبی امریکہ میں ہی مینڈک کی ایک دوسری نسل بہت ہی موٹی تازی اور بے ہنگم شکل کی ہوتی ہے۔ اس مینڈک کے زبان نہیں ہوتی اور تمام عمر پانی میں رہتا ہے۔ کولمبیا میں ایک طرح کا مینڈک اپنے جسم سے لیس دار مادہ خارج کرتا ہے۔ اس مادّے سے ایمیزن کے توتوں کو نیا رنگ دیا جاتا ہے۔ کرتے یہ ہیں کہ توتے کے نیلے اور ہرے پر اکھاڑ دیتے ہیں اور توتے کی ننگی کھال کو مینڈک کے جسم سے چھوا جاتا ہے بار بار یہ عمل دہرایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پر دوبارہ نکلنے شروع ہوجاتے ہیں۔ اور ان نئے پروں کا رنگ نیلے کی جگہ پیلا ہوتا ہے۔

کچھ یورپی ملکوں خصوصاً جاپان میں مینڈک کی کھال سے بڑے خوبصورت پرس بنائے جاتے ہیں۔

مینڈک عام طور پر ڈیڑھ انچ سے آٹھ انچ تک کا ہوتا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا مینڈک

جنوبی کیمرون میں ہوتا ہے اس کی لمبائی دس انچ ہے مگر افریقہ میں ایک بار ایک ایسا مینڈک بھی دیکھا گیا جو ایک فٹ لمبا تھا۔ دنیا کا سب سے چھوٹا مینڈک کیوبا میں ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی آدھا انچ ہوتی ہے۔

پیرس میں ایک خیال عام ہے کہ مینڈک زیادہ عرصہ تک زندہ رہے تو وہ سانپ کی طرح زہریلا ہو جاتا ہے۔ اسے وہاں کے لوگ دیکھتے ہی مار دیتے ہیں — مینڈک کے بارے میں عام خیال ہے کہ وہ بنا کھائے پیے بہت دنوں تک زندہ رہ سکتا ہے۔

جس طرح تمہارے یہاں اسکولوں اور کالجوں میں کھیل کود کے مقابلے ہوتے ہیں اسی طرح کیلی فورنیا میں ہر سال "مینڈکوں کی دوڑ" ہوتی ہے۔ اس مقابلہ میں شرکت کے لیے دور دور سے قسم قسم کے مینڈک لائے جاتے ہیں۔ دوڑنے سے پہلے ایک لکیر کھینچ کر مینڈک ان پر ترتیب وار بٹھائے دیے جاتے ہیں ان کے مالک ان کے پیچھے کھڑے ہوتے ہیں جنھیں وہ "دوڑو، دوڑو" کی آوازیں دوڑنے کا حکم دیتے ہیں۔ اور پھر یقین جانو۔ یہ تمھاری طرح ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں جی جان سے دوڑتے ہیں اور اول آنے والے انعام پاتے ہیں۔

کبھی کبھی تم اپنی باجی یا آپا کو مینڈک دکھا کر کہتے ہو کہ دیکھیے آپا اس کا اچار بڑا عمدہ ہوتا ہے۔ تمھاری آپا کس طرح "آخ تھو" کہتی ہیں۔ اور یہ پڑھ کر آپ کو تعجب ہوگا کہ بہت سے ملکوں میں مینڈک بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔ شمالی امریکہ میں "بل فراگ" لوگوں کی پسندیدہ غذا ہے۔ اس کی پچھلی ٹانگیں امریکی باشندے بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مینڈک کی یہ ٹانگیں جس وقت "روسٹ" کی جاتی ہیں یعنی بھونی جاتی ہیں تو ان کی سوندھی سوندھی مہک "بھونے ہوئے مرغ" کی مہک سے بھی کہیں اچھی ہوتی ہے۔ چین، اٹلی اور فرانس میں بھی مینڈک بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔

اور سائنس کی لیب یا لیبورٹیری میں تو ان بے چاروں کا روز پوسٹ مارٹم ہوتا ہے۔ تم نے سائنس لی ہے تو تمھیں خود بھی تجربہ ہوگا۔

جناب ادیج لی ڈی یو
ترجمہ :- جناب اشفاق محمد خاں



تین دوست

انڈونیشیا کی ایک لوک کہانی

کبھی کبھی آدمی خوف اور دہشت کھا کر بھی اپنی جان گنوا دیتا ہے مثلاً سانپ کے کاٹے سے اکثر آدمی مر جاتے ہیں۔ حالانکہ زہر ہر سانپ میں نہیں ہوتا۔ آدمی پھر بھی مر جاتا ہے۔ اس کی وجہ وہی خوف یا دہشت ہے۔ خوف یا دہشت کبھی کبھی دل پر اس قدر گہرا اثر کرتی ہے کہ بے چارے دل کی حرکت بند ہو جاتی ہے۔ آیئے آج انڈونیشیا کی ایک لوک کہانی پڑھیئے اس لوک کہانی میں خوف اور دہشت ہی کو موت کا بڑا سبب بتایا گیا ہے۔

ہر سال "ہیضہ" مقدس شہر مکہ کی زیارت کو آیا کرتا تھا۔ ہیضے کے دو جگری دوست بھی تھے "موت" اور "دہشت یا خوف"۔ یہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے تھے۔

ایک سال ایسا ہوا کہ خوف اپنے دوستوں سے پہلے ہی شہر میں آدھمکا۔ شہر کا چوکیدار "خوف یا دہشت" کو جانتا نہیں تھا۔ لیکن اس نے انھیں شہر میں داخل ہونے دیا۔

جب دوسرے دو ساتھی مقدس شہر کے دروازے پر پہنچے تو چوکیدار نے ناراض ہو کر کہا "اچھا تو اب تم لوگ پھر رنج اور مصیبتیں لے کر آئے ہو۔ کہو ٹھیک ہے نا اور ملعون ہیضے بتا اب تو کتنی جانیں لے کر ٹلے گا۔"

"تم یا نہ کہیے"۔ ہیضہ نرمی سے بولا۔ میرا خیال ہے کہ ... رہبری میں

پا پانچ سو سے زیادہ جانیں نہیں لوں گا۔"

"لو اے کمبخت موت تو اس شہر سے کتنی جانیں لے کر اپنی سلطنت میں واپس جائے گی؟" چوکیدار نے اس کی طرف مڑ کر پوچھا۔

"مجھے تو ہیضہ جتنی جانیں دے گا لے کر چلی جاؤں گی" موت نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"اچھا اندر جاؤ"۔ چوکیدار نے بڑبڑاتے ہوئے اجازت دے دی لیکن اس سے کہا دیکھو پانچ سو سے زیادہ جانیں ہرگز نہ لینا۔ تم وعدہ کر چکے ہو اس لیے جاؤ اور ہیضے کی نگرانی کرو۔ تاکہ وہ وعدہ کے مطابق ہی لوگوں کو مارے۔"

میاں چوکیدار ـــــ ہاں ہاں تم ہماری بات پر بھروسہ کرو"۔ یہ کہتے ہوئے دونوں ساتھ ساتھ شہر کے پھاٹک میں داخل ہوگئے۔

کئی ہفتے تک دونوں شہر میں رہتے رہے پھر ایک دن دونوں نے چوکیدار کو بتایا کہ دوبارہ شہر کا دروازہ کھول دے۔

"اچھا اچھا ـــ تم دونوں آگئے، ارے ہیضے تو نے کتنے آدمی مارے"؟ چوکیدار نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میں نے سمجھا اس بات کا بے حد خیال رکھا کہ وعدہ سے زیادہ لوگوں کی جانیں نہ لوں"، ہیضہ نے جواب دیا۔

چوکیدار نے ہیضہ کے اس بیان پر یقین کرلیا اور پھر موت کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا۔

ارے موت! تو نے کتنے آدمی مارے؟"

"جی جی ـــ میرے پاس تو ایک ہزار سے زیادہ جانیں ہیں"، موت نے کہا۔

ہیضہ یہ سن کر بدحواس ہوگیا۔ "یہ کیسے ممکن ہے؟" وہ حیرت سے پوچھنے لگا۔ مگر پھر خود ہیضہ نے بتایا کہ موت کے پاس صرف ۴۹ جانیں ہیں"

موت نے کہا۔ "ہاں ہاں میرے پاس ۴۹ جانیں ہیں جو مجھے میرے دوست ہیضہ نے دی ہیں لیکن اس سے زیادہ موتیں دہشت، خوف" کی وجہ سے ہوتی ہیں اور خوف بغیر کسی اطلاع کے تمہارے دروازے سے داخل ہوا تھا۔ اے بوڑھے چوکی دار ـــ ایک دن تجھے معلوم ہوگا کہ ہمارا بھائی خوف (دہشت) ہیضے اور دوسری بیماریوں سے زیادہ انسانی جانوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔

(×)

اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ستمبر سے ختم ہوگئی ہے۔

پیام تعلیم سال بھر تک آپ کے پاس آتا رہا ہے۔ اس کے دلچسپ مضامین اور مزیدار کہانیاں آپ کو ضرور پسند آئی ہوں گی ہمیں امید ہے کہ آپ نہ صرف اس کے خریدار رہیں گے بلکہ اپنے دوستوں کو بھی خریدار بنائیں گے۔ براہ کرم ۵ ستمبر تک سالانہ چندہ چھ روپے منی آرڈر سے بھیج دیجیے۔۔۔۔ اگر آپ کا منی آرڈر یا اس سلسلے میں کوئی خط ۲۵ اگست سے پہلے نہ آیا تو مجبوراً آپ کا نام خریداری سے خارج کردیا جائے گا۔

آپ کا خریداری نمبر ـ 1695 ـ ہے۔

مولانا مقبول احمد سیوہاروی۔

سفرنامہ ابن بطوطہ

مُسلسل

بیگم کے ہم راہی ترکوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ خاتون اب تک باپ کے دین پر ہے اور واپس جانا نہیں چاہتی تو اپنے وطن جانے کی اجازت مانگی جسے خاتون نے منظور کر لیا اور انھیں بہت کچھ بطور انعام دیا اور مجھے بھی بلا کر رخصت کر دیا رخصت کے وقت تین سو سونے کی اشرفیاں چاندی کے دو ہزار سکّے، لڑکیوں کے ہاتھ کا بُنا ہوا اعلیٰ قسم کا چوغہ دس ریشمی جوڑے اور دو گھوڑے مجھے دیے اور محافظ امیر کو جسے ہمارے ساتھ کیا تھا ہدایت کر دی کہ ہمیں امن اور سلامتی کے ساتھ سرحد پار پہنچا دے۔ امیر کے ساتھ پانچ سَو سوار تھے۔ بطور خاص تاکید کر دی کہ میرا خیال رکھے اور کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دے۔ یہاں پر قیام ایک مہینہ چھ دن رہا۔

محافظ امیر ہمارے ساتھ بابا سلطوق کے شہر تک آیا۔

ہمارا چھوڑا ہوا سامان اُونٹ، گاڑیاں، بیل سب یہیں تھے۔ اس وقت شدید سردی تھی۔ میری یہ حالت تھی کہ تلے اوپر تین لبادے، دو پجامے جن میں ایک روئی بھرا ہوا تھا اونی موزے اوپر کتان کے دوہرے موزے ... پر گھوڑوں کی کھال کے ... تھا اس ... تھی پہنتا تھا۔ انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر گرم پانی سے وضو کرتا تھا پھر بھی سردی کا یہ عالم تھا کہ وضو کرتے وقت پانی کا جو قطرہ گرتا تھا جم جاتا تھا۔ منہ دھوتے میں پانی کے قطرے داڑھی پر گرتے جم کر اٹک جاتے تھے جنھیں ہاتھوں سے جھاڑتا تھا۔ زیادہ کپڑے پہننے سے اتنا بھاری ہو گیا تھا کہ جب تک ساتھی سوار نہ کراتے گھوڑے پر بیٹھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ برف کے ٹکڑے ہانڈی میں ڈال دیتے گھل جاتے تھے تو پانی پیا جاتا تھا۔ حاج ترخان جہاں ہم سلطان سے رخصت ہوئے تھے پہنچے، معلوم ہوا کہ سلطان اپنے دارالسلطنت پہونچ گیا ہے۔

سلطان ازبک کا پایۂ تخت

سلطان اوزبک کی راج دھانی کا نام سرائے برکۃ ہے آج کل سلطان یہیں ٹھہرا ہوا ہے۔ ہم نے اپنے سفر کا حال بیان کیا اور جو جو سوالات سلطان نے کیے جواب دے دیا۔

سرائے برکۃ اچھے شہروں میں ہے، گھنی آبادی ہے

... شیافعی ...

کی مسجد ہے۔

سرائے میں ہر قوم کے لوگ آباد ہیں اور مُغلوں کا وہ خاندان بھی ہے جو کسی زمانے میں یہاں کا حکمراں تھا۔ چرکسی، رومی، روسی، مسلمان ہر ایک کے الگ الگ محلے ہیں۔ عراقی، مصری، اور شامی بھی آباد ہیں۔

دار السلطنت کا قاضی بدرالدین الاعرج ہے شافعی مدرسین میں صدرالدین سلیمان بڑے فاضل ہیں اور مالکی علماء میں شمس الدین المصری ہیں۔

شہر میں حاجی نظام الدین کی خانقاہ ہے جہاں ہماری دعوت ہوئی۔ امام نعمان الدین خوارزمی کی خانقاہ بھی ہے۔ خوارزمی صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ بزرگ ترین مشائخ ہیں۔

سلطان اوزبک ہر جمعہ کو خوارزمی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔

خوارزمی صاحب کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ وہ اُمراء اور سلاطین پر توجہ نہیں کرتے عام مسلمان، غربا اور مساکین پر زیادہ توجہ اور محبت کرتے ہیں۔

کرامت

میں نے خوارزم جانا چاہا تو خوارزمی صاحب نے فرمایا:

"ابھی چند دن اور ٹھہرو" میں نے اصرار کیا تو مسکرا کر فرمایا: "ٹھہرنا تو ضرور پڑے گا۔"

آخر مجھے ٹھہرنا پڑا کیونکہ اسی عرصے میں میرا غلام بھاگ گیا تھا۔ اس لئے سفر کرنا دشوار تھا۔ تین دن بعد میرے ایک ساتھی ترخان سے آئے تو غلام اُن کے ساتھ تھا مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ یہ خوارزمی صاحب کی کرامت تھی۔

خوارزم

ترکی کے شہروں میں خوارزم بڑا شہر ہے۔ اس کی آبادی اور مردم شماری بہت زیادہ ہے بازاروں میں اتنی بھیڑ رہتی ہے کہ ہر دم کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ ایک دن بازار لگا تو ایک طرف سے دوسری طرف جانا مشکل ہو گیا او واپس آنے میں بھی مشکل ہوئی لوگوں نے کہا کہ جمعہ کے دن اس بازار میں آنا جانا مشکل نہیں ہوتا۔

سرا ہے سے خوارزم تک آنے میں چالیس دن کا ایک جنگل میں طے کرنا پڑا جہاں چارے کی کمی کے سبب گھوڑوں کی جگہ اونٹوں سے کام لینا پڑا۔ مسافر چلتی گاڑیا میں کھانا کھاتے تھے اور سوتے تھے فقط دو گھنٹے ٹھہرتے تھے آش جو کھاتے تھے اور گوشت کے کباب ڈال کر اوپر سے دہی ملا لیتے تھے۔ راستہ میں گڈھوں کا پانی جو بارش کے زمانے میں جمع ہو جاتا ہے پینا پڑا۔ خوارزم کے لوگ بڑے مہمان نواز اور پابند صوم و صلوٰۃ ہیں جو لوگ نماز نہیں پڑھتے انھیں شرعی سزا دی جاتی ہے۔ خوارزم کے قریب دریائے جیحوں بہتا ہے یہاں سلطان کا ماتحت ایک امیر ہے قطلو دمور نام ہے جس نے مدرسوں اور مضافات کو ترقی دینے میں بڑی محنت کی ہے۔

خوارزم سے زیادہ خلیق اور بامروّت آدمی دنیا کے کسی حصے میں نہیں ہیں۔ یہاں کے موذن لوگوں کو بلا بلا کر مسجد تک لاتے ہیں، اگر کوئی جماعت میں شریک نہیں ہوتا

تو کوڑے سے جو ہر ایک مسجد میں لٹکا رہتا ہے خبر لی جاتی ہے۔ اور جرمانہ الگ ہوتا ہے جس کی رقم مسجد کے کاموں یا مساکین و فقراء کے کھانے میں خرچ کی جاتی ہے

دریائے جیحون جس کا میں نے ذکر کیا ہے اس کا پانی سردی میں جم جاتا ہے اور پانچ مہینے جما رہتا ہے جس پر پار اُترنا آسان ہوتا ہے گرمی میں کشتی سے جانا پڑتا ہے۔

حضرت نجم الدین کبڑے کا مزار اِسی شہر میں ہے جس میں ہر ایک کو کھانا ملتا ہے حضرت جلال الدین سمرقندی کی خانقاہ بھی یہیں ہے۔ مشرق سے مغرب تک خوارزم کے خربوزوں کی نظیر نہیں ملتی۔ بخارا اور اصفہان کا خربوزہ بے شک اس سے ملتا جلتا ہے

خوارزم کے خربوزے کا چھلکا بہت سبز اور اندر سے بہت سُرخ نکلتا ہے۔ مٹھاس کا ٹھکانا نہیں عجیب بات یہ ہے کہ اسکی پھانکیں دھوپ میں سکھا لیتے ہیں اور خوارزم سے ہندوستان اور چین تک لے آتے ہیں۔

جس زمانے میں میرا قیام ہندوستان میں تھا تو جو کوئی تاجر باہر کی چیزیں لاتا خوارزم کے سوکھے خربوزے لوں میں ضرور پوچھتا۔ شاہ ہند کو بھی میرا آتنا خیال تھا کہ اگر تحفتاً خربوزے آتے تو مجھے ضرور بھیج دیا کرتا تھا۔

زمخشر

خوارزم سے چار میل زمخشر کی آبادی ہے [illegible]

ابوالقاسم محمود بن عمر زمخشری کا مزار اسی جگہ ہے جس پر گنبد بنا ہوا ہے۔ زمخشر کے علماء میں مولانا جمال الدین، مولانا زین الدین المقدسی، مولانا رضی الدین یحییٰ، مولانا فضل اللہ رضوی مشہور لوگوں میں ہیں۔ یہ سب معتزلی عقید کے ہیں مگر سلطان اور امیر شہر کے خوف سے بول نہیں سکتے کیونکہ یہ دونوں اہلِ سُنّت ہیں۔

خوارزم اور زمخشر میں کوئلہ نہیں جلاتے لکڑیوں کے گٹھے لاتے ہیں اور پھونک پھونک کر جلاتے ہیں ہندوستان میں بھی لکڑی اور اپلوں کا رواج ہے جسکا ذکر آگے چل کر کروں گا۔

چین کے لوگ پتھر کا کوئلہ جلاتے ہیں، راکھ ہو جاتا ہے تو پانی ملا کر دھوپ میں سکھاتے ہیں اور پھر جلاتے ہیں۔ جب تک بے کار نہیں ہو جاتا کام لیتے رہتے ہیں۔

خوارزم سے جانے لگا تو میں نے اونٹ کرایہ کیے سردی زیادہ تھی اس لیے میرے خادموں نے گھوڑوں پر جھولیں ڈالیں اور سوار ہوئے۔ اب ہمارا اٹھارہ دن تک ریگستان میں سفر رہے گا راستے میں فقط ایک بستی ملے گی جسکا نام کات ہے۔

امیر خوارزم نے رخصتی خلعت پہنائی اور ایک خلعت قاضی نے پہنائی پھر فقہاء نے ساتھ ساتھ دور تک جا کر مجھے رخصت کیا، چار دن چلکر کات پہنچ گئے۔ (باقی آئندہ)

بچوں کی کوششیں

بندر بادشاہ: شیر مرگیا۔ نئے بادشاہ کی تلاش ہوئی۔ جنگل کے درندوں اور چرندوں نے جلسہ کیا کہ نیا بادشاہ کسے بنائیں۔ قرار یہ پایا کہ سب اپنے اپنے کرتب دکھائیں جس سے سب خوش ہوں وہ بادشاہ بنے

ہاتھی نے سونڈ میں پانی بھر کر فوارہ چلایا سب بولے واہ، واہ چیتے نے لمبی لمبی چھلانگیں ماریں۔ سب بولے واہ، واہ، ہرن نے چوکڑی بھری سب بولے واہ واہ۔ گھوڑے نے دوڑ لگائی سب بولے واہ، واہ۔

بندر کی باری آئی تو وہ ناچنے لگا۔ اس کے ناچ سے سب بہت خوش ہوئے۔ اور بولے اچھا تم ہی ہمارے بادشاہ بنو۔ چنانچہ اس کے سر پر تاج رکھ کر تخت پر بٹھادیا۔

لومڑی کو بندر کا بادشاہ بننا بُرا لگا۔ وہ آہستہ سے بولی "آؤ تمھیں سیب کھلاؤں" بندر ساتھ ہولیا۔

ایک شکاری نے ایک پنجرے میں سیب لٹکا رکھا تھا۔ بندر سیب دیکھ کر پنجرے میں گھس گیا پنجرے کا دروازہ بند ہوگیا۔

لومڑی ہنسنے لگی۔ بندر جھلا کر بولا "لومڑی قریب ہے" جلد دروازہ کھول، ورنہ چیتے سے پھڑوادوں گا" ——— لومڑی بولی۔ واہ ر
جل گئی پر بل نہ گیا۔ پنجرے میں پھنسے ہیں۔ تھوڑی د
میں گلے میں رسی اور ہاتھ میں ڈگڈگی ہوگی۔ لیکن خیا
اب بھی یہی ہے کہ ہم تخت پر بیٹھے ہیں۔

میاں بندر تم میں اتنی بھی عقل نہیں ہے سیب کے درخت اور اور پنجرے میں تمیز کرسکو۔ حکومت کیا کروگے؟ یہ کہہ کر لومڑی چل دی۔ بـ
چڑچڑ کرتا وہیں رہ گیا۔

منی یا

راج کماری کے سات باغ: کسی دیس میں ا
راجہ رہتا تھا۔ اس کا ایک لڑکا تھا۔ راجا کا لڑکا ب
ہوچکا تھا۔ راجا نے اپنے لڑکے کی شادی کرنی چاہ
دوسرے دیس میں ایک راج کماری رہتی تھی۔ وہ بہ
خوبصورت تھی۔ راج کمار سے راج کماری کی نسبت
ہوگئی۔ راج کمار کے دیس میں دشمن بھی تھے۔ ان
دل میں حسد پیدا ہوا۔ انھوں نے راج کمار کو ایک بد
راج کماری کی تصویر دکھائی اور کہنے لگے "یہ تمہار
شادی اس راج کماری سے ہونے والی ہے۔ راجہ
کا دل اُداس ہوگیا۔ لیکن وہ اپنے باپ کے آ

کچھ نہ کہہ سکا۔ بس چپ چاپ رہا۔ آخر کار ایک دن شادی ہو گئی۔ راج کماری اپنے جہیز میں سات باغ لائی۔ جو سات رنگ کے تھے۔ راج کمار نے راج کماری کا منھ نہ دیکھا۔ اس طرح کئی دن گزر گئے۔ راج کماری بہت ہوشیار تھی۔ اس نے سوچا خاموشی سے کام نہیں چلے گا۔ کوئی نہ کوئی تدبیر کرنا پڑے گی۔ راجکماری نے محل میں سات سرنگیں کھدوائیں۔ یہ سرنگیں ان ساتوں باغوں میں نکلتی تھیں۔ باغ میں کام کرنے والے نوکروں کو لالچ دے کر اپنا بنا لیا اور کہا راجکمار اگر باغ دیکھنے آئے تو مجھے آکر بتانا۔ اتفاق سے راجکمار ایک دن لال رنگ کے باغ میں گیا۔ لال رنگ کے باغ کی ہر چیز لال تھی۔ اور نوکروں نے راجکماری کو آکر اطلاع دے دی۔ راجکماری سج دھج کر باغ میں گئی۔ اور جھاڑیوں میں چھپ چھپ کر راجکمار کو دیکھنے لگی۔ راجکمار کی نظر راجکماری پر پڑی۔ اس نے سمجھا کہ شاید باغ میں کوئی پری ہو گی راجکمار چلا گیا۔ اسی طرح جس رنگ کے باغ میں جاتا راجکماری اسی رنگ کا لباس پہن کر باغ میں آجاتی۔ اور چھپ چھپ کر دیکھتی۔ آخری دن راجکمار ساتویں باغ میں گیا۔ اس باغ کا رنگ سفید تھا۔ راج کماری سفید کپڑے پہن کر باغ میں پہنچی۔ راجکمار نے سوچا اس پری کو پکڑ لوں۔ راج کماری کو پکڑنا چاہا۔ راجکماری دوڑی دوڑی سرنگ کے راستے سے آنے لگی۔ تاکہ راز نہ کھل جائے۔ راجکمار اپنے رستے چلا گیا۔ لیکن راجکماری کے دوڑنے میں چوٹ لگی۔ وہ گھر آئی اور اپنے کمرے میں جاکر سو گئی۔ راجکمار محل میں آیا کمرے میں گیا ــ تو گیا دیکھتا ہے کہ باغ کی وہی پری پلنگ پر سو رہی ہے۔ جو اس نے باغ میں دیکھی تھی۔ راجکمار نے راجکماری کو جگایا۔ اور کہا سچ سچ تم انسان ہو یا پری ہو۔ اب راجکماری نے پوری کہانی راجکمار کو سنائی۔ راجکمار نے راجکماری سے معافی مانگی اور قسم کھائی کہ آیندہ کبھی لوگوں کی باتوں میں نہیں آئے گا۔ راجکمار نے اپنے دشمن کو جھوٹ بولنے کی سزا دی اور راجکمار اور راجکماری ہنسی خوشی رہنے لگے۔

زینب بیگم بستی

لڑکے کی محنت کہتے ہیں الہ آباد کے کسی گاؤں میں ایک غریب آدمی کی جھونپڑی تھی۔ بے چارہ بہت ہی غریب تھا۔ گھر میں ایک بیوی تھی بچے تھے۔ اور دو بھائی بہن تھے۔ بھائی کا نام جمیل تھا۔ اس کی بہن کا نام جمیلہ تھا۔ اس کا باپ صبح سے شام تک کام کر کے گھر آتا اور جیسے تیسے اپنا خرچ چلاتا خدا کا کرنا ایک دن وہ بھی مر گیا۔ اس کا بیٹا بہت رویا اس کی ماں نے اسے بہت دلاسا دیا اور سمجھایا کہ تم گھر سے باہر نکلو اور کہیں سے کما کر لاؤ۔ خیر صاحب بیٹا گاؤں کے زمیندار کے پاس گیا۔ زمیندار نے اس کو نوکر رکھ لیا، لڑکے نے بہت محنت سے بہت ایمانداری سے کام کیا۔ زمیندار نے خوش ہو کر اس کی تنخواہ بڑھا دی۔ لڑکے نے دھیرے دھیرے بہت ترقی کر لی۔ پڑھنا لکھنا بھی سیکھ لیا ــــــ اب تو یہ بہت ہی امیر ہو گیا اور بہت مزے سے گزر بسر ہونے لگی۔ لوگ اس کی تعریف کرتے تھے۔ پڑھ لکھ کر وہ بہت بڑا آدمی بن گیا۔

احمد کریم

[illegible]

آدھی ملاقات

ساری دنیا میں ہل چل مچی ہوئی ہے کہ انسان چاند پر پہنچ چکا ہے۔ انسان کی اس فتح پر صرف امریکہ ہی نہیں دوسرے بہت سارے ممالک بھی خوشیاں منا رہے ہیں۔

میں آپ کی توجہ ایک بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ میرے شہر کے تقریباً ہر بزرگ کا یہی خیال تھا کہ انسان چاند تک نہیں پہنچ سکتا۔ پھر جب انسان چاند فتح کر چکا اور وہاں سے واپس بھی لوٹنے لگا۔ اب بھی ہمارے بزرگوں کو اس خبر پر یقین نہیں آیا اور جنھیں آیا وہ یہی کہتے رہے کہ تینوں خلا باز زمین پر زندہ سلامت نہیں آسکتے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ دعائیں بھی مانگ رہے تھے کہ راکٹ اور خلا باز راستے ہی میں فنا ہو جائیں۔ جب شہر میں راکٹ کے برباد ہونے کی جھوٹی افواہ پھیلی تو ان بزرگوں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ یہ سب اس لیے کہ ان بزرگوں کا خیال ہے کہ چاند تک جانے کی کوشش خدا اور قدرت سے ٹکرانا ہے۔ اس لیے کامیابی ہرگز نہیں ہو سکتی۔

میں اس خط کے ذریعے آپ سے گذارش کرتا ہوں کہ جہاں آپ اپنے پرچے "پیام تعلیم" میں خلائی کارناموں کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہیں تھوڑی سی جگہ میں بزرگوں کی اس غلط فہمی کو دور کریں۔ میں نے پڑھے لکھے لوگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ قرآن مجید کی ایک آیت کا مطلب ہے "کوشش کرنے پر انسان چاند تک پہنچ سکتا ہے" براہِ کرم اس کی بھی وضاحت کریں۔

مختار احمد محمد ابراہیم
مالیگاؤں دنار

اے صاحب! اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ پہلے ہی کہہ چکا ہے ہم نے تمہارے لیے آسمان اور زمین کو مسخر کیا ہے۔ اسلام علم و ترقی میں روک لگاتا تو اتنے بڑے سائنس داں طبیب حکیم کبھی پیدا نہ ہوتے۔ یورپ نے انھی کی بتائی ہوئی باتوں کو بنیاد بنا کر ترقی کی ہے۔ اس کے قدم ترقی کی طرف ہیں اور ہم ان جاہلانہ باتوں میں الجھے ہوئے ہیں۔

ایڈیٹر

بہت ہی افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ آپ پرچہ بھیجنا بند کر دیں۔ یہ پرچہ ممبروں کو پسند نہیں۔ ایک صاحب نے لائبریری کے لیے اپنے نام یہ جاری کیا تھا جس کا خریداری نمبر ۵۶۹ ہے ممبروں کا کہنا ہے کہ پرچہ کمیونسٹ خیال کا ہے۔ اس پرچے میں اسلام کی باتوں کو چھوڑ کر گاندھی اور لینن کی باتیں ہمیشہ رہا کرتی ہیں۔ پرچہ مسلمان بچوں کا دماغ بدل کر رکھ دے گا۔ اس لیے اس پرچے کو بند کیا جا رہا ہے۔

محمد علی لائبریری کلونا۔

پیام تعلیم کوئی مذہبی یا سیاسی پرچہ نہیں ہے یہ تو بچوں کا تعلیمی پرچہ ہے۔ اس میں ہر طرح کی معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اگر آپ یہ بات ناپسند کرتے ہیں پرچہ نہیں خریدتے ہیں تو یہ آپ کی خوشی۔

ایڈیٹر

جون کا پیام تعلیم پڑھ کر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوئی اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے بارے میں جو باتیں آپ نے رسالہ میں اکٹھا کی ہیں اگر ہم انھیں سے کچھ سبق لے سکتے تو کتنا اچھا ہوتا ——— ڈاکٹر صاحب مرحوم کے بارے میں زیادہ جاننے کی خواہش ہے۔ شاید کچھ دنوں پہلے آپ نے "ذاکر نمبر" نکالا تھا اور وہ ختم بھی ہو گیا۔

اگر آپ آیندہ "ذاکر نمبر" نکالیں جیسا کہ آپ نے خیال فرمایا ہے تو مجھے بھی ایک کاپی مرحمت فرمادیں شکر گزار ہوں گا۔ محمد معین الدین۔ خریداری ۱۲۸۳

گذشتہ ماہ پیام تعلیم کا "ذاکر صاحب صدر جمہوریہ ہند کی یاد میں" خاص نمبر ملا تھا۔ اب جولائی کا تازہ شمارہ بھی موصول ہوا ——— آپ نے بے حد خلوص کے ساتھ صدر ہند آنجہانی کی یاد میں یہ مخصوص نمبر نکال کر تمام اردو داں حضرات کے لیے قابل فخر یادگار قایم کی ہے۔ آپ نے اور تمام فن کاروں نے نیز مقتدر ادبا و شعرا نے ذاکر نمبر دوم میں اعلیٰ معیاری مضامین پیش کیے ہیں۔ انتخاب مضامین بہت خوب ہے۔ ہر تخلیق میں سچی محبت اور عقیدت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ آنجہانی صدر محترم کے لیے آپ نے ان کی زندگی میں تو ایک شاہکار تحفہ پیش کیا ہی تھا اب ان کی وفاتِ حسرت آیات پر بھی آپ نے بلند پایہ یادگار نمبر نکال کر اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے مبارک ہو

مہر

جولائی کا پیام تعلیم ملا۔ ماشاء اللہ بے حد پسند آیا۔

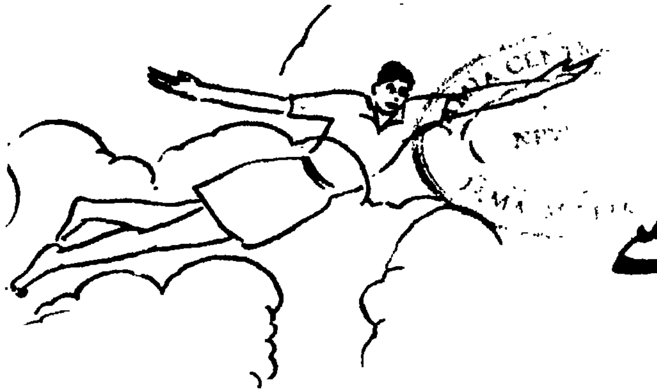
ہر کہانی ہر مضمون اپنی جگہ لاجواب ہے۔ "کون بڑا" "کون بری عادت کو چھوڑ سکتا ہے" "لال شہزادہ" "وہ بے قصور تھا" بے حد پسند آئیں۔ لینن والے مضمون کا تو جواب ہی نہیں سچ پوچھیے تو ایک دفعہ شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کیے اٹھنے کو دل نہ چاہا۔ بے حد دلچسپ پیرائے میں بیان کیا اندر کی تصویریں اچھی نہ لگیں۔ اتنے سال ہو گئے مصور صاحب نے اپنا انداز نہ بدلا۔ تصاویر ایسی ہونی چاہییں کہ اصلی لگیں جیتی جاگتی۔ کارٹون کا سلسلہ بھی شروع کر دینا چاہیے۔

سید حسن مہر مراد آبادی

آپ کا ذاکر نمبر دیکھا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مضمون نگاروں کی تعریف کروں جنھوں نے اتنے مختصر عرصہ میں اتنے خوبصورت مضامین لکھے یا آپ کی جنھوں نے ایسے خوبصورت مضامین جمع کیے۔ بہرحال نمبر قابل تعریف ہے۔ خلیق انجم اشرفی

محترم و معظم مرحوم صدر ذاکر حسین صاحب کے اچانک انتقال کر جانے پر ہم لوگوں کو بہت غم ہوا۔ ہمارے یہاں ۳ مئی تاریخی دن ہو گیا۔ ہمارے بھانجے آصف اقبال احمد کا ختنہ ۸ بجے صبح میں ہوا تھا۔ اس لیے اس کے ختنہ کی تاریخ ہم لوگوں کو ہمیشہ یاد رہے گی۔ جس طرح صدر جمہوریہ ہند کے انتخاب کے بعد ایک خاص نمبر نکالا تھا اس سے زیادہ آب و تاب کے ساتھ ایک یادگار نمبر نکالیے۔ مضامین سبھی پسند آئے۔ نظمیں بھی خوب رسیلی ہیں۔ خاص طور سے "برسات" "ننھے میاں کا خواب" "لینن اپنے بچپن میں" "آسٹریلیا کے چند انوکھے جانور" وغیرہ وغیرہ۔ خالدہ خاتون ملک دیسنوی دو بھنگا

صحافی



اِدھر اُدھر سے

بنا پروں کے اُڑیے

بچپن میں آپ نے اپنی امی دادی اماں سے پریوں یا دیوں کے ہوا میں اڑنے کی کہانیاں سنی ہوں گی۔ یہ سب خواب وخیال کی باتیں تھیں۔ پر اب تو نیا زمانہ ہے اور اب بات ہوائی جہازوں سے بھی آگے بڑھ گئی ہے کہیں آگے۔ اور اب جناب آپ بھی اڑ سکتے ہیں۔ مزہ یہ کہ بغیر پروں کے اڑ سکتے ہیں۔ پرندوں کی طرح آپ کو پر پھڑپھڑانے کی مطلق حاجت نہ ہوگی۔

ایک خبر ہے کہ نئے قسم کی راکٹ پیٹی ایجاد ہوئی ہے پیٹی ایجاد کرنے والی فرم امریکہ کی ہے۔ اس نے اعلان کیا ہے کہ ایک ہوائی اڈے پر اس پیٹی کا تجربہ کیا گیا۔ اس پیٹی کو لگا کر ایک آدمی پچیس فٹ کی اونچائی پر ۴۰ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑتا رہا ہے۔ دو فٹ لمبا اور ایک فٹ قطر کا جیٹ انجن اس پیٹی میں لگا ہوا ہے۔ انجن میں مٹی کے تیل جیسا کوئی ایندھن استعمال ہوتا ہے۔

ایک نا تربیت یافتہ نوجوان نے ہوائی جہاز چلایا

بیس سال کا ایک نوجوان جس نے کبھی ہوائی جہاز نہیں چلایا تھا۔ پرنس جارج (برٹش کولمبیا) کے ہوائی اڈے پر ہوائی جہاز کو سلامتی کے ساتھ اتارنے میں کامیاب ہوگیا۔

ہوا یہ کہ جہاز کے پائلٹ یا ہواباز کا دل کی حرکت بند ہونے سے اچانک انتقال ہوگیا۔ یہ نوجوان فوراً اس کی جگہ آگیا اور جہاز کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ ایک اور ہوائی جہاز نے اس کی رہنمائی کی اور کنٹرول ٹاور اسے ہدایتیں دیتا رہا۔ انسان اس طرح کے ناگہانی حادثوں کے وقت ہوش حواس اور سوجھ بوجھ سے کام لے تو بہت سی آفتیں ٹل جاتی ہیں۔

کھلاڑی بھی بکنے لگے

ایک نئی بات سنیے کھلاڑیوں کی خرید فروخت بھی ہوتی ہے اور جناب انگلستان میں ہوتی ہے۔ وہاں اگست میں فٹ بال کھیلنے کا سیزن شروع ہوتا ہے۔ اور فٹ بال کے مشہور مشہور کھلاڑیوں کی خرید فروخت کا سلسلہ زور شور سے شروع ہوجاتا ہے۔ اس سال کھلاڑیوں کے دام پچھلے سال کے مقابلے میں بہت چڑھ گئے۔ انگلستان کے مختلف کلب کھلاڑیوں کی خریداری پر اب تک ۱۵ لاکھ ۲۰ ہزار پونڈ خرچ

کر چکے ہیں۔ اب خاص خاص کھلاڑیوں کی قیمتیں بھی سنیئے۔
۱۔ ایلن کلارک ۳۰ لاکھ ۴۵ ہزار روپیے۔
۲۔ کولن سجسٹ ۱۹ لاکھ روپیے۔
۳۔ بروس ریوش ۱۶ لاکھ روپیے۔
۴۔ جم اسمتھ ۱۹ لاکھ روپیے۔
ان کے علاوہ چھ اور کھلاڑیوں کو بارہ لاکھ سے ۱۴ لاکھ تک خرید اگیا۔

قسمت کا دھنی

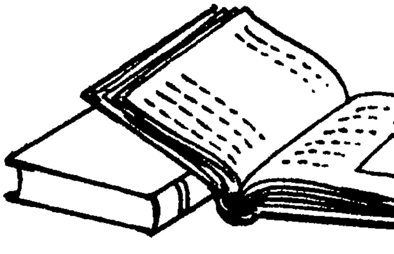
ابھی کچھ دنوں پہلے ایک ہندوستانی کو امریکہ سے چودہ کروڑ روپیہ ملا ہے۔ اب سے کوئی چالیس برس پہلے (۱۹۲۹ء میں) اتر پردیش کے ایک صاحب ٹھاکر چندروپ سنگھ امریکہ چلے گئے۔ اور وہاں کے مشہور شہر شکاگو میں کاروبار کرنے لگے۔ کاروبار میں انھوں نے بہت ترقی کی اور کروڑوں روپیے کمائے۔ انھوں نے شادی نہیں کی۔ ۱۹۵۲ء میں انھوں نے ایک وصیت لکھی جس کے مطابق مرنے کے بعد ساری جائداد کا وارث اپنے بھائی گمبھیر سنگھ صاحب کو مقرر کیا۔

چندروپ سنگھ صاحب کا گذشتہ ۱۲ر مارچ کو شکاگو میں انتقال ہوا۔ اور اس طرح ان کی چودہ کروڑ روپے کی بھاری جایداد قانونی طور پر ان کے بھائی کے حصے میں آئی ہے۔ جس کے تمام متعلقہ کاغذات شکاگو کے اٹارنی نے گمبھیر سنگھ صاحب کے پاس بھیج دیئے ہیں۔
گمبھیر سنگھ صاحب سچ مچ قسمت کے دھنی ہیں۔ اس وقت اس کی عمر ۶۵ سال ہے۔ وہ کھیم پور کھیری ...

ایک زراعتی فارم چلاتے ہیں۔ ان کا لڑکا جوالا سنگھ آگرہ کی ایک فوجی ورک شاپ میں پینٹر کا کام کرتا ہے۔

۱۶ سو مغلئی کھانوں کا سراغ مل گیا۔

مغل بادشاہوں کی اور باتوں کے ساتھ ان کے کھانے بھی مشہور تھے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ غریبی آتی گئی۔ لوگ ان کھانوں کو بھی بھول بھال گئے جو باورچی یہ کھانے پکاتے تھے۔ وہ پڑھے لکھے تو ہوتے نہ تھے۔ پکانے کی ترکیبیں اپنی اولاد کو بتا جاتے تھے۔ اس طرح یہ فن سینہ بسینہ چلتا تھا۔
مگر رنجیت ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر ککڑ نے کمال کیا۔ اس فن پر تین قلمی کتابیں ڈھونڈھ نکالیں یہ کتابیں فارسی زبان میں ہیں۔ ان میں دیمک لگ گئی ہے۔ اس لیے انھیں پڑھنے اور سمجھنے میں انھیں بیس برس لگ گئے۔ اب انھوں نے اس کے بہت سے حصوں کا انگریزی میں ترجمہ کرلیا ہے۔ اب تک جتنے حصے کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے مطابق خالی نان یا روٹی کی ۴۴ قسمیں ہیں۔ بریانی کی ۵۰، دوپیازہ کی ۵۰، کباب کی ۶۰، قورمے کی ۳۰، پراٹھوں کی ۵۰، اور دال کھچڑی کی ۳۰۔ ویسے ان کتابوں میں کل سولہ سو کھانوں کی ترکیبیں ہیں۔
ککڑ صاحب نے ان میں سے کچھ کھانوں کا تجربہ بھی کیا۔ ۱۹۶۸ء میں انکٹاڈ کانفرنس ہوئی تھی دنیا بھر کے نمایندے اس میں شریک ہوئے تھے۔ اس موقع پر یہ مغلئی کھانے پیش کیے گئے تھے اور بہت پسند کیے گئے۔



کتابوں کی باتیں

اعتمادیہ سالانہ نمبر (بیادِ غالب)

ضخامت ۲۲۸ صفحے۔ سائز ۱۸×۲۲/۸

لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت عمدہ ٹائٹل پر مرزا غالب کی رنگین تصویر۔ بلاک کی تصویروں کے پانچ صفحے اس کے علاوہ۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ

اینگلو عربک ہائر اسکول، اجمیری گیٹ دہلی ۶

اینگلو عربک ہائر سکنڈری اسکول کا یہ سالانہ پرچہ ہر سال نکلتا ہے۔ بڑی شان سے نکلتا ہے ہر بار اس میں کوئی نہ کوئی خاص بات ہوتی ہے۔ اب کے یہ غالب کی یاد میں نکلا ہے اس میں مرزا غالب کی زندگی پر ان کی شاعری پر اچھے اچھے مضمون ہیں بڑوں کے بھی اور بچوں کے بھی سب سے پہلا مضمون مرزا محمود بیگ صاحب کا ہے۔ (غالب بہ سلسلۂ استادانِ سخن) یہ اپنی جگہ خود ایک شاہ کار ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر خورشید الاسلام، ڈاکٹر تنویر احمد، عبدالصمد سیفی پریمی، غلام احمد فرقت، خواجہ احمد فاروقی اور دوسرے بھاری بھرکم لوگوں نے رسالے کو نوازا ہے اور اس سے رسالے کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ طالب علموں نے بھی اپنے اپنے مضمون بڑی محنت اور سلیقے سے لکھے ہیں۔

رسالہ ہمیشہ کی طرح اُردو، ہندی، انگریزی تین زبانوں میں نکلا ہے۔ ہندی اور انگریزی میں زیادہ تر مضمون غالب کے بارے میں ہیں۔ رسالے کے چیف ایڈیٹر محمد قاسم صدیقی صاحب ہیں۔ رضا احمد صدیقی صاحب (یازدہم) ابو سعید صاحب یازدہم) ریاض الحق صاحب راشد (یازدہم) ان کے معاون ہیں۔ ان سب کی محنت اور سلیقہ شعاری نے رسالے کو یادگاری چیز بنا دیا ہے۔ محمد قاسم صاحب ہمارے جانے پہچانے بزرگ ہیں بہت عرصے سے یہ کام ان کے سپرد ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے کیا مضمونوں کے اعتبار سے اور کیا ظاہری سج دھج اور شان کے اعتبار سے نمونے کا رسالہ بنا دیا ہے۔

اعتمادیہ (حصہ دوم) یہ رسالہ آٹھویں درجے تک کے بچوں کا ہے۔ مضمون بھی زیادہ تر انھی کے معیار کے ہیں غالب کا حصہ اس میں بھی غالب ہے لکھنے والوں میں شفیع الدین نیرؔ اور مولانا مقبول احمد سیوہاروی کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ ذاکر صاحب کی ایک کہانی "آخری قدم" اور غلام حیدر ایم اے کا مضمون دونوں "پیام تعلیم" کے "ذاکر نمبر" سے نقل کیے گئے ہیں۔

یہ پرچہ ۸۸ صفحے کا ہے ۶۷ صفحے اُردو کے اور باقی ہندی کے۔ مجموعی اعتبار سے یہ پرچہ بھی بہت دلچسپ ہے لکھائی چھپائی اور کاغذ بھی پہلے جیسا ہے۔ ٹائٹل پر بھی مرزا غالب کی وہی تصویر ہے ہاں اندر شروع میں ذاکر صاحب کی اور آخر میں پرنسپل صاحب کی تصویریں ہیں۔ ہم ان دونوں رسالوں کی اشاعت پر جناب قاسم صدیقی صاحب اور ان کے ساتھیوں کو مبا



آرم اسٹرانگ چاند پر کوئی آلہ نصب کر رہے ہیں (بہ شکریہ "علم و فن")

Regd. No. D. 1457 SEPTEMBER 1969

Payam - i - Taleem

NEW DELHI 25.

مکتبہ جامعہ کی نئی مطبوعات

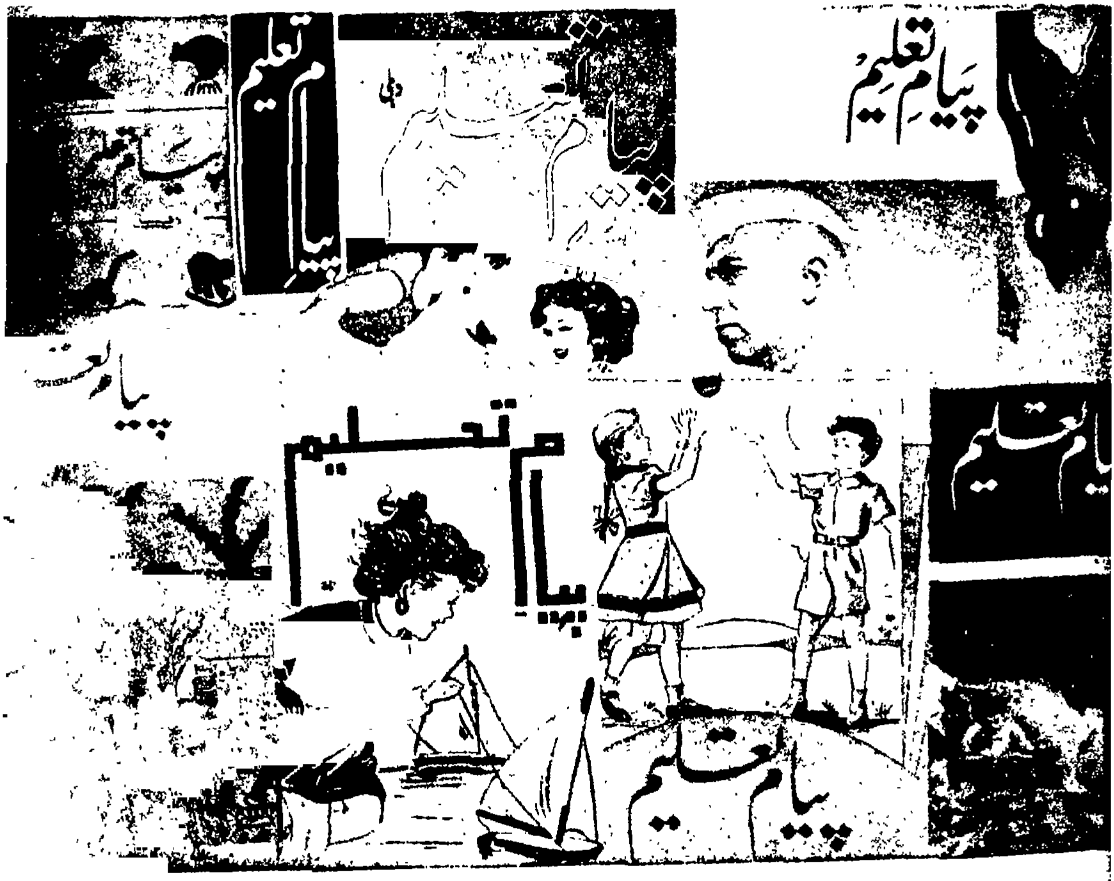
[illegible]

ملنے کے پتے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳	جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵	اردو بازار دہلی ۶

یونین پرنٹنگ پریس

پیام تعلیم



[redacted]

ریاستہائے میسور، مدھیہ پردیش، جموں و کشمیر اور ہریانہ کے
تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ پیامِ تعلیم نئی دہلی

جلد ۶، اکتوبر ۱۹۶۹ء شمارہ ۱۰

ایڈیٹر: محمد حسین حسّان ندوی

صدر دفتر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے سالانہ چندہ ۶ روپے۔

فہرست

ریاستہائے میسور، مدھیہ پردیش، جموں وکشمیر اور ہریانہ کے
تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ پیام تعلیم نئی دہلی

جلد ٦ اکتوبر ۱۹۶۹ء شمارہ ۱۰

ایڈیٹر:۔ محمد حسین حسان ندوی

صدر دفتر:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

شاخ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ٦

شاخ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

قیمت فی پرچہ ٦٠ پیسے سالانہ چندہ ٦ روپے۔

فہرست

تو کچھ اور ہی تھا۔ تعلیم، بچوں کی تعلیم، بڑوں کی تعلیم، ایسی تعلیم جس سے پڑھنے والوں میں صحیح انسانیت پیدا ہو۔ اخلاقی قدریں رچیں بسیں۔ تعمیری ذہن پیدا ہو۔ عجیب بات ہے کہ پربھنی جیسے دور دراز مقام کے صاحب دل حضرات نے ایسا صحیح اور نیک اقدام کیا۔ ذاکر صاحب کے نام پر اپنے اسکول کا نام رکھا۔ ہم ان کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ خدا کرے اس نیک مثال سے دوسرے بھی سبق حاصل کریں۔ یوپی والوں کے لیے تو یہ عبرت کا مقام ہے۔ ذاکر صاحب آندھرا میں پیدا ہوئے تھے۔ آندھرا والے ہم سے زیادہ انھیں اپنانے کو تیار ہیں۔ تازہ مثال آپ کے سامنے ہے۔

پچھلے پرچے میں ہم نے ایک درخواست کی تھی۔ پیام تعلیم کو اب کافی لوگ جان گئے ہیں۔ بچوں کے لیے اسے مفید سمجھتے ہیں۔ پیام تعلیم کے ہمدرد بزرگ اور ساتھی مقامی طور پر اگر کوشش کریں تو کامیابی یقینی ہے، ہماری یہ درخواست ابھی شایع بھی نہیں ہوئی تھی کہ سورت کے محترم آدم بھائی پٹیل صاحب کا نوازش نامہ ملا۔ انھوں نے بغیر ہماری درخواست کے محض اپنی ہمدردی کی بدولت کوششیں شروع کر دی ہیں۔ ابھی تک تین اسکولوں کو خریدار بنا سکے۔ اور اسکولوں کے لیے کوشش جاری ہے۔ انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔ ہمارے لیے یہ بہت نیک شگون ہے خدا کرے آدم بھائی پٹیل جیسے ہمدرد ہر شہر ہر گاؤں میں پیدا ہو جائیں۔

آدم بھائی پٹیل کے تین خریداروں کے علاوہ اس مہینے شاہد صاحب (انچارج شاخ بمبئی) نے چھ خریدار مرحمت فرمائے۔ مبشر احمد صاحب ورنگل، اقبال نصیب صاحب برہان پور، یزدانی صاحب حیدر آباد، مولانا بدرالدین صاحب جامعہ نگر، محمد طاہر صاحب نانپارہ، محمد ذہین صاحب (انچارج شاخ مکتبہ جامع مسجد) آفاق احمد صاحب (کارکن مکتبہ) نے ایک ایک خریدار فراہم کیا۔ عبدالحمید صاحب پربھنی، ام زیڈ انصاری صاحب جمشید پور، محمد کمال صاحب منگلور، محمد ہارون صاحب بریلی، سید رؤف صاحب پارسی ناگلی اپولہ، مولانا دلاور خاں بسم اللہ خاں کو پرگاؤں احمد نگر، محمد میران صاحب بھٹکل عبداللہ صاحب عطا سرائے پٹنہ خود خریدار بنے ہیں اور ہاں بی بی رضا ہائی اسکول گلبرگہ۔ خالد ہائر سکنڈری اسکول بریلی، مڈل اسکول دھاڑ بانڈانہ ہائر سکنڈری اسکول جامعہ اور ٹیچرس کالج جامعہ نے اپنی لائبریریوں کے لیے ایک سال کے لیے پیام تعلیم کی خریداری منظور فرمائی ہے۔

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔

پیام تعلیم سال بھر تک آپ کے پاس آتا رہا ہے۔ اس کے دل چسپ مضمون اور مزیدار کہانیاں آپ کو پسند آئی ہوں گی۔ ہمیں امید ہے کہ آپ نہ صرف اس کے خریدار بنے رہیں گے۔ بلکہ اپنے دوستوں کو بھی خریدار بنائیں گے۔ اس لیے ۲۵ر اکتوبر تک آپ سالانہ چندہ ۶ر روپے منیجر صاحب پیام تعلیم کے نام بھیج دیجیے۔ آپ کا خریداری نمبر۔۔۔۔۔ ہے۔ اگر آپ نے ۲۵ اکتوبر تک منی آرڈر نہیں بھیجا تو آپ کا نام خریداری سے خارج ہو جائے گا۔

بچوں سے باتیں

پچھلے پرچے میں آپ نے تایا جان وسعت ناظم صاحب کا مضمون پڑھا تھا۔ کیوں ہیں نا؟ ہمیں امید ہے کہ اس پرچے میں اپنے ایک ادیب اور مضمون نگار محترم اظہر افسر صاحب کا مزے دار مضمون پڑھیں گے۔ پچھلے پرچے میں ہم نے اسی مضمون کا ذکر کیا تھا۔ اظہر صاحب بہت ہی مصروف آدمی ہیں۔ انھوں نے آپ کی خاطر اتوار کی چھٹی اس مضمون کی نذر کر دی۔ رات کے دو بجے مضمون ڈاک میں ڈال کر انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

پچھلے پیام تعلیم میں چاند کے سلسلے کے دوسرے مضمون "چاند کی سیر کی کہانیاں" "چاند کی مہم" "خلا کا مسافر" کہانی وغیرہ بھی کافی پسند کیے گئے۔ علقمہ شبلی صاحب، جناب لطف احمد صدیقی صاحب، جناب حافظ باقری صاحب کی نظموں نے تو چار چاند لگا دیے۔ اس سلسلے میں دو بھی جان ڈال دی۔ ہم ان سب کے شکر گزار ہیں۔

نئی تصویری کہانی نیلم اور شہزادہ بھی سبھی بچوں کو اچھی لگی۔ کہانی جوں جوں آگے بڑھے گی دلچسپی بڑھتی جائے گی۔ اس کا اندازہ اس مہینے کی قسط سے ہو جائے گا۔

گذشتہ اونٹ چھوٹوں نے بڑوں نے سب نے پسند کیا۔ ٹیگور، بارش، مینڈک تینوں مضمون بڑے بچوں نے خاص طور پر پسند کیے۔ ٹیگور کا نمبر پہلا رہا۔ اور ہاں ... نظم بھی بہت مزے کی رہی۔

محترمہ آصفہ مجیب اور محترم پروفیسر محمد مجیب صاحب پچھلے دنوں اپنے صاحبزادے (محمد امین صاحب) سے ملنے ترکی تشریف لے گئے تھے۔ ہماری درخواست پر محترمہ آصفہ مجیب نے پیام تعلیم کے لیے مختصر سا سفرنامہ لکھا ہے۔ بہت دل چسپ انداز میں لکھا ہے۔ اس کی پہلی قسط اس پرچے میں پڑھیے۔ آپ کے سالنامے کے لیے بھی انشاء اللہ کوئی اچھی سی چیز مرحمت فرمائیں گی۔

پچھلے پرچے میں ہم نے کہا تھا کہ چاند پر پہلا قدم رکھنے کے بعد اس دنیا کا باسی آگے قدم بڑھائے گا۔ دور دور کی خبر لائے گا۔ زہرہ اور مریخ پر کمند پھینکے گا۔ زہرہ اور مریخ کے حالات کی کھوج تو پہلے سے ہو رہی ہے پر اب اس میں نئی زندگی پیدا ہو گئی ہے۔ ہمارے محترم بزرگ جناب غلام ربانی صاحب نے زہرہ پر ایک مضمون مرحمت فرمایا ہے۔ یوں سمجھیے کہ وقت کی چیز ہے۔ اس کا دوسرا حصہ اگلے نمبر میں پڑھیے۔

اس مہینے (اکتوبر) میں ہمارے باپو (گاندھی جی) کی پیدائش کو سو سال ہو جائیں گے۔ یہ پورا سال گاندھی شتابدی کا سال تھا۔ وقتاً فوقتاً باپو کی تعلیمات یا ان کی بتائی ہوئی باتوں کے سلسلے میں تمام دنیا کے ملکوں میں تقریبیں منائی گئیں۔ اب اس مہینے دلی میں اور دلی سے باہر زیادہ دھوم دھام رہے گی۔ باہر سے مہمان بھی آئیں گے۔ آزادی کی لڑائی کے بہت بڑے ہیرو اور باپو کے دلی دوست خان عبدالغفار صاحب بھی تشریف لائیں گے۔

ابھی ابھی پیام تعلیم کے دفتر میں ایک اطلاع ملی کہ بمبئی میں ایک اسکول ہے ذاکر حسین ہائی اسکول۔ وہ رسالے کا خریدار رہا ہے۔ ذاکر صاحب کو قدرت نے استاد پیدا کیا تھا۔ اسی کام پر انھوں نے اپنی زندگی نچھاور کر دی۔ عیش و آرام تج دیا۔ آخر عمر میں انھیں بڑے بڑے مرتبے حاصل ہوئے پر ان کا اپنا منصب

تو کچھ اور ہی تھا۔ تعلیم، بچوں کی تعلیم، بڑوں کی تعلیم، ایسی تعلیم جس سے پڑھنے والوں میں صحیح انسانیت پیدا ہو۔ اخلاقی قدریں پنپیں بسیں۔ تعمیری ذہن پیدا ہو عجیب بات ہے کہ پربھنی جیسے دور دراز مقام کے صاحب دل حضرات نے ایسا صحیح اور نیک اقدام کیا۔ ذاکر صاحب کے نام پر اپنے اسکول کا نام رکھا۔ ہم ان کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ خدا کرے اس نیک مثال سے دوسرے بھی سبق حاصل کریں۔ یوپی والوں کے لیے تو یہ عبرت کا مقام ہے۔ ذاکر صاحب آندھرا میں پیدا ہوئے تھے۔ آندھرا والے ہم سے زیادہ انھیں اپنانے کو تیار ہیں۔ تازہ مثال آپ کے سامنے ہے۔

پچھلے پرچے میں ہم نے ایک درخواست کی تھی۔ پیام تعلیم کو اب کافی لوگ جان گئے ہیں۔ بچوں کے لیے اسے مفید سمجھتے ہیں۔ پیام تعلیم کے ہمدرد بزرگ اور ساتھی مقامی طور پر اگر کوشش کریں تو کامیابی یقینی ہے، ہماری یہ درخواست ابھی شایع بھی نہیں ہوئی تھی کہ سورت کے محترم آدم بھائی پٹیل صاحب کا نوازش نامہ ملا۔ انھوں نے بغیر ہماری درخواست کے محض اپنی ہمدردی کی بدولت کوششیں شروع کر دی ہیں۔ ابھی تک تین اسکولوں کو خریدار بنا سکے۔ اور اسکولوں کے لیے کوشش جاری ہے۔ انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔ ہمارے لیے یہ بہت نیک شگون ہے خدا کرے آدم بھائی پٹیل جیسے ہمدرد ہر شہر ہر گاؤں میں پیدا ہو جائیں۔

آدم بھائی پٹیل کے تین خریداروں کے علاوہ اس مہینے شاہد صاحب (انچارج شاخ بمبئی) نے چھ خریدار مرحمت فرمائے۔ مبشر احمد صاحب ورنگل، اقبال نصیب صاحب برہان پور، یزدانی صاحب حیدر آباد، مولانا بدرالدین صاحب جامعہ نگر، محمد طاہر صاحب نانپارہ، محمد ذہین صاحب (انچارج شاخ مکتبہ جامع مسجد) آفاق احمد صاحب (کارکن مکتبہ) نے ایک ایک خریدار فراہم کیا۔ عبدالحمید صاحب پربھنی، ام زیڈ انصاری صاحب جمشید پور، محمد کمال صاحب منگلور، محمد ہارون صاحب بریلی، سید رؤف صاحب بارسی ٹاکلی اکولہ، مولانا دلاور خان بسم اللہ خاں کو پر گاؤں احمد نگر، محمد میران صاحب بھٹکل عبداللہ صاحب عطا سرائے پٹنہ خود خریدار بنے ہیں اور ہاں بی بی رہنما ہائی اسکول گلبرگہ۔ خالد ہائر سکنڈری اسکول بریلی مڈل اسکول دھاڑ بلڈانہ ہائر سکنڈری اسکول جامعہ اور ٹیچرس کالج جامعہ نے اپنی لائبریریوں کے لیے ایک سال کے لیے پیام تعلیم کی خریداری منظور فرمائی ہے۔

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔

پیام تعلیم سال بھر تک آپ کے پاس آتا رہا ہے۔ اس کے دل چسپ مضمون اور مزیدار کہانیاں آپ کو پسند آئی ہوں گی۔ ہمیں امید ہے کہ آپ نہ صرف اس کے خریدار بنے رہیں گے۔ بلکہ اپنے دوستوں کو بھی خریدار بنائیں گے۔ اس لیے ۲۵ اکتوبر تک آپ سالانہ چندہ ۶ روپے منیجر صاحب پیام تعلیم کے نام بھیج دیجیے۔ آپ کا خریداری نمبر...... ہے۔ اگر آپ نے ۲۵ اکتوبر تک منی آرڈر نہیں بھیجا تو آپ کا نام خریداری سے خارج ہو جائے گا۔

کیسے ہیں۔

بچی:۔ آپ نے ؟

چچا:۔ ہاں میں نے یعنی امریکہ نے، ایک ہی بات ہے، جب کہیں چاند پر جانے کا بندوبست ہوسکا۔ سو میرے تین دوست ہیں آرم سٹرانگ، آلڈرن اور کولنس۔ یہ تینوں ابھی ۱۶ر جولائی ۱۹۶۹ء کو چاند کی طرف جاکر اور چاند کی اچھی طرح سیر کرکے واپس آچکے ہیں۔

بچی:۔ ہاں یہ تو میں نے سنا تھا کہ انسان چاند پر اُتر چکا ہے۔

چچا:۔ اتر چکا ہے اور واپس بھی ہوچکا ہے اور اب پھر جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں نے ان لوگوں سے ساری خط کتابت کرلی ہے، اس بار میں بھی جا رہا ہوں۔ گھور گھور کے کیا دیکھ رہی ہو۔ میں تمھیں بھی لے جاؤں گا۔

بچی:۔ ہم لوگ چاند پر جائیں گے ؟

چچا:۔ نہ صرف جائیں گے بلکہ وہاں کی خوب سیر کریں گے، وہاں سے خوب بہت سی چیزیں لائیں گے۔

بچی:۔ تمھارے یہ تینوں دوست کیا لائے وہاں سے۔

چچا:۔ انھوں نے تو صرف وہاں کی خاک اور چند پتھر پسند کیے اور وہی لے آئے، میں لاؤں گا جو کچھ لاؤں گا۔ میرا مطلب ہے ہم دونوں لائیں گے جو کچھ لائیں گے۔

بچی:۔ کون کون جا رہا ہے۔

ہندوستان سے صرف ہم دونوں ہی ہیں۔ کسی اور سے ذکر نہ کرنا، ہاں واپس آنے کے بعد چاہے جس سے کہتی پھرنا۔

بچی:۔ شہزادی اور اس کی بچی کو بھی لے لیں گے جی؛ یا فاطمہ بیگم کو۔

چچا:۔ ہُنھ فاطمہ بیگم کو لے لیں گے۔ زیادہ جھنجھٹ بالکل نہیں۔ میں نے تمھارا اور اپنا انتظام بڑی مشکل سے کیا ہے۔ اوخوہ! کیا کیا مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں۔

بچی:۔ آپ نے مجھ سے اب تک تو کچھ کہا نہیں۔

چچا:۔ اچھا ہوا جو نہیں کہا۔ ورنہ سارے خاندان کو ساتھ لے چلنے پر ضد کرتیں۔

بچی:۔ خیر چھوٹے کو تو لے چلیں گے جی۔

چچا:۔ بے کار باتیں نہ کرو۔ چاند پر پہنچنا کوئی کھیل ہے! چاند یہاں سے ڈھائی لاکھ میل دور ہے۔

بچی:۔ ڈھائی لاکھ میل دور! یہ چاند جو نظر آتا ہے ہمیں۔

چچا:۔ ہاں ۲ لاکھ ۳۹ ہزار میل۔

بچی:۔ اسی چاند پر ہم جا رہے، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔

چچا:۔ میری طبیعت تو بہت ٹھیک ہے، دیکھو کھانسی بھی نہیں ہے۔

بچی:۔ ڈھائی لاکھ میل دور ہم کیسے جائیں گے جی۔

چچا:۔ (قہقہہ لگاتا ہے)، اسی کا تو میں نے انتظام [illegible]

ہے۔ اب ہم اپالو ۱۲ میں جائیں گے۔ تم نے باتوں باتوں میں سب کچھ بھلا دیا۔ چلو چلو جلدی کرو۔

چچی:۔ کم از کم دو تین جوڑے آپ کے اور دو تین جوڑے اپنے تو رکھ لوں۔

چچا:۔ سنو سنو یہاں آؤ۔ چاند پر جانے کے لیے بالکل الگ کپڑے ہوتے ہیں اور خاص لباس ہوتا ہے۔ یہ کرتے پاجامے دوپٹے وہاں نہیں چلیں گے۔ میں نے تمھارے لیے اور اپنے لیے خاص لباس منگوا لیا ہے۔

چچی:۔ رہنے دو جی وہ میلا ہو جائے گا تو یہ بدل لیں گے۔ اے ہے میرا پیارا پیارا چاند۔

چچا:۔ وہ تمھارا پیارا پیارا چاند اب ویسا نہیں رہا ہے۔

چچی:۔ کیوں کیا ہوا۔

چچا:۔ وہ گول گول خوبصورت چاند جس کے آج تک سبھی گن گاتے تھے، پتہ ہے وہاں کیا ہے؟ ایسی زمین جس میں ہزاروں خوفناک ہیں، گڑھے ہیں اور ٹیلے ہیں، وہاں نہ ہرے بھرے درخت ہیں، نہ ہریالی ہے، نہ پہاڑ ہیں، نہ دریا ہیں۔

چچی:۔ سچ!

چچا:۔ ہاں بس ایک لق و دق صحرا ہے۔ کھوبڑ کھابڑ چٹیل میدان ہے، دھول ہے پتھر ہیں، نہ ندی نالے نہ آبشار۔

چچی:۔ نہیں نہیں جی ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔

چچا:۔ دیکھو ایک کام کرو۔ اب آگے میں جو کچھ کہوں اسے چپ چاپ سنتی جاؤ۔ اپنی طرف سے کچھ نہ بولو۔

چچی:۔ کچھ نہ بولوں؟

چچا:۔ ہاں بالکل نہیں۔ بس بغیر سوچے سمجھے ہاں ہاں کہتی جاؤ، ورنہ مجھے غصہ آجائے گا۔

چچی:۔ اچھا۔ اچھا۔

چچا:۔ میرے تینوں دوست مسٹر آرم سٹرانگ، مسٹر الڈرن اور مسٹر کولنس اپالو ۱۱ میں جس کی تیاری میں تین لاکھ آدمیوں سے کام لیا گیا تھا۔ ۱۶ جولائی کو روانہ ہوئے اس راکٹ کی تیاری میں ۸۵ ملین ڈالر خرچ ہوئے اور آنے جانے میں ۵۴ ملین ڈالر کا خرچہ آیا۔

چچی:۔ یہ تو بہت روپیہ ہوا۔

چچا:۔ بہت۔ بہت اندازے سے بھی زیادہ۔ میرے ہر دوست کی پیٹھ پر ۱۲۰ پونڈ کا ایک بنڈل تھا جس میں گیس، سیال ٹنکیاں، بجلی پیدا کرنے کی مشینیں، پیغام بھیجنے اور وصول کرنے کے آلات، ریڈیو اور ٹرانسسٹرز سب تھے، انہوں نے وہاں سے تصویریں بھی بھیجیں اور انھی مشینوں کی بدولت زمین پر رہنے والوں سے بات چیت بھی کی۔

چچی:۔ آئی ہئی۔

چچا:۔ ہاں لو میں تمھیں اپنے دوست آرمسٹرانگ کا خط ہی نہ سنا دوں، دیکھو یہ وہ خط ہے جو اس نے مجھے لکھا ہے۔ سنو، میرے

دوست کائنات کے بنتے وقت چاند زمین کا ایک حصہ تھا۔ لیکن طرح طرح کی جغرافیائی اور فلکیاتی تغیرات اور دل بدل کی وجہ سے یہ زمین سے جدا ہوگیا اور زمین کے گرد مداری گردش میں مصروف ہوگیا۔ یوں سمجھو کہ زمین کے چاروں طرف چہل قدمی کرنے لگا۔ چاند زمین کا چھٹا حصہ ہے، اور یہ ۱/۶ حصہ الگ ہوجانے کی وجہ سے زمین میں ایک بہت بڑا گہرا گڑھا ہوگیا اس گڑھے پر پانی نے قبضہ کرلیا۔ اور سائنس داں کہتے ہیں یہ بحرالکاہل ہے۔"

چچی:۔ بحرالکاہل۔

چچا:۔ ہاں اور عجیب بات یہ ہے کہ بحرالکاہل کا رقبہ اور چاند کا رقبہ بالکل ایک ہے، اور چاند کی قوتِ کشش بھی زمین کی قوتِ کشش سے ۱/۶ ہے، یہی وجہ ہے کہ ۱۲۰ پونڈ کا آدمی چاند پر پہنچ کر صرف ۲۰ پونڈ کا رہ جاتا ہے۔

چچی:۔ دبلا تو نہیں ہوتا۔

چچا:۔ نہیں جسم تو وہی رہتا ہے مگر وزن ایک دم گھٹ جاتا ہے اس لیے چلنے پھرنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے پھدک پھدک کر چلنا پڑتا ہے۔

چچی:۔ توبہ توبہ۔

چچا:۔ اور ستو لکھتا ہے "چاند کے چاروں طرف ہوا کی کوئی چادر نہیں اس لیے وہاں آواز کا بھی پتہ نہیں"۔

چچی:۔ کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔

چچا:۔ کوئی نہیں۔

چچی:۔ پھر بات چیت کیسے کرتے ہوں گے۔

چچا:۔ کوئی ہوگا تو بات چیت بھی کریں گے۔ کسی نے بات کی تو صرف ہونٹ ہلیں گے مگر آواز سنائی نہ دے گی۔

چچی:۔ تو جو لوگ جائیں گے وہ لوگ کیسے بات کریں گے۔

چچا:۔ وہ لوگ ریڈیائی سسٹم کے ذریعہ بات چیت کریں گے۔ انہی مشینوں کے ذریعہ جس کا ستو نے ابھی ذکر کیا ہے۔ سورج کی گرمی اور خلا کی خنکی دونوں براہِ راست چاند کی سطح پر اثر ڈالتی ہیں۔ اس لیے دن میں گرمی ۲۱۰ درجہ فارن ہائٹ تک پہنچ جاتی ہے اور رات میں سردی اس قدر پڑتی ہے کہ جسم کا خون جم جاتا ہے۔ خیر تم خط سنو، لکھا ہے یہ تو آپ جانتے ہیں کہ چاند زمین کے گرد اپنے محور پر چوبیس گھنٹے گھومتا رہتا ہے۔ اس کو اپنے محور پر گھومنے کے لیے ۲۹ یا ۳۰ دن ہیں۔ اس لیے زمین والوں کو ہمیشہ چاند ایک یہی رخ نظر آتا ہے۔ دوسرا رخ نظروں سے اوجھل رہتا ہے اور اس چاند کی سطح پر چودہ دن مسلسل روشن دن رہے گا، چودہ دن مسلسل رات۔

چچی:۔ چودہ دن تک دن رہے گا اور چودہ دن تک رات؟

چچا:۔ ہاں اب سن لو کہ چاند جس کا قطر ۲۱۶۰ میل ہے اس پر اس قدر ہزاروں رخنے گڑھے اور شگاف کیوں ہیں۔

چچی:۔ کیوں ہیں؟

چچا:۔ شہاب ثاقب یعنی ٹوٹنے والے تارے ہزاروں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کرتے ہوئے یہاں آکر گرتے ہیں اور ہر دفعہ ایک بڑا گہرا شگاف ڈالتے ہیں۔

چچی:۔ ٹوٹنے والے تارے زمین کی طرف بھی تو آتے ہیں جی۔

چچا:۔ ہاں ہاں یہ شہاب ثاقب زمین کی طرف بھی آتے ہیں۔ مگر زمین کے گرد کرۂ ہوائی کا غلاف جو ہے۔ جب یہ کرۂ ہوائی کے غلاف میں داخل ہوتے ہیں تو اوپر ہی اوپر بجھ کر راکھ ہو جاتے ہیں ورنہ اس زمین کا حشر بھی چاند جیسا ہوتا۔

خیر میرے دوست مسٹر آرمسٹرانگ نے لکھا ہے گیارہ سال نو ماہ اور سولہ دن کی مسلسل کوششوں کے بعد انسان آخر چاند پر پہنچ گیا۔

چچی:۔ انسان نہیں آپ کا دوست۔

چچا:۔ ہاں میرا وہی مطلب ہے یعنی اس کا وہی مطلب ہے، یعنی میرا مطلب ہے۔ خیر تم آگے سنو۔ ۴ر اکتوبر ۱۹۵۷ء کو پہلا اسپٹنک خلا میں چھوڑا گیا تھا۔

چچی:۔ ہاں۔

چچا:۔ اور ۱۲ر اپریل ۱۹۶۱ء کو یوری گگارن نے پہلی بار خلا میں دور دراز سفر کیا اور اب ۲۱ر جولائی کو ہندوستانی وقت کے مطابق صبح آٹھ بج کر ۲۶ منٹ اور ۳۰ سکنڈ پہ میرے دوستوں نے چاند پر قدم جما دیا۔ ساٹھ کروڑ لوگوں نے ٹیلی وژن پر انھیں دیکھا۔ جن لوگوں کو اخبار کے ذریعہ اور ریڈیو کے ذریعہ چاند کی اس فتح کی خبر پہنچی ان کی تو کوئی گنتی ہی نہیں ہے۔

چچی:۔ ہاں۔

چچا:۔ میرے دوست نے لکھا ہے چاند پر انسان کا پہنچنا صرف سائنس ہی کی فتح نہیں بلکہ انسان کے عزم اور ارادہ کی فتح ہے ہم لوگ چاند سے خاک اور پتھر کے نمونے لائے ہیں۔ اور ابھی چیزوں سے تحقیق و جستجو کے کئی نئے باب کھلیں گے۔

چچی:۔ دیکھو جی برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔

چچا:۔ ہاں ہاں کہو۔

چچی:۔ یہ باتیں تو وہ ہیں جو چھوٹا کل اخبار سے پڑھ کر سنا رہا تھا۔

چچا:۔ بھئی وہ ۔ وہ ۔ دیکھو انھی باتوں پہ مجھے غصہ آجاتا ہے۔

چچی:۔ اچھا اچھا جانے دیجے۔ لو یہ میں کیا کیا

سامان رکھوں۔ آپ کہہ رہے تھے نا وہاں سخت سردی پڑتی ہے اور گرمی بھی سخت ہوتی ہے۔

چچا:۔ ہاں ہاں۔

چچی:۔ تو کچھ کپڑے گرم رکھتی ہوں کچھ کپڑے معمولی ہلکے پھلکے، دو صندوق ہوں گے، ایک آپ کے سامان کا ایک میرے سامان کا ایک صندوق کھانے پینے کے سامان کا۔

چچا:۔ کھانے پینے کے سامان کا۔

چچی:۔ ہاں مسالے دار کریلوں کا سالن، انبا ڑے کی بھاجی اور روغنی روٹی۔

چچا:۔ بس بس ٹھیک ہے۔ پھر بھی زیادہ نہ پکانا وہاں جا کر دیکھیں گے کہ وہاں کے حالات میں کیا پک سکتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں۔

چچی:۔ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟

چچا:۔ بھئی تم سوچ رہی ہو یہاں سے کیا کیا لے جاؤں۔ میں سوچ رہا ہوں وہاں سے کیا کیا لاؤں۔

چچی:۔ کیا لائیں گے آپ وہاں سے؟

چچا:۔ یہ لوگ تو مٹی اور پتھر لے کر آئے ہیں میں سونا چاندی اور جواہرات لاؤں گا۔ اب تو سمجھو اپنے دن پھر گئے ——— پھر گئے اپنے ——— اپنے دن۔

چچی:۔ اے جی کیا دن دن کر رہے ہو اتنا دن چڑھ آیا اب اٹھو گے نہیں۔ کب تک سوتے رہو گے۔

چچا:۔ دن؟

چچی:۔ اور کیا۔ اٹھیے آج دفتر جانے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟ چلیے اٹھیے۔

چچا:۔ اَی ہَی۔ کیسے اچھے خواب سے جگا دیا تم نے۔

چچی:۔ خواب سے۔

چچا:۔ اور کیا، میں تمھیں چاند کی سیر کرانے کے لیے لے جا رہا تھا، ہم دونوں چاند پر جانے والے تھے اور وہاں سے میں سونا چاندی اور جواہرات لانے والا تھا۔

چچی:۔ سچی؟

چچا:۔ اور کیا۔

چچی سونا چاندی اور جواہرات؟

چچا:۔ ہاں۔

چچی:۔ تو پھر سے سو جائیے۔ سو جائیے۔ ہاں ہاں۔ سو جائیے۔

چچا:۔ اچھا۔ (خراٹے شروع ہوتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

پچھلے پرچے میں مینڈک والے مضمون کے مضمون نگار کا نام غلط چھپ گیا تھا۔ صحیح نام "قدیر جاوید پریمی" ہے۔

جناب آزاد بارانوی

اگر ایک ہو جائیں

خوشی میں غم بدل جائے اگر ہم ایک ہو جائیں
زمیں پر خلد[۱] اُتر آئے اگر ہم ایک ہو جائیں

جہالت، مفلسی، بے روزگاری ختم ہو جائے
سماج اپنا سنور جائے اگر ہم ایک ہو جائیں

ہر اک وہ کام جو معلوم ہوتا ہے بہت مشکل
بہت آسان ہو جائے اگر ہم ایک ہو جائیں

ابھی اپنی یہ حالت ہے کہ ڈرتے ہیں زمانے سے
زمانہ ہم سے تھرّائے اگر ہم ایک ہو جائیں

بہت ہیں ہم میں اب بھی بھیم، ارجن، حیدر و خالد
نہ کوئی سامنے آئے اگر ہم ایک ہو جائیں

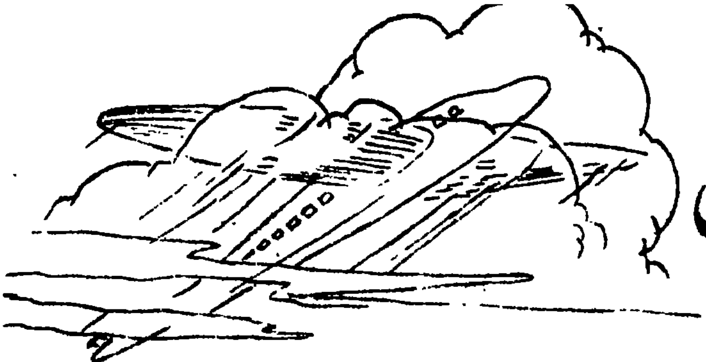
نہ ہو بجلی کو یہ جرأت کہ تاکے آشیاں اپنا
نہ پھر صیاد ادھر آئے اگر ہم ایک ہو جائیں

بڑی بے چین ہوں گی گاندھی و آزاد کی روحیں
انھیں کتنا سکوں آئے اگر ہم ایک ہو جائیں

۱ بہشت

محترمہ آصفہ مجیب

چند دن انقرہ میں



اب کی گرمیوں میں مجھے اپنے بیٹے محمد امین کے پاس انقرہ جانے کا سنہرا موقع ہاتھ آیا۔ وہ تعلیم کے سلسلے میں وہاں رہتے ہیں۔

انقرہ بہت پہلے کبھی ترکی کا دارالسلطنت تھا پھر مصطفیٰ کمال پاشاہ نے ۱۹۲۰ء میں اس کو نئے ڈھنگ سے آباد کیا۔ پہلے اس کا نام انگورہ تھا اب یہی ترکی کا دارالسلطنت ہے۔

دہلی سے ہمارا جہاز پین امریکن ساڑھے تین بجے رات کو روانہ ہوا۔ امریکن سیاحوں کا ایک بڑا گروہ سفر پر چلا تھا۔ اس میں بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں اور بچے سبھی شامل تھے۔ کچھ اور بھی مسافر تھے۔ نیند کوسوں دور تھی۔ رات آنکھوں میں کٹ گئی مگر خوشی میں کچھ پتہ نہیں چلا۔ یہی تو اور امید لگی تھی کہ خدا، امین اور اس کی بیوی بچوں سے اب جلد ملائے گا۔ کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو آسمان کے کنارے افق سے سپیدۂ صبح نمودار ہو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی دودھیا روشنی جھلکنے لگی۔ میلوں کا راستہ ہوائی جہاز نے کیسا دم بھر میں طے کیا۔ لیجیے صبح ہو گئی ہم طہران پہنچ گئے۔ ہوائی اڈے پر مسافروں کا ہجوم تھا۔ جو مختلف ملکوں میں جا رہے تھے۔ کوئی پون گھنٹہ بعد ہمیں انقرہ جانے والا جہاز ملا۔ یہ جہاز اتر رہا تھا تو ہم نے دیکھا ایک آدمی دونوں ہاتھوں میں نارنجی رنگ کی دو گول گول تختیاں سی لیے ہاتھ ہلا ہلا کر گویا جہاز کا استقبال کر رہا ہے۔ ہم اترے تو وہاں نو بجے تھے ابھی صبح ہی تھی۔ ہندوستانی حساب سے ہماری گھڑی میں بارہ بجے تھے یہاں سورج دیر میں نکلتا ہے۔

نظر اٹھائی تو دیکھا امین کی بیوی سوزانہ۔ چار برس سے کچھ اوپر بچی رخسانہ، اس سے چھوٹا لڑکا نسیم اسلام اوپر کٹہرے کے پاس سے ہٹ کر ہماری طرف لپکے دونوں بچے مجھے اور مجیب صاحب کو ایسے چپٹے جیسے پہلے سے جانتے پہچانتے ہوں۔ حالانکہ بہت دنوں بعد دیکھا تھا۔ ان سب سے مل کر اور بچوں کی میٹھی میٹھی باتیں جو سنیں تو سفر کی تھکان کا نام و نشان بھی نہ رہا۔ نہ نیند کی کمی کا کچھ احساس ہوا۔ امین کے ایک دوست بھی ساتھ تھے سب موٹر میں بیٹھ کر گھر آئے۔ یہ نئی آبادی میں ایک پہاڑی پر بنا ہے۔ دو منزلہ ہے۔ اوپر کے حصے میں یہ لوگ ہیں۔ نیچے مالک مکان رہتے ہیں۔ ادھر زیادہ تر امریکن اور ترک آباد ہیں۔ یہ حصہ غازی عثمان پاشا کہلاتا ہے۔ بہت صاف ستھرا اور خوشنما ہے۔ پہاڑیوں پر گھروں کے ارد گرد شمشاد کے اونچے سر سبز پیڑ شان سے کھڑے ہیں۔

کچھ زینے چڑھ کر ہم پھلواری میں آئے جو مالک
مکان نے لگائی ہے، طرح طرح کے پھول کھلے ہیں کہیں
پھلوں کے درخت اور ترکاریاں ہیں اور ہرا بھرا چمن
ہے۔ میاں بیوی دونوں کو باغبانی کا بہت شوق ہے۔
خوب محنت اور دیکھ بھال کرتے ہیں۔

بٹیا نے جو میرا ہاتھ پکڑا تو چلو چلو کہتی ہوئی اوپر
تک میرے ساتھ گئی۔ اپنے کھیل کھلونے دکھا کر، دلچسپ
حرکتوں اور پیاری پیاری باتوں سے خوش کر رہی تھی اور
اس کی خوشی کا بھی اظہار ہو رہا تھا۔ وہ اُردو جرمن اور
ترکی تین زبانیں بولتی ہے۔ مجھ سے 'مجیب صاحب'
سے اور امین سے اُردو بولتی۔ ماں اور بھائی سے جرمن'
ترکی کے لوگوں سے ترکی چھانٹتی۔ بھیّا کو صرف اپنی ماں
کی بولی جرمن ہی آتی ہے۔ وہ جرمنی میں زیادہ رہا بھی تھا۔
اور ابھی تھوڑے دن ہوئے ترکی آیا، مجھ سے جرمن
بولنے لگا۔ میرے پلے کچھ بھی نہیں پڑا۔ میں اس سے
اردو بولتی رہی، خوب تماشا تھا۔ اس سے دوستی بڑھانے
کے لیے میں نے دو چار جرمن الفاظ سیکھنا شروع کر دیے۔

"این اولو کمٹ" ایک موٹر آتی ہے۔
"کپُٹ" ٹوٹ گیا۔
"سُلُش" ختم ہو گیا۔
"ہائس" گرم۔

کبھی موقع سے اور کبھی اس کو اپنی طرف متوجہ
کرنے کے لیے بے موقع ہی بول پڑتی۔ وہ خاص نظروں
سے مجھے دیکھ کر مسکراتا، وہی الفاظ دہراتا۔ پاس
آکر بہت زوروں سے باتیں کرنے لگتا۔ میں بغیر سمجھے
ہی گردن ہلا کر ہاں ہاں کرتی اور ہنسی بھی آتی۔ قیاس سے
تھوڑا بہت مطلب سمجھ لیتی۔ اب وہ دو چار لفظ اُردو
کے بھی سمجھنے لگا۔ کچھ مشق بٹیا کی وجہ سے ہو جاتی۔ غرض
تین مختلف زبانوں کی کھچڑی سے بڑا تماشا رہتا۔ بہت مزہ آتا۔

مکان آرام کا ہے، دو سونے کے کمرے دو
غسل خانے۔ بیٹھنے اور کھانے کا کمرہ ایک میں ملا ہے
کافی بڑا ہے۔ اس کے پاس صاف ستھرا باورچی خانہ
ایک کوٹھری، باورچی خانے میں گیس کا چولھا ہے۔
بجلی کی کیتلی چائے بنانے کو۔ گرم اور ٹھنڈے پانی کے
الگ الگ نل لگے ہیں، کپڑا دھونے کی مشین ہے، ان
سب چیزوں کی وجہ سے کام میں بڑی آسانی رہتی ہے۔
اور منٹوں میں ہو جاتا ہے۔

گھر کا قصہ امین نے یوں بیان کیا کہ جب ہم
مکان تلاش کرنے نکلے بٹیا بھی ساتھ تھی۔ یہ مکان
دور ہی سے آنکھوں میں جچ گیا۔ کرایہ پوچھا تو بہت
تھا۔ ہم ہچکچا گئے۔ لیکن مکان کی مالکہ کو بٹیا پر اتنا پیار
آیا کہ ان کا جی چاہا کہ یہ بچی یہیں ان کے پاس رہے۔
انھوں نے کرایہ گھٹا دیا اور ہم یہاں آ گئے۔ کرایہ آٹھ
سو لیرا ہے۔ جیسے ہندوستان میں روپیہ ہوتا ہے۔
یہاں لیرا ہوتا ہے۔ ہندوستان کے حساب سے ایک
لیرا تقریباً نئے ۵۰ پیسوں کے برابر ہے۔ اس میں
سو قرص (پیسے) ہوتے ہیں۔

مالکۂ مکان بٹیا کو بہت چاہتی ہیں وہ ان
کے پاس گھنٹوں کھیلا کرتی ہے اور شرارتیں کرتی ہے۔
وہ خوش ہوتی ہیں اور ان سب ہی کا بڑا خیال کرتی ہیں۔

ہر وقت ہر بات اور ضرورت کی فکر رکھتی ہیں۔ یہی حال ہم لوگوں کے ساتھ رہا۔ بہت مہربانیاں کیں ان میں بڑا خلوص ہے دونوں میاں بیوی بڑی خوبیوں کے مالک ہیں ان سے مل کر ترکوں کے اخلاق۔ مروت اور طرز تپاک کا اندازہ ہوتا ہے ان کی ایک دوست یا عزیز مجھ سے ملیں تو ایسے گلے لگ گئیں جیسے کوئی اپنا عزیز مل گیا۔ مجھے بہی محسوس ہوا ان کی خوشی دیکھ کر۔ یہاں گاؤں والے جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو سلام علیک کہتے ہیں اور شہر والے "مرحبا" کہتے ہیں جب رخصت ہوتے ہیں تو "گلے گلے" کہتے ہیں شاید اس کا مطلب یہ ہو اکر پھول کی طرح کھلو اور شاداب ہو۔

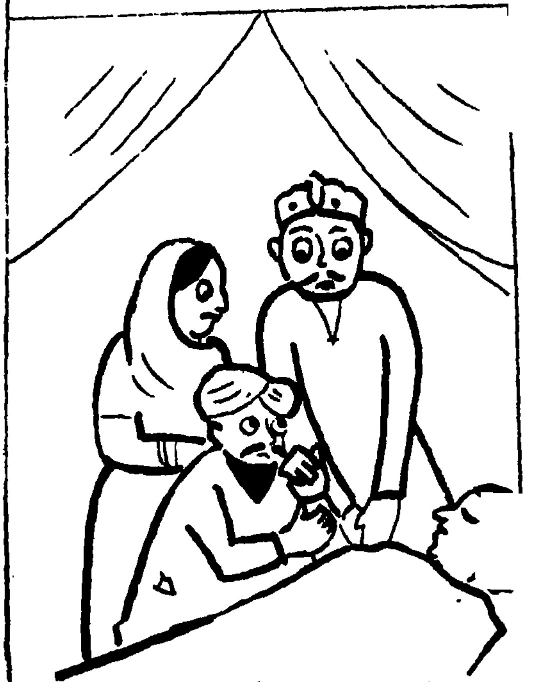
انقرہ پہاڑ کی طرح ہے سمندر کی سطح سے تین ہزار فٹ اونچا۔ موسم بڑا خوش گوار ہے۔ گرمی نام کو نہیں۔ جب پانی برستا ہے تو اور ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ جاڑوں میں خوب برف پڑتی ہے۔ گھروں کو گرم رکھنے کا اچھا انتظام ہے۔ کشمیر کی طرح شمشاد کے اونچے اونچے پیڑوں نے بڑا حسن پیدا کر دیا ہے کہیں دو دو چار چار کہیں قطار کے قطار عجیب بہار دکھاتے ہیں۔ شام کو بجلی جلتی ہے تو سارا شہر ایسا جگمگا اٹھتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ہر طرف چراغاں ہی چراغاں ہے۔ یہاں کے لوگ خوب صورت ہیں، خوب گورا رنگ ہے لباس انگریزی ہے کچھ عورتیں ایک لانبا کوٹ اوپر سے پہن لیتی ہیں لانبے موزے اور سر کو ریشمی رومال سے ڈھک لیتی ہیں۔ کوئی کوئی برقع بھی پہنے ہوتی ہیں گاؤں والیوں کے کپڑے بڑے بد قطع ہوتے ہیں۔ کمر سے ایک تھیلا سا لٹکا ہوتا ہے جس کے نیچے کی طرف دو پائنچے الگ ہو جاتے ہیں جیسے شلوار کی مہری، لیکن وہ شلوار بھی نہیں کہی جا سکتی۔ آستینوں دار کوٹ یا قمیص سر پر رومال بندھا ہوا، کبھی کبھی ٹوکری میں کچھ سامان لیے باہر نظر آتی ہیں۔ ہندوستانی گاؤں کی عورتیں جو لہنگے پہنتی ہیں۔ ان میں بھی کچھ خوبصورتی اور شان ہوتی ہے، اس میں تو کچھ بھی نہیں۔ دیکھ کر جی گھبراتا ہے۔ سڑکیں چوڑی اور اچھی بنی ہیں موٹریں فراٹے بھرتی ہیں۔ بسیں بھی چلتی ہیں ٹیکسی بڑی آسانی سے ہر جگہ ہر وقت مل جاتی ہے۔ اسے یہاں "دولمس" کہتے ہیں۔ اس کی پہچان کے لیے بیچ میں اس کے گرد ایک نقشی پٹی بناتے ہیں۔ دور سے معلوم ہوتا ہے جیسے موٹر کو ہار پہنا دیا ہے۔ سیر و تفریح کے لیے باغ ہیں۔ بچوں کے لیے باغ اور پارک بہت اچھے اچھے ہیں۔ ان میں چھوٹی چھوٹی جھیلیں ہیں کھیل کود کا سامان جھولے وغیرہ ہیں۔ جیسے جامعہ نرسری اور مدرسہ ابتدائی میں ہیں۔ پھلوں کی کثرت ہے اور زیادہ مہنگے بھی نہیں۔ لال لال خوب بڑی "اسٹابری" خوبانی سے ملتا ہوا ایک پھل بڑا میٹھا ہوتا ہے جسے یہاں شکرپارے کہتے ہیں۔ چشمے کا پانی پیا جاتا ہے جو بہت میٹھا اور ہاضم ہے۔ آدمی شیشے کی بڑی سی بوتل میں بھر کر اسے ایک جال میں رکھتا ہے اور پیٹھ پر لاد کر گھروں میں بڑے سے مٹکے میں ڈال جاتا ہے۔ اگر کسی وقت پانی ختم ہو جائے اور آدمی نہ آئے تو اس سے کچھ چھوٹی بوتلیں پانی سے بھری بازار میں مل جاتی ہیں۔ پانی کی قیمت دی جاتی ہے۔

(باقی آئندہ)

جناب غلام حیدر ام اے

نیلم اور فرّخ

(۲)



مگر یہ بات شہزادے کے دل کو اس طرح لگ گئی تھی کہ وہ کسی طرح راضی نہ کیا جا سکا۔ آخر بیمار پڑ گیا۔ بیماری بڑھتی رہی۔ بادشاہ نے ہر طرف سے حکیم بلوائے وید بلوائے۔ اچھی اچھی دوائیں تیار کروائیں۔ مگر شہزادے کی حالت خراب ہی ہوتی گئی۔ کچھ دن بعد وہ اتنا کمزور ہو گیا کہ اب اس کے دوست بھی اُسے نہ پہچان سکتے تھے۔ فرخ کا باپ بہت پریشان رہنے لگا۔ آخر بادشاہ کے وزیر نے اُسے مشورہ دیا۔

بادشاہ:۔ وزیر صاحب، فرّخ کی طبیعت تو کسی طرح سنبھل ہی نہیں رہی ہے۔



وزیر:۔ حضور، شہزادے کی طبیعت اب دواؤں سے ٹھیک نہیں ہو سکتی۔

بادشاہ:۔ تو پھر کیا کیا جائے۔

وزیر:۔ شہزادے پر جو دھن سوار ہوئی ہے اسے پورا ہونا چاہیے حضور۔

بادشاہ:۔ تم کہتے ہو میں اسے شہزادی نیلم کے ملک جانے کی اجازت دے دوں ؟ تم نے آج تک کسی کو وہاں سے زندہ واپس آتے سنا ہے ؟

وزیر:۔ مگر حضور آپ یہ تو سوچیے کہ یہاں بھی تو شہزادے کی جان خطرے سے باہر نہیں ہے پھر کیوں

چار ناچار بادشاہ نے اجازت دے دی۔ اور
اسی دن سے شہزادے کی طبیعت بہتر ہونی شروع ہو گئی۔
چند ہی دن میں فرخ بھلا چنگا ہو گیا اور آخر ایک دن
دور دراز ملک کے سفر کے لیے چل کھڑا ہوا۔

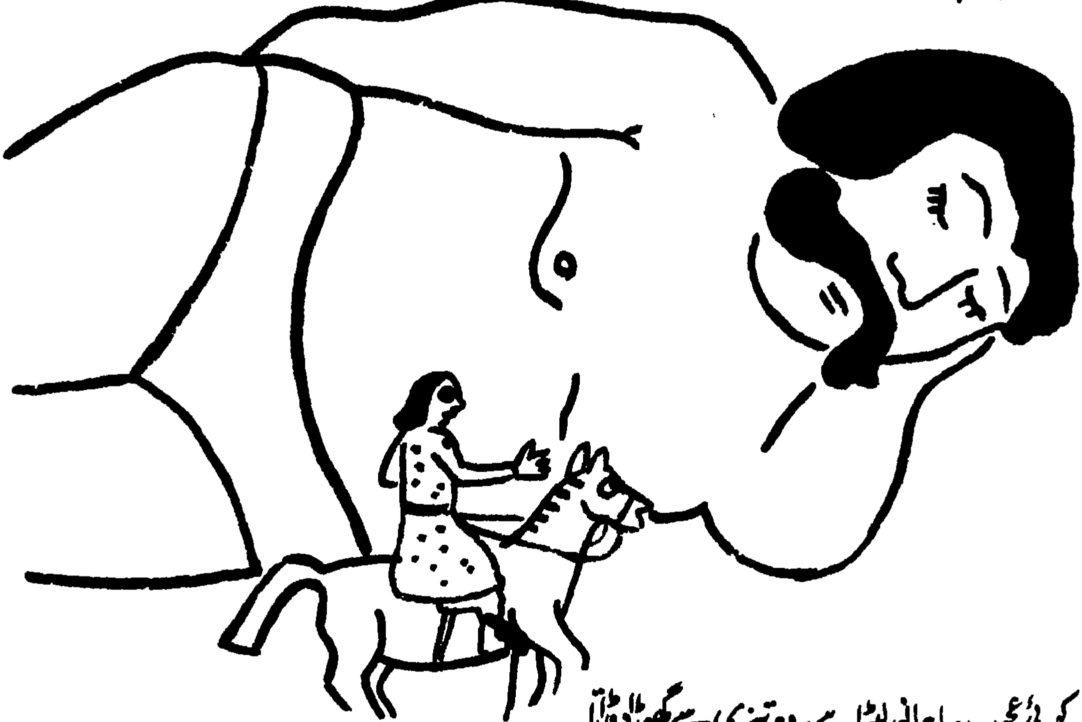
جب شہزادہ چلا ہے تو اس کے ماں باپ روتے
ہوئے کافی دور تک اس کے ساتھ آئے۔ شہر کی دیوار
تک اس کے تمام دوست اور ساتھی چلے اور تمام
شہریوں نے اُسے الوداع کہا۔

شہزادہ چلتا رہا، چلتا رہا وہ جنگلوں سے پہاڑوں
سے، دریاؤں سے اور ویرانوں سے گزرتا چلا جاتا تھا۔
کبھی بھوکا، کبھی پیاسا، کبھی جنگلی جانوروں سے لڑتا،
کبھی ان سے بچتا بچاتا، اپنی دھن میں مگن چلا جا رہا تھا۔
ایک جگہ اسے کچھ ایسا لگا کہ سامنے کچھ دور



آپ اسے اپنی خواہش پوری کرنے کا موقع نہیں دیتے۔





کوئی عجیب سا جانور لیٹا ہے۔ وہ تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا اس چیز کے پاس پہنچا۔ اور جب اس نے غور سے دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہاں تو ایک آدمی لیٹا تھا۔ موٹا، بہت موٹا، بلکہ بہت ہی موٹا۔ شہزادے نے اتنی موٹی چیز اس سے پہلے کبھی دیکھی نہ تھی۔ اُسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ آدمی ہو سکتا ہے۔ بس وہ تو مٹی کا ایک بہت بڑا سا ٹیلا لگ رہا تھا۔ مگر وہ آدمی تھا بڑا دل چسپ۔ جیسے ہی اِن موٹو میاں نے شہزادے فرخ کو اپنے پاس دیکھا وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

موٹو میاں:- اگر تمھیں کسی ملازم کی ضرورت ہو تو تم مجھے ملازم رکھ سکتے ہو۔

فرخ:- مگر میں تم جتنے موٹے آدمی کا کروں گا کیا۔

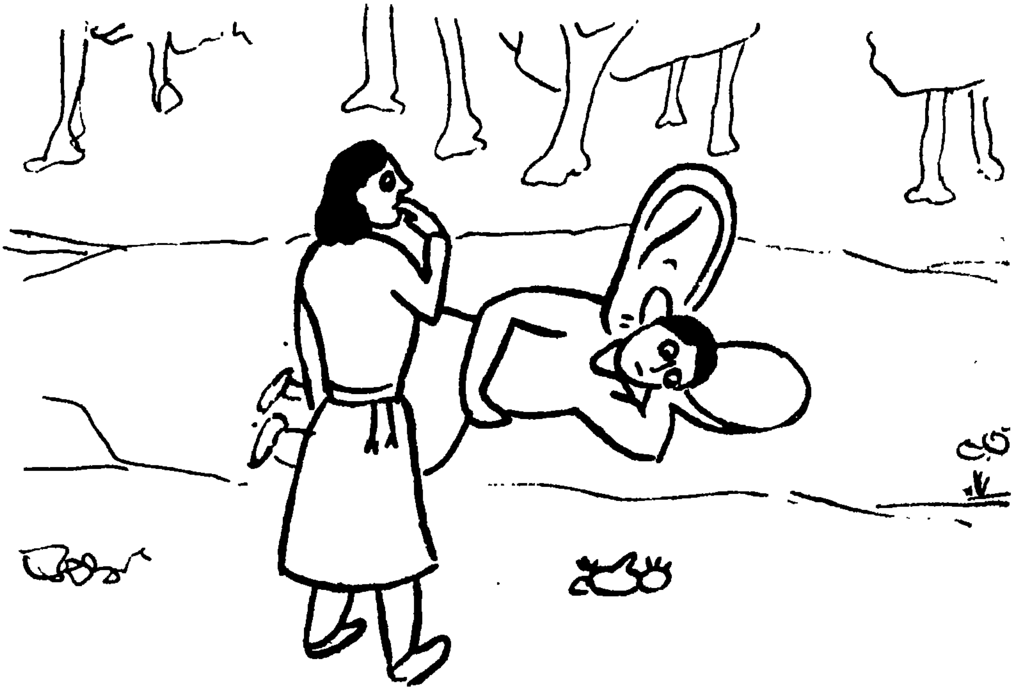
موٹو میاں:- کیوں، اگر میں اس سے تین ہزار گنا موٹا اور ہو جاؤں، جو وقت آنے پر میں ہو بھی سکتا



ہوں، لیکن تمہاری خدمت اچھی طرح انجام دیتا رہوں تب تمھیں میرے مٹاپے سے کیا پریشانی ہوسکتی ہے ؟

فرخ :۔ یہ بات تو ٹھیک ہے ۔ اچھا چلو میرے ساتھ ۔

اور دونوں چل پڑے ۔ کچھ دور آگے گئے تھے



انھیں ایک آدمی ملا، ویسے تو اس میں کوئی بات حسن نہیں تھی مگر اس کے کان بہت ہی بڑے بڑے تھے ۔ وہ اپنے ایک کان کو زمین پر لگائے لیٹا تھا، جیسے بڑے غور سے کچھ سن رہا ہو، شہزادے کو اُس کی حرکت کچھ عجیب سی لگی ۔

فرخ :۔ تم کون ہو، اور یہ کیا کر رہے ہو ۔

آدمی :۔ میرا نام کنیت ہے، اور میں سن رہا ہوں ۔

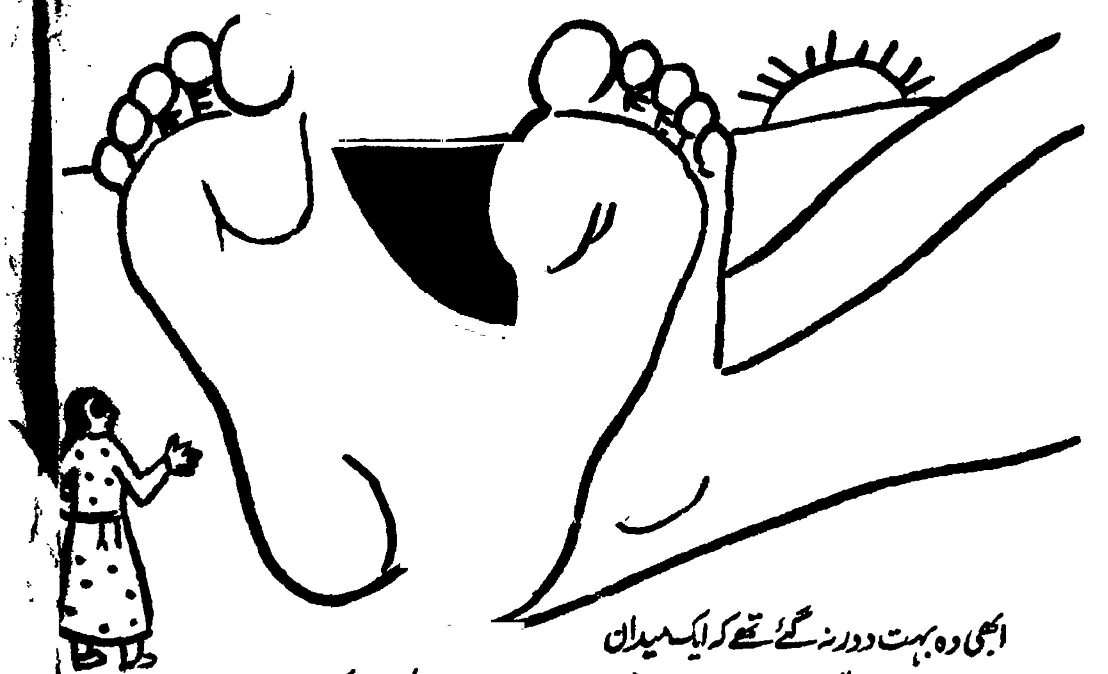
فرخ :۔ کیا سن رہے ہو ؟

کنیت :۔ سب کچھ، جو کچھ اس وقت دنیا میں ہو رہا ہے میں سن رہا ہوں ۔ میں سب کچھ سن سکتا ہوں ۔ ہلکی سے ہلکی آواز میرے کان میں آجاتی ہے ۔ میں گھاس کے اُگنے کی آواز تک سن لیتا ہوں ۔

فرخ :۔ اچھا اگر یہ بات ہے تو بتاؤ کہ اُس بوڑھی ملکہ کے دربار میں اس وقت کیا ہو رہا ہے جس کی ایک بہت خوبصورت شہزادی ہے ؟

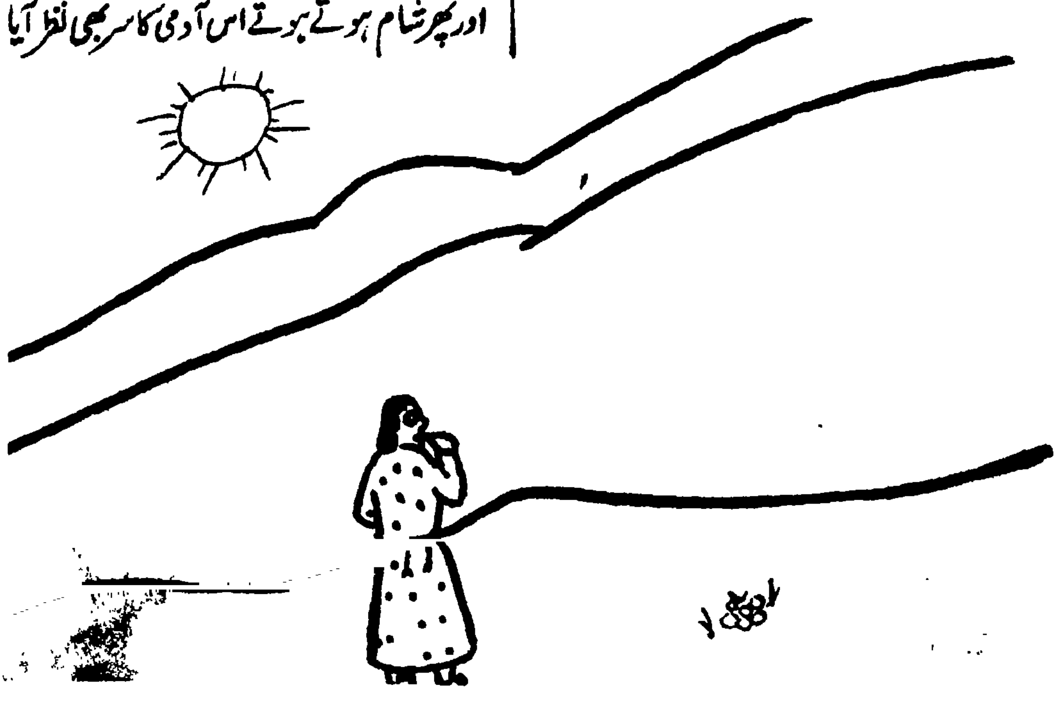
کنیت :۔ ہاں میں سن رہا ہوں ۔ میرے کان میں اس تلوار کی آواز آرہی ہے جس سے وہاں ایک شہزادے کو قتل کیا جا رہا ہے ۔

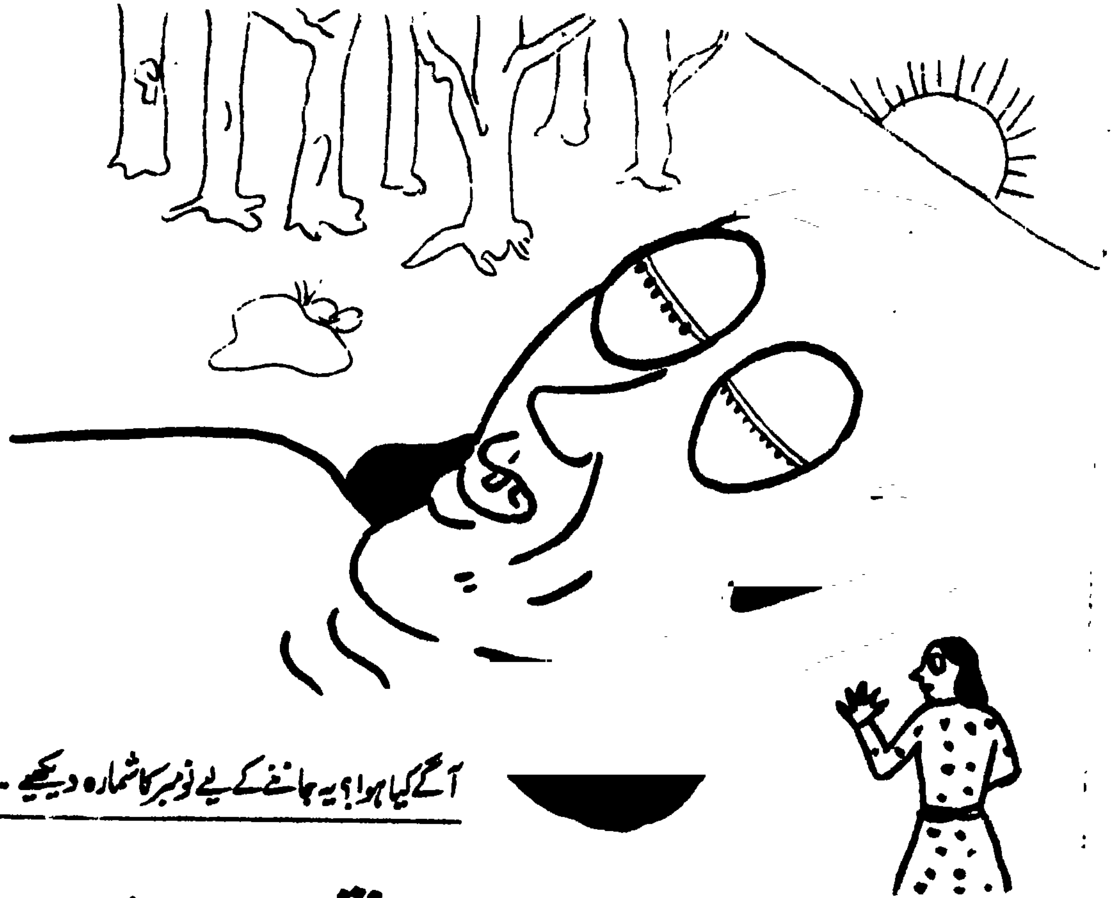
فرخ :۔ اچھا ٹھیک ہے، تم میرے کام آسکتے ہو ۔ چلو میرے ساتھ چلو ۔ وہ تینوں چل پڑے ۔



ابھی وہ بہت دور نہ گئے تھے کہ ایک میدان
میں انھیں ایک آدمی کے دو بہت بڑے بڑے پیر نظر
آئے۔ ہاں وہ تو صرف پیر تک ہی دیکھ سکے، پھر کچھ اور
دور چل کر انھیں پتہ چلا کہ ان پیروں کے ساتھ ٹانگیں

بھی جڑی ہوئی ہیں، لیکن باقی جسم اور سر وغیرہ تو دہاں
نہیں نظر آ رہے تھے۔ پھر وہ اور آگے چلے، چلتے رہے
چلتے رہے، کئی گھنٹے چلنے کے بعد انھیں جسم بھی مل گیا
اور پھر شام ہوتے ہوتے اس آدمی کا سر بھی نظر آیا



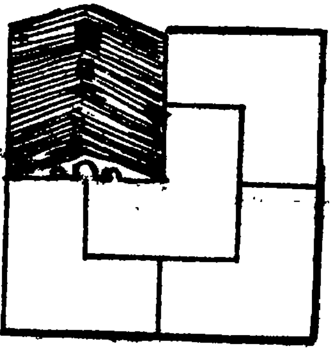


آگے کیا ہوا؟ یہ جاننے کے لیے نومبر کا شمارہ دیکھیے۔

شہزادے فرخ کو اس آدمی کو دیکھ کر بہت ہی حیرت ہوئی۔
فرخ:۔ تم آدمی ہو یا شیطان کی آنت، جس کا کوئی سرا ہی نہیں ہے۔ کیا نام ہے تمھارا؟
آدمی:۔ میرا نام لمبو خاں ہے۔ اور یہ تو کچھ لمبائی نہیں، اگر میں چاہوں تو اور بھی لمبا ہو سکتا ہوں۔ میری پوری اونچائی اونچے سے اونچے پہاڑ سے تین گنی ہو گی۔ خیر اگر تم مجھ سے کوئی خدمت لینا چاہتے ہو تو میں اس کے لیے خوشی سے تیار ہوں۔
فرخ:۔ اچھا، آؤ چلو، تم بھی میرے ساتھ۔ تمھیں بھی کہیں نہ کہیں کام میں لایا جا سکتا ہے۔

نتیجہ دماغی ورزش

دیکھیے اس طرح زمین چار حصوں میں تقسیم ہو
چاروں حصے شکل میں بھی برابر ہیں اور پیمائش میں بھی۔



جناب غلام ربانی

زہرہ کی سیر

اگر ہم کسی رات آسمان کو غور سے دیکھتے رہیں تو معلوم ہوگا کہ پورا آسمان گھوم رہا ہے اور ستارے آہستہ آہستہ مغرب کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ ستارے سپاہیوں کے دستوں کی طرح آگے بڑھتے ہیں اس طرح کہ کوئی تارا اپنے ساتھیوں سے آگے پیچھے یا اِدھر اُدھر نہیں ہونے پاتا۔ ہزاروں برس گذر گئے اور لوگ یہی سوچتے رہے کہ یہ اَن گنت روشنیاں کیا ہیں، کہاں ہیں اور کتنی دور ہیں۔

آخر ایک زمانہ آیا جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان ستاروں میں بعض ایسے بھی ہیں جو اپنے ساتھیوں سے بچھڑ جاتے ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ یہ ستارے ٹھیک طرح چلتے چلتے کسی جگہ رُک جاتے اور کچھ دن ٹھہرنے کے بعد الٹے چلنے لگتے ہیں یعنی جدھر سے آئے تھے۔ اُدھر کو واپس جانے لگتے ہیں۔ کچھ دور چل کر رک جاتے اور پھر اپنے پہلے راستہ پر لگ جاتے ہیں۔ ان کی اِس بے ڈھنگی چال نے لوگوں کو اچنبھے میں ڈال دیا مگر آدمی میں سمجھ ہے۔ اس نے ان کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ آخر کار معلوم کر لیا کہ آسمان پر پانچ ستارے ایسے ہیں جو اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر اِدھر اُدھر سیر کرتے پھرتے ہیں۔ چنانچہ ان کا نام سیارہ رکھا گیا۔ پہلے زمانے میں جو سیارے معلوم کیے گئے وہ عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل ہیں۔ ان میں سے ہم دوسرے ستارے یعنی زہرہ کا حال بیان کرتے ہیں۔

دن چھپتے ہی شام کو مغرب کی طرف ایک بڑا ستارہ دکھائی دیتا ہے، یہ اتنا روشن ہوتا ہے کہ آسمان کا کوئی ستارہ اس کی برابری نہیں کر سکتا یہی زہرہ ہے۔ اس کو انگریزی میں وینس، اور ہندی میں شکر کہتے ہیں۔

تمام ستارے صورت شکل میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہیں۔ ان میں سیاروں کو معلوم کرنا مشکل ہے۔ مگر زہرہ ایک ایسا سیارہ ہے جس کے پہچاننے میں غلطی نہیں ہو سکتی۔ یہ سیارہ کبھی سر پر نہیں دکھائی دے گا۔ مشرق کی طرف بھی نظر نہیں آئے گا۔ صرف مغرب میں افق سے اوپر دکھائی دے گا۔ اسے شام کا ستارہ بھی کہتے ہیں۔ اس کی روشنی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ جب یہ اپنے کمال پر پہنچتا ہے تو اس کی روشنی زمین پر بھی پڑتی ہے اور اس میں ہم کو اپنا سایہ بھی دکھائی دیتا ہے۔

زہرہ بڑی شان سے مغرب میں چمکتا ہے پھر رفتہ رفتہ نیچے ہوتا جاتا ہے، پھر دو مہینے بعد مشرق میں سورج نکلنے سے پہلے دکھائی دیتا ہے۔ اس کو صبح کا ستارہ بھی کہتے ہیں۔

زہرہ سورج کے آس پاس ہی دکھائی دیتا ہے۔
شام کو سورج چھپنے کے بعد مغرب میں اور صبح کو سورج نکلنے سے پہلے مشرق میں اپنی بہار دکھاتا ہے۔ پہلے زمانے میں لوگوں کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ شام کا ستارا اور صبح کا ستارا دونوں ایک ہی ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھیے کہ یہ ستارہ جب شام کو دکھائی دیتا ہے تو صبح کو نظر نہیں آتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ زہرہ کسی دن صبح اور شام دونوں وقت دکھائی دے۔

یہ سیارہ سال کے بڑے حصے میں دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ ایک سال اور سات مہینے میں نظر آیا کرتا ہے جس دن تم زہرہ کو کسی جگہ دیکھو تو سمجھ لو انیس مہینے پہلے یہ سیارہ اسی جگہ تھا اور آئندہ انیس مہینے بعد پھر اسی جگہ دکھائی دے گا۔

بات یہ ہے کہ ہماری زمین کی طرح زہرہ بھی سورج کے گرد چکر لگاتا ہے۔ زمین ۳۶۵ دن میں ایک گردش کرتی ہے اور زہرہ ۲۲۴ دن میں سورج کا چکر لگاتا ہے۔ اس لیے ہر سال ہم اس کو نہیں دیکھ سکتے۔ حساب لگانے سے معلوم ہوا کہ انیس مہینے میں ایسا موقع آتا ہے کہ ہم زہرہ کو دیکھتے ہیں۔

اب تک جتنے سیارے معلوم ہوئے ہیں ان میں زہرہ ہماری زمین سے زیادہ قریب ہے جسامت میں بھی زمین کے لگ بھگ ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی باتوں میں زمین سے ملتا جلتا ہے، اس لیے خیال کیا جاتا ہے کہ شاید زہرہ میں بھی خدا کی ایسی مخلوق ہو جو ہم سے ملتی جلتی ہو۔ بچو! ہم نے وعدہ کیا ہے کہ تم کو زہرہ کی سیر کرائیں گے۔ مگر سفر کرنے سے پہلے اس دنیا کا کچھ حال سن لو۔

زہرہ سورج کے گرد ۲۲۴ دن میں گردش کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کا سال ۲۲۴ دن کا ہوتا ہے اور انھی سات مہینوں میں وہاں کے موسم بدلتے رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے زہرہ کے موسم ہمارے موسموں سے چھوٹے ہوتے ہیں۔

جس طرح ہماری زمین کرۂ ہوائی کے غلاف میں لپٹی ہوئی ہے اسی طرح زہرہ کے گرد بھی سینکڑوں میل تک ہوا موجود ہے اور اس میں ہر وقت بادل چھائے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بادل اتنے گہرے ہیں کہ وہاں سے آسمان دکھائی نہیں دیتا۔ ہمارے آسمان پر رات کو تاروں کا باغ کھلتا ہے۔ زہرہ ان تاروں بھری رات سے محروم ہے۔ وہاں آسمان اور تارے دکھائی نہیں دیتے۔

سورج سے زہرہ کا فاصلہ ہماری زمین کی نسبت کم ہے۔ یعنی زہرہ سورج سے زیادہ قریب ہے۔ اگر ہم زہرہ پہنچ جائیں تو وہاں کا سورج ہمارے سورج سے دُگنا بڑا ہوگا۔ اس کی روشنی بھی ہماری دھوپ سے دگنی تیز ہوگی، اور اس میں حرارت بھی دگنی ہوگی۔

کسی شخص کو اگر کسی سیارے یا ستارے کا نام معلوم ہو جائے تو وہ ستارہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ اب جس دن زہرہ تم کو نظر آئے تو ایسا معلوم ہوگا کہ تمھارا دوست آسمان سے تم کو دیکھ رہا ہے۔

جناب محمد امین ایم۔اے



"بکومی! بکومی! تم کہاں ہو؟"

دادی اماں اور پوتا دریا کے کنارے ذرا دم لینے کو بیٹھ گئے۔ چلتے چلتے تھک گئے تھے، بوجھ بھی کچھ کم نہ تھا۔ درخت کے سائے میں تھوڑی دیر بیٹھ کر آرام کر لینا اچھا تھا۔

"دادی دیکھو سامنے ہپّو ہے" لڑکے نے کالی پیٹھ اور بھدی ناک دیکھ کر ہپو پوٹیمس (دریائی گھوڑا) کی طرف اشارہ کیا جو پانی کی سطح سے اوپر آرہا تھا۔

"اور دیکھو اس کی بغل میں ایک مگرمچھ ہے" دادی اماں نے پانی کے دوسرے جانور کو دیکھ کر کہا۔

"دادی کہیں وہ باہر تو نہیں آجائیں گے" لڑکے نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ مگرمچھ کے سفید سفید تیز دانت دکھائی دے رہے تھے۔ دریائی گھوڑا بھی کسی کو کچل کر مار سکتا تھا

"نہیں بیٹے وہ سب سو رہے ہیں، وہ زیادہ تر پانی میں ایسے ہی پڑے رہتے ہیں، ڈرو نہیں" دادی دریا سے ایک چھوٹی سی مچھلی نکال رہی تھیں۔

"کیا یہ دونوں ایک دوسرے سے لڑیں گے۔؟" لڑکا جانتا تھا کہ افریقہ کے بہت سے جانور ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہیں۔

"نہیں بیٹے یہ نہیں لڑنے والے، دریائی گھوڑا اور گھڑیال دونوں مل جل کر رہتے ہیں، یہ دونوں دوست ہیں، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بہت دنوں پہلے دنیا میں جانور ہی جانور پائے جاتے تھے دریائی گھوڑا اس وقت بادشاہ تھا اور یہ گھڑیال اس کی رانی تھی۔ کیا میں تم کو ایک کہانی سناؤں؟ میں نے بھی یہ کہانی اپنے گاؤں میں سنی تھی اس وقت سنی تھی جب میں تمھاری طرح چھوٹی سی تھی"

لڑکا بہت خوش ہوا، دادی سے کہا: "دادی اماں ضرور سنائیے"

"ایک وادی میں ایک بیوہ عورت تن تنہا رہتی تھی ایک دن اس کی جھونپڑی کے پاس سے مویشیوں کا ایک گلہ گزرا۔ رات میں کھانا پکاتے وقت اس نے ایک عجیب و غریب آواز سنی اس نے جا کر دیکھا تو قریب ہی ایک جھاڑی میں ایک ننھا سا بچھڑا پڑا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ادھر سے گزرتے ہوئے کوئی گائے بیاہ گئی تھی، گلے والے نے دیکھا نہیں اور گلے کو ہنکالے گیا۔

"یہ بچھڑا میرے لیے تحفہ ہے اللہ میاں نے آسمان سے بھیجا ہے میں تو جانوں یہ میرے مرحوم لاڈلے کے بدلے میں آیا ہے۔ میں اسے اپنے بچے سے کم نہ سمجھوں گی"

یہ بول بیوہ عورت کے دل سے نکلے تھے۔ بچھڑے کو اٹھا کر وہ اپنی جھونپڑی میں لے گئی اپنی گائے کا دودھ اسے پلایا۔ پھر اس کو اٹھا کر وہ باہر لے گئی جہاں وہ نرم نرم گھاس کی پھنگیاں چن چن کر کھاتا۔ وہ اس بچھڑے کی اس طرح پرورش کرنے لگی گویا یہ اس کا حقیقی بچہ ہے

بچھڑا بڑا ہونے لگا اور ایک دن وہ جوان ہو کر پورا سانڈ بن گیا۔

ایک دن بادشاہ کے آدمی ادھر سے گزر رہے تھے انھوں نے اسے دیکھ لیا دیکھتے ہی بولے:

"اے عورت یہ سانڈ ہمارے ہاتھ بیچ دے، منہ مانگے دام ملیں گے"

"یہ عام سانڈ جیسا نہیں ہے" عورت نے جواب دیا۔

"اس کا نام بگوری ہے مجھے یہ بہت عزیز ہے"

میرے بچے کی جگہ لینے کے لیے خدا نے اسے آسمان سے بھیجا تھا۔ بکومی کو بیچنے کا سوال ہی نہیں۔"

بادشاہ کے آدمیوں نے محل میں جاکر کہا:۔

"بادشاہ سلامت! اِدھر وادی میں ایک بیوہ عورت رہتی ہے اس کے پاس خوب موٹا تازہ اور عمدہ قسم کا ایک سانڈ ہے، دیکھنے کی چیز ہے۔ اس کا گوشت نرم اور ملائم ہوگا، اسے آپ کے علاوہ کسی اور کو نہیں کھانا چاہیئے"

دوسرے دن قصائی کو لے کر بادشاہ کے چھ آدمی وہاں پہنچے اور انھوں نے بیوہ عورت سے کہا:۔

"بادشاہ کا حکم ہے کہ یہ سانڈ دے دو آج اُن کے یہاں محل میں دعوت ہے۔ تمھیں گوشت میں سے ایک حصّہ ملے گا اس کے لیے تم جتنے دام مانگو گی ملیں گے" یہ الفاظ سن کر عورت رو پڑی۔

"بکومی کی جدائی بھلا میں کیسے برداشت کروں گی، لیکن ادھر بادشاہ کا حکم بھی ہے میں کیسے انکار کر دوں" یہ کہہ کر وہ زار زار رونے لگی۔

بادشاہ کے آدمی سانڈ کی طرف بڑھے۔ بکومی خاموش تھا، اس کے سینگ ابھی پوری طرح نہیں نکلے تھے لیکن جتنے بھی نکلے تھے وہ سخت اور نوکیلے تھے جب وہ زمین کو کھرچتا اور آوازیں نکالتا تو بڑا ڈر لگتا۔ آدمیوں نے اس کے قریب آنے کی ہمت نہیں کی۔ اس کو پکڑتے اور رسی کا پھندہ گلے میں ڈالتے وہ ڈرے۔

"اپنے سانڈ سے کہو کہ وہ چپ کھڑا رہے" بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ ذبح ہی اسے ہم لے آئیں۔

"بکومی! بکومی!" عورت نے روتے ہوئے کہا "بیٹے میں کیا کروں۔ بادشاہ کا حکم نہیں ٹال سکتی ان کے آدمی تمھاری گردن میں رسی ڈال رہے ہیں، تم چپ ہو جاؤ"

عورت کی آواز سنتے ہی سانڈ اتنا سیدھا ہو گیا گویا کہ وہ ایک میمنا ہے۔ اس کے گلے میں رسی پڑ گئی اور اس کی ٹانگوں کو بھی اس طرح جکڑ دیا گیا کہ وہ چل تو سکتا تھا لیکن رسی کے شکنجے سے نکل نہیں سکتا تھا۔

بادشاہ کے محل میں قصائی اور اس کے آدمیوں نے جانور کو زمین پر پٹخ دیا چھری سے اسے ذبح کرنے کی کوشش کی، حیرت کی بات یہ کہ چھری کی دھار اس کی کھال میں نہیں گھستی تھی۔ واقعی یہ تو بڑے غضب کا سانڈ ہے معلوم ہوتا ہے آسمان کے خدا نے ہی اسے بھیجا تھا

"حضور! عورت کو بلوائیے" قصائی نے بادشاہ سے کہا۔

"جب تک وہ آکر خود نہیں کہے گی، ہماری چھری کام نہیں کرے گی"

اور یہ بات سچ تھی۔ گڑگڑا گڑگڑا کر جب تک کہ عورت نے منت سماجت نہیں کی بکومی نے اپنے آپ کو ذبح نہیں ہونے دیا۔

جیسا کہ وعدہ تھا، بادشاہ نے عورت کو گوشت کا ایک حصّہ دینے کی کوشش کی۔

"میں بھلا بکومی کا گوشت کیسے کھا سکتی ہوں" اس نے کہا۔

"وہ تو مجھ کو اپنی اولاد جیسا پیارا تھا"

"پھر بھی تمھیں کچھ نہ کچھ تو لینا چاہیے" بادشاہ

نے نرمی سے کہا۔ اس کے بعد اس کے آدمیوں نے ایک بڑے گھڑے میں بھر کر چربی عورت کے گھر پہنچا دی۔

بیوہ عورت کسی طرح اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھی اس نے گھڑا اٹھا کر اپنی جھونپڑی کے پیچھے کہیں ڈال دیا۔ وہ کبھی بھول کر بھی اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی پر جب کبھی اس کو یاد ستاتی تو مجبوراً چربی کو دیکھ دیکھ کر روتی اور کہتی:۔

"میرے پیارے میرے لاڈلے بکومی! اب بھلا میں تم کو کیسے پا سکتی ہوں؟"

لیکن اس کی جھونپڑی میں عجیب و غریب واقعات پیش آنے لگے۔ صبح کو جب وہ سو کر اٹھتی تو دیکھتی کہ اس کا سارا کام کاج مکمل ہے۔ فرش صاف ہے گھڑے میں پانی بھرا رکھا ہے۔ چولھے پر کھانا پک رہا ہے۔

"بھلا یہ سب کون کرتا ہے؟"

گتھی کسی طرح نہیں سلجھتی تھی۔

ایک رات اس نے طے کیا کہ سوئے گی نہیں اور دیکھتی بھالتی رہے گی۔

وہ رات بھر جاگتی رہی آخر جب پو پھوٹی تو جھونپڑی کے پیچھے اس نے ہلکی سی آواز سنی۔ بکومی کی چربی جس گھڑے میں رکھی تھی، اسی میں سے یہ آواز آرہی تھی، پھر اس نے دیکھا کہ اس میں سے ایک جوان لڑکی نکل رہی ہے۔

لڑکی نے فرش صاف کیا، پانی لا کر رکھا پھر آگ جلائی۔ عورت یہ سب کچھ دیکھ کر چیخ پڑی۔ آواز سن کر لڑکی گھڑے میں گھسنے کے لیے بھاگی۔

"مجھ سے کیوں چھپ رہی ہو؟ تم میرے پیارے بکومی کی اولاد ہو"

عورت نے شرافت سے کہا۔

"میرے ساتھ رہو میں بالکل تنہا ہوں، تم میری لاڈلی ہو اور میں تمھیں بھی بکومی کہہ کر پکارا کروں گی"

اس کے بعد وہ عورت اور خوب صورت لڑکی وادی میں ہنسی خوشی رہنے لگیں۔ شروع میں بکومی کو کسی نے نہیں دیکھا جھونپڑی سے باہر وہ صرف پانی لینے یا ایندھن کی لکڑیاں چننے جاتی۔

لیکن ایک دن صبح ہی صبح جبکہ کام کے لیے لڑکی باہر گئی ہوئی تھی ادھر سے گزرتے ہوئے ایک مسافر نے اسے دیکھ لیا۔ وہ قصبے کا سوداگر تھا اس وقت اپنے لیے اور اپنے خچر کے لیے پانی چاہتا تھا۔ بکومی نے اپنے گھڑے سے اسے پانی دے دیا۔

"وادی میں جو بیوہ عورت ہے اس کے ساتھ ایک بڑی خوب صورت لڑکی رہتی ہے"

اس نے جلدی سے جاکر بادشاہ کو خبر کی۔

"لڑکی اتنی خوب صورت ہے کہ اس کو نظر بھر دیکھنے کی خوشی میں، میں پانی پینا بھی بھول گیا۔ وہ دلہن بنانے کے قابل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ محل ہی اسے زیب دیتا ہے"

یہ سنتے ہی بادشاہ بے قرار ہو گیا اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اس لڑکی کو محل میں حاضر کیا جائے۔ عورت بھی اس کے ساتھ آئی، وہ ڈری ہوئی

تھی۔ اس نے دیکھا کہ بادشاہ بکومی پر لٹو ہے تو وہ سمجھ گئی کہ وہ اسے اپنی ملکہ بنانا چاہتا ہے۔

"تمھاری بکومی میں سورج کی مانند چمک دمک ہے میں اسے اپنی رانی بنانا چاہتا ہوں، جتنی گائیں مانگو گی میں تمھیں دوں گا۔ تم امیر ہو جاؤ گی۔"

حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ کا دل قابو میں نہیں تھا وہ اس کی ساری بیویوں سے کہیں زیادہ حسین تھی

بادشاہ سلامت! مجھے انکار نہیں۔ میری لڑکی کو آپ ملکہ بنانا چاہتے ہیں شوق سے بنائیے" عورت نے بے چارگی سے کہا۔

"لیکن اس میں ایک راز ہے اور وہ راز اس نے خود مجھے بتایا ہے" بادشاہ کے قریب جاکر اس کے کان میں اس نے چپکے سے کہا:

"گھڑے میں میرے چہیتے سانڈ کی جو چربی رکھی تھی، بکومی اس سے پیدا ہوئی ہے، سورج کی دھوپ اور گرمی وہ برداشت نہیں کر سکتی۔ جلتی ہوئی آگ پر کھانا بھی پک رہا ہو تو اسے کبھی اس پر جھکنا نہیں چاہیے ورنہ سمجھ لیجیے کہ وہ بہت نازک ہے اور فوراً پگھل جائے گی۔"

یہ کتنے اچنبھے کی بات تھی بادشاہ نے سوچا لیکن کیا کرے وہ بھی مجبور تھا۔ لڑکی کو وہ دل سے چاہنے لگا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ یہ راز وہ کسی کو نہ بتائے گا اور برابر اس پر نظر رکھے گا۔

"بکومی پکتے ہوئے سالن پر کبھی نہیں جھکے گی میری سب سے بڑی ملکہ رہے گی۔ دوسری بیویاں گھر کا سارا کام کریں گی۔"

شادی ہو گئی اور شاندار دعوتیں ہوئیں بادشاہ کی دوسری بیویاں اس بات سے خوش نہیں تھیں کہ اُن کے سر پر ایک نئی نویلی دلہن کو لاکر بٹھا دیا گیا ہے لیکن وہ بھی مجبور تھیں اور بادشاہ کے حکم کو ٹال نہیں سکتی تھیں۔

دن اور مہینے گزرتے گئے ایک دن بادشاہ نے اپنی ساری بیویوں کو بلاکر کہا۔

"میں آج شکار کھیلنے جا رہا ہوں اور سب غور سے سُن لو! میرا یہ حکم ہے کہ بکومی کا درجہ سب سے اونچا ہے، اور وہ میری سب سے بڑی بیوی ہے تم لوگ اس کی مرضی کے مطابق کام کرنا۔ اس کے علاوہ اس بات کا خیال رکھنا کہ دھوپ میں پانی لینے کے لیے باہر نہ جائے، اس کا بھی خیال رکھنا کہ چولہے پر پکتے ہوئے سالن پر وہ جھکنے نہ پائے۔"

لیکن بادشاہ نے وضاحت نہیں کی کہ آخر اس کا راز کیا ہے۔

سب بیویاں خاموش رہیں اور جیسے ہی بادشاہ باہر گیا سب نے آکر بکومی کو گھیر لیا۔

"مانا کہ تم ہم سب کی سردار ہو" سب نے چیختے ہوئے کہا "لیکن تم تو تنہا ہو، ہم بہت ساری ہیں اب جبکہ ہمارا شوہر بھی نہیں ہے تو تمھیں ہمارا کام کرنا ہوگا نہ یہ کہ ہم تمھارا کام کریں۔ ہم نے تمھاری بہت خدمت کی ہے لیکن آج پانی جاکر لاؤ گی، کھانا بھی تم ہی پکاؤ گی۔"

جب دریا پر پانی لینے کے لیے وہ پہنچی تو بادلوں نے سورج کو ڈھک لیا اس لیے اسے گرمی نہیں لگی لیکن پھر سب نے اسے مجبور کیا کہ آگ کے پاس جائے جہاں دوپہر کا سالن اُبل رہا تھا۔

"بکومی سالن کو چلاؤ آخر تم ایسی کیا نازک ہو کہ ذرا سی گرمی تم نہیں برداشت کر پاؤگی۔"

بادشاہ نے یہ تو کسی کو بتایا نہیں تھا کہ بکومی کہیں پگھل نہ جائے۔

غریب بکومی ظاہر ہے کہ اتنی ساری بیویوں کے خلاف تنہا کیا کر سکتی تھی، وہ اُبلتے سالن پر جھکی اور اس نے نکلتی بھاپ کے بیچ سے چلایا۔

یک بیک ساری بیویاں ڈر کے مارے چیخ پڑیں اس لیے کہ انھوں نے دیکھا کہ ان کے گھر کی چہیتی بیوی غائب ہو رہی ہے۔ آگ پر رکھتے ہی مکھن جس طرح پگھلتا ہے وہ بھی بالکل اسی طرح پگھل رہی تھی۔

جہاں بکومی کھڑی تھی ایک سیکنڈ میں وہاں پیلی پیلی چکنائی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ چکنائی کا ڈھیر بڑھتا گیا، یہ پھیلنے لگا پھر ایک چشمہ کے مانند بادشاہ کے محل سے بہہ نکلا اور اس کے بعد میدان سے ہو کر وہ جاکر دریا میں مل گیا۔

پیلی ندی کے پیچھے پیچھے بیویاں دوڑیں اور انھوں نے خود دیکھا کہ وہ دریا میں جاکر مل گئی۔

"چربی جم کر سخت ہو گئی" ایک بیوی نے حیرانی سے کہا۔

ارے دیکھو تو اس کی شکل گھڑیال جیسی ہو رہی ہے۔ ہائے بکومی نے اپنا حلیہ گھڑیال جیسا بنا لیا۔"

سب نے یہ تماشا دیکھا۔ ہر ایک کو یہ یقین کہ دریا کے ٹھنڈے پانی میں جو جانور تیر رہا ہے وہ بکومی کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں۔

یہ کہانی تم کو کتنی عجیب سی لگی ہوگی۔ لیکن بادشاہ یعنی بکومی کا شوہر جب واپس آیا اور اس کے بعد جو واقعہ پیش آیا وہ اس سے زیادہ تعجب میں ڈالنے والا ہے۔

کھانا اور پانی مانگنے سے پہلے اس نے اپنی چہیتی بیوی کو آواز دی۔

"بکومی! بکومی! اِدھر آؤ۔ تم کہاں ہو؟" اس نے محل میں چاروں طرف ڈھونڈھا۔ اس کی ساری بیویاں اس کے اردگرد جمع ہو گئیں لیکن بکومی کہیں ہو تو آئے۔ اس کی وہ بیوی جو پہلے مہارانی تھی ہمت کر کے بولی۔

"بادشاہ سلامت! اصل بات چھپانے سے کیا فائدہ۔ جب آپ یہاں سے گئے تو ہم نے مجبور کیا کہ بکومی چولھے پر چڑھے ہوئے سالن کو چلائے۔ ہم نے اس سے کہا کہ ابلتے ہوئے سالن کو جھک کر چلاؤ اس نے جیسے ہی یہ کیا وہ پگھل گئی گویا کہ وہ مکھن تھی پھر وہ ایک پیلا پیلا سا نالہ بن گئی اور بہہ کر دریا میں جا ملی۔"

بادشاہ بے چین ہو اٹھا۔ اسی لمحہ بھاگ کر دریا پر پہنچا۔

"بکومی! بکومی! بکومی! تم کہاں ہو؟"

اس کی آنکھیں ڈب ڈبا آئیں اس لیے کہ وہ واقعی اس لڑکی کو دل و جان سے چاہتا تھا۔

بکومی کا کہیں پتہ نہیں، البتہ ایک جوان گھڑیال دریا کے کنارے تیر رہا تھا۔

بادشاہ کو حیرت ہوئی جب گھڑیال نے اس سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"میرے پیارے شوہر! دیکھو میں یہاں ہوں۔ دریا کے ٹھنڈے پانی میں بکومی آگ سے اور دوپہر کی دھوپ کی گرمی سے محفوظ رہ سکتی ہے۔"

خوشی میں چیخ کر بادشاہ اس کی بغل میں پانی کے اندر کود پڑا اور پھر کیا ہوا؟ یہ تو واقعی بڑی حیرت کی بات ہے۔

جیسے ہی وہ پانی میں داخل ہوا اُس کا جسم (ہپوپوٹیمس) دریائی گھوڑا بن گیا۔ اس وقت سے لے کر یہ دونوں "بادشاہ اور اس کی چہیتی ملکہ" دریائی گھوڑا اور گھڑیال پانی میں اطمینان سے اور آپس میں مل جل کر رہتے ہیں، کبھی آپس میں لڑتے نہیں، دن میں جب بہت گرمی ہوتی ہے تب بھی وہ بھول کر خشکی پر نہیں آتے۔

لطیفہ

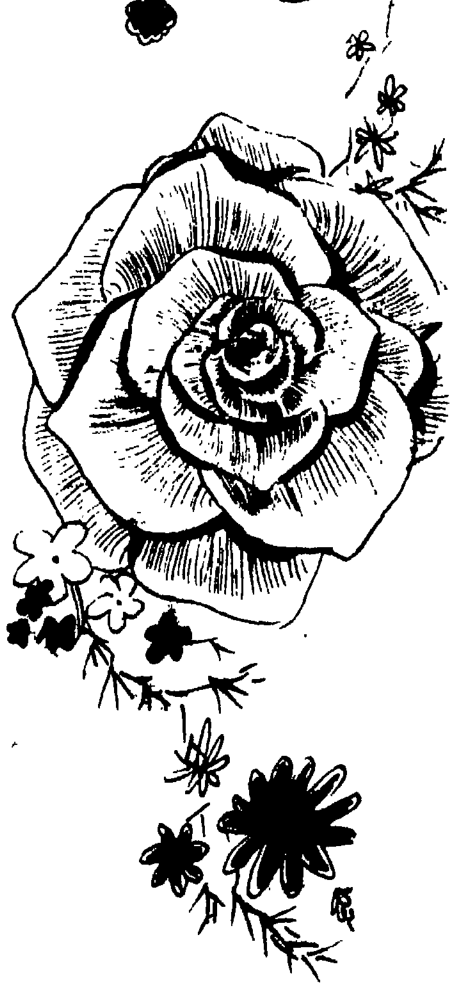
پہلا: اگر تم نے سمندر میں ڈبکی لگائی تو کہاں تک پہنچ سکو گے۔

دوسرا: موت کے فرشتے تک۔

خالد ریاض قاضی

جناب کیف احمد صدیقی

گلاب



ساری دنیا میں لاجواب ہو تم
انتخابوں کا انتخاب ہو تم
امن و انسانیت کی آب ہو تم
اے گلستانِ ہند کے بچّو!
مسکراتے ہوئے گلاب ہو تم

تم ہو ہندوستاں کے مستقبل
تم سے روشن ہے جادۂ منزل
آرزوؤں کے ماہتاب ہو تم
اے گلستانِ ہند کے بچّو!
مسکراتے ہوئے گلاب ہو تم

کامیابی کی شاہراہوں میں
مادرِ ہند کی نگاہوں میں
جگمگاتے حسین خواب ہو تم
اے گلستانِ ہند کے بچّو!
مسکراتے ہوئے گلاب ہو تم

دُور دنیا سے تیرگی[1] کر دو
سارے عالم میں روشنی کر دو
علم و حکمت کے آفتاب ہو تم
اے گلستانِ ہند کے بچّو!
مسکراتے ہوئے گلاب ہو تم

تم سے دنیا میں شانتی پھیلی
مردہ قوموں میں زندگی پھیلی
اپنے مقصد میں کامیاب ہو تم
اے گلستانِ ہند کے بچّو!
مسکراتے ہوئے گلاب ہو تم

[1] اندھیرا

مہاتما گاندھی

بالاسندرم

دل کی سچی اور پاک آرزو ہمیشہ پوری ہوتی ہے
میں نے خود اس اصول کی صحت کا بار ہا تجربہ کیا ہے۔ غریبوں کی خدمت کرنے کی مجھے ہمیشہ آرزو رہی ہے۔ اس کی بدولت میں ان میں مل جل کر رہا اور انھی کا ہو رہا۔

نٹال انڈین کانگریس میں افریقی، ہندی اور محرر وغیرہ شامل تھے۔ لیکن بے سیکھے مزدور اور پابند مزدور ابھی شامل نہیں کیے گئے تھے۔ ابھی تک کانگریس ان کی نہ تھی۔ ان لوگوں میں اتنی سکت نہ تھی کہ چندہ دے کر اس کے کارکن بنیں کانگریس انھیں صرف اس طرح اپنا سکتی تھی کہ ان کی خدمت کرے۔ اس کا ایک موقع آیا۔ لیکن سچ پوچھیے تو ابھی تک نہ کانگریس اس موقع سے فایدہ اٹھانے کے لیے تیار تھی اور نہ میں تھا۔ ابھی مجھے وکالت شروع کیے دو تین ہی مہینے ہوئے تھے اور کانگریس بالکل ابتدائی حالت میں تھی۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ ایک تامل چیتھڑے لگائے اپنا پھٹیا (صافہ) ہاتھ میں لیے میرے سامنے کھڑا کانپ رہا ہے اور رو رہا ہے۔ اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے ہیں اور اس کے منھ سے خون بہہ رہا ہے، مجھے اس شخص کا سارا حال اپنے محرر سے معلوم ہوا جو خود تامل تھا۔ آنے والے کا نام بالاسندرم تھا اور یہ نٹال کے ایک مشہور یورپی یا انگریز کے یہاں پابند مزدور تھا۔ اس کے آقا نے غصے میں آپے سے باہر ہو کر اسے اتنا مارا کہ اس کے دو دانت ٹوٹ گئے۔

میں نے اسے ڈاکٹر کے پاس بھیجا۔ ان دنوں وہاں صرف انگریز ڈاکٹر تھے۔ میں ایک تصدیق نامہ چاہتا تھا جس سے معلوم ہو کہ بالاسندرم کو کس قسم کی چوٹ آئی ہے۔ مجھے یہ تصدیق نامہ مل گیا اور میں نے فوراً بالاسندرم کو مجسٹریٹ کے یہاں لے جا کر بیان حلفی داخل کرا دیا۔ مجسٹریٹ اسے پڑھ کر آگ ہو گیا اور اس نے فوراً آقا کے نام سمن جاری کر دیا۔

میری ہرگز یہ خواہش نہیں تھی کہ آقا کو سزا دلاؤں۔ میں تو صرف بالاسندرم کو اس کے پنجے سے چھڑانا چاہتا تھا۔ پابند مزدوروں کے متعلق جو قانون تھا وہ میں نے پڑھا۔ اگر معمولی نوکر بغیر پہلے سے اطلاع دیئے نوکری چھوڑ دے تو اس کا آقا اس پر دیوانی میں مقدمہ چلا سکتا ہے۔ مگر پابند مزدور کی حالت بالکل دوسری تھی۔ اس پر ایسی صورت میں فوجداری میں

مقدمہ چلایا جاتا تھا اور اگر وہ مجرم قرار پائے تو اسے قید کی سزا ہوتی تھی۔ اس لیے سر ولیم ہنٹر نے کہا تھا کہ پابند مزدوری غلامی سے کم نہیں۔ پابند مزدور بھی غلام کی طرح اپنے آقا کی ملک ہوا کرتا تھا۔

بالاسندرم کو چھڑانے کی صرف دو تدبیریں تھیں۔ یا تو پابند مزدوروں کے محافظ (ایک سرکاری عہدہ دار جس کا کام یہ تھا کہ پابند مزدوروں کی نگرانی اور ان کے حقوق کی حفاظت کرے) سے درخواست کی جاتی ہے کہ اس کے معاہدے کو منسوخ کر دے یا اسے کسی اور شخص کی ماتحتی میں دے دے یا خود سندرم کے آقا سے کہا جاتا کہ وہ اسے سبکدوش کر دے۔ میں نے اس کے آقا کے پاس جا کر کہا "میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ آپ پر مقدمہ چلاؤں اور آپ کو سزا دلاؤں۔ میرے خیال میں آپ کو خود یہ احساس ہوگا کہ آپ نے اس شخص کو بری طرح مارا ہے۔ میرے اطمینان کے لیے یہی کافی ہے کہ آپ اس کی خدمات کسی اور کے ہاتھ بیچ دیں۔ اس پر وہ فوراً راضی ہوگیا۔ اس کے بعد میں محافظ سے ملا۔ اس نے بھی رضامندی ظاہر کی مگر اس شرط پر کہ میں خود بالاسندرم کے لیے کوئی نیا آقا ڈھونڈوں۔

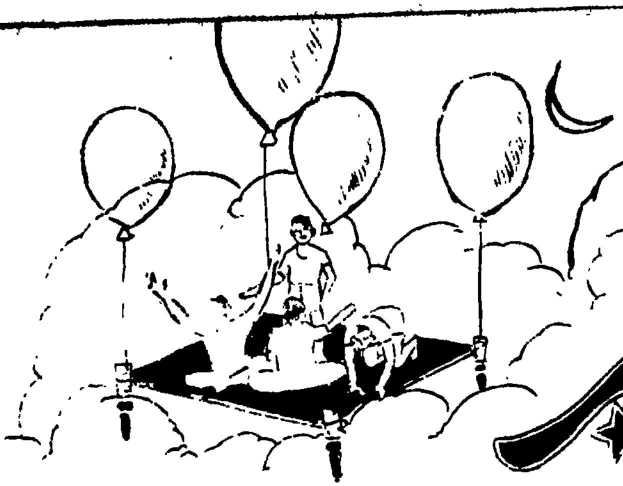
میں نے تلاش شروع کر دی۔ یہ شرط تھی کہ آقا صرف فرنگی ہی ہو کیونکہ ہندوستانیوں کو پابند مزدور رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ ان دنوں میری ملاقات بہت کم فرنگیوں سے تھی۔ ان میں سے ایک سے میں ملا۔ وہ ازراہِ مہربانی بالاسندرم کو لینے پر راضی ہوگیا میں نے اس مہربانی کا دل سے شکریہ ادا کیا۔ مجسٹریٹ نے بالاسندرم کے پہلے آقا کو مجرم قرار دیا اور فیصلے میں لکھ دیا کہ وہ (باہمی تصفیہ کی بنا پر) بالاسندرم کی خدمات کسی دوسرے کی طرف منتقل کرنے پر راضی ہو گیا ہے۔

بالاسندرم کے معاملے کی خبر ہر پابند مزدور کو ہوگئی اور میں ان مزدوروں کا دوست سمجھا جانے لگا۔ مجھے اس رابطے کے پیدا ہونے سے بڑی خوشی ہوئی۔ میرے دفتر میں پابند مزدوروں کا تانتا بندھ گیا اور مجھے ان کے رنج و راحت سے واقف ہونے کا بہترین موقع ملا۔

اس معاملے کی گونج دور دراز مدراس تک سنی گئی۔ اس صوبے کے مختلف حصے کے مزدور جو معاہدہ کر کے نٹال جایا کرتے تھے اپنے بھائیوں کے ذریعہ سے جو افریقہ میں تھے اس سے واقف ہوگئے۔

خود اس معاملے میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن پابند مزدوروں کو یہ دیکھ کر کہ نٹال میں ایک شخص ان کی مدد کے لیے کھلم کھلا ان کا ساتھ دینے کے لیے موجود ہے، بڑی خوشی ہوئی اور ان کا دل امید سے بھر گیا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ جب بالاسندرم میرے دفتر میں آیا تھا تو اپنا پھٹا صافہ ہاتھ میں لیے تھا۔ اس بات کا ایک افسوسناک پہلو تھا جس سے ہم لوگوں کی ذلت ظاہر ہوتی تھی۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ مجھے عدالت نے پگڑی اتارنے کا حکم دیا تھا۔ ہر پابند مجبور



چاند کی سیر

جناب بختیار احمد

غبارہ دھیرے دھیرے اوپر اڑتا جا رہا تھا، اوپر اور اوپر —— جب کافی دور جا نکلا تو بہت چھوٹا دکھائی دینے لگا۔ بچے یہ تماشا دیکھ کر خوشی میں تالیاں بجانے لگے۔ مگر نیّر بہت اداس تھا۔ اصل میں دھاگے سے بندھا ہوا گیس والا یہ غبارہ اسی کا تھا اور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ہوا کے کندھے پر اڑ رہا تھا۔ جب یہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو پارک میں اس کا جی بھی نہ لگا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا گھر کی طرف چل پڑا۔

گھر پہنچ کر بھی ماہتابی رنگ کا یہ بڑا سا غبارہ اسے بار بار یاد آیا تھا۔ نیّر کو غباروں کا بڑا شوق تھا۔ تیوہاروں میں جب کبھی اسے پیسے ملتے تو ٹافی اور مٹھائی کے بدلے وہ رنگ برنگ کے غبارے خرید لاتا۔ روشنی میں یہ غبارے قمقموں کی طرح رنگین اور خوبصورت دکھائی دیتے۔ اور جب پھٹتے تو پٹاخے کی آواز پیدا کرتے۔

ماں اس کا اداس چہرہ دیکھ کر بہت پریشان ہوئی۔ پر اصل بات معلوم ہونے پر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے نیّر کو دوسرے غبارے منگوانے کا لالچ دیا۔ مگر اس کے دل کا بوجھ کم نہ ہوا۔ آخر ماں نے کہانی سنانے کا وعدہ کیا۔ تب کہیں غبارے والی بات اس کے دل سے اتری۔ کہانی سننے کا شوق اسے بچپن سے تھا۔ اور کہانی سننے کے شوق میں وہ اپنا غم بھول گیا۔ ماں نے بڑی اچھی کہانی سنائی چوری چھپے ہم نے بھی سن لی۔ اب آپ کو سناتے ہیں۔

سینکڑوں برس پہلے کی بات ہے۔ جب راکٹ اور جہاز نہیں بنے تھے۔ ہوائی سفر کے بارے میں تو کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

انھی دنوں ایک سہ پہر کو چند بچے چار بڑے غبارے لائے اور ایک کھٹولے کے چاروں پاؤں سے ان چاروں غباروں کو مضبوطی سے باندھ دیا۔ پھر چاروں دلیر بچے کھٹولے پر سوار ہو گئے۔ غباروں میں گیس بھرا ہوا تھا کھٹولا دھیرے دھیرے زمین سے اوپر اٹھنے لگا۔ بلندی پر پہنچ کر یہ اڑن کھٹولا جیسے ہوا کی گود میں آ گیا اور تیزی سے اڑنے لگا۔ بچوں نے نیچے کی طرف دیکھا۔ زمین کی ہر چیز چھوٹی نظر آ رہی تھی۔ مکان اور عمارتیں ان کے بنائے ہوئے گھروندے لگتے تھے۔

اتنا کہہ کر ماں چپ ہو گئی ۔ اور نیّر کھٹولے میں بیٹھے بچّوں کے بارے میں سوچ رہا تھا ۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ خود بھی اڑن کھٹولے پر سوار ہو اور اسی اونچائی سے زمین کا نظارہ کر رہا ہو ۔ پھر اچانک اس نے محسوس کیا کہ غبارے پھٹ گئے ہیں اور وہ ان بچّوں کے ساتھ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح قلابازیاں کھاتا ہوا زمین کی طرف آ رہا ہے ۔ اتنے میں اس کی ماں نے کہانی پھر شروع کر دی۔

"اڑن کھٹولا اُڑتا رہا ۔ شام ہو گئی تو دن بھر کا تھکا ماندہ سورج پچھم میں آہستہ آہستہ ڈوبنے لگا ۔ بچّوں نے جب پورب کی طرف نظر دوڑائی تو پیارا پیارا چاند نکل چکا تھا ۔ اس کی دودھیا چاندنی بڑی خوبصورت لگ رہی تھی ۔ چاند جب کافی اونچائی پر آ گیا تو اس میں بیٹھی ہوئی بڑھیا نے زمین کے ننھے مسافروں کو دیکھا ۔ وہ ان کے حوصلے اور بہادری کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی ۔ بڑھیا کا چرخہ چل رہا تھا ۔ اور وہ دیکھ رہی تھی کہ زمین کے نونہالوں کا خلائی قافلہ چاند کی جانب بڑھا چلا جا رہا ہے ۔ جب اس نے بچّوں کے بھولے بھالے اور پیارے چہرے دیکھے تو اسے ترس آنے لگا ۔ اور اس نے فوراً اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ اڑن کھٹولے کو حفاظت سے چاند پر لے آئیں۔ حکم ملتے ہی پروں والے سپاہی ہوا میں تیرنے لگے ۔"

"ممی! مگر بڑھیا کے پاس سپاہی کہاں سے آئے ؟" نیّر بیچ میں پوچھ بیٹھا ۔

"بڑھیا اصل میں چاند کی رانی تھی ۔ وہاں کی ہر چیز پر اس کا حکم چلتا تھا" ماں نے جواب دیا اور کہانی سنانے لگی "پھر آن کی آن میں پروں والے سپاہیوں نے اڑن کھٹولے کو سہارا دے کر رانی کے پاس لا حاضر کیا ۔ بچّوں کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ وہاں کی ہر چیز چاند کی طرح چمک دار اور خوب صورت تھی ۔ پیڑ، پودے، جانور اور پرندے، سبھی کچھ تھے مگر انسان کا کہیں نام و نشان نہیں تھا ۔ بھولے بھالے خوب صورت بچّوں کو دیکھ کر رانی بہت خوش ہوئی اور زمین کے ننھے مسافروں کو اپنا مہمان بنا لیا ۔ اور یہ چاروں اپنا مزے سے وہاں رہنے لگے ۔ بلّی کا ایک بچہ تو ان ننھے مسافروں کا دوست بن گیا ۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ بھی ان بچّوں کے ساتھ کھیلے ۔ اور زمین کے دوسرے بچّوں کے بارے میں باتیں کرے ۔ مگر یہ تو تبھی ممکن تھا جب وہ بھی انسان کا بچہ ہوتا ۔ یہ خیال آتے ہی وہ بھاگا بھاگا رانی کے پاس پہنچا ۔ اور اسے اپنے دل کی بات بتائی ۔

تھوڑی دیر بعد رانی کا جادو والا چرخہ ایک بار تیزی سے گھوما اور بلّی کا بچہ ایک خوب صورت انسان کا بچہ بن گیا ۔

" زمین کے ننھے مسافروں کی نظر اس بچے پر پڑی تو بہت خوش ہوئے ۔ اور اب چار کی جگہ پانچ بچے مل کر کھیلنے لگے ۔

تھوڑے دنوں بعد واپسی کی تیاری شروع ہوئی تو رانی نے ایک الوداعی دعوت کا اہتمام کیا ۔ محل کے بڑے ہال میں سب جمع تھے ۔ پانچوں بچے بیچ میں بیٹھے تھے ۔ میز پر مزے دار کھانے اور عمدہ میوے سجائے جا رہے تھے ۔ اچانک نہ جانے کہاں سے ایک موٹا چوہا نکل کر بھاگا ۔ اسے دیکھتے ہی چاندی جیسا بلّا

جناب مائل خیرآبادی

ماں

"اے بھائی یہ مقام جعرانہ ہے نا!"

"ہاں اے محترم خاتون یہ جعرانہ ہی ہے۔ وہ کیا غرض ہے جو آپ کو یہاں لائی؟"

"اے سنجیدہ انسان مجھے توقع ہے کہ تو مجھے ٹھیک ٹھیک بتا دے گا۔ میں یہاں اپنے بیٹے سے ملنے آئی ہوں"۔

"آپ کے بیٹے کا کیا نام ہے؟"

"میرے بیٹے کا نام محمدؐ ہے"

"محمدؐ! آپ کے بیٹے کا نام محمدؐ ہے؟ اس نام کے تو کئی لوگ یہاں ہیں، آپ ذرا وضاحت فرمائیں"

"میں محمدؐ بن عبداللہ سے ملنے آئی ہوں میں نے سنا ہے کہ میرے بیٹے پر اللہ نے اپنی سب سے بڑی رحمت نازل فرمائی ہے"

"یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" "بے شک اے محترم خاتون! ان پر اللہ نے سب سے بڑی نعمت نازل فرمائی ہے۔ مگر ان کی والدہ محترمہ کا انتقال تو ان کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ معاف فرمائیے گا۔ آپ اس عمر میں داخل ہو چکی ہیں جس میں انسان کا دماغ اس کے بس میں نہیں رہتا۔"

"اے سنجیدہ انسان تو نے بھی وہی بات کہی جو کئی اور آدمیوں سے اپنے متعلق سن چکی ہوں، مگر تو نے اچھے الفاظ میں کہی جو کچھ کہا۔ دوسرے لوگوں سے جب میں نے اپنے بیٹے محمدؐ بن عبداللہ کے بارے میں پوچھا تو وہ مسکرا دیے پھر مجھ سے تو نہیں آپس میں کہنے لگے کہ اس بڑھیا پر جنون کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ واللہ میں سچ کہتی ہوں۔"

"اچھا تو تم مجھے محمدؐ بن عبداللہ کے پاس لے چلو"

"میرے ساتھ آیئے"

"مرحبا! اللہ تیرے چہرے کو روشن کرے"

اس مختصر سی گفتگو کے بعد معمر خاتون اس سنجیدہ شخص کے ساتھ ہو لی۔ وہ زیر لب کہتی جاتی تھی۔ لوگ مجھے مجنوں سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ میں اپنے بیٹے سے ملوں گی تو سب حیران رہ جائیں گے۔ میرا بیٹا مجھے ضرور پہچان لے گا۔ شیماء کہتی تھی "ماں! آپ کا بیٹا محمدؐ آپ کو بہت یاد کرتا ہے" ہاں وہ ضرور یاد کرتا ہوگا۔ کیسا شریف ہے وہ۔ اس نے میرے دودھ کی لاج رکھ لی۔ اس نے میرے قبیلے کے تمام قیدیوں کو فدیہ[1] لیے بغیر آزاد کر دیا۔ بے شک اس کے ساتھی بھی نہایت شریف ہیں سب نے اس کی تائید کی تھی"

"محترمہ! آپ زیر لب کیا فرما رہی ہیں۔ کچھ الفاظ میں سن رہا ہوں لیکن مفہوم سمجھ میں نہیں آتا"

"تم مجھے میرے بیٹے کے پاس لے چلو سب سمجھ جاؤ گے"

"وہ دیکھو سامنے لوگ بیٹھے ہیں وہ ہیں محمدؐ بن عبداللہ۔ اللہ کے آخری رسول، ان پر میرے ماں باپ قربان ہوں"

[1] [illegible] کا تاوان۔

یہ سن کر معمر خاتون سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس نے ایک نظر مجمع پر ڈالی پھر اچانک اس پر والہانہ کیفیت طاری ہو گئی۔

"یہی ہے میرا بیٹا محمدؐ۔ خدا کی قسم میں نے پہچان لیا۔ نہ میری آنکھوں نے مجھے دھوکا دیا اور نہ میرے ذہن نے۔"

وہ والہانہ انداز میں بڑھی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ کے اسی مقام پر اپنے ساتھیوں میں گوشت تقسیم فرما رہے تھے۔ (ان سب پر اللہ کی رحمت ہو) آپ نے دفعتاً اس معمر خاتون کو دیکھا۔

آپؐ "میری ماں" کہتے ہوئے آگے بڑھے معمر خاتون "میرا بیٹا۔ میرا بیٹا" کہتی ہوئی اس طرح چلی آ رہی تھی جیسے کوئی غیبی کشش آپ سے آپ اسے اس طرف کھینچ رہی ہو۔ اس کے پاؤں اس کی عجلت کا ساتھ نہ دے سکے۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اٹھتے ہی تمام صحابہؓ کی نظروں نے حیرت و استعجاب کے ساتھ اس منظر کو دیکھا جو انھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سب دم بخود سوچ رہے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ محترمہ کا تو انتقال ہو چکا ہے۔ پھر یہ کون خاتون ہیں جن کی طرف حضور بے تاب ہو کر بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ سمجھ کوئی نہ سکا۔ لیکن سب نے آگے بڑھ کر اس معمر خاتون پر سایہ کر لیا۔ اللہ کے رسول نے اپنی چادر دی "اس پر میری ماں کو بٹھا دو۔" لوگوں کو اور زیادہ حیرت ہوئی کہ یہ شرف اس خاتون کے سوا کسی کو نصیب نہ ہوا۔

"شیماء نے تجھ کو اور تیرے ساتھیوں کو سلام کہا ہے۔"

"ان پر بھی سلامتی ہو اور اللہ کی رحمت اور آپ پر بھی۔" صحابہؓ کے مجمع میں ایک گونج پیدا ہوئی۔ معمر خاتون نے ایک نظر سب پر ڈالی۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

"شیماء کہتی تھی کہ تجھ پر اللہ نے سب سے بڑی رحمت اور نعمت اتاری لیکن میں دیکھتی ہوں کہ تو بے حد دبلا ہو رہا ہے۔"

"ماں مجھے اللہ نے اپنا رسول بنایا ہے میں نبوت کے بوجھ سے دبا جا رہا ہوں کیا آپ میری نبوت کی تصدیق فرمائیں گی۔"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں، میں گواہی دیتی ہوں کہ محمد بن عبد اللہ اللہ کا رسول ہے۔ اے میرے بیٹے ایسی فیاضی ایک نبی اور اس کے ساتھی ہی کر سکتے ہیں۔ ہوازن کی لڑائی میں جب شیماء اور اس کے ساتھی سینکڑوں بنو سعد قید ہو کر آئے تو محض میرے دودھ کی بدولت فدیہ لیے بغیر انھیں آزاد کر دیا گیا۔ اے میرے بیٹے تو بھی شریف ہے اور تیرے ساتھی بھی۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی کی اس وقت انتہا نہ تھی لیکن یہ معما ہنوز معما ہی تھا کہ یہ خاتون حضور کی ماں کیسے ہو سکتی ہے۔ جب کہ آپ کی والدہ محترمہ کا انتقال آپؐ کے بچپن ہی میں ہو چکا ہے۔

"شیماء یہ بھی کہتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کا بوجھ جس بندے پر ڈالا اس کے جسم پر گوشت نہ چڑھ سکا۔ سچ کہا تھا شیماء نے۔"

"میں نے پا لیا میں نے پا لیا۔" اچانک حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زبان سے نکلا سب ان کی طرف دیکھنے لگے حضرت صدیقؓ کی اصابت رائے اور معاملہ فہمی کا سب کو اعتراف تھا ہی یہ سمجھے کہ کون ہے یہ بزرگ خاتون۔ جناب ابوبکر صدیقؓ نے حضورؐ سے نہایت ادب سے عرض کیا "یا رسول اللہ! یہ شاید حلیمہ سعدیہ ہیں۔"

حضورؐ نے صدیق اکبر کی بات سن کر ان کی طرف دیکھا فرمایا۔

"بے شک یہ حلیمہ سعدیہ ہیں قبیلہ ہوازن کی سب سے زیادہ محترم خاتون میری ماں انھوں نے مجھے چادر میں پالا۔ اللہ ان پر اپنی رحمت نازل

جناب محمد عُبید اللہ شریف

ذاکر صاحب سنبل پور یونیورسٹی میں

ابھی کوئی ڈیڑھ برس پہلے کی بات ہے ۵ ۱/۶۸ میں ذاکر صاحب نے سنبل پور یونی ورسٹی (اڑیسہ) کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ اس موقع پر ڈاکٹر اے این کھوسلہ چانسلر سنبل پور یونی ورسٹی نے ڈاکٹر صاحب مرحوم سے سنگِ بنیاد رکھنے کی درخواست کرتے وقت ایک مختصر تقریر کی تھی۔ اس تقریر کا خلاصہ پیامیوں کے لیے نیچے دیا جا رہا ہے۔

"سنبل پور یونی ورسٹی اور ریاست اڑیسہ کی تعلیمی ترقی کے لیے یہ ایک نیک شگون ہے کہ اس یونی ورسٹی کا سنگ بنیاد ہمارے محبوب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین رکھ رہے ہیں جو بذات خود ایک ممتاز عالم ادیب۔ انسان دوست۔ مدبّر اور سیاست داں ہیں۔

"ڈاکٹر ذاکر حُسین کی بے مثال قومی خدمات مشہور ہیں لیکن یہ بہتر ہوگا کہ آج کے اس موقع پر موصوف کی اعلیٰ شخصیت اور خدمات کا ایک وسیع خاکہ پیش کیا جائے

"ڈاکٹر ذاکر حسین ۸ر فروری ۱۸۹۷ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اسکول اور یونی ورسٹی کی تعلیم یوپی میں حاصل کی۔ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ سے ایم اے کی ڈگری لینے کے بعد برلن یونی ورسٹی سے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اس کے بعد دہلی، کلکتہ، الہ آباد، علی گڑھ اور قاہرہ یونی ورسٹی سے موصوف کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی گئی۔ اور کل ہی (۴ر جنوری ۱۹۶۸ء) مدورائی یونی ورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری دی گئی۔

"آپ ۲۲ سال تک یعنی ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۸ء تک جامعہ ملیہ دہلی کے وائس چانسلر رہے اور ۸ سال تک یعنی ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۶ء تک مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر رہے۔ ۱۹۵۷ء تک آپ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن اور راجیہ سبھا کے ممبر رہے۔

"جولائی ۱۹۵۷ء سے مئی ۱۹۶۲ء تک بہار کے گورنر رہے اور مئی ۱۹۶۲ء سے اپریل ۱۹۶۷ء تک ہندوستان کے نائب صدر اور ۱۹ مئی ۱۹۶۷ء سے صدر جمہوریہ ہند ہیں۔

"۱۹۵۴ء میں آپ کو پدما بھوشن اور ۱۹۶۳ء میں بھارت رتن کے سب سے بڑے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔

"ڈاکٹر ذاکر حسین مختلف قومی اور بین الاقوامی تعلیمی کمیٹیوں کے صدر اور انڈین پریس کمیشن کے صدر رہ چکے ہیں۔ کئی ملکوں کا دورہ کر چکے ہیں۔ آپ متحدہ عرب جمہوریہ

مراقش - الجیریا - تیونس - کویت - سعودی عرب - اُردن مصر - یو - ایس - اے اور سوویت یونین کا دورہ کر چکے ہیں - ہمارے دور کے بہت بڑے عالموں اور ادیبوں میں آپ کا شمار ہے - آپ کئی کتابوں کا ترجمہ کر چکے ہیں اور کئی کتابیں آپ نے لکھی ہیں -

" ہندی - اردو - فارسی - انگریزی اور جرمن زبانوں پر آپ کو عبور حاصل ہے - آپ نے تعلیمی میدان میں جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ واقعی بہت بڑے ہیں۔

" ڈاکٹر ذاکر حسین گاندھی جی کے سچے پیرو ہیں رحم دلی - سادگی - ہم دردی - سچائی اور عدم تشدد پر عقیدہ رکھتے ہیں - جمہوریت - عالمی بھائی چارگی اور سماجی انصاف آپ کی زندگی کے نمایاں پہلو ہیں - آپ ہر طرح سے ہندوستان کے ایک سچے سپوت ہیں - "

(انگریزی سے ترجمہ و تلخیص)

بالا سندرم صفحہ ۳۲ سے

اور ہر اجنبی ہندوستانی کے لیے زبردستی یہ قاعدہ بنا دیا گیا تھا کہ جب وہ کسی فرنگی کے سامنے جائے تو اپنی پگڑی یا ٹوپی یا پھینٹا (صافہ) اتار کر جائے صرف سلام کرنا ہے دونوں ہاتھوں سے کیوں نہ کیا جائے کافی نہ تھا - بے چارا بالا سندرم یہ سمجھا کہ اسے میرے سامنے بھی اسی طرح آنا چاہیے - میرے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی اسی طرح میری تعظیم کرے - مجھے بڑی شرمندگی ہوئی اور میں نے اس سے کہا کہ پھینٹا (صافہ) باندھ لے - اس نے کچھ تامل کے بعد میری بات مانی مگر اس کے چہرے سے پتا چلتا تھا کہ اسے بڑی خوشی ہوئی -

یہ بات میرے لیے ہمیشہ ایک معمہ رہی کہ لوگ اپنے ہم جنسوں کی ذلت میں اپنی عزت کیوں سمجھتے ہیں -

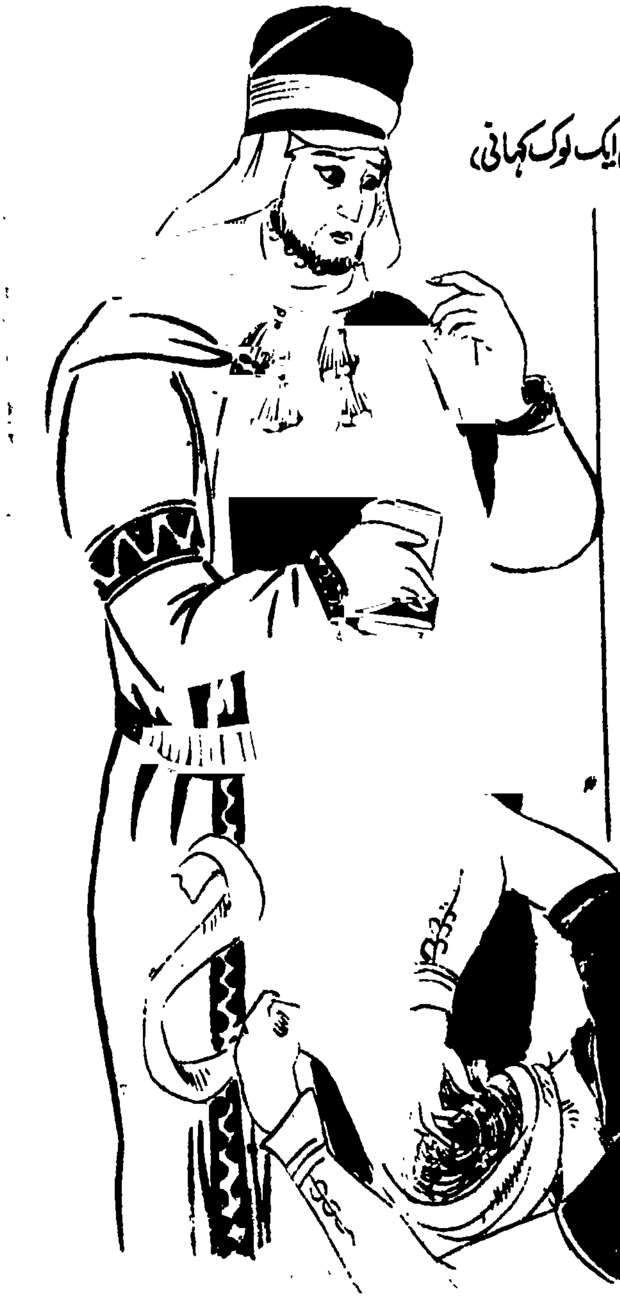
چاند کی سیر صفحہ ۴۳ سے

بچہ تو ہے پر جھپٹ پڑا - یہ دیکھ کر سبھوں کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں - رانی نے تب اصل بات ظاہر کر دی - پھر بلی کے بچے کو اس کی اصلی صورت میں بدل کر اس سے بولی -

" صرف جسم بدلنے سے طور طریقہ نہیں بدلتا - تم ایک جانور ہو - چاہے لاکھ بھیس بدلا کرو - تمھاری عادتیں نہیں بدل سکتیں " اس کے بعد اس نے زمین کے ننھے مہمانوں کو رخصت کیا - چاروں اسی اڑن کھٹولے پر بیٹھ کر خیریت کے ساتھ نیچے آ گئے " ماں نے کہانی ختم کی اور نیّر میاں کی طرف دیکھا - پر وہ تو آنکھیں موندے ننديا پور کی سیر کر رہے تھے -

ترجمہ
محمد حسین حسان

ابونواس اور اس کی بیوی



(تیونس کی ایک لوک کہانی)

یہ بات اب تو کچھ خواب وخیال سی معلوم ہوتی ہے۔ مگر کچھ برسوں پہلے ملکوں پر حکومت کرنے کا جو ڈھنگ تھا وہ آج کل کی حکومت کے ڈھنگ سے الگ تھلگ تھا۔ پہلے بادشاہ نواب یا راجہ ہوتے تھے ان کے امیر ہوتے تھے، درباری ہوتے تھے۔ باقاعدہ دربار سجتا تھا۔ اس دربار میں عالم فاضل ادیب، شاعر سبھی جمع ہوتے تھے اور جناب ایک آدھ مسخرا بھی ہوتا تھا۔ تیونس کے سلطان کے دربار میں بھی ایک مسخرا تھا۔ ابونواس۔

ابونواس ایک دن تیونس کے سلطان کی خدمت میں روتا پیٹتا آیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ سسکیاں لے رہا تھا۔ بے چارے کی بیوی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔



بادشاہ سچ مچ بہت غمگین ہوا اپنے محل کی سب سے خوب صورت بن بیاہی لڑکی سے اس کا بیاہ کر دیا اور اپنی طرف سے ایک ہزار اشرفیاں نقد دیں۔ شادی کے تحفے کے طور پر۔

اب تو یہ دونوں بہت خوش، بہت ہی خوش زندگی خوب ہنسی خوشی گذرنے لگی مگر کب تک، ہوتے ہوتے ایک دن ساری پونجی ختم ہو گئی ـــــ اب کیا کریں ـــــ بہت حیران۔ بہت پریشان۔

اچانک ابو نواس کو ایک بات سوجھی اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"تم یہیں رہو میں بادشاہ سلامت کی خدمت میں جاتا ہوں اور اُن سے کہتا ہوں کہ تم مر گئی ہو اور میرے پاس کفن کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں"۔

بیوی بولی: "واہ واہ کیا خوب سوجھی۔ اگر تم بادشاہ سلامت سے سیدھی سیدھی بات کرتے کہتے کہ میں قلاش اور کنگال ہو گیا ہوں۔ بادشاہ سلامت نے جو کچھ دیا تھا وہ ختم ہو گیا ہے تو تم خالی ہاتھ لوٹتے ایک پائی بھی نہ ملتی"۔

ابو نواس نے کالی مرچیں پیس پیس آنکھوں میں لگائیں۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ آنسو رخساروں پر بہنے لگے۔ وہ روتا بلبلاتا بادشاہ کے پاس پہنچا اور اس کے قدموں پر اوندھے منہ گر گیا۔

بادشاہ گھبرا گیا "ارے ارے ابو نواس خیریت تو ہے کیا حادثہ پیش آ گیا"۔

ابو نواس ہچکیاں لیتے ہوئے بولا: "کیا بتاؤں بادشاہ سلامت میری بیوی مر گئی ہے اور میرے پاس کفن خریدنے کے لیے پھوٹی کوڑی نہیں ہے"۔

بادشاہ بہت اداس ہو کر بولے "ہاں میاں ابو نواس ایک دن ہم سبھی کو مرنا ہے۔ اچھا لو یہ سو اشرفیاں کفن دفن کا انتظام کر لینا۔ ابو نواس نے شکریہ ادا کیا اور گھر کی راہ لی۔ وہ اب بھی رو رہا تھا مگر دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔

گھر پہنچا تو بیوی بولی۔ پر یہ سو اشرفیاں کیے دن چلیں گی۔ اچھا ٹھہرو تم یہیں رہو میں ملکہ کے پاس جاتی ہوں اس سے کہوں گی کہ تم مر گئے ہو اور میرے پاس ایک کوڑی نہیں جو اس کے لیے کفن خریدوں"۔

ابو نواس کی طرح اس نے بھی آنکھوں میں کالی مرچیں ملیں۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں رخساروں پہ آنسو بہنے لگے۔ روتی دھوتی ملکہ کے پاس پہنچی اور دھڑ سے اس کے قدموں پر گر گئی۔

ملکہ بے چاری حیران پریشان جلدی سے بولی:۔

"ہے ہے کیا بات ہے؟ سب خیریت تو ہے؟"

ابو نواس کی بیوی سسکیاں لے کر بولی "میری اچھی ملکہ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ میرا سہاگ اجڑ گیا میرا شوہر مر گیا۔ میرے پاس اتنا بھی نہیں ہے جو اس کے لیے کفن دفن کا انتظام کر لوں"۔

ملکہ کو بڑا ترس آیا۔ اسے فوراً سو اشرفیاں دیں اور کہا جاؤ کفن دفن کا انتظام کرو"۔

ابو نواس کی بیوی اب بھی روئے جا رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے پر دل؟ ـــــ

دل ہنس رہا تھا۔

شام کو سلطان ملکہ کے پاس گیا۔ کچھ اداس اداس سا۔ کہنے لگا "کچھ سنا تم نے بے چارے ابو نواس کی بیوی مر گئی۔"

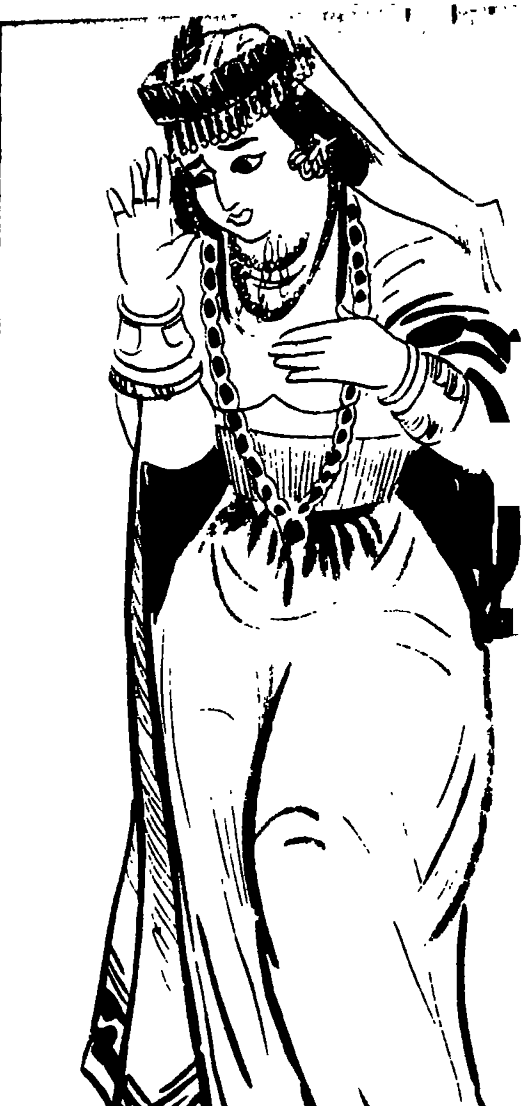
ملکہ فوراً بول اٹھی "ارے ارے یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کی بیوی نہیں مری ہے خود ابو نواس مرا ہے یہ غلط خبر آپ کو کس نے سنائی۔"

سلطان نے کہا "تم غلط کہہ رہی ہو خود ابو نواس نے آکر بتایا کہ اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔"

ملکہ اپنی بات پر اڑی رہی "کیا خوب! مجھے خود اس کی بیوی نے بتایا سب کے سامنے بتایا کہ ابو نواس کا انتقال ہو گیا۔"

اب تو دونوں الجھن میں پڑ گئے۔ سلطان نے اپنا نوکر ابو نواس کے گھر بھیجا اور کہا: "دیکھ کر آؤ ان دونوں میں سے کون مرا ہے۔"

نوکر لوٹ کر آیا سلطان کے سامنے ادب سے سر کو جھکایا اور بولا "عالی جاہ میں ابو نواس





کے طرح کیا تھا ابونواس بڑی طرح رو رہا تھا۔ چارپائی پر اس کی بیوی کی میت تھی بالکل بے حس و حرکت میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں۔ اس میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔"

یہ سنتے ہی ملکہ نے اپنا نوکر دوڑایا کہ صحیح صحیح خبر لائے۔ نوکر لوٹ کر آیا ملکہ اور بادشاہ کے سامنے ادب سے سر جھکایا اور بولا: "میں حکم کے مطابق ابونواس کے گھر گیا۔ اس کی بیوی بڑی طرح رو رہی تھی۔ ابونواس کی لاش بے حس و حرکت پلنگ پر پڑی تھی۔ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔"

اب تو دونوں کی الجھن اور بڑھی بادشاہ سلامت نے حکم دیا ہماری سواری لاؤ ہم خود ابونواس کے گھر جائیں گے۔

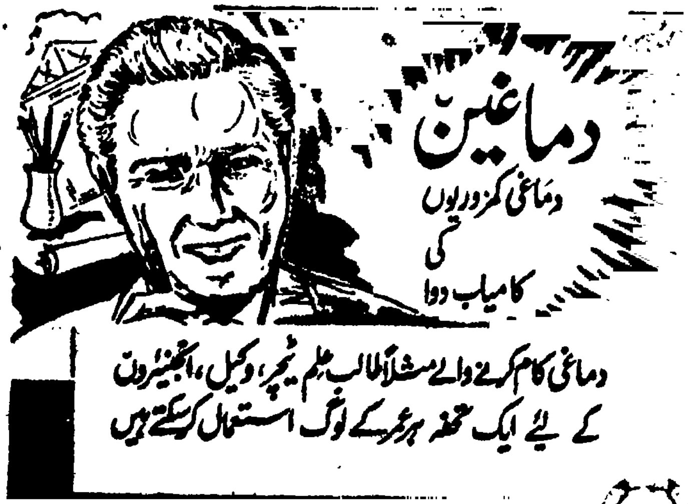
بادشاہ سلامت اور ملکہ دونوں شاہی سواری میں بیٹھ کر ابونواس کے گھر پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ابو نواس اور اس کی بیوی کی لاشیں ایک ہی پلنگ پر پاس پاس پڑی ہیں اوپر سے چادر ڈھکی ہے۔

سلطان چلا کر بولا: - دونوں مرے پڑے ہیں! بھلا یہ کیسے ممکن ہے!! جو کوئی بھی مجھے سچی سچی بات بتائے گا میں اسے ایک ہزار اشرفیاں انعام دوں گا۔"

اتنا سننا تھا کہ ابونواس صاحب اچانک اٹھ کر بیٹھ گئے اور ہاتھ بڑھا کر زور سے بولے: "سرکار ان ہزار اشرفیوں کا تو بس میں ہی مستحق ہوں۔ میرے علاوہ اور کوئی بھی ٹھیک ٹھیک بات بتا ہی نہیں سکتا۔"

بادشاہ اور ملکہ نے مسخرے ابونواس کی اس دیدہ دلیری پر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

(فائنڈنگ آوٹ)

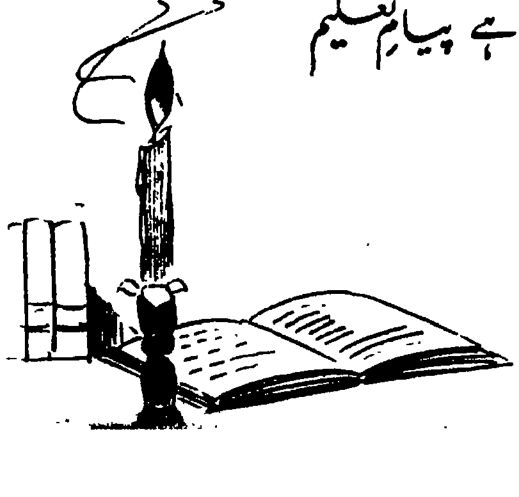
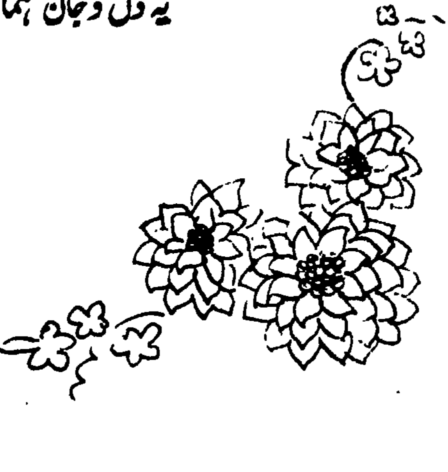


جناب نثار اعظمی

پیامِ تعلیم

کتنا دل چسپ ہے پیارا ہے پیامِ تعلیم — کس مصور نے سنوارا ہے پیامِ تعلیم
دوست ملتے ہیں، بچھڑ جاتے ہیں کیسے کیسے — ہر گھڑی دوست ہمارا ہے پیامِ تعلیم
ذہن و دل کے لیے تفریح کے ساماں اس میں — خالی وقتوں کا سہارا ہے پیامِ تعلیم
جیسے ہر ماہ نکلتا ہے نئی شان سے چاند — یوں ہی اِک ماہ کا پارا ہے پیامِ تعلیم
کتنی دل چسپ ہیں نظمیں و مضامیں اس کے — اردو پرچوں میں نیارا ہے پیامِ تعلیم
اس کو بچے ہی نہیں پیر و جواں پڑھتے ہیں — سب کی آنکھوں کا ستارا ہے پیامِ تعلیم
ہر ورق میں ہیں نصیحت کی سبق کی باتیں — ایک تعلیمی اشارا ہے پیامِ تعلیم
اس میں چھوٹے بڑے فن کار بھی لکھتے ہیں — شوق نے سب کے نکھارا ہے پیامِ تعلیم
جی میں آتا ہے کہ بس پڑھتے ہی جائیں اس کو — ایک دل چسپ نظارا ہے پیامِ تعلیم
اے پیامی! اٹھو اس کے لیے کچھ کام کرو — بند ہو؟ کب یہ گوارا ہے پیامِ تعلیم

اس کو ہر شہر میں ہر گاؤں میں پھیلانا ہے
یہ دل و جان ہمارا ہے پیامِ تعلیم

جناب مشہود مفتی

پرندوں کی چند انوکھی عادتیں



جیسے ہماری آپ کی ایک دنیا ہے ۔ چرندوں، پرندوں اور درندوں کی ایک دنیا ہے ۔ اس دنیا میں آپ کو بھانت بھانت کے پنکھ پکھیرو ۔ بھانت بھانت کے پرندے اور درندے ملیں گے ۔ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے ۔ آئیے آج ہم پرندوں کی دنیا کی کچھ انوکھی باتیں بتائیں ۔

آپ نے دیکھا ہوگا ۔ چڑیوں کے ننھے بچّوں کے جسم پر عام طور پر روئیں ہوتے ہیں لیکن رام چڑیا اور چند دوسرے ایسے پرندے بھی دنیا میں موجود ہیں ۔ جن کے جسم پر روئیں نہیں ہوتے ۔ چڑیوں کے لیے یہ کہنا کہ وہ اڑ نہیں سکتیں کیسی عجیب کیسی انوکھی سی بات لگتی ہے ۔ لیکن دنیا کے بعض پرندے سچ مچ نہیں اڑ پاتے جیسے پینگوئن، شتر مرغ ، آسٹریلیا کا ایمو وغیرہ ۔

جسامت اور وزن کے اعتبار سے اس وقت دنیا کا سب سے بڑا پرندہ شتر مرغ ہے ۔ اکثر اس کا قد آٹھ فٹ سے بھی زیادہ اور وزن تین سو پونڈ تک ہوتا ہے ۔

اس کے متعلق ایک عام روایت مشہور ہے ۔

اس کی رفتار کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ اپنی جگہ درست ہے ۔ شتر مرغ سچ مچ بہت تیز دوڑتے ہیں ۔ ان کی رفتار پچاس میل فی گھنٹہ ہوتی ہے ۔

ان کے انڈے کا وزن تین پونڈ ہوتا ہے ۔

ان کا بچہ چالیس یا پچاس دن میں انڈے سے نکلتا ہے ۔ انڈے دینے کے بعد انڈوں کو زیادہ تر نر ہی سیتا ہے ۔ مادہ کا کام ختم ہو جاتا ہے ۔

اور بھی دنیا کی سب سے چھوٹی چڑیا کی لمبائی



کل سوا دو انچ ہے ۔ انگریزی زبان میں اس ننھی چڑیا کو (Humming Bird) اور اردو میں پھدکی یا پھل سنگھی کہتے ہیں۔ اس کے بازو صرف ایک انچ کے ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ یہ پھولوں کے رس پر زندہ رہتی ہے ۔ لیکن یہ بات غلط ہے ۔ ننھے بھنگے، شہد کی مکھی اور مکڑی بھی اس کی خوراک میں شامل ہیں ۔ یہ ایک سکنڈ میں کم سے کم 75 بار اپنے پروں کو پھڑپھڑاتی ہے۔ اس کے اڑنے کی رفتار شتر مرغ کے دوڑنے کی رفتار سے کم نہیں ہوتی۔ یعنی پچاس میل فی گھنٹہ ۔

امریکہ میں یہ چڑیا سردیوں کے موسم میں وسط امریکہ کی طرف نکل جاتی ہے۔ وسط امریکہ تک پہنچنے کے لیے یہ پانچ سو میل کا سفر کرتی ہے کہیں ٹھہرتی نہیں مسلسل اڑتی رہتی ہے ۔

الٹے قدموں واپس ہونا آپ نے سنا ہے۔ یہ چڑیا الٹے پروں واپس آتی ہے ۔ بہت بڑے پھولوں کے اندر یہ اڑتی اڑتی داخل ہوتی ہے۔ چونچ سے کھانے کے دوران اس کے پر پھڑپھڑاتے رہتے ہیں اور یہ جیسے ہوا میں لٹکی رہتی ہے۔ اور اسی طرح پر پھڑپھڑاتے پھڑپھڑاتے یہ الٹی ہو کر پھول سے باہر نکلتی ہے ۔ یعنی پہلے دم نکلتی ہے، پھر پیٹ کا حصہ اور پر، سر بعد میں نکلتا ہے ۔

لگ بھگ سبھی چڑیاں اپنے اپنے گھونسلے بنا کر رہتی ہیں ۔ انھی میں انڈے دیتی ہیں۔ اور انھی میں [illegible]

چڑیوں کے گھونسلوں میں انڈے دے آتی اور ان انڈوں سے جو بچے نکلتے ہیں ان گھونسلوں کی چڑیاں ان بچوں کی پرورش کرتی ہیں

کاؤ برڈ اسی قسم کی چڑیا ہے ۔ یہ چڑیا فطرتاً بہت کاہل ہے ۔ اس کا رنگ کالا ہوتا ہے ۔ دیکھنے میں گندی معلوم ہوتی ہے ۔ خوراک کی تلاش میں یہ چڑیا کھیتوں سے آگے نہیں بڑھتی ۔ بیلوں کے پیچھے چلتی ہے اور ان کے کھروں سے کھرچی ہوئی زمین کے اندر سے نکلے ہوئے کیڑے مکوڑوں کو کھا کر آسودہ ہو جاتی ہے۔

ان چڑیوں کا جوڑا ایک ساتھ نہیں رہتا ۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتے ہیں۔ انڈے دینے کے وقت یہ چڑیا دوسری چھوٹی چڑیوں کے ایسے گھونسلے کی تلاش کرتی ہے جن میں انڈے ہوں اور اس وقت اس میں گھونسلے کی چڑیا موجود نہ ہو۔ ایسے گھونسلے میں یہ انڈے دے کر اڑ جاتی ہے ۔ انڈے گھونسلے کے دوسرے انڈوں میں مل جاتے ہیں ۔

اگر اتفاق سے گھونسلے میں چڑیا موجود ہو تو یہ قریب کی جھاڑیوں اور پیڑ کے پتوں میں چھپ کر گھونسلا خالی ہونے کا انتظار کرتی ہے ۔ اور جب چڑیا گھونسلے سے اڑ جاتی ہے تو یہ اس کے گھونسلے میں انڈے دے آتی ہے۔

اگر اتفاق سے کوئی گھونسلا خالی نہیں ملتا تو وہ زمین پر اپنا انڈا گرا دیتی ہے۔ گھونسلوں کے دوسرے انڈوں سے اس کا انڈا بڑا ہوتا ہے ۔ رابن کے گھونسلوں میں یہ خاص طور سے انڈے دیتی ہے ۔

ننھی چڑیا جب اپنے گھونسلے میں انڈوں پر بیٹھتی ہے تو اسے انڈوں میں کسی زیادتی کا ہلکا سا احساس ہوتا ہے۔ لیکن تھوڑے پس و پیش کے بعد وہ مطمئن ہو کر انڈوں کو سینا شروع کر دیتی ہے۔

جب انڈوں سے بچے نکلتے ہیں تو ننھی چڑیا کا ننھا دماغ یہ اندازہ نہیں کر پاتا کہ ایک بچہ دوسروں سے کہیں بڑا ہے۔ وہ ان کو بھرانا شروع کرتی ہے۔ اور دن بھر بھراتی رہتی ہے۔ بچے چونچیں کھولتے ہیں لیکن ان میں ایک چونچ سب سے زیادہ بھوکی دکھائی دیتی ہے اور یہ دوسری چونچوں کے آگے اور اوپر رہتی ہے۔ چڑیا اسی چونچ کو زیادہ بھراتی ہے۔ دوسرے بچے بھوکے رہ کر کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بڑا بچہ چھوٹے اور کمزور بچوں کو ڈھکیلتا ڈھکیلتا گھونسلے کے کنارے پرے آتا ہے اور بچے نیچے گر کر ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر گھونسلے میں تنہا رہ کر یہ بچہ بڑھتا رہتا ہے ور ایک دن خود اُڑ جاتا ہے۔

لیکن دوسری چڑیوں کو اگر اپنے گھونسلے ں اپنے نیلے انڈوں کے درمیان کوئی دھبے والا انڈا ائی دیتا ہے تو وہ چیخ پڑتی ہیں اور غصے سے پاگل راس انڈے کو چونچ سے پھوڑ ڈالتی ہیں۔ لیکن زرنگ کی Zwan Bler اس انڈے کو اپنے نسلے میں ہی دفن کر دیتی ہے۔

کاؤبرڈ کا انڈا اپنے گھونسلے میں دیکھ کر ں انڈے پر اور اپنے انڈوں پر ایک دوسری نا بنا لیتی ہے اور پھر نئے سرے سے انڈے دیتی ہے۔ پرانے انڈے اس چھت کے نیچے دب کر ختم ہو جاتے ہیں۔

عام طور سے جب مادہ چڑیا انڈے سیتی ہے تو نر گھونسلے کی نگرانی کرتا ہے۔ اور مادہ کے لیے خوراک مہیا کرتا ہے۔ مادہ کے انڈے سینے کے دوران جنگی عقاب جب مادہ کے لیے خوراک لاتا ہے تو گھونسلے کے پاس نہیں جاتا۔ گھونسلے سے تھوڑے فاصلے پر رک کر مدہم آواز میں مادہ کو پکارتا ہے۔



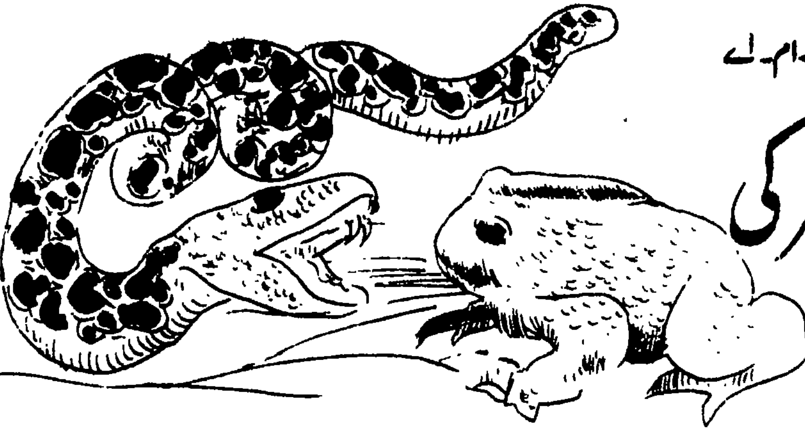
مادہ HORN BILL دھنیل یا دھنیش

اس وقت تک اپنے ٹھکانے سے باہر نہیں نکلتی جب تک بچے ٹھیک نہیں ہو جاتے۔ یہ چڑیا درختوں کی کھوہ میں انڈے دیتی ہے۔ نر کھوہ کے سامنے ایک دیوار اٹھا کر مادہ کو اس کے اندر قید رکھتا ہے۔ دیوار میں صرف اتنا سوراخ ہوتا ہے کہ مادہ اپنی چونچ باہر نکال سکے۔ اس سوراخ کے ذریعے نر اپنی مادہ کو کھانا پہنچاتا رہتا ہے۔ جب انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں تو نر بچوں کو اسی طرح قید رکھ کر ان کی پرورش کرتا ہے۔

(باقی آئندہ)

جناب رفیق شاستری۔ ایم۔ اے

پنچ تنتر کی کہانیاں



تب بندر نے مگرمچھ کو گنگادت مینڈک کی یہ کہانی سُنائی:۔

"ایک کنویں میں گنگادت نام کا ایک مینڈک رہتا تھا۔ وہ اپنے غول کے مینڈکوں کا سردار تھا۔ ایک دن وہ اپنے غول کے مینڈکوں کی کسی حرکت سے ناراض ہو کر کنویں سے باہر آگیا اور سوچنے لگا کہ اس کا بدلہ وہ کیسے لے۔

یہ سوچتا ہوا وہ ایک سانپ کے بل تک آگیا بل میں ایک کالا سانپ رہتا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ اس سانپ سے کہا جائے کہ وہ مینڈکوں کے اِس پورے غول کا صفایا کر دے۔ اس نے سوچا کہ دشمن سے دشمن کی کاٹ کرانا بڑی مصلحت کی بات ہوتی ہے، ویسے ہی جیسے کانٹے سے کانٹا نکالا جاتا ہے۔

یہ خیال آتے ہی وہ بل کے اندر گھس گیا اور سانپ کو اس کا نام لے کر پکارنے لگا۔ سانپ یہ عجیب آواز سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ "یہ آواز میرے کسی دوست کی تو ہو نہیں سکتی، تو پھر یہ کون بل میں گھسا آرہا ہے" اس نے سوچا کہ جب تک کسی کی عادت، چال چلن اور اخلاق وغیرہ کا حال معلوم نہ ہو اُس سے الگ ہی الگ رہنا چاہیے۔ اُسے خیال آیا کہ کہیں یہ کسی سپیرے کی چال نہ ہو اور اس نے مجھے پکڑنے کا یہ نرالا ڈھنگ نکالا ہو۔ وہ بل کے اندر تھوڑا اور کھسک گیا اور وہیں سے بولا:۔

"کون ہے بھائی مجھے کیوں بلا رہے ہو؟"

مینڈک بولا:۔

"میں ہوں گنگادت مینڈکوں کا سردار، تم سے دوستی کرنے تمہارے دروازے پر آیا ہوں۔"

سانپ بولا:۔

"بھلا یہ بھی کیا بات ہوئی کہ مینڈک سانپ سے دوستی کرنے آئے۔ یقین نہیں آتا کہیں آگ اور گھاس میں دوستی ہو سکتی ہے۔ کھانے والے کی بھلا نوالے سے کیا دوستی۔ کہیں شکاری اور شکار میں بھی دوستی ہوئی ہے۔"

گنگادت بولا:۔

"بھائی، تم ٹھیک کہتے ہو، مگر پہلے میری پوری

بات تو سنو! میں مینڈکوں کا سردار ہوں۔ میرے غول کے مینڈکوں نے میرے ساتھ بُرا سلوک کیا ہے۔ میں انھیں اس کا مزہ چکھانا چاہتا ہوں۔ میں ان سب سے بدلہ لینے کے لیے تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں ۔۔" سانپ بولا:

"مگر تم رہتے کہاں ہو؟" مینڈک بولا:۔

"کنوئیں میں"

سانپ نے دریافت کیا: کنواں پکّا ہے یا کچّا، پکّے کنوئیں میں مَیں کیسے اُتروں گا اور کیسے بل بناؤں گا"

مینڈک نے جواب دیا: "بھائی! آپ اس کی فکر نہ کریں یہ سب میں کرا دوں گا۔ اس کنوئیں میں پہلے ہی سے بل بنا ہوا ہے وہاں بیٹھ کر تم آرام سے مینڈکوں کو کھا سکتے ہو"

سانپ بوڑھا ہو چلا تھا۔ پیٹ بھرنے کے لیے مشکل سے شکار کر پاتا تھا اس نے سوچا بوڑھاپے میں بغیر دوڑ بھاگ کے اس طرح شکار کرنے میں بڑا مزہ رہے گا۔ وہ مینڈک کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا اور گنگا دت کے پیچھے پیچھے کنوئیں کی طرف چل پڑا۔

بوڑھے سانپ نے دھیرے دھیرے اُن تمام مینڈکوں کا صفایا کر دیا جن کی گنگا دت سے دشمنی تھی جب ایسے تمام مینڈک ختم ہو گئے تو بوڑھے سانپ نے گنگا دت سے کہا:

"بھائی گنگا دت جتنے مینڈک تمھارے دشمن تھے میں ان سب کا صفایا کر چکا ہوں، اب میرے پیٹ بھرنے کے لیے کیا انتظام سوچا ہے؟" گنگا دت نے جواب دیا۔

"اب یہی ہو سکتا ہے کہ جس راستے ہم تمھیں لائے تھے اسی راستے ہم تمھیں پرانے بل تک پہنچا دیں۔ تم وہاں پہلے کی طرح آرام سے رہنا اور مزے کرنا"

بوڑھا سانپ بولا: "اب میں وہاں کیسے رہ سکتا ہوں۔ اس بل پر تو اب کسی اور سانپ کا قبضہ ہو چکا ہوگا"

گنگا دت بولا: "تو پھر کیا کیا جائے" بوڑھا سانپ بولا:

"بس یہ کیا جائے کہ تم روزانہ میرے لیے ایک مینڈک بھیج دیا کرو۔ نہیں تو میں ایک ہی وار میں سب مینڈکوں کو صاف کر دوں گا"

گنگا دت کو اب اپنی بھول کا احساس ہوا جو اپنے سے زیادہ طاقت ور دشمن کو دوست بناتا ہے اس کی یہی حالت ہوتی ہے۔ مجبوراً اس نے یہی فیصلہ کیا کہ جو مینڈک بچ رہے ہیں ان میں سے باری باری ایک ایک کو بھیجوں گا۔ جب سب کچھ لٹ رہا ہے اس وقت آدھا بھی بچا لینا غنیمت ہے۔

دوسرے دن سے سانپ نے دوسرے مینڈکوں کو بھی چٹ کرنا شروع کیا اور دھیرے دھیرے سارے مینڈکوں کا خاتمہ ہونے لگا۔ ایک دن سانپ نے گنگا دت کے لڑکے پر بھی ہاتھ صاف کر دیا۔ گنگا دت اپنے بچے کے غم میں رو پڑا۔ اُسے روتا دیکھ کر اس کی بیوی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی:۔

"اب رونے سے کیا فائدہ؟ جو اپنے بھائی بندوں کو برباد کراتا ہے وہ ایک دن خود بھی برباد ہو جاتا ہے۔ اپنے عزیز و اقارب ہی نہیں رہیں گے تو پھر کون ہماری مدد کو آئے گا۔"

اگلے دن بوڑھے سانپ نے گنگا دت کو بلا کر کہا:

"میں بھوکا ہوں، اس کنویں کے مینڈک تو سب ختم ہو چکے ہیں اب تم میرے کھانے کا کوئی اور انتظام کرو۔"

گنگا دت کو ایک ترکیب سوجھی اس نے سانپ سے کہا کہ اس کنویں میں تو اب ایک بھی مینڈک نہیں رہا اب میں دوسرے کنویں سے مینڈکوں کو بلا کر لاتا ہوں تب تک تم یہیں بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔

بوڑھا سانپ مینڈک کی بات سے بہت خوش ہوا اور کہنے لگا: "بھائی گنگا دت تم میرے بھائی ہو اس لیے میں تمھیں نہیں کھا سکتا۔ اگر تم دوسرے کنوؤں سے میرے لیے مینڈک لا دیا کروگے تو میں تمھاری باپ کے برابر عزت کرنے لگوں گا۔"

گنگا دت موقع پاتے ہی کنویں سے باہر نکل آیا پھر بہت دن اس کنویں کا رخ نہیں کیا۔ بوڑھا سانپ اس کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ جب بہت دن گزر گئے تو اس نے پاس کے بل میں رہنے والی گوہ سے کہا۔

"تم باہر جا کر گنگا دت کو ڈھونڈو اور جہاں کہیں ملے تو اُسے میرا یہ پیغام دو کہ اگر دوسرے مینڈک اس کنویں میں آنا پسند نہیں کرتے تو اس کے لیے زیادہ پریشان نہ ہو اور کنویں میں واپس چلے آؤ۔ تمھارے بغیر میرا دل نہیں لگتا۔"

گوہ باہر نکل کر گنگا دت کو ڈھونڈنے لگی اور ایک دن ایک تالاب کے کنارے اُسے پا لیا اور اس سے بولی:۔

ارے گنگا دت تمھارا دوست وہ بوڑھا سانپ کنویں میں بیٹھا کب سے تمھارا انتظار کر رہا ہے تمھارے بغیر اس کا دل نہیں لگتا۔ چلو ذرا اس کے دل کو تسلی دے آؤ بے چارہ بہت اداس رہتا ہے۔

گنگا دت نے کہا۔ نہیں اب تو میں وہاں کبھی قدم بھی نہیں رکھوں گا۔ اس دنیا میں بھوکے آدمی کا کوئی بھروسا نہیں۔ تم بوڑھے سانپ سے کہہ دینا کہ اب میں وہاں کبھی واپس نہیں جاؤں گا۔"

یہ کہانی سنانے کے بعد بندر نے مگرمچھ سے کہا کہ میں بھی گنگا دت کی طرح اب کبھی تمھارے ساتھ واپس نہیں چلوں گا۔ مگرمچھ آنکھوں میں آنسو بھرے روتے ہوئے بولا

"ارے دوست یہ کیا کہہ رہے ہو، غضب ہو جائے گا میں تو تمھاری عزت اور خاطر کر کے اپنے کالے کرتوتوں کا بدلہ کرنا چاہتا ہوں اگر تم میرے ساتھ نہیں چلوگے تو میں یہیں بھوک سے جان دے دوں گا۔"

بندر بولا: "اے احمق میں اس لمبے کان والے گدھے جیسا بے وقوف نہیں ہوں جو ایک بار بچ کر بھی پھر خود موت کے منہ میں جا پڑوں۔" مگرمچھ نے پوچھا "وہ کیا؟"

تب بندر نے مگرمچھ کو گدھے کی یہ کہانی سنائی:۔

باقی نومبر کے پیام تعلیم میں

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابن بطوطہ

کات

چھوٹا سا خوب صورت شہر ہے۔ ہم شہر کے باہر ایک تالاب کے کنارے پر اترے جس کا پانی سردی سے جما ہوا تھا لڑکے اس پر دوڑ رہے تھے اور پھسل رہے تھے۔ کات کے قاضی کو ہماری خبر پہنچی تو وہ اور شیخ محمود الخیومی ملنے آئے پھر قاضی واپس گئے اور امیر شہر کو لائے جس نے ہماری شاندار دعوت کی۔ دعوت میں فوجی افسر بھی شریک تھے۔

امیر نے مجھے ایک جوڑا اور عمدہ گھوڑا دیا اور ہم کات سے رخصت ہوگئے پھر چھ راتیں ایک ایسی سرزمین سے ہو کر جہاں نہ چارہ تھا نہ پانی تھا گزرے۔ یہاں سے بخارا فقط ایک دن کا راستہ ہے، ہر طرف باغ اور میوے کے درخت تھے جن کے بیچ نہریں بہتی تھیں۔

یہاں پھلوں میں سے عجیب آلو ہے جسے سکھاتے ہیں اور ہندوستان اور چین تک لے جاتے ہیں یعنی آلو بخارا / تازہ کھایا جائے تو میٹھا ہوتا ہے سوکھنے پر ترش ہو جاتا ہے۔ یہ میوہ بخارا کے سوا میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ بخارا کی شہرت امام المحدثین ابو عبداللہ بن محمد اسماعیل بخاری کے نام کے سبب ہوئی۔ کسی زمانے میں یہ شہر پایۂ تخت تھا، اب ویران ہے۔ اس کی مسجدیں۔ بازار سب ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہوگئے ہیں۔ چنگیز خاں نے اسے برباد کر دیا۔ اور جب تک دنیا کی تاریخ باقی ہے ظالموں کی فہرست میں چنگیز خاں کا نام باقی رہے گا۔

حضرت امام بخاری کے مرقد پر میری حاضری ہوئی۔ قبر پر کتبہ لگا ہوا تھا۔

"یہ محمد بن اسماعیل بخاری کی قبر ہے جن کی تصنیفات یہ ہیں:"

نیچے تمام تصنیفات کا نام تھا۔ بخارا کے دوسرے علماء کی قبریں اور ان کی تصنیفات کی یادداشت میں نے لکھی تھی۔ ہندوستان کے بحری سفر میں لٹیروں نے سامان لوٹا تو وہ یادداشت بھی ضائع ہوگئی۔

بخارا سے نخشب گئے اور مولانا حسام الدین یاغی سے ملاقات ہوئی۔

سلطان ماوراء النہر: ماوراء النہر کا سلطان جسکا

تمام طرمشیری ہے بڑا عادل اور صاحبِ مرتبہ انسان ہے۔
اس کی فوجی قوت بھی بہت مضبوط ہے۔ شاہِ ہند
سلطانِ عراق۔ سلطان اوزبک خاقان چین اسے ہدیئے
بھیجتے ہیں اور اس کی دولت وشوکت سے متاثر ہیں۔
اس کے بھائی کا نام کبک ہے یہ مسلمان نہیں ہے شاہ
کبک کا ایک لطیفہ بڑا دلچسپ ہے۔

اس نے ایک مرتبہ اپنے شہر کے عالم کو بلایا جن کا نام بدرالدین المیوانی تھا بڑے واعظ تھے۔ شاہِ کبک ان سے کہنے لگا:۔

"مولانا آپ کا دعویٰ ہے کہ قرآن پاک میں ہر چیز کا ذکر ہے بتائیے میرا نام بھی ہے یا نہیں؟"

مولانا نے برجستہ جواب دیا۔ ارشادِ باری ہے:۔

"فِی اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ"

دیکھ لیجیے کبک موجود ہے۔ اس دن سے شاہِ کبک مولانا کی اور مسلمانوں کی عزت کرنے لگا۔

اسی کا ایک لطیفہ یہ ہے کہ دربار میں کسی عورت نے آکر فریاد کی کہ فلاں امیر نے زبردستی مجھ سے دودھ چھین کر پی لیا اور میرے بچے بھوکے رہ گئے ہیں۔ کبک نے کہا میں ابھی امیر کا پیٹ کسواتا ہوں۔ اگر دودھ نکلا تو ایسی سزا دوں گا کہ یاد کرے گا۔"

ہر چند عورت نے کہا میں نے دودھ معاف کیا اور حلال کر دیا اور اب کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ مگر بادشاہ نے امیر کا پیٹ کسوایا اور دودھ نکل پڑا تو سزا دی۔

یہ بات بیچ میں آگئی ذکر سلطان ماوراء النہر کا ہو رہا تھا۔

میں چھاؤنی میں ٹھہرا ہوا تھا ایک دن صبح کی نماز کے بعد مسجد میں کسی نے مجھ سے کہا۔ سلطان مسجد میں ہے۔ میں نے دیکھا تو وہ مصلّے پر بیٹھا تھا۔ اُٹھا تو میں سلام کے لیے آگے بڑھا شیخ حسن اور فقیہ حسام الدین الیاغی نے میرا تعارف کرایا۔ سلطان ترکی میں بولا۔

"آپ بخیریت ہیں تندرست ہیں آپ کا تشریف لانا مبارک"۔

مسجد سے دربار جانے لگا تو پیادہ پا تھا راستہ میں ضرورت مند اپنی اپنی ضرورتیں بتاتے جاتے تھے اور فریادی دکھ درد سناتے جاتے تھے۔ جب کوئی شکایت کرتا تو سلطان غور سے سنتا۔ امیر غریب، عورت مرد سب کے لیے اجازت تھی۔ نہ اکتاتا تھا نہ جھڑکتا تھا شاہی خیمہ میں پہنچ گیا تو مجھے طلب کیا۔ بادشاہ کرسی پر بیٹھا تھا جس پر ریشم کا غلاف چڑھا تھا۔ سر سے ایک گز اونچا یاقوت سے مرصع تاج لٹکا ہوا تھا۔ دائیں بائیں امراء بیٹھے تھے سامنے شہزادے تھے جن کے ہاتھوں میں سونے کے گرز تھے شاہی خیمہ کے دروازے پر نائب وزیر سکریٹری اور صاحب العلّامہ تھے میں اندر گیا تو چار عہدہ دار جن میں صاحب العلّامہ تھے میرے ساتھ ہو گئے صاحب العلّامہ میرے اور بادشاہ کے درمیان ترجمان تھے۔

بادشاہ نے مجھ سے مدینہ منورہ۔ مکہ مکرمہ بیت المقدس، مدینۃ الخلیل۔ مصر۔ دمشق۔ ملک الشام اور شاہانِ عراق کے حالات پوچھے۔

ظہر کی نماز کا وقت آیا تو بادشاہ اٹھا نماز میں میرا اور بادشاہ کا ساتھ رہا۔ شدید سردی کا موسم تھا مگر بادشاہ روزانہ عشاء اور صبح کی نماز مسجد میں پڑھتا تھا۔ صبح کی نماز کے بعد سورج کے طلوع تک وظائف پڑھتا رہتا تھا۔ نمازی آتے تھے تو ہر ایک سے گرم جوشی سے مصافحہ کرتا تھا۔ کھجور اسے بہت پسند تھی اگر کوئی ہدیتاً کھجور لاتا تو اسے قبول کر لیتا اور نمازیوں کو تقسیم کر دیتا۔

"ایک واقعہ ایسا ہے جس سے
نصیحت حاصل کرنی چاہیے۔"

ایک مرتبہ شاہی غلام بادشاہ کا مصلّٰی لے کر آیا اور جس جگہ بادشاہ نماز پڑھا کرتا تھا بچھا دیا۔ امام حسّام الدین یاغی سے کہا۔ سلطان وضو فرما رہے ہیں ذرا تاخیر فرمائیے

امام نے جواب دیا۔ نماز خدا کی ہے بادشاہ کی نہیں ہے اور موذّن سے کہا تکبیر پڑھو سلطان آیا تو دو رکعتیں ہو چکی تھیں بادشاہ سب سے پیچھے کھڑا ہو گیا نماز ختم ہو گئی تو امام سے مصافحہ کیا اور محراب کے سامنے بیٹھ کر مجھ سے ہنس کر کہا۔

"وطن جانا تو لوگوں کو بتانا کہ ایک عجمی درویش نے خدا کے حکم کے سامنے سلطان ترک کی پرواہ نہ کی تھی۔"

"شیخ ہر جمعہ کو وعظ کہتا ہے اور بادشاہ کو بھی باتیں کرنے کی رغبت اور بُری باتوں سے نفرت ایسے انداز پر دلاتا ہے کہ بادشاہ پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور رو پڑتا ہے۔ بادشاہ اسے کچھ دینا چاہتا ہے تو انکار کر دیتا ہے نہ اس کا کھانا کھاتا ہے۔ جب کبھی میں نے شیخ کو دیکھا بدن پر ایک پھٹے ہوئے روئی کے چوغے کے سوا کچھ نہ دیکھا۔ اور جب ایک دن میں نے کہا آپ کا لباس بہت شکستہ ہو گیا تو بولے۔ یہ چوغہ میں نے اپنے لڑکے سے مانگ لیا ہے پچاس سال ہو گئے ہیں خدا سے میں نے عہد کیا ہے کہ کبھی کسی سے کچھ نہ لوں گا۔ کسی سے لیتا تو تم سے لے لیتا۔

جب میں یہاں سے رخصت ہونے لگا تو سلطان نے سات سو سونے کے سکّے دیے ایک سمور کا چوغہ دیا جس کی قیمت ایک سو اشرفی سے کم نہ تھی۔ دو گھوڑے دیے اور دو اونٹ ہندوستان پہنچنے کے دو سال بعد مجھے معلوم ہوا کہ بھائی نے اس کے خلاف بغاوت کی اور حکومت چھین لی۔

سمرقند ایک وادی کے کنارے پر آباد ہے بہت خوب صورت شہر ہے۔ اگرچہ شہر کا بڑا حصّہ ویران ہے مگر پھر بھی سمرقند کے محلّات دیکھنے کے قابل ہیں۔ سمرقند والوں کے عادات و اخلاق شریفانہ اور کریمانہ ہیں پردیسیوں سے محبّت کرتے ہیں۔

سمرقند کے باہر قثم ابن عبّاس رضی اللہ عنہ کا مزار مبارک ہے۔ یہ شہر ان ہی کے ہاتھ پر فتح ہوا ہے۔

ہماری امّی ۔

محترمہ سلمیٰ جاوید (پٹنہ)



بھلائی کا بدلہ

(اودھ کی ایک لوک کہانی)

بڑی بوڑھیاں دن کے کام سے چھٹی پاکر رات کو آرام کرنے اپنے بستر پر لیٹتی ہیں تو اب بھی ان کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی پوتیاں، پوتے اور پر پوتے جمع ہو کر دادی اماں اور نانی اماں کی رٹ لگا کر کہتے ہیں کہ "گیدڑ اور کتے والی" کہانی سنائیے اور نانی اماں یا دادی اماں اپنے پوپلے منہ، لرزتی آواز اور تھرتھراتی زبان سے ٹھہر ٹھہر کر یوں کہانی شروع کرتی ہیں ۔

کہانی جیسی جھوٹی اور شکر جیسی میٹھی کہ سننے والے کو عذاب اور کہنے والے کو ثواب ۔

بہت پرانے زمانے کی بات ہے اتنے پرانے زمانے کی بات ہے کہ گیدڑ آبادی میں اور کتے جنگلوں میں رہا کرتے تھے ۔ کہتے ہیں کہ جب کتے کبھی آبادی میں آتے اور گیدڑوں سے ملاقات ہوتی تو گیدڑ ان کتوں کی بڑی آؤ بھگت کرتے ۔ ان کو طرح طرح کی پکی ہوئی چیزیں کھلاتے، بھنا ہوا گوشت کھلاتے، تیز چٹ پٹی ترکاریاں کھلاتے، مٹھائیاں کھلاتے، صراحیوں کا ٹھنڈا پانی پلاتے، دودھ پلاتے ۔ کتے ان سب چیزوں کو کھا کر بڑا اچنبھا محسوس کرتے ۔

یہ بے چارے تو جنگلوں میں رہتے تھے ۔ ان کے پاس یہ سب چیزیں کہاں سے آتیں ۔ وہ تو گرا پڑا اور مرا ہوا کوئی جانور مل جاتا تو اس کا گوشت کھا جاتے تھے ۔ کوئی جنگلی پھل آسانی سے زمین پر انھیں پڑا مل جاتا تھا تو اسے کھا لیتے تھے ۔ پورے پیٹ تو انھیں کبھی کھانے کو ملتا ہی نہ تھا ۔ کبھی آدھا پیٹ، کبھی چوتھائی اور کبھی کبھی بالکل ہی فاقہ ۔ پانی بھی بڑا خراب ملتا تھا ۔ جوہڑوں اور تالابوں کا سڑا ہوا گدلا پانی، اسی کو پی کر کسی نہ کسی طرح جیتے تھے ۔ بالکل دبلے پتلے مریل اور بیمار ۔ بڑی مشکل سے دوڑا جاتا تھا ۔ بدن میں طاقت ہی کہاں تھی جب گیدڑوں سے ملاقات ہوتی اور ان کے اس طرح کے ٹھاٹھ باٹھ، کھانے پینے کی

چیزوں کو دیکھتے، بڑھیا بھنا ہوا گوشت دیکھتے، صاف ستھرا پانی دیکھتے آرام سے رہنے کی جگہوں کو دیکھتے تو منھ میں پانی بھر آتا۔ سب مل کر سوچتے کہ ہم بھی اسی طرح کی آرام والی جگہوں کو کسی طرح سے پا جاتے۔

ایک بار کچھ کتے گیدڑوں سے ملنے آئے۔

گیدڑوں نے بڑی خاطر کی، اچھی سے اچھی چیزیں کھانے اور پینے کے لیے سامنے لا رکھیں۔ مگر ان سبھوں نے کسی چیز کو بھی منھ نہ لگایا۔ گیدڑ بڑے حیران ہوئے۔

"کھاؤ بھائی یہ سب چیز شوق سے کھاؤ" گیدڑوں نے کہا۔

"کیا کہیں بھائی کوئی چیز بھی ہم سے کھائی نہیں جاتی" کتے بولے۔

"کیوں! کیا اس میں سے آپ لوگوں کو کچھ بھی پسند نہیں ہے" ایک گیدڑ نے کہا۔

"پسند کیوں نہیں ہے۔ مگر بھائی ہم سب بہت بیمار ہیں اور ہم سے کوئی چیز بھی کھائی نہیں جاتی" ایک کتا بولا۔

"کیا آپ سبھی بیمار ہیں" ایک گیدڑ نے پوچھا۔

"ہاں یہی تو بات ہے۔ اس بیماری سے ہماری پوری قوم پریشان ہے" ایک کتے نے کہا۔

"تو آپ اپنا علاج کیوں نہیں کراتے کسی سیانے سے" گیدڑ بولا۔

"کیا بتائیں بھائی ہمارے یہاں کوئی بھی سیانا اور علاج کرنے والا نہیں ہے" کتے نے افسوس سے کہا۔

"ہمارے یہاں تو بہت سارے سیانے اور علاج کرنے والے ہیں، جھاڑ پھونک کرنے والے ہیں" ایک گیدڑ بولا۔

"بھائی یہ تو اپنی اپنی قسمت کی بات ہے" کتے نے روندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو آپ سب یہیں آ کر اور رہ کر علاج کرا لیجیے" کئی گیدڑوں نے کہا۔

"دوستو! ہم سب یہاں علاج کے لیے چلے آئیں گے اور علاج میں وقت لگے گا۔ ایسے میں ہم سب کو خطرہ ہے کہ باہر سے کوئی آ کر جنگل میں ہمارے سارے سامان پر قبضہ کر لے اور ہم لوٹ کر جائیں تو ہمیں وہاں کچھ نہ ملے" کتوں نے کہا۔

"ہاں اس کا ڈر تو ضرور ہے" ایک گیدڑ بولا۔

ایک ہوشیار کتے نے کہنا شروع کیا۔

"بھائی آپ سب بھی ہماری ہی برادری کے ہیں اور محبت کرتے ہیں، دکھ درد کو سمجھتے ہیں کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ۔۔۔۔" یہاں پر وہ رک گیا۔

"کیا نہیں ہو سکتا۔ اور ہم سب آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں، بتائیے" ایک گیدڑ بولا۔

"مجھے شرم معلوم ہوتی ہے۔ آپ سب اتنے ہمدرد ہیں اور اس کے لیے آپ کو تکلیف دوں"

"ارے بھائی ہمدردوں ہی کو تو تکلیف دی جا سکتی ہے" گیدڑ نے کہا۔

"تو اگر ایسا ہو جاتا کہ صرف تھوڑے دنوں کے لیے آپ سب ہماری جگہوں پر چلے جاتے۔ وہاں بھی

کوئی تکلیف نہیں ہے۔ کھانے کو پھل ہیں، ترکاریاں ہیں۔ گھومنے اور سیر کرنے کو لمبے چوڑے میدان ہیں۔ رہنے کو ٹھنڈی ٹھنڈی گھاٹیاں ہیں۔ پینے کو چشموں کا ٹھنڈا میٹھا پانی ہے۔ بس صرف اس غرض سے کہ ہمارے سامان کی آپ کی وجہ سے حفاظت رہے گی، کوئی دوسرا قبضہ نہ کر سکے گا۔ ہم سب بس علاج کرا کے واپس آجائیں گے۔ اور آپ سب اپنی جگہ آجائیے گا۔" ایک کتا خوب سمجھا کر بولا۔

"ویسے ہم کو آبادی میں رہنا کوئی زیادہ پسند نہیں۔ مگر مشکل یہی ہے کہ ہماری بیماری کا علاج یہیں پر ہوتا ہے چند دن بیماری کے ہم کسی نہ کسی طرح کاٹ لیں گے۔ پھر آپ سب واپس آجائیے گا۔" ایک بڑا کائیاں کتا بولا۔

"یہ کوئی مشکل بات تو نہیں ہے، دوستی میں کیا کچھ نہیں کیا جاتا اور پھر دوستوں ہی سے امید بھی رکھی جاتی ہے۔" تیسرا کتا بولا۔

"ہاں کوئی مشکل بات تو نہیں ہے، ہم سب آپ کے لیے اتنی بات کر سکتے ہیں۔ جیسے ہی علاج کے بعد آپ سب ٹھیک ہوں ہم کو بتلا دیں۔" ایک گیدڑ نے کہا۔

"بے شک بے شک، جیسے ہی ہمارا علاج ختم ہوا ہم سب آجائیں گے اپنی اپنی جگہ پر۔" کتے بولے۔

ایک شام کو جنگل سے آبادی کی طرف تمام کتے پلے اور کتیاں آرہی تھیں اور دوسری طرف گیدڑ گیدڑیاں اور ان کے بچے جنگل کو جا رہے تھے۔

اب جب کبھی گیدڑوں کا آنا آبادی میں ہوتا تو وہ دیکھتے کہ کتے خوب پھول پھول کر موٹے ہو رہے ہیں اور خود ان کی حالت خراب اور پتلی ہو رہی ہے۔ کتے کہتے: "ہاں ہاں بھائی آپ سب کی وجہ سے ہمارا علاج بڑا اچھا چل رہا ہے۔ سیانے نے کہا ہے کہ بہت جلد تم کو چھٹی مل جائے گی۔ جیسے ہی چھٹی ملی ہم سب اپنی جگہوں پر آجائیں گے۔ آپ اطمینان رکھیں۔"

ادھر گیدڑوں کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ بھوک سے ادھ موئے ہو رہے تھے۔ اس وقت سے روز ہی شام کو وہ آبادی کے قریب میں آکر کہتے ہیں۔

ہوا۔ ہوا۔ (یعنی علاج ختم ہوا۔)

اور کتے ادھر سے گلا پھاڑ کر چلاتے ہیں:

"ونہہ، ابھی نہ، نہہ ابھی نہ۔" (بھوں بھوں بھوں، یعنی علاج ابھی ختم نہیں ہوا۔)

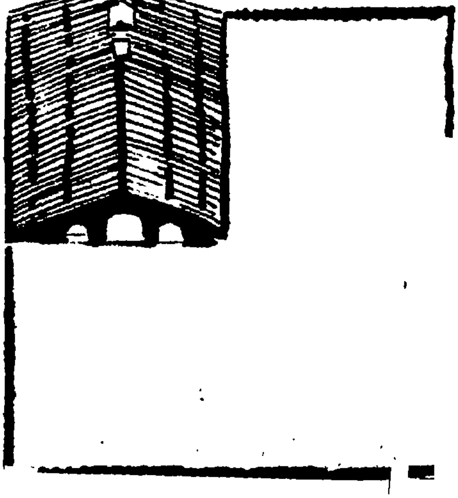
اگر کوئی بھولا بسرا گیدڑ آبادی میں چلا آتا ہے تو مسٹنڈے کتے دوڑ پڑتے ہیں اور رگیدتے ہوئے اس کو جنگل کی طرف لے آتے ہیں۔

جناب جمشید اشرف

دماغی ورزش



شہر میں ایک دکاندار تھا، محنتی دیانت دار اپنی ایمانداری کی وجہ سے وہ بہت جلد امیر ہو گیا۔ خوب دولت جمع ہو گئی۔ اس دکاندار کو باغبانی کا بہت شوق تھا لیکن اس کا گھر اس قابل نہ تھا کہ اس میں پھول اگا سکے۔ اب جب وہ امیر ہو گیا تو اس نے سوچا کہ مجھے ایک ایسا گھر خریدنا چاہیے جس میں میں باغبانی کر سکوں۔ اچھے اچھے پھول اُگا سکوں۔ تلاش کرنے پر اس کو ایک ایسا گھر مل بھی گیا۔ یہ گھر تھا تو چھوٹا مگر اس میں باغبانی کے لیے کافی زمین تھی اور وہ زمین کے ایک کونے میں بنا ہوا تھا۔ مکان اور زمین کا نقشہ کچھ یوں تھا۔



دکاندار بہت خوش ہوا اور اس نے وہ گھر خرید لیا۔

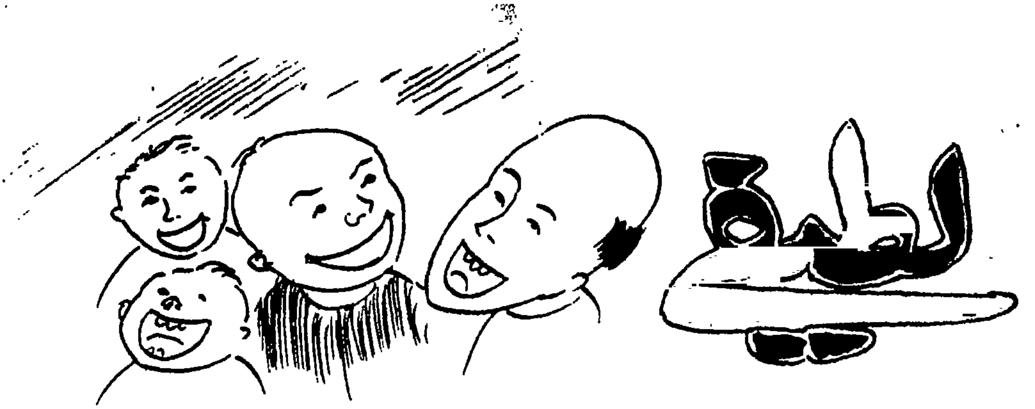
اس کے چار لڑکے تھے۔ ان سب کو بھی باغبانی کا بہت شوق تھا۔ لڑکوں نے جب اتنی جگہ دیکھی تو اپنے والد سے کہا۔ ابّا یہ زمین ہم میں تقسیم کر دیجیے تاکہ ہم سب اپنی اپنی پسند کے پھول بو سکیں۔ پھر آپ دیکھیے گا کہ کس نے پھول عمدہ اور اچھے بوئے ہیں۔ باپ نے کہا "اچھی بات ہے تم اس زمین کو تقسیم کر لو۔ لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔" لڑکوں نے پوچھا "وہ کیا؟"

باپ نے کہا "اس زمین کو تم اس طرح تقسیم کرو کہ چار بالکل برابر اور بالکل ایک جیسے قطعے نکل آئیں وہ تم آپس میں بانٹ لو۔"

لڑکوں نے کہا اچھی بات ہے۔ ہم اس کے چار بالکل برابر اور بالکل ایک جیسے حصے کر لیتے ہیں۔ مگر بھئی یہ تو بڑا بے ڈھب سوال ہو گیا۔ مکان اس طرح ایک کونے میں بنا ہوا تھا کہ چار حصے تو ہو جاتے تھے مگر ایک جیسی شکل کے نہ ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنے والد کے سامنے یہ پریشانی پیش کی۔ باپ نے ہنس کر کہا۔ بھئی کوشش کرو چار حصے ہو سکتے ہیں۔

لڑکے سوچ میں پڑ گئے۔ سوچتے رہے سوچتے رہے۔ آخر ایک لڑکے کے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی اور اس نے زمین کے چار حصے اس طرح کر دیے کہ وہ پیمائش میں بھی برابر تھے اور شکل میں بھی بالکل برابر تھے۔

لیکن بھئی کس طرح؟ ذرا آپ بھی تو سوچیے۔ اور خوب غور کرنے کے بعد اپنا جواب صفحہ نمبر ۲۰ پر دیے ہوئے جواب سے ملاؤ۔



ایک افیونی:۔ کسان سے (جو بیج بو رہا تھا) حرام خور

(بلیک مارکیٹر (چوری سے مال چھپانے والا)

کِسان:۔ ارے ارے مجھے گالیاں کیوں دے رہے ہو۔

افیونی:۔ ملک میں قحط پڑا ہے اور تو غلّہ زمین میں چھپا رہا ہے۔

"مبشر احمد"

دو لڑکے باغ میں گھومنے کی غرض سے گئے اور راستہ بھول گئے۔ شام ہونے کے قریب تھی کہ انھیں باغ کا چوکیدار مل گیا اور انھیں ان کے گھر کی طرف لے جانے لگا۔ اس پر ایک لڑکے نے چوکیدار سے کہا

لڑکا:۔ ابھی ہمیں گھر نہ لے جاؤ بلکہ دو تین گھنٹے یہیں ٹھہر جاؤ

چوکیدار:۔ کیوں؟

لڑکا:۔ کیونکہ ابھی گھر جانے پر ہمیں ابا دیر سے گھر آنے پر ماریں گے۔ اگر رات کو دیر سے گئے تو وہ ہمیں پا کر خوش ہوں گے اور مٹھائیاں دیں گے۔

"محمد یحیٰ"

ایک منہار:۔ چوڑیوں کی ایک گٹھری کمر پر لادے چلا جا رہا تھا۔ راستے میں ایک چور نے اس کی گٹھری پر ایک لاٹھی مار کر پوچھا "اس میں کیا ہے"

منہار:۔ اگر ایک لاٹھی اس پر اور مار دو تو کچھ بھی نہیں ہے صرف بوجھ ہی بوجھ ہے۔

استاد:۔ دل لگا کر پڑھنے سے کیا فائدہ ہے۔

جناب آپ کی مار کھانے سے نجات مل جاتی ہے۔

"محمد صغیر خاں"

لڑکا:۔ ابا میں اِن ماسٹر صاحب سے نہ پڑھوں گا۔

باپ:۔ کیوں بیٹا؟

لڑکا:۔ انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ افریقہ کہاں ہے کل مجھ سے پوچھ رہے تھے۔

"محمد عاشق"

بچّہ:۔ (دسترخوان پر گھر کے لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں)

بچّہ:۔ ابّا! ابّا۔۔۔۔۔۔ کیک

ابّا:۔ بیٹے کھاتے وقت بات چیت نہیں کرتے۔

بچّہ:۔ جی! ابّا حضور۔

ابّا:۔ (کھانے کے بعد) کہو کیا کہہ رہے تھے۔

بچّہ:۔ ابّا حضور آپ کے کیک میں۔ ایک کیڑا تھا۔

بچوں کی کوششیں



"بوجھو تو جانیں"

رسالوں کے نام تلاش کرو۔

۱- سلیم تندور سے روٹی لے آیا۔

۲- اپی آم خالی اوقات میں نہ کھائیے۔

۳- پھول اور کلی انیل نے توڑی تھیں۔

۴- ایک چھوٹا فیتہ لے آؤ۔

ملکوں کے نام تلاش کرو۔

۱- الائچی نہ کھاؤ۔

۲- کیلے من بھر ہیں کہ نہیں؟

۳- قتل کا مجرم نہ پکڑا جا سکا۔

۴- آج آپا نسرین کے گھر گئی ہیں۔

سید قمر الحسن لکھنوی

جواب:-

۱- پندرہ روزہ "نور" رام پور۔

۲- ماہنامہ "پیام تعلیم" دہلی۔

۳- ماہنامہ "کلیاں" لکھنؤ۔

ملک ۱- "چین" ۲- "یمن" ۳- "جرمن" ۴- "جاپان"

ملکوں ملکوں میں مزاج پرسی کے فقرے۔

کیسے ہو۔ (انگریزی)

کیسے گزرتی ہے۔ (فرانسیسی)

خدا تمہیں صبر عطا کرے۔ (روسی)

تمہاری عمر دراز ہو۔ (ہسپانی)

آپ کو پسینہ تو خوب آتا ہے۔ (مصری)

خوشیاں مناتے نظر آؤ۔ (یونانی)

تمہارا سایہ دراز ہو۔ (ایرانی)

تم پر سلامتی ہو۔ (عربی)

تم نے خوب کھایا ہاضمہ تو درست ہے (یونانی)

تمہارے خاندان پر امن کا سایہ ہو۔ (ایرانی)

تندرستی ہو۔ (افغانی)

کیوں کر بسر ہوتی ہے۔ (جرمنی)

مزاج اچھا ہے۔ (ہندوستانی)

تم پر سلامتی ہو صبح یا شام یا رات۔ (ترکی)

ع۔ ع۔ قریشی ہینگن گھاٹ

محبت کی بازی

رسول پور میں ایک کسان رہتا تھا۔ اس کا نام شیر خاں تھا۔ وہ بڑا گھمنڈی تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتا۔

گاؤں کے لوگوں سے شریفوں کی طرح بات نہ کرتا تھا۔ نہ تو وہ کسی کے گھر ہی جاتا، نہ راستے میں کسی کو سلام کرتا۔ گاؤں کے لوگ بھی اسے گھمنڈی سمجھ کر

اس سے نہیں بولتے تھے۔

اس گاؤں میں ایک نیا آدمی کسی کام کے سلسلے میں آیا اور رہنے لگا۔ اس کا نام تھا بھلّو میاں۔ وہ سیدھا آدمی تھا۔ وہ سب کی کچھ نہ کچھ مدد کیا کرتا تھا۔ اس لیے سبھی کسان اس کی عزت کرتے تھے اور اپنے کاموں میں اس سے مشورہ لیا کرتے تھے۔

گاؤں کے کسانوں نے بھلّو میاں سے کہا۔ "بھائی بھلّو میاں! تم کبھی شیر خاں کے گھر مت جانا۔ اس سے دور ہی رہنا۔ وہ بہت جھگڑالو آدمی ہے۔"

بھلّو میاں نے ہنس کر کہا۔ "شیر خاں نے اگر مجھ سے جھگڑا کیا تو میں اسے مار ہی ڈالوں گا۔"

کسان یہ سن کر ہنس پڑے۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ بھلّو میاں بہت مہربان آدمی ہے۔ مارنا تو دور رہا کسی کو گالی تک نہیں دے سکتا۔ لیکن یہ بات کسی نے شیر خاں سے کہہ دی۔ شیر خان غصّہ سے لال ہو گیا۔ وہ اسی دن سے بھلّو میاں سے جھگڑا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے بھلّو میاں کے کھیت میں اپنے بیل چھوڑ دیے۔ بیل بہت دور تک کھیت چر گئے۔

"بھلّو میاں کچھ نہ بولے۔"

دوسرے دن شیر خاں نے بھلّو میاں کے کھیت کی نالی توڑ دی۔ پانی دوسری طرف بہنے لگا۔ بھلّو میاں نے آکر چپ چاپ نالی ٹھیک کر لی۔ اسی طرح شیر خاں برابر بھلّو میاں کو پریشان کرتا رہا۔ لیکن بھلّو میاں نے ایک بار بھی اسے جھگڑنے کا موقع نہ دیا۔

ایک دن بھلّو میاں کے بڑے بھائی نے لکھنؤ سے لکھنؤ کے میٹھے خربوزے بھیجے۔ بھلّو میاں نے سبھی کسانوں کے ہاں ایک ایک خربوزہ بھیج دیا۔ لیکن شیر خاں نے اس کا خربوزہ یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میں بھیک منگا نہیں ہوں۔

برسات کا موسم تھا۔ شیر خاں ایک گاڑی اناج لے کر دوسرے گاؤں سے آ رہا تھا۔ راستہ بہت خراب تھا۔ اس کی گاڑی نالے میں پھنس گئی۔ شیر خاں کے بیل دبلے تھے۔ وہ گاڑی کو کیچڑ سے نکال نہ سکے۔ جب گاؤں میں اس بات کی خبر پہنچی تو سب لوگ بولے شیر خاں بڑا ہی خراب آدمی ہے اسے رات بھر نالے میں پڑا رہنے دو۔ لیکن بھلّو میاں نے اپنے طاقتور بیل ساتھ لیے۔ اس طرف چل پڑا۔ لوگوں نے اسے روکا اور کہا۔ "بھلّو میاں! شیر خاں نے تمھارا بہت نقصان کیا ہے تم تو کہتے تھے کہ "وہ لڑے گا تو اسے مار ڈالوں گا" پھر تم آج اس کی مدد کرنے کیوں جاتے ہو۔؟"

بھلّو میاں نے کہا۔ "میں آج سچ مچ اسے مار ڈالوں گا۔ دیکھ لینا۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل پڑا۔

جب شیر خاں نے بھلّو میاں کو بیل لے کر آتے دیکھا تو اکڑ کر بولا۔ "تم اپنے بیل لے کر واپس چلے جاؤ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔"

بھلّو میاں نے کہا۔ "تمھارے من میں آئے تو گالی دو چاہو تو مجھے مارو۔ لیکن اس وقت تم پریشانی میں ہو۔ تمھاری گاڑی پھنسی ہے اور رات ہونے والی ہے۔ میں تمھاری بات اس وقت نہیں مان سکتا۔"

بھلّو میاں نے شیر خاں کے بیلوں کو کھول کر اپنے بیل گاڑی میں جوت دیئے۔ اس کے طاقتور بیلوں نے

گاڑی کو کھینچ کر اسے باہر نکال دیا۔ شیر خان گاڑی لے کر گھر آ گئے۔

اب وہ گھمنڈی نہیں تھا —— گھمنڈی شیر خاں تو مر چکا تھا۔ سچ مچ بھلو میاں نے اسے مار ڈالا۔ شفقت اور محبت کی تلوار سے!!

بھلو میاں نے بازی جیت لی تھی۔

قرار احمد خاں آزاد۔ اکبر پور

عقل مند بوڑھا۔

ایک دفعہ کسی بادشاہ نے یہ اعلان کیا کہ وہ سونے سے بھرا ہوا تھیلا اپنی رعایا میں اس شخص کو دے گا۔ اس کو کوئی حیرت انگیز کہانی سنائے گا۔ لیکن یہ کہانی سچی نہ ہو۔ ورنہ وہ انعام حاصل نہ کر سکے گا۔ دوسرے دن ملک بھر سے لوگ اچھی سے اچھی کہانیاں لے کر آئے لیکن بادشاہ نے بتایا کہ یہ ناممکن ہے کہ یہ کہانیاں سچی نہ ہوں۔ لہذا انعام کوئی نہیں پا سکتا ہے۔ آخر ایک بوڑھا لمبا مرتبان ہاتھ میں لیے ہوئے حاضر ہوا اور عرض کیا۔

"بادشاہ سلامت! آپ کے والد صاحب نے میرے والد صاحب سے یہ سونے سے بھرا ہوا مرتبان ادھار لیا تھا۔ اس شرط پر کہ جناب اس کی رقم مجھے چکا دیں گے۔"

بادشاہ نے جوں ہی اس مرتبان کی طرف دیکھا فوراً بول اٹھا "یہ بالکل ناممکن بات ہے"۔

تب بوڑھا بولا۔ "اگر یہ ناممکن بات ہے تو میں نے صاف طور پر سونے سے بھری ہوئی تھیلی جیت لی ہے اور اگر میری یہ کہانی سچی ہے تو محترم والد صاحب کی رقم چکا دیں۔"

بادشاہ یہ جواب سن کر شش و پنج میں پڑ گیا اور اپنی رعایا میں یہ اعلان کروا دیا کہ بوڑھا انعام جیت گیا ہے۔ بوڑھا انعام پا کر خوشی خوشی اپنے گھر روانہ ہو گیا۔

نیاز احمد میر

جامعہ کے مدرسوں میں الیکشن کی دھوم دھام

اگست اور ستمبر کے مہینے میں جامعہ کے ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں خوب چہل پہل رہتی ہے۔ ان کی انجمنوں کے چناؤ عام طور پر انھی مہینوں میں ہوتے ہیں۔ ہفتہ دو ہفتے پہلے الیکشن کی سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ اور دن پر دن ان میں تیزی آتی جاتی ہے۔ ہر امیدوار اور اس کے حمایتی ووٹروں کو اپنے موافق کرنے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کرتے ہیں۔ پھر جلسے ہوتے ہیں۔ ان میں دھواں دار تقریریں ہوتی ہیں۔ الیکشن مینی فسٹو پیش کیے جاتے ہیں یعنی ہم کامیاب ہو گئے تو سب کی بھلائی کے لیے کیا کیا کام کریں گے۔ ان کے علاوہ چھوٹے چھوٹے اشتہار تقسیم ہوتے ہیں۔ پوسٹر لگائے جاتے ہیں۔ ان پوسٹروں کی ڈرائنگ بچے اپنے شوق سے بناتے ہیں۔ بہت دلچسپ بہت مزے دار۔ ایسا لگتا ہے جیسے دیواروں پر بچوں کی ڈرائنگ کی نمائش لگی ہو۔

۱۴ر اگست کو مدرسہ ثانوی کا الیکشن ہوا۔ کیسا کچھ جوش و خروش تھا۔ الٰہی توبہ! اور جب ووٹ پڑ چکے تو نتیجے کا انتظار تھا یہ اسی دن سنایا جانے والا تھا۔ امیدوار اور ان کے ہمدردوں کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ آخر شام کو نتیجہ سنا دیا گیا اور ان خوش نصیبوں نے کامیابی حاصل کی۔

نائب صدر عنایت اللہ، سکریٹری پرویز علی خان ایڈیٹر المصور۔ انصر سعید ایڈیٹر اُمنگ زویا نسرین۔ کھیل کے ناظم صابر علی۔ لائبریرین سید محمد عاقل۔

ہم ان سب امیدواروں کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

مدرسہ ابتدائی کے بچوں کی انجمن کا نام "بچوں کی حکومت" ہے۔ اور بھئی بچے اپنی حکومت کے کاموں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ ان کا اپنا کام جو ٹھہرا۔

اس مرتبہ بچوں کی حکومت کے صدر کا الیکشن ۱۶ر ستمبر کو ہوا۔ پانچ امیدواروں کے درمیان مقابلہ تھا۔

۱۶ر ستمبر کو سنیچر کے دن سویرے تڑکے بچے مدرسے میں آ گئے، اس سے پہلے انھوں نے رات بھر دیواروں پر پوسٹر چپکائے۔ چادروں پر ہر امیدوار کا نام اور چلتے ہوئے فقرے۔ لکھ کر انھیں جگہ جگہ لٹکایا۔

ساڑھے آٹھ بجے جلسہ شروع ہوا۔ جلسے میں امیدواروں کی تقریریں ہوئیں مضمون پڑھے گئے، نظمیں پڑھی گئیں آخر میں معمول کے مطابق ہر امیدوار نے اپنے منصوبے بتائے اپنے ارادے ظاہر کیے۔ جلسے کے بعد تمام امیدواروں کے الگ الگ جلوس نکلے۔ ٹھیک ساڑھے دس بجے پولنگ شروع ہوئی اور ۱۲ بجے تک جاری رہی اور جناب نتیجہ بھی ہاتھ کے ہاتھ یعنی ایک بجے سنا دیا گیا۔ محمد عیسٰی صاحب کو سب سے زیادہ (۲۹) ووٹ ملے۔ پھر کیا تھا۔ لڑکوں نے عیسٰی صاحب کو ہار پہنائے، پٹاخے چھوڑے، کرسی پر بٹھا کر جلوس نکالا۔ اور زندہ باد کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

محمد عیسٰی صاحب مبارک ہو۔ دیکھیے مسند نشینی کی تقریب میں ہمیں بھی یاد رکھیے گا۔

ادھر اُدھر سے



ڈولفن کی سواری

حال ہی میں نوورسیسک میں ایک خلافِ معمول بات ظہور میں آئی۔ گرمی بہت زیادہ تھی۔ لوگ سمندر کے کنارے بیٹھے دھوپ کھا رہے تھے۔ اچانک کسی نے شور مچایا "ڈولفن" "ڈولفن"۔ سمندر کے کنارے پر موجود لڑکے بہت جوش میں آگئے اور فوراً پانی میں کود پڑے۔ ڈولفن رک گئی جیسے یہ سوچ رہی ہو کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ تیر کر ساحل پر چلی آئے یا سمندر میں لوٹ جائے۔ چند لمحوں کے بعد اس نے لڑکوں کی سمت میں تیرنا شروع کر دیا۔ چند منٹ کے بعد لڑکوں نے جانور کو گھیر لیا۔ لڑکے ڈولفن کے ساتھ پانی میں چھینٹے اڑاتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوڑتے رہے، اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے رہے اور ایک اطہر لڑکا تو ڈولفن کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور اس پر سوار کئی میٹر تک تیرتا ہوا چلا گیا۔ تھوڑی دیر تک لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کے بعد ڈولفن واپس سمندر میں چلی گئی۔

(تاس)

لوہا اور شیشا کھانے کا شوق

بین الاقوامی ریکارڈ محض کھیلوں اور ورزشی مقابلوں میں ہی نہیں ٹوٹا کرتے کبھی کبھی اکثر بالکل غیر کسرتی لوگوں کو بھی کوئی نہ کوئی نیا عالمی ریکارڈ قائم کرنے کا شوق چرایا کرتا ہے۔ کوئی کباب کھانے میں نام پیدا کرتا ہے کوئی سگریٹ پینے میں، بعض مٹکوں شراب پی جانے کو ہی ذریعۂ عزت سمجھ بیٹھتے ہیں۔ مگر غالباً سب سے انوکھا شوق وفاقی جمہوریۂ جرمنی کے مشہور سلڈورف کے ایک اکتالیس سالہ بازی گر مسٹر کارل نیگماں کو ہے۔ یہ صاحب بڑی رغبت کے ساتھ لوہے اور شیشے کی چیزیں کھانے کے عادی ہیں ان دنوں وہ اس میدان میں اپنے ایک سوئیڈش (سوئیڈن کے رہنے والے) حریف سے بازی لے جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں جو ایک دن ڈھائی سیر لوہا نگل گیا تھا۔ ان کی مرغوب غذاؤں میں بلب، ریزر بلیڈ ریکارڈ اور نوک دار کیلیں سبھی کچھ شامل ہے۔ بسا اوقات وہ ایک دن میں پچاس بلب چٹ کر جاتے ہیں۔ چونکہ بہت سے لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا۔ کہ نیگماں سچ مچ یہ چیزیں ہضم کر جاتا ہے اس لیے ایک دفعہ انھوں نے اس کے پیٹ کا ایکسرے کروانے کی شرط رکھی۔ جب انھوں نے کیمرے کے سامنے آنے سے پہلے شیشے کی ایک ڈیڑھ میٹر لمبی ٹیوب نگل لی تو ڈاکٹر صاحب کو اس کی حیرت انگیز صلاحیت کی تصدیق کرنی پڑی۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ عام طور سے انسان جب کوئی ایسی چیز نگل جاتا ہے تو وہ سخت گھبراتا ہے۔ اس کی یہی گھبراہٹ اسے نقصان پہنچاتی ہے جو لوگ ٹھنڈے رہتے ہیں۔ ان کے معدے

اور انتڑیوں میں بہت سی رطوبت پیدا ہو کر انھیں گھائل ہونے سے بچا دیتی ہے۔ اگر کوئی چیز آنت میں اٹک جائے تو باریک کٹی ہوئی گوبھی ثابت نگلنے سے بڑا فائدہ پہنچتا ہے۔ جرمن شفاخانوں میں بھی اکثر ایسی ہی ترکیبیں استعمال کی جاتی ہیں۔ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ اگر آدمی گھبرائے نہیں تو ۹۰ فیصدی صورتوں میں ایسی چیزیں فطری راستے خارج ہو جاتی ہیں ۔ ورنہ آپریشن کیے بغیر چارہ نہیں ۔

بونوں کا کلب

لیجیے جناب ایک مزے کی خبر سنیے :۔ بونوں نے بھی اپنا کلب کھول دیا۔ یہ کلب ایوا اور اولڈ اینگل نے جرمنی کی مشہور بندرگاہ ہمبورگ میں کھولا ہے جو وفاقی جمہوریہ جرمنی میں تمام ٹھنگنے لوگوں کی مشکلات دور کرنے کی کوشش کرے گا۔ اب تک پچاس سے زیادہ بونے اس کلب کے ممبر بن چکے ہیں۔ یہ دونوں میاں بیوی جو خود بونے ہیں ان مشکلات کا جو روزگار کے مسئلے سے شروع ہوتے ہیں اور روزمرہ زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کرتے ہیں۔ خوب تجربہ کر چکے ہیں۔ اپنے بونے پن کی وجہ سے یہ رہنے سہنے کی تمام مروجہ سہولتوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے ۔ انھیں اپنا لباس بھی خاص آرڈر دے کر بنوانا پڑتا ہے۔ یورپ کے ملکوں میں تو آج کل سلے سلائے کپڑوں کا رواج ہے۔ اس لیے یہ کپڑے انھیں نہایت مہنگے پڑتے ہیں۔ ہمبورگ کی شہری حکومت ٹیکسوں کے سلسلے میں ان کے ساتھ خاص رعایت کرتی ہے ۔ اور آئندہ انہیں خاص قسم کی گاڑیاں خریدنے کے لیے مالی امداد بھی فراہم کرے گی۔ ہمسایہ ہمارے ملکوں میں بھی خیر سے بہت کافی ہیں۔ خدا کرے یہ خبر ان کے کانوں تک پہنچ جائے۔

بلیاں بھی مہنگے داموں بکنے لگیں

اڑیسہ کے صوبے میں ایک ضلع سمبل پور ہے سو وہاں چوہوں نے سر اٹھایا ہے۔ اتنے بڑھ گئے ہیں، اتنے بڑھ گئے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ یہ چوہے اناج کو سخت نقصان پہنچا رہے ہیں۔ لوگوں نے ان کا قلع قمع کرنے کے لیے زہر استعمال کیا پر یہ تدبیر کچھ ایسی کارگر نہ ہوئی لوگوں نے سوچا صرف بلیاں ہی انھیں اس مصیبت سے نجات دلا سکتی ہیں۔ بس پھر کیا تھا، وہاں اب ایک ایک بلی دس دس روپے میں بک رہی ہے

ایک انوکھی بستی سو میٹر اونچے میناروں پر

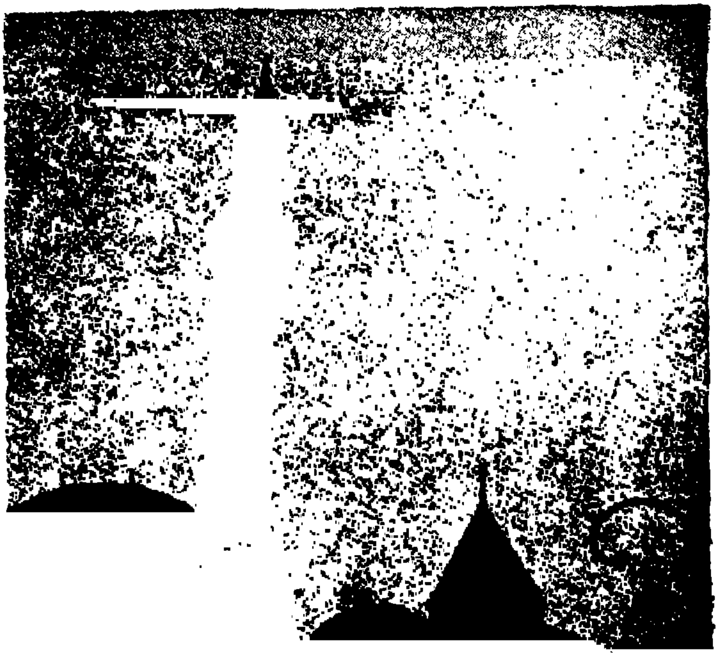
چند سالوں کے اندر اندر فولاد لوہے اور کنکریٹ کی ٹہنیوں والا یہ درخت ہیکل عمارتی پیڑ وفاقی جمہوریہ جرمنی کے شہر اسٹوٹگارٹ میں تین چار ہزار انسانوں کی رہنے سہنے کی ضروریں پوری کرنے لگے گا۔ اس کا نقشہ تیار کرنے والوں کو یہ بھی امید ہے کہ ان کی ایک سو میٹر اونچی دیو ہیکل ایجاد شہروں کی گندگی اور کثافت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک معقول ذریعہ ثابت ہو گی۔ ان کے خیال میں بڑے بڑے شہروں میں فلک بوس عمارتوں کے سپاٹ بلاک کھڑے کرنے کی بجائے ایسے سڈول مینار تعمیر کیے جائیں جو کافی بلندی پر جانے کے بعد رہائشی مکانوں کی شکل و صورت اختیار کریں تو گھروں کے نیچے جنگلات لگا کر اندرونی شہر کی ہوا کو بھی دیہاتوں کی سی فرحت و تازگی کا مالک بنایا جا سکتا ہے۔ مالی اعتبار سے بھی اس منصوبے کے قابل عمل ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ سو شاخ در شاخ باہم پیچیدہ عمارتوں پر کم و بیش ۲ کروڑ جرمن مارک کی لاگت آئے گی۔

Payam - i - Taleem

NEW DELHI-25.

نیشنل جلوہ فائن پریس دہلی

پیام تعلیم



[redacted]

[illegible]

[illegible]
تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ
پیام تعلیم
نئی دہلی

شمارہ ۱۱   نومبر ۱۹۶۹ء   جلد ۶

ایڈیٹر: محمد حسین حسان ندوی

صدر دفتر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار، دہلی ۶

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علیگڑھ

قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے   سالانہ چندہ چھ روپے

فہرست

کچھ باتیں

یہ نومبر کا پرچہ آپ کے ہاتھوں میں ہے اگلا پرچہ دسمبر کا ہوگا۔ اور پھر ——؟ پھر کیا وہی سالنامہ۔

سالنامے کی تیاری شروع ہو چکی ہے مضمون نگاروں کو شاعروں کو خط لکھے جا رہے ہیں کچھ مضمون آ چکے ہیں۔ ان کی کتابت ہو رہی ہے۔ جامعہ کے حلقے میں اور جامعہ سے باہر بزرگ اور ساتھی آپ کے سالنامے کے لیے اچھے اچھے مضمون، اچھی اچھی کہانیاں لکھ رہے ہیں، اچھی اچھی نظمیں لکھ رہے ہیں۔

نظموں کے سلسلے میں پیام تعلیم کے شاعر صاحب نے ایک بات کی خاص طور پر درخواست کی ہے، وہ یہ کہ نظم کہنے سے پہلے محترم شاعر حضرات ایسی بحریں انتخاب کریں جو شگفتہ ہوں اور جن میں ترنم ہو پیامی انھیں مزے لے کر اور گا کر پڑھ سکیں یہ بھی نہ ہو کہ ایک شعر ایک بحر کا ہے دوسرا کسی اور بحر کا۔

ہم پوری کوشش کر رہے ہیں کہ آپ کا یہ سالنامہ ہر لحاظ سے شاندار ہو اور دلچسپ ہو، اس میں کہانیاں بھی ہوں، ڈرامے بھی ہوں، معلوماتی مضمون بھی ہوں، ہنسنے ہنسانے والی باتیں بھی ہوں۔

ہمارے منیجر صاحب کا خیال ہے کہ سالنامہ رجسٹری سے بھیجا جائے۔ یہاں سے بہت احتیاط سے بھیجا جاتا ہے۔ پھر بھی بہت سی شکایتیں آتی ہیں جس سے ادارے پر خرچ کا بہت بوجھ پڑ جاتا ہے۔ اس لیے ان کی درخواست ہے کہ پیامی رجسٹری کے ۷۵ پیسے بھیج دیں۔ نئے خریدار یا خریداری کی مدت ختم ہونے کے بعد دوبارہ چندہ بھیجنے والے پیامی یہ ۷۵ پیسے ضرور بھیجیں کہ سالنامہ یقینی طور پر انھیں مل جائے گا۔

ہمیں بڑی خوشی ہے کہ اکتوبر کا پرچہ آپ سب کو پسند آیا۔ پیامیوں نے ہر مضمون کی تعریف کی ہے۔ نیلم اور فرخ کی کہانی کی تعریف میں تو اتنے خط آئے ہیں، اتنے خط آئے ہیں کہ شمار سے باہر ہیں۔ اس پرچے میں تیسری قسط چھپ رہی ہے۔ یعنی ستمبر سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے۔ ان سب پرچوں کو محفوظ رکھیے۔ نئے خریدار ہونے والے پیامی بہتر ہے کہ ستمبر ۱۹۷۰ء سے اپنی خریداری کا سلسلہ شروع کریں تاکہ پوری کہانی ان کے پاس محفوظ ہو جائے۔

نیلم اور فرخ کے علاوہ اس پرچے میں مسجد اقصیٰ پر ایک مستند عالم کا مضمون پڑھیے۔ جناب محمد امین صاحب کی کہانی توبہا پڑھیے۔ ۲ مزے وار محاورے گویا کی شادی اور ہارون رشید کا انصاف پڑھیے۔ سمندری جانور وہیل کا حال پڑھیے۔ نظمیں اور لطیفے پڑھیے۔

اب کی ٹائٹل پر مولانا جلال الدین رومی کے مزار کی تصویر چھپ رہی ہے۔ یہ "القرہ میں چند دن" کی دوسری قسط کے سلسلے میں ہے۔ محترمہ آصفہ مجیب صاحبہ نے ہمارے لیے بھی ایک اچھی سی چیز لکھ رہی ہیں۔ اور ہاں بھئی ایک دلچسپ معلوماتی مضمون اجتبا ندوی صاحب لکھ رہے ہیں۔

پچھلے مہینے محترم اجتبا ندوی استاد مدرسہ ثانوی جامعہ نے آٹھ خریدار مرحمت فرمائے۔ دو خریدار عادل جعفری صاحب دانڈوں اور ایک بڑی بھاری صاحب انچارج شاخ علی گڑھ (نجم انصاری) نے۔ محمد اسد اللہ صاحب ہیڈ ماسٹر بلڈانہ۔ محترمہ ہیڈ مسٹریس صاحبہ گرلس اسکول شولاپور۔ جناب ہیڈ ماسٹر صاحب اردو اسکول ناگوتھنا قلابہ، جناب ہیڈ ماسٹر صاحب اردو اسکول منور دتھانہ، جناب ہیڈ ماسٹر صاحب اردو اسکول دھکا در بلڈانہ نے ایک سال کی خریداری منظور فرمائی ہے۔ ان کے علاوہ ہمارے پرانے مضمون نگار جناب خلیق انجم سرائی دہلی، حبیب اللہ صاحب کھنڈوا، قاضی وہاب الدین صاحب برہان پور خود خریدار بنے ہیں۔ مدرسہ ثانوی جامعہ میں خریدار ہونے والے بچوں کے نام ہم اگلے پرچے میں دیں گے۔

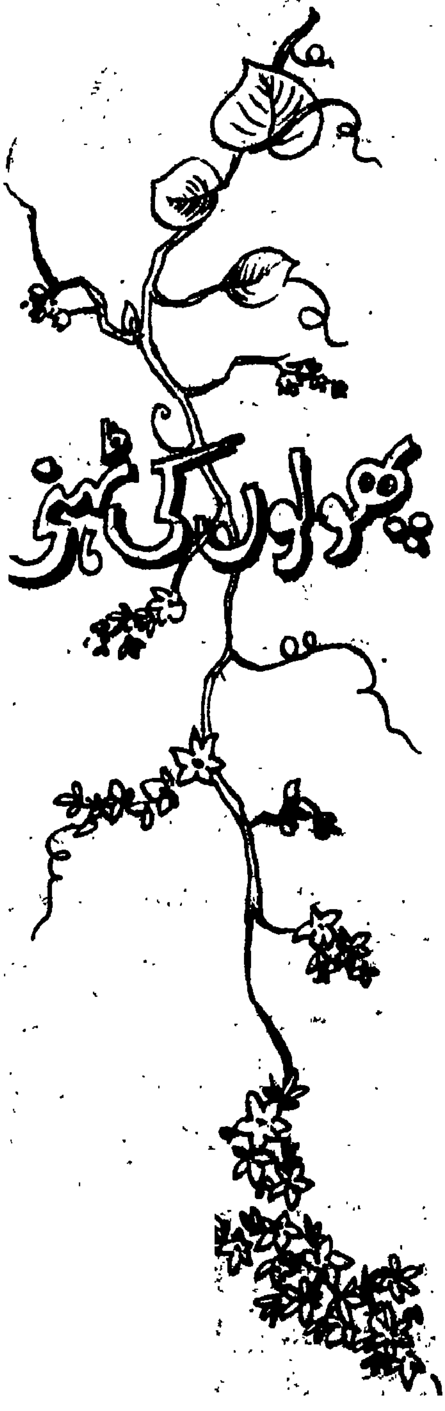
ان صفحوں میں ہم ایک بات کا ذکر بار بار کر چکے ہیں۔ پیام تعلیم کے کم سے کم پانچ خریدار بنانے والے بزرگوں اور سپاہیوں کی خدمت میں پیام تعلیم ایک سال کے لیے مفت نذر کیا جائے گا۔ اور اگر وہ خریدار ہیں تو وہ جس کے نام چاہیں رسالہ جاری کر دیا جائے گا۔

اچھا بھئی اب دو خوش خبریاں بھی سن لیجیے۔ شاہد علی خاں صاحب انچارج مکتبہ جامعہ بمبئی کو تو آپ خوب جانتے پہچانتے ہیں۔ پیام تعلیم پر ان کی مہربانیوں کا ذکر اکثر ہوتا رہتا ہے۔ پچھلے مہینے (اکتوبر میں) ان کی شادی خانہ آبادی کی تقریب خیر و خوبی کے ساتھ عمل میں آ رہی ہے۔ ہم انھیں اپنی اور آپ کی طرف سے دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

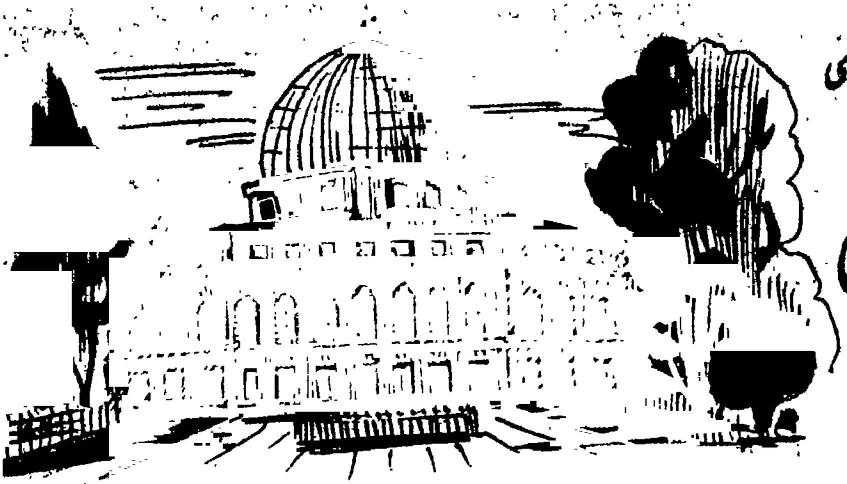
دوسرے صاحب، قیصر سرمست دھیلا گم ہیں۔ یہ بھی آپ کے پرچے کے پرانے مضمون نگار ہیں۔ معلوماتی مضامین بہت انوکھے اور دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں۔ یہ بھی پچھلے مہینے ماشاء اللہ ایک سے دو ہو گئے۔ قیصر صاحب ہماری اور آپ کی طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

جناب حافظ بھوی

پھولوں کی ٹہنی



اے نازک پھولوں کی ٹہنی
کتنی ہری پوشاک ہے پہنی
تو نے گلوں کے گہنے پہنے
تیری سج دھج کے کیا کہنے
تیرے بدن میں کتنی لچک ہے
تیرے گلوں میں کتنی مہک ہے
تجھ سے صبا کرتی ہے شرارت
تو بھرتی ہے اس میں نکہت
سارے چمن کو لہکاتی ہے
لہکاتی ہے، مہکاتی ہے
اکھ چلے طوفان کہ آندھی
تجھ کو نہیں ہے خوف ذرا بھی
بز ہوا کے زور سے جھک کر
تن جاتی ہے اپنے تنے پر
سب دکھ ہر دم سہتی ہے تو
ہنستی کھیلتی رہتی ہے تو
دئی لہکنا تجھ سے سیکھے
اور مہکنا تجھ سے سیکھے



مولانا اجتباء ندوی

مسجدِ اقصیٰ

۲۱ر اگست (۱۹۶۹ء) کی تاریخ مسلمانوں کے لیے بلکہ ساری دُنیا کے لیے بڑی منحوس تاریخ تھی۔ فلسطین کی مشہور مسجد۔ مسجد اقصیٰ میں یہودیوں نے آگ لگا دی۔ ساری دنیا میں غصّے اور رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں کے لیے تو یہاں کی متبرک جگہیں پہلے قبلے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مسلمان پہلے اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ تمام دنیا کے مسلمانوں خاص کر عرب ملکوں نے اس حادثے کو بہت شدت سے محسوس کیا۔

یہ مسجد اقصیٰ کیا چیز ہے؟ اور یہاں کے دوسری مقدس جگہوں کی تاریخی اور مذہبی حیثیت کیا ہے۔ ہماری درخواست پر محترم اجتباء ندوی (استاد مدرسہ ثانوی جامعہ) نے آپ کے لیے یہ اچھا سا مضمون لکھا ہے۔ اجتباء صاحب اپنی تعلیم کے سلسلے میں تین چار سال تک دمشق (شام) میں رہے ہیں۔ بیت المقدس دمشق سے قریب ہی ہے۔ لگ بھگ پچاس میل کا فاصلہ ہے، گھنٹے سوا گھنٹے میں پہنچ جاتے ہیں۔ اجتباء صاحب کئی بار بیت المقدس ہو آئے ہیں۔ انھوں نے جیسے آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے۔ اسی لیے اتنا دلچسپ ہے۔ مضمون ذرا لمبا ہو گیا ہے اگلا حصہ دسمبر میں پڑھیے۔

ایڈیٹر

مغربی ایشیا میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ بہت بہت ہی پرانا، لاکھوں برس پرانا، انسان نے ل سے نکل کر میدانوں کی طرف قدم رکھا۔ بڑیاں بنائیں، گاؤں بسائے قصبے آباد کیے ی کرتے کرتے شہروں کی بنیاد ڈالی اور شاید سب سے پہلے پہل یہی شہر آباد ہوا۔

اس شہر کا پہلا نام "ایلیا" تھا بعد میں یروشلم ہوا اور اب اسے بیت المقدس کہتے ہیں۔ یہ شہر ملک اردن کی راجدھانی عمان سے ۴۰ میل کے فاصلے پر ہے۔

بیت المقدس بڑا خوبصورت اور عجیب شہر ہے، وادیوں اور میدانوں سے گذرتے ہوئے سرسبز و شاداب بلند پہاڑیاں نظر آتی ہیں، اونچی، نیچی، ہموار، ناہموار پہاڑیاں، ان پر ہر قسم کے پھلدار درخت اُگے ہوئے ہیں۔ زیتون کے درخت تو بڑے سلیقہ سے لائنوں میں کھڑے ہوئے، جیسے شہر میں ہر داخل ہونے والے کو خوش آمدید کہہ رہے ہوں۔

ایک پہاڑ تو صرف زیتون کے درختوں کا ہے۔ اسی لیے اس کا نام "جبل الزیتون" (زیتونی پہاڑ) پڑ گیا ہے۔ زیتون کے درخت خوبصورت پھلوں سے لدے ہوئے، ہرے، سرمئی، نیلے اور سفیدی مائل نگاہوں کو بڑے بھلے لگتے ہیں۔

جنوب مشرق کے پہاڑ "تاریا" پر مسجد اقصٰی اور قبۃ الصخرہ کے آسمان کو چھونے والے گنبد و محراب دور سے نظر آتے ہیں۔ پہاڑیوں کے نیچے چشمہ ہے۔ اس کا پانی بہت صاف و شفاف ہے جیسے آئنہ اور ٹھنڈا جیسے برف۔

بیت المقدس شہر بڑا صاف ستھرا ہے۔ سڑکیں کشادہ، گلیاں روشن مگر تنگ، بازار د درعدہ، بہت سلیقے سے بنائے گئے ہیں چھت والے تاکہ خریداروں کو بارش اور دھوپ کی تکلیف کا احساس نہ ہو، دکانیں قرینے سے سجی ہوئیں، ہر قسم کا سامان اور ہر طرح کا اسباب، زیتون کی لکڑی کے قلم دان، گل دان، رحل، تختیاں، کھلونے اور گڑیاں۔ ان پر ہاتھی دانت اور سیپ کے دلکش نقش و نگار، بازار میں چلے جایئے تو نکلنے کو جی نہ چاہے۔ ہر سامان کو دیکھئے، ضرور خریدنا، خریدنا آپ کی مرضی پر ہے۔ دکان دار بڑے با اخلاق خوش سلیقہ اور خوش مزاج، چہرہ پر تلخی نہ جھنجھلاہٹ، گرمی نہ غصہ، خوش خوش جایئے اور خوش خوش واپس آجایئے۔

بیت المقدس ایک قدیم مضبوط شہر پناہ سے گھرا ہوا ہے۔ اس میں داخل ہونے کے لیے سات دروازے ہیں۔ ان میں سے صرف چار ہی کھلے رہتے ہیں۔ اور زیادہ تر لوگ مشرقی دروازے۔ "الباب المشرقی" سے داخل ہوتے ہیں۔ روشن اور ہموار مگر پُرپیچ گلیوں سے گذرتے ہوئے مسجد اقصٰی یا کلیسا قیامت تک پہنچ جایئے۔ اگر کہیں راستہ بھول گئے، تو گلیوں میں گھنٹوں چکر لگا کر ہر مرتبہ مسجد اقصٰی کے کسی دروازے کے سامنے پہنچ جایئے گا، ہر گلی مسجد اقصٰی کے کسی نہ کسی دروازے پر ختم ہوجاتی ہے۔ عمارتیں نئی پرانی ملی جلی، آرام دہ اور پُر فضا، نئی اور پرانی تہذیب کی آئینہ دار۔

اسی یروشلم میں آج سے تقریباً پانچ ہزار برس پہلے دو اجنبی (ایک مرد اور ایک عورت) داخل ہوئے۔ کلدانیوں کی راجدھانی بابل کے رہنے والے تھے، عقیدہ، دین، اخلاق اور نیکی

کے پیرچار کے لیے انھیں بابل کی زمین تنگ نظر آئی۔
تو اہل وطن سے رخصت ہو کر اس پُر امن اور پُر سکون
شہر میں پناہ لی، جو آگے چل کر پیغمبروں کا شہر کہلایا اور
دنیا کے تین بڑے آسمانی مذہبوں یہودیت، عیسائیت
اور اسلام کے لیے یکساں طور پر قابلِ احترام ٹھہرا۔

یہ دونوں اجنبی حضرت ابراہیمؑ تھے اور ان
کی بیوی سائرہ تھیں، حضرت ابراہیمؑ کی ایک
دوسری بیوی حضرت ہاجرہ تھیں۔ ان سے ایک
لڑکے حضرت اسماعیلؑ ہوئے، حضرت ابراہیمؑ ان
دونوں کو ایک بے آب و گیاہ سرزمین میں لے
جا کر چھوڑ آئے تھے۔ یہیں بعد میں مکہ مکرمہ آباد
ہوا، اور تھوڑے عرصہ کے بعد خدا کی عبادت کے
لیے کعبہ کی تعمیر کی۔

حضرت ابراہیمؑ کی پہلی بیوی سائرہ سے
ضرت اسحاقؑ تھے، ان دونوں باپ بیٹوں نے
ک کر "ماریا پہاڑ" پر ایک چھوٹا سا عبادت خانہ
ایا تھا، اور اس میں بیٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے۔
رت اسحاقؑ کے لڑکے یعقوبؑ تھے، ان کا دوسرا
م اسرائیل تھا، ان کے بارہ بیٹے تھے۔ انھی
اولاد کو یہود کہتے ہیں۔

حضرت یعقوبؑ کے ایک لڑکے حضرت
فؑ مصر کے بادشاہ ہوئے تو اپنے والد اور
والوں کو مصر بلا لیا۔ وہاں یہ لوگ رہ بس گئے۔
عرصہ بعد زمانے کی گردش نے اسی خاندان کو

بڑی بے چارگی اور بے بسی کی زندگی بسر کرنے پر
مجبور کر دیا، لیکن خدا نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ
ان کو اس مظلومی اور بے کسی سے نجات دلائی۔
اور یہ لوگ "بیت المقدس" دوبارہ واپس آگئے۔
اور بنی اسرائیل کے نام سے شہرت اور عزت حاصل کی۔

بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر سموئیلؑ نے
ان کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو منظم اور پائیدار
بنانے کی خاطر ایک لائق اور دانش مند نوجوان
حضرت داؤدؑ کو ان کا بادشاہ مقرر کیا، حضرت
داؤدؑ بڑے نیک پرہیزگار اور عبادت گذار تھے
حضرت ابراہیمؑ و اسحاقؑ کے بنائے ہوئے "معبد"
(عبادت گاہ) کے کھنڈروں کو تلاش کر کے اسی
جگہ "معبد ثانی" عمدہ اور پختہ تعمیر کے لیے ایک
لاکھ ٹیلنٹ سونا (ٹیلنٹ سوا من کے قریب ہوتا
تھا) دس لاکھ ٹیلنٹ چاندی اور بے حساب
لوہا، تانبہ اور پیتل جمع کیا تھا۔ لیکن عمر نے وفا نہ
کی۔ ان کے جانشین انھی کے صاحبزادے حضرت
سلیمانؑ ہوئے، اور اپنی حکومت کے چوتھے سال
"ھیکل سلیمانی" کے نام سے (۹۴۵ ق م) اسی
سرمایہ سے ایک معبد (عبادت گاہ) کی تعمیر شروع
کی، ایک لاکھ ۸۳ ہزار آدمی روزانہ کام کرتے
تھے۔ اس طرح ساڑھے سات برس کی مدت
میں "یہ معبد" (عبادت گاہ) بن کر تیار ہوا۔

اس زمانے کی یہ سب سے خوبصورت

بسی محلہ جات پانی ہوم سترہ

دل کش اور دل فریب عمارت تھی۔ یہ آلِ اسرائیل کی مرکزی عبادت گاہ تھی، یہ ہیکل ۴۲۴ سال تک باقی رہا، پھر مصر کا فرعون شیشک کسی وجہ سے یہودیوں سے ناراض ہوا اور بیت المقدس پر حملہ کردیا۔ اس حملہ میں ہیکل کو سخت نقصان پہنچا۔

۵۸۶ ق م میں بابل کے زبردست بادشاہ بخت نصر نے بیت المقدس پر یلغار کی اور ہیکل کو توڑ پھوڑ کے برابر کردیا۔ لاکھوں یہودیوں کو گرفتار کرکے بابل لے گیا۔ آلِ اسرائیل (یہودیوں) کے لیے یہ بہت بڑا سانحہ اور حادثہ تھا، ان کے پیغمبر ہیکل کی بے حرمتی اور قوم کی ذلت و رسوائی پر نوحہ خوانی اور بیت المقدس کی تباہی پر ماتم کرتے تھے، اور یہود کے گناہ اور بداعمالی کی پاداش میں عذابِ الٰہی سمجھتے تھے اور ہمیشہ انھیں ڈراتے رہتے تھے۔

شاید آلِ اسرائیل کی اس رسوائی اور ذلت پر ترس کھا کر شاہ ایران نے بابل پر حملہ کیا اسرائیلی قیدیوں کو رہائی دی، اور دوبارہ ہیکل کی تعمیر کی اجازت دی۔ ہیکل بن کر تیار ہوا لیکن اب اس میں پہلی جیسی خوبصورتی، دل کشی، دل فریبی اور نقش و نگار کہاں، وہ پہلی شان و شوکت اور آن بان کھو چکا تھا، اسرائیلی پیغمبروں کی نشانیاں تبرکات اور تحفے بھی بخت نصر کے حملہ کی نذر ہو چکے تھے، تاہم یہ پانچ سو سال تک یہود کی عظمت اور مرکزیت کا نشان بنا رہا۔

۲۰ ق م، روم کے عظیم بادشاہ نے ہیکل سلیمانی کی پرانی اور ٹوٹی پھوٹی کو نئے سرے سے بنوانا شروع کیا، اور یہود کی بڑی ہمت افزائی کی۔ چنانچہ ہیکل بہ عمدہ، خوبصورت، مضبوط اور شاندار اور رنگین شیشوں سے مزین و آراستہ کیا گیا۔

جناب محمد امین

بہادر بومبا



قطی نے کہا: بومبا! کیا تم ہو؟

افریقہ میں کبھی بہادروں کی کمی نہیں رہی ہے۔ جیسے دنیا کے دوسرے حصوں میں۔ لیکن بومبا سے بڑھ کر کوئی بہادر گزرا ہے یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی۔ بہانے بہت ہی پرانے زمانے سے لوگ یہ کہانی سنتے آئے ہیں۔

بومبا مغربی افریقہ میں سینے گل کے ایک بادشاہ کا لڑکا تھا۔ اس کے دادا بھی بادشاہ تھے اور اس وقت ان کی بڑی شہرت تھی۔ ان کا نام بقری تھا اور ان پر خدا کی بڑی عنایتیں تھیں۔ بقری اتنا بہادر اور نیک تھا کہ آسمان کا خدا اس کے لیے بادلوں کے اندر سے سونے کا عظیم اسٹول بھیج دیا تھا۔ سونے کا یہ اسٹول گویا تخت تھا۔ اسی پر بیٹھ کر مغربی افریقہ کے بادشاہ اپنی سرزمین پر حکومت کرتے چلے آئے ہیں۔

بقری نے ایک دن دیکھا کہ کالے بادل چھا گئے ہیں اور ان بادلوں میں اسے سونے کا اسٹول نظر آیا۔ منٹوں میں وہ اس کے قدموں میں آگیا۔ اس اسٹول کے ساتھ سونے کی بنی ہوئی ایک چھوٹی چیز جڑی ہوئی تھی۔ اس چمکیلی چیز میں زبردست جادو تھا۔

اس کی شکل کیا تھی اس سے کوئی بحث نہیں۔ اصلی بات یہ تھی کہ اسے ہاتھ میں لے کر اس کا مالک جیسے بھی چاہے اپنی شکل بدل سکتا ہے۔ یہی اس جادو کا کمال تھا کہ اسے ہاتھ میں لے کر جو چاہیے کر لیجیے۔ یہاں تک کہ اس کی مدد سے اپنے آپ کو بھی غائب کر سکتا تھا۔

آج کل جو لوگ وہاں رہتے ہیں۔ ان میں سے بھی بعضوں نے سنہرے اسٹول کو دیکھا ہے۔ ابھی تک یہ موجود ہے۔ کم سے کم افریقہ میں خصوصاً مغربی افریقہ میں تو اسے دیکھا ہی گیا ہے۔ عوام میں اب بھی اس کا چرچا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ وہی سنہرا اسٹول ہے جسے آسمان کے خدا نے بقری کے لیے بادلوں کے ذریعے نازل کیا تھا۔

جب بادشاہ بقری مر گیا تو سونے کا اسٹول اور اس کا جادو اس کے لڑکے کو ملا۔ اور جب وہ مر گیا تو یہ دونوں چیزیں اس کے لڑکے (بقری کے پوتے) بومبا کے حصے میں آنی چاہیے تھیں۔ جو اس کہانی کا ہیرو ہے۔ مرنے سے پہلے بومبا کے باپ نے ایک جوان کے پاس انھیں امانت رکھ دیا تھا لیکن بومبا کے چچا قولی نے انھیں چھین لیا تھا۔

"بومبا بھی سونے کے اسٹول پر بیٹھے گا۔ بومبا ہمارا بادشاہ ہے۔ خدا اس کی عمر دراز کرے"

جب اس کے باپ کا انتقال ہوا تھا تو ہر ایک کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔ بومبا ابھی کچی عمر کا لڑکا ہی تھا۔ لیکن ہر ایک اسے بہت چاہتا تھا۔ وہ ایک بہادر شکاری تھا۔ اپنی عمر کے دوسرے جوانوں کے مقابلے میں وہ کہیں زیادہ عقل مند تھا۔ اس لیے ہر ایک کی خواہش اور تمنا تھی کہ جلد سے جلد

وہ ان کا بادشاہ بن جائے۔ لیکن اس علاقے میں ایک ایسا آدمی تھا جو سونے کے اسٹول کو ہمیشہ کے لیے ہڑپ کرنا چاہتا تھا۔ اس کا نام قولی تھا۔ یہ آنجہانی بادشاہ کا بھائی تھا اور بومبا کا چچا۔

"بومبا ابھی بچہ ہے۔ وہ ہمارا بادشاہ کیا بنے گا۔ میں قولی اپنے بھائی کی جگہ حکومت کروں گا" قولی نے یہی باتیں لوگوں سے کہیں اور سب طرف اس کا ڈھنڈورا پٹوا دیا۔

اس طرح قولی فوج کا مالک بن بیٹھا ہزاروں سپاہی اس کے حکم پر چلنے لگے۔ اس لیے کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ کوئی اس کو بادشاہ نہ مانے۔ لیکن دل میں چور تھا اور جیسے ہی اس نے سنہرے اسٹول پر اپنی گدی سنبھالی قولی کو ڈر محسوس ہوا۔ کون جانتا تھا کہ جنتا اس کے خلاف بغاوت نہ کر بیٹھے؟ اور کہے آخر بومبا کو اس کی جگہ کیوں نہ بادشاہ بنا دیا جائے؟ لہٰذا وہ اس پھیر میں رہا کہ اس کانٹے کو کسی طرح راستے سے ہٹا دے۔ اس نے نوجوان شہزادے کو شاہی قلعہ میں نظر بند کر دیا۔ اس پر سخت پہرہ بٹھا دیا۔ قولی اس کے خلاف سازش پہ سازش کرتا رہا کہ اس کو مار دے لیکن ہر بار اس کے سپاہیوں نے خبر کی "ہم بومبا کو نہیں مار سکتے۔ جب ہم نے اس کو گھیرنے کی کوشش کی وہ غائب ہو گیا۔ ایک مرتبہ اس کی جگہ ہم کو چوہا ملا جو بھاگ کر دیوار کے ایک بل میں گھس گیا۔ دوسری بار اس کی جگہ ایک مکڑا تھا۔ وہ بھی بھاگ گیا"

بومبا کے پاس سونے کا جادو تھا جو اسے اپنے دادا بقری سے وراثت میں ملا تھا۔ اس جادو کی مدد سے وہ آسانی کے ساتھ ہر جال سے نکل جاتا تھا۔

ہو سکتا ہے یہ بات بھی ہو کہ قولی کے سپاہی جان بوجھ کر اسے مارنا نہ چاہتے ہوں یہ ممکن ہے دل ہی دل میں وہ اسے چاہتے ہوں۔

"یہاں ہمارا رہنا خطرے سے خالی نہیں" بومبا نے آخر کار ایک رات اپنے وفادار غلام بنگا سے کہا "اپنے چچا کے قریب رہنا ٹھیک نہیں کہیں وہ ہمیں مروا نہ دے"

جب سارے محافظ سو گئے اور سناٹا ہو گیا تو چپکے سے بومبا قلعہ سے باہر نکل گیا۔ اسے ایک پوشیدہ راستہ معلوم تھا۔ بنگا بھی اس کے پیچھے پیچھے نکل آیا۔ بومبا کا شکاری کتا بھی ساتھ میں تھا۔ اس کا اپنا کوئی محافظ دستہ نہیں تھا لیکن اپنے دو وفادار دوستوں کو ساتھ لے کر وہ جنگل کی طرف چل پڑا۔

چلتے چلتے یہ چھوٹا سا قافلہ پڑوس کے دوسرے بادشاہ کے علاقے میں داخل ہوا۔ یہ بادشاہ بومبا کے باپ کا دوست تھا۔

"اے بادشاہ میں آپ کی پناہ میں آیا ہوں۔ میرا غلام اور میرا وفادار کتا بھی ساتھ ہے" بومبا

نے قدم چومتے ہوئے کہا۔

"میری یہ بھی گزارش ہے کہ آپ مجھ کو فوجی امداد دیں تاکہ میں اپنے چچا سے سنہرا اسٹول حاصل کرسکوں۔ سلطنت جب مجھے واپس مل جائے گی تو میں اس کا بدلہ چکا دوں گا۔"

لیکن سب جانتے تھے کہ قولی کے پاس بڑی زبردست فوج ہے اور اس سے لڑنا آسان نہیں۔ اس لیے اس بادشاہ کی ہمت نہیں پڑی اور اس نے انکار کردیا۔ بومبا مایوس ہوگیا۔ پر وہ اپنے ارادے کا پکا تھا۔ حق اس کے ساتھ تھا۔ وہ سنہرے اسٹول کو حاصل کرنے کے لیے جنگ ضرور کرے گا۔ یہ بات اس نے جی میں ٹھان لی تھی۔ وہ دوسرے ملک میں گیا۔ وہاں کے بادشاہ کا نام الکبیر تھا۔

"الکبیر کے پاس بڑی فوج ہے۔" بومبا نے سگا سے کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ ہماری مدد کے لیے آمادہ ہوجائے۔" اور پھر وہ سیدھا اس کے محل میں داخل ہوگیا۔ جہاں وہ اپنی سو بیویوں کے جھرمٹ میں راجہ اندر بنا بیٹھا تھا۔

"اے بادشاہ میرا نام بومبا ہے۔" نوجوان نے مخاطب ہوکر کہا۔ "میں بقری کا پوتا ہوں جسے آسمان کے خدا نے سونے کا ایک عظیم اسٹول دیا تھا۔ میں بقری کے لڑکے کا لڑکا ہوں۔ میرے باپ نے بھی اسٹول پر بیٹھ کر حکومت کی ہے۔ میرے باپ کا انتقال ہوگیا ہے۔ میرے چچا قولی نے سلطنت غصب کرلی۔ مجھے فوجی امداد چاہیے تاکہ اپنی سلطنت واپس لے سکوں۔"

"بقری کے پوتے! بومبا! میں تمھیں خوش آمدید کہتا ہوں۔" الکبیر نے گرم جوشی سے جوان کا استقبال کیا۔

"تم یہاں رہو۔ ہمارے مہمان ہو لیکن قولی کے خلاف چڑھائی کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ میرا بھلا اس سے کیا جھگڑا ہے۔"

بومبا کو افسوس ہوا لیکن بادشاہ کی مہمانی اس نے قبول کرلی۔ کھانے کے لیے اس کے سامنے دلیا آیا جس میں نمک بہت تیز تھا۔ یہ مزے میں اتنا نمکین تھا اور اتنا کھاری تھا جتنا سمندر کا پانی۔

"اے لڑکی میرے لیے تازہ پانی لاؤ۔" اس نے غلام زادی سے کہا جو کھانا لائی تھی۔ "جلدی جاؤ اور پانی لاؤ۔ یہ دلیا اتنا نمکین ہے گویا کہ سمندر کا کھارا پانی۔"

"یہاں تازہ پانی نہیں ہے، چھوٹے سرکار۔" لڑکی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "سامنے پہاڑیوں پر تازہ پانی ملتا ہے لیکن وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔" پھر اس نے بتایا کہ تازے پانی کے چشموں پر ایک بھاری فیبر رہتا ہے۔

"جب اس کو ایک جوان لڑکی بھینٹ دی جاتی ہے تو وہ تازے پانی کو نیچے تک بہنے دیتا ہے۔ پھر ہم کو چند مہینوں کے لیے پانی مل جاتا

ہے۔ دوبارہ پانی لینا ہو تو پھر ایک جوان لڑکی
کی بھینٹ دینی پڑے گی۔"

اور جناب ذرا بومبا کی ہمت تو دیکھو۔
اپنے کتے ملازم کو لے کر اور اپنا تیز چمکیلا اور
نوکیلا بلم ساتھ میں لے شیر کو مارنے کے لیے وہ
سیدھا پہاڑیوں کی طرف نکل کھڑا ہوا۔

شیر اس وقت سو رہا تھا۔ بومبا نے
کر اپنا بلم اس کے دل میں پیوست کر دیا۔
تے مرتے شیر نے پورے الکبیر کے قصبے کو سر پر
اٹھا لیا۔ مرد اور عورتیں، غرض سارا قصبہ دوڑ
کہ یہ کیا ہنگامہ ہے۔

پہاڑی پر چشمے کے سامنے انھوں نے
دیکھا کہ شیر مرا پڑا ہے۔ پاس میں ریت کے اندر
گڑا ہے۔ ایک کتا اس سے بندھا ہوا ہے۔
کے سر پر ایک سینڈل بھی رکھا ہوا ہے۔
منٹوں میں یہ خبر گرم ہو گئی۔ جوان لڑکیاں
خوشی میں جھوم اٹھیں "شیر ختم ہو گیا"۔ سب نے
ور کر کرکے خوب گلے ملیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب ہماری
ن نہیں جائے گی۔"

بادشاہ نے بھی خوشیاں منائیں۔ اب سب
اطمینان ہو گیا کہ تازہ پانی میٹھے چشموں سے بہہ
کر آتا رہے گا اور پانی کی کوئی کمی نہیں پڑے گی۔
کس بہادر نے یہ جواں مردی کا کام کیا ہے؟
نے سب سے پوچھا۔ "اسے چاہئے کہ وہ سامنے
آجائے تاکہ ہم اسکو انعام واکرام دیں۔" اس
قصبے کے کئی جوان شکاریوں نے سوچا کہ اپنی شہرت
جمانے کا اچھا موقع ہے۔ وہ بھی بھیڑ کے ساتھ چل
پڑے۔ مرے ہوئے شیر کے پاس پہنچ کر الکبیر نے
آواز دی "دیکھو سامنے شکاری کا بلم ہے۔ اس کی
حفاظت کے لیے اس کا کتا موجود ہے۔ شکاری کا
ایک سینڈل بھی شیر کے سر پر ہے۔ یہ سب چیزیں
جس کی ہیں اسے چاہیئے کہ سامنے آجائے۔"

یکے بعد دیگرے کئی شکاری آئے۔ لیکن
ہر ایک کو دیکھ کر کتا غراتا تھا۔ چند جو بہادر تھے
اور کتے سے ڈرے نہیں وہ جب آگے بڑھے اور
انھوں نے بلم کو نکالنے کی کوشش کی تو وہ چیں
بول گئے۔ بلم درخت کے مانند مضبوطی سے گڑا
تھا گویا کہ زمین میں اس کی جڑیں پیوست ہوں۔
شیر کے سر پر جو سینڈل تھا وہ بھی کسی کے پیر
میں فٹ نہیں ہوا۔

"بومبا نے شیر کو مارا ہے" بگا نے چیخ
کر کہا۔ اور یہ جوان ہیرو آگے بڑھا اسے دیکھ
کر کتے نے دم ہلا دی۔ چھوتے ہی بلم زمین سے
نکل آیا۔ سینڈل بھی اس کے پیر میں فٹ ہو گیا۔
سب نے دیکھا کہ دوسرا سینڈل پہلے ہی سے اس
کے دوسرے پیر میں موجود ہے۔ الکبیر نے تعریف
کے پل باندھ دیئے "بومبا واقعی بہادر ہے
اس نے ہمیں شیر سے نجات دلا دی۔ بومبا زندہ

ہم تمھیں کیا انعام دیں؟"

"اے بادشاہ! مجھے ایک چیز کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے اور وہ یہ کہ قولی سے مجھ کو سنہرا اسٹول واپس لینا ہے۔"

لیکن الکبیر قولی کا نام سنتے ہی دہل جاتا تھا اور اس کی طاقت دیکھ کر اس کے خلاف جنگ کرنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔

"ایک کام اور ہے اسے پورا کر دو۔" اس نے بومبا کو جواب دیا۔ "یہاں سے شمال میں ایک دوسری سلطنت ہے۔ وہاں کے مویشی سفید ہیں۔ اور ہمیں بہت پسند ہیں۔ ایسے مویشی اور کہیں نہیں ملتے۔ تم وہاں جاکر کچھ سفید مویشی ہمارے لیے لادو۔ پھر ہم سونے کا اسٹول واپس دلانے میں تمھاری مدد کریں گے۔"

بومبا ایسا تو تھا نہیں کہ رات میں جا کر چپکے سے چوری کر لائے۔ وہ تو لڑنا جانتا تھا۔ اس زمانے کی رسم کے مطابق وہ اس بات کے لیے تیار تھا کہ الکبیر کے سپاہیوں کی رہنمائی کرے اور جنگ جیت کر وہ سفید مویشی لادے۔

جنگ ٹھن گئی۔ بومبا شیر کی طرح لڑا اور جنگلی جانور کی طرح بادشاہ پر جھپٹ پڑا۔ فتح اس کے سر رہی۔

بومبا جتنا بہادر تھا۔ اتنا ہی شریف بھی تھا۔ جنگ جیتنے کی وجہ سے سارے سفید مویشی اس کے تھے۔ لیکن اس نے ان میں سے محض آدھے لیے۔ اس نے الکبیر کے سپاہیوں کو لوٹ مار کرنے اور غلام بنانے سے بھی روک دیا۔

سپاہی برہم ہو گئے۔ وہ خالی ہاتھ گھر نہیں لوٹنا چاہتے تھے۔ انھوں نے کھلے بندوں یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہمارا سردار دغاباز ہے۔ انھوں نے الکبیر سے شکایت کی کہ نصف مویشی پر اس نے ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ بومبا کو موت کی سزا دی جائے۔

الکبیر نے قولی کے خلاف جنگ کرنے کا جو وعدہ کیا تھا اسے ٹالنے کا یہ اچھا بہانہ تھا۔

اصرار پہ اصرار اور مطالبہ پہ مطالبہ کیے جانے پر وہ اس بات کو مان گیا کہ بہادر جوان کو ریگستان میں مرنے کے لیے جلا وطن کر دیا جائے۔

لیکن لڑکیاں اور الکبیر کے قصبے کی نئی بیبیاں نہیں مانیں۔

"بومبا نے ہم کو شیر سے بچایا ہے۔ اسے ہم مرنے نہیں دیں گے۔ ہم اپنے گھروں کی پروا نہیں کریں گے۔ نہ ہم بچے پیدا ہونے دیں گے۔"

شاہی چراگاہوں سے گھوڑے پکڑ پکڑ کر وہ بھی گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھ گئیں۔ ہوا کی تیزی سے وہ بومبا اور اس کے محافظ دستے کے قریب ٹپ ٹپ کرتی پہنچ گئیں۔

"بغیر نئی بیبیوں کے ہم لوگ کیسے رہیں گے

الکبیر نے کہا: "بومبا کو لوٹ آنا چاہیئے"

پھر اس نے اس کے پاس یہ کہلوا کر بھیجا۔

"بومبا! میں نے غلطی کی۔ واپس آجاؤ۔ میں تم کو اپنی فوج دوں گا تاکہ تم اپنا سنہرا اسٹول حاصل کرو"

بومبا نے پھر چڑھائی کر دی۔ الکبیر کے سپاہیوں کے بلم سورج کی روشنی میں چمکنے لگے۔ عورتوں نے گا گا کر اور دعائیں دے دے کر ان کو رخصت کیا سب کے حوصلے بلند تھے۔ بیویوں اور لڑکیوں نے بومبا کے بارے میں سپاہیوں کے ذہنوں کو بدل دیا۔

فوج لے کر جب بومبا اپنے وطن پہنچا تو ایک طرف اس نے فوج کو کھڑا کر دیا۔ خود کتے کی شکل بنا کر وہ قولی کے قلعہ میں گھس گیا۔

"یہ کیسا کتا ہے؟" قولی نے اس کتے کو دیکھتے ہی کہا۔ "دیکھنے سے یہ بومبا کا کتا معلوم ہوتا ہے لیکن وہ بھلا کہاں ہوگا۔ وہ تو اپنے مالک کے ساتھ کبھی کا مر چکا ہوگا جبھی تو وہ کبھی دکھائی نہیں دیا تھا"

"کیا تم کتے ہو؟ یا یہ کہ ایک جو جو ہو؟"۔ قولی نے اس سے اس طرح پوچھا گویا کہ کتا سوال کا جواب دے گا۔

افریقہ کے دوسرے ملکوں کی طرح اس ملک میں بھی جو جو کے جادو سے سبھی ڈرتے تھے۔

کتا فوراً غائب ہو گیا۔ اس کی جگہ بومبا موجود تھا۔ اسے دیکھتے ہی خوف کے مارے اس کا حلیہ بگڑ گیا۔

"بومبا! کیا تم ہو؟" اس نے چیختے ہوئے کہا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ جب تم یہاں سے بھاگ گئے تھے تو ریگستان میں بھٹکتے ہوئے کہیں مر گئے ہو گے"

"چچا جان! یہ میں ہی ہوں۔ اور دیکھ لیجیے میں زندہ ہوں" اس کے چہرے کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ وہ وہاں کھڑا رہا تاکہ قولی اسے اچھی طرح دیکھ لے۔ اور سنہرے جادو کو بھی سمجھ جائے جو کہ آس[illegible] بقری کو دیا تھا۔ اب بھی بھلا اس میں کوئی شک تھا کہ سنہرے اسٹول کا وہ سچا حق دار نہیں تھا۔

"الکبیر کی بھاری فوج لے کر میں آیا ہوں۔ وہ شہر کے باہر تیار کھڑی ہے۔" اس نے کہا۔ "آج رات میں اپنے آباؤ اجداد کا سنہرا اسٹول تم سے چھین لوں گا۔ یہ بھی یاد رکھو کہ آج رات کو تمھیں مرنا ہے اور میں تمھیں کسی طرح چھوڑوں گا نہیں"

جنگ چھڑ گئی۔ قولی کی فوج نے مقابلہ کیا لیکن سچ یہ ہے کہ وہ بہت بہادری سے نہیں لڑی۔ شاید سپاہی پوشیدہ طور سے بومبا کے استقبال کے لیے دل ہی دل میں خوش تھے۔ چنانچہ آخر میں فتح بومبا کی رہی۔ ملک کے کونے کونے میں خوشی کے نعرے گونج اٹھے۔

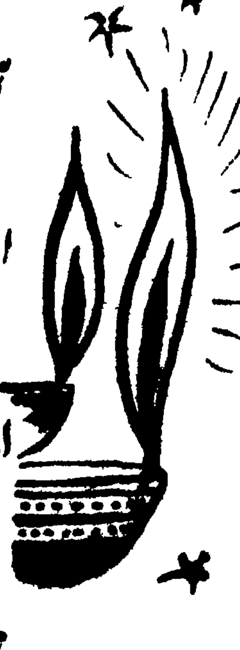
بومبا نے تخت چھین لیا۔ وہ واپس آگیا

باقی صفحہ … پر

جناب عادل جعفری

دیوالی

دیوالی کہ تہوار ہے پُر نور و ضیا
ہر سال جب آتا ہے بصد صدق و صفا
ہر گھر کی سلیقے سے صفائی کے بعد
خوش ہو کے عقیدت سے جلاتے ہیں دیا



اے کاش! ہر اک گھر کی صفائی کی طرح
سب خانۂ دل کی بھی صفائی کرتے
اے کاش! اسی رات سے ہوتا دستور
نفرت نہ کسی بھائی سے بھائی کرتے



ہر گھر کو دیے کرتے ہیں جیسے روشن
یہ ویسے ہی ہر دل کو بھی روشن کرتے
جیسے کہ نہیں فرق من و تو ان میں
آپس میں یونہی شیخ و برہمن رہتے

محترمہ آصفہ مجیب

چند دن انقرہ میں

(۲)

گوشت اور ترکاریاں بہت مہنگی ہیں۔ کوئی ترکاری ایک کلو پانچ لیرا سے شاید کم نہیں۔ گوشت ایک کلو سولہ لیرا کا۔ ایسی ہی مرغی گراں ملتی ہے لیکن گوشت مرغی کچھ لیجیے صاف ستھری بنی پیک کی ہوئی مل جاتی ہے۔ دم بھر میں تیار نہ بنانے صاف کرنے کا جھگڑا نہ بکھیڑا۔ سوزانہ نے بڑے مزے کا نفیس کھانا پکا کر کھلایا۔ انگریزی ہندوستانی سب ہی قسم کا کھانا پکانا جانتی ہے۔ اور اپنی ملنے والیوں سے نئی چیزوں کی ترکیبیں پوچھ کر بڑی جلدی سیکھ لیتی ہے۔ دن بھر سارا کام بڑی پھرتی سے کرتی ہے۔ کسی وقت میں تھوڑی سی مدد کرتی تھی تو وہ منع کرتی "نہیں امی جان آپ نہ کیجیے میں کروں گی۔"

میں کہتی "میرا جی نہیں مانتا" سوزانہ مسکراتی۔ میرے اس جواب پر ایک دن اس نے کہا "اردو کا یہ جملہ مجھے بہت پسند ہے "جی نہیں مانتا"۔

یہاں گھریلو کاموں کے لیے ملازم نہیں ملتے۔ عام طور سے ہفتے میں ایک دو بار کوئی ملازمہ کچھ دیر کے لیے آکر گھر کی صفائی وغیرہ کر جاتی ہے اور اپنی اجرت لے کر چلی جاتی ہے۔ ویسے گرد غبار نہیں ہوتا۔ بغیر جھاڑے سب صاف پڑا رہتا ہے۔ نہ کہیں مکھی مچھر نظر آئے۔

ایک دن میوزیم دیکھنے گئے۔ اس کی عمارت بلندی پر ہے۔ سنگِ مرمر کی بہت سیڑھیاں ہیں۔ جن کے دونوں طرف شیر بنے ہیں۔ بہت شان سے بیٹھے ہیں۔ سامنے اتاترک مصطفےٰ کمال کا سیاہ پتھر کا مجسمہ گھوڑے پر سوار نصب ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ان کا مقبرہ نظر آتا ہے۔ میوزیم کے ہال میں جا کر تو نظر حیران تھی کہ کیا کیا دیکھیں۔ ایسے ایسے نقش و نگار کے قالین کہ آدمی دیکھتا رہ جائے۔ ترکی خواتین کے پرانے زمانہ کے چم چم کرتے لباس ان کے مجسمے بنا کر پہنائے تھے جو شیشے کی الماریوں میں کھڑے تھے۔ سونے چاندی کے زیور، سادے اور جڑاؤ شیشے کے کیس میں سجے تھے۔ لکڑی کی کھڑاویں۔ شالیں جامہ وار۔ تانبے کی بڑی بڑی منقش سینیاں، رکابیاں، پیالے، شمع دان، سلفچی۔ لکڑی کا نفیس کام کا سامان الگ۔ صندوق، تخت، دروازے دوسری طرف نظر اٹھائی تو شیشے کے کیس میں بہت

خوشخط لکھی ہوئی قلمی کتابیں قرآن شریف، سونے سے مرصع۔ ایک جگہ عالموں اور فقیروں کے لباس۔ عمامے۔ پگڑیاں وضع وضع کی، کئی کمروں میں چکر لگا کر دیکھا ہر چیز سے ترکی کی پرانی تہذیب فن۔ اور رہن سہن کا پتہ چلتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے میں تھک گئی اور شوق پورا نہ ہوا۔ کونیا جانے کا پروگرام بنا۔ یہاں ایک بڑے بزرگ مولانا جلال الدین رومی کا مزار ہے۔ آپ میں سے بہت سے ان کے بارے میں جانتے ہوں گے کبھی ان کی مشہور مثنوی سنی ہو گی۔ یہ ایک خاص لَے سے پڑھی جاتی ہے۔ تو کلام کی تاثیر اور بڑھ کر بہت سی اچھی اور سچی باتوں کے درمیان میں جو اشاروں اور مثالوں سے بتائی گئی ہیں آدمی کو جیسے اس میں ڈبو دیتی ہے۔

امین کے دوست کبیر صاحب نے بڑی عنایت کی ہم لوگوں کو اپنی موٹر پہ لے گئے۔ ان کی بیگم صاحبہ اور بیٹے بھی ساتھ تھے۔ لمبا سفر تھا اسی دن واپس آنا تھا۔ اس لیے بچوں کو نہیں لیا کہ پریشان ہوں گے۔ ان کی وجہ سے ان کی ماں بھی رہ گئی۔

کونیا شہر انقرہ سے ڈھائی سو کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ ہم نے دوپہر کا کھانا ساتھ لے لیا اور صبح نو بجے گھر سے چلے۔ راستہ میں موٹر کے پہیوں میں ہوا بھروائی اور سب جانچ کرائی کہ ٹھیک ہے۔ خوش قسمتی سے موسم خوشگوار تھا۔ بادل چھائے تھے۔ کبھی ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگتی پکی سڑک پہاڑ ٹیلوں پر بل کھاتی اور کہیں میدان تک سیدھی چلی گئی ہے۔ راستہ میں گل پاشی ایک بڑی جھیل پڑی۔ اس سے سینچائی کا کام لیا جاتا ہے۔ یہ علاقہ بہت زرخیز ہے۔ گیہوں کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ کئی گاؤں پڑے۔ ہر گاؤں میں بچوں کے اسکول ہیں۔ پچھلے دس برس میں حکومت نے بائیس ہزار اسکول کھولے۔ اور ستائیس اٹھائیس ہزار مسجدیں لوگوں نے چندہ کر کے بنوائیں۔

دو جگہ موٹر روک کر ہم نے تھرماس سے گلاسوں میں چائے لے کر پی۔ چائے نے بڑا مزا دیا اور بنی بھی اچھی تھی۔ ایک بجے کونیا پہنچ گئے۔ وہاں کوئی مناسب جگہ کھانا کھانے کی تلاش کرنے لگے۔ ایک پارک میں جس کا تھوڑا حصہ پھول پتیوں سے ڈھکا تھا۔ میز کرسیاں لگی تھیں وہاں اترے۔ معلوم ہوتا ہے یہ مسافروں ہی کے لیے بنایا گیا ہے۔ اور لوگ بھی تھے۔ وہاں کھانا کھا کر مزار پہنچے۔

پہلے ایک صحن ہے۔ ایک طرف جوتے ایک آدمی کو سپرد کر کے ہال میں داخل ہوئے یہ بہت بڑا ہے۔ سیدھی طرف مزار بنے ہیں۔ پہلا مزار حسام الدین چلپی کا ہے۔ انھوں نے مولانا کی مثنوی لکھی تھی۔ اس طرح کہ وہ بولتے جاتے تھے اور یہ لکھتے جاتے تھے۔ اس کی ایک تصویر بھی لگی ہے۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔ مولانا کا ایک ہاتھ ذرا سا اٹھا ہے۔ ان پر ایک کیفیت طاری معلوم ہوتی ہے حسام الدین چلپی بڑی محویت سے سر جھکائے قلم ہاتھ میں لیے لکھ رہے ہیں۔ ان کے بعد مولانا روم کا مزار ہے۔

اونچا بنا ہے۔اس پر بہت قیمتی کامدار قبر پوش پڑا ہے۔ آخر میں ان کے بیٹے کا ہے۔ فاتحہ پڑھ کر آگے بڑھے۔ ہال کے دائیں طرف ایک اور راستہ جاتا ہے۔ اس کے تین طرف کمرے بنے ہیں۔ جہاں اس زمانہ کا پورا نقشہ دکھایا ہے۔ ایک کمرے میں بڑے بڑے بزرگ بیٹھے تھے۔ ایک میں گانے والے، ہال کے بیچ میں رقص ہوتا تھا۔ پوری محفل کا نقشہ ایک تصویر میں بھی کھینچا ہے جو سامنے دیوار میں لگی ہے۔ اوپر کا حصہ خواتین کے لیے بنا ہے۔ ہال کے باہر بھی کئی کمرے ہیں جن میں پلنگ چوکی جائے نماز وغیرہ بچھا کر مولانا کے بیٹھنے کا طریقہ اور مشاغل بتائے ہیں۔ اور بہت لوگ زیارت کرنے آئے تھے۔ کچھ خواتین کوٹ اور برقع پہنے تھیں۔ حالانکہ دوپہر کا وقت تھا اور گرمی تھی۔ یہاں ہر سال عرس ہوتا ہے۔ زائرین کی تعداد ہر سال بڑھتی جاتی ہے۔ ایک نقشہ لگا ہے جس میں اس کا حساب معلوم ہوتا ہے۔ پچھلے سال ۱۹۹۱ء میں چار لاکھ پچیس ہزار آدمی زیارت کرنے آئے۔ دور دور کے بھی تھے۔ پھر ایک مسجد دیکھی جو مزار کے قریب بنی ہے۔ یہ ترکی کے بادشاہ سلطان سلیم ثانی کی بنوائی ہوئی ہے۔ گنبد بہت بڑا ہے مگر باہر سے اتنا اونچا نہیں ہے جیسے ہندوستان میں ہمایوں کے مقبرے میں ہے۔ اس میں صحن نہیں ہے۔ یہاں ظہر کی نماز پڑھی۔ خواتین کے لیے الگ ایک حصہ ہے۔ میں نے دیکھا وہ خواتین میرے بعد بیٹھیں اور انھوں نے وہیں نماز پڑھی۔

ایک اور پرانی مسجد ہے۔ جو ترکی کے بادشاہ علاؤالدین غلجی نے بنوائی تھی۔ مگر اندر سے ہم اسے نہیں دیکھ پائے۔ علاؤالدین بادشاہ کے محل کے ٹوٹے پھوٹے آثار رہ گئے ہیں۔

اب ہمیں جانے کی جلدی تھی۔ اس لیے کہ شام ہی شام انقرہ پہنچنا چاہتے تھے۔ واپسی میں امین نے موٹر چلائی۔ تھوڑی دیر کبیر صاحب کے صاحبزادے نے۔ ہم ایسے وقت انقرہ پہنچ گئے جب اندھیرا ہو رہا تھا۔

ترکی کے کافی لوگوں سے ملنے جلنے کا موقع ملا۔ مجیب صاحب کے انقرہ آنے کی ایک سے دوسرے کو خبر ہوئی اور ملاقاتوں دعوت پارٹیوں کا سلسلہ بڑھ رہا تھا۔ ہندوستانی سفیر کے یہاں لنچ اور ریسپشن میں گئے۔ وہاں ہندوستانی بھی ملے۔ ہندوستانی فرسٹ سیکرٹری کے یہاں ایک روز ڈنر پر گئے۔ یہاں بعض ترکی کے ان لوگوں سے ملے جو ہندوستان آچکے ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ انھوں نے کشمیر کی بھی سیر کی۔ جتنے ترکی کے لوگ ہمیں ملے ان میں اتنا خلوص اور اپنائیت ہے کہ مل کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اور پھر ملنے کو جی چاہتا ہے۔

پروفیسر بلکان صاحب جو ترکی یونیورسٹی میں آرٹس کے شعبے کے پروفیسر ہیں۔ اور ان کی بیوی دونوں بہت اچھے اخلاق کے ہیں۔ انقرہ سے جانے سے ایک دن پہلے ایک جگہ دعوت میں مسز بلکان نے ہمیں دوسرے دن اپنے یہاں چائے پر

بلایا۔ اُس روز میری طبیعت ذرا خراب تھی۔ مگر میاں ان سے ملنے کو اتنا جی چاہتا تھا کہ ان کے گھر پہنچ گئی۔ دو منزلہ مکان تھا بہت سی سیڑھیاں چڑھنا پڑیں۔ وہاں آج پروفیسروں کا جمگھٹا تھا خواتین بھی تھیں۔ چائے کے بعد سب پروفیسر ایک طرف مل بیٹھے۔ ان میں پروفیسر چغتائی بھی تھے جو دینیات کے شعبہ کے پروفیسر ہیں۔ سب لوگ اس طرح گھل مل گئے جیسے ایک خاندان کے ہوں۔ جب ہم جانے لگے تو مسز بلکان نے کہا کہ ترکی میں جب کوئی لمبے سفر پر جا رہا ہو۔ رخصت کے وقت ایک رسم ادا کی جاتی ہے۔ سواری کے پیچھے پانی بہاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ سفر پانی کی طرح آسانی سے روانی سے طے ہو۔ اور جانے والا پھر خیریت سے واپس آئے۔ ہمیں بڑی خوشی ہوئی اس بات سے اور ہم شوق سے دیکھنے لگے کہ کیسے کرتی ہیں۔ وہ ایک جگ میں پانی لائیں۔ جب ہم سب سے خدا حافظ کہہ کر موٹر میں بیٹھ گئے۔ وہ سڑک پر پانی لیے کھڑی تھیں۔ جوں ہی موٹر چلی انھوں نے اس جگہ پر پیچھے کی طرف پانی بہا دیا۔ ہم سر گھما کر دیکھ رہے تھے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح پروفیسر چغتائی یونی ورسٹی دکھانے کے لیے مجیب صاحب کو لینے آئے وہاں لائبریری کی نئی عمارت بن رہی ہے اور اس کے ساتھ مسجد بھی۔

یہاں مسجدوں میں ایک یا دو دو اونچے اونچے مینار ہوتے ہیں۔ پانچوں وقت موذن مینار پر چڑھ کر اذان دیتے ہیں۔ اذان دینے کا انداز اور آواز اتنی سہانی اور خوش گوار ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے سُنیں ہی جائیں۔ اسی طرح مدینہ شریف میں سنی تھی۔

میلاد شریف اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ دسویں پندرھویں کسی نہ کسی گھر میں میلاد ہوتا ہے۔ اس کے بعد زوردار چائے کی پارٹی۔

۲۸ جون کو ہم بہت سی خوشگوار یادیں اور مسرتیں لیے ہوئے انقرہ سے روانہ ہوئے۔ جہاز لیٹ تھا دیر تک سب ایروڈروم پر بیٹھے رہے۔ دونوں بچوں نے خوب اودھم مچایا۔ کبھی اِدھر بھاگیں کبھی اُدھر، اتنی بڑی جگہ۔ ان پر نگاہ رکھنا مشکل تھا اور بچے بھی شامل تھے۔ امین سے کہا کھیلئے دیکھیے یہاں سے باہر نہیں جا سکتے۔ اتنے میں بٹیا نے پاس آکر پوچھا۔ بھیا کہاں ہے؟ سب گھبرا کے کھڑے ہو گئے۔ بھیا غائب تھا۔ ماں پریشان پھر رہی تھی۔ امین اِدھر اُدھر بھاگے۔ دیکھا تو حضرت وہیں کہیں ذرا ہٹ کر ایک امریکن لڑکے کے ساتھ جھولنے والی کرسی پر بیٹھے مزے میں جھولا جھول رہے ہیں۔ امین پکڑ لائے تب جان میں جان آئی۔ چلتے وقت سب کو چھوڑتے بڑا دکھ ہوا امین کی بچی بہت رو رہی تھی میں بھی چلوں گی۔ جی چاہتا تھا اسے چپکے سے گود میں بٹھا کر جہاز پر بیٹھ جاؤں مگر چاروناچار چھوڑ کر چلے آئے جہاز کی کھڑکی سے میں ان کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں بچے بڑے شوق سے ہاتھ ہلا رہے تھے بلکہ جی جان سے ہل رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اتنے دنوں ایسا لگا جیسے جنت میں رہے۔

جناب سید خواجہ معین الدین ام۔ اے۔ بی ایڈ



بچّوں کی راست بازی

فتح علی میسور کے سلطان تھے۔ ٹیپو سلطان کے نام سے مشہور تھے۔ وہ بڑے ہی نڈر اور بلا کے بہادر تھے۔ انگریز اُن کے نام سے چونک جاتے تھے۔ ان کے دو کم سن شہزادے تھے۔ ایک کا نام خلیق اور دوسرے کا مجاہد تھا۔ خلیق کی عمر دس سال کی تھی مجاہد آٹھ سال کا تھا۔ سلطان ان دونوں کو دل و جان سے عزیز رکھتے تھے۔

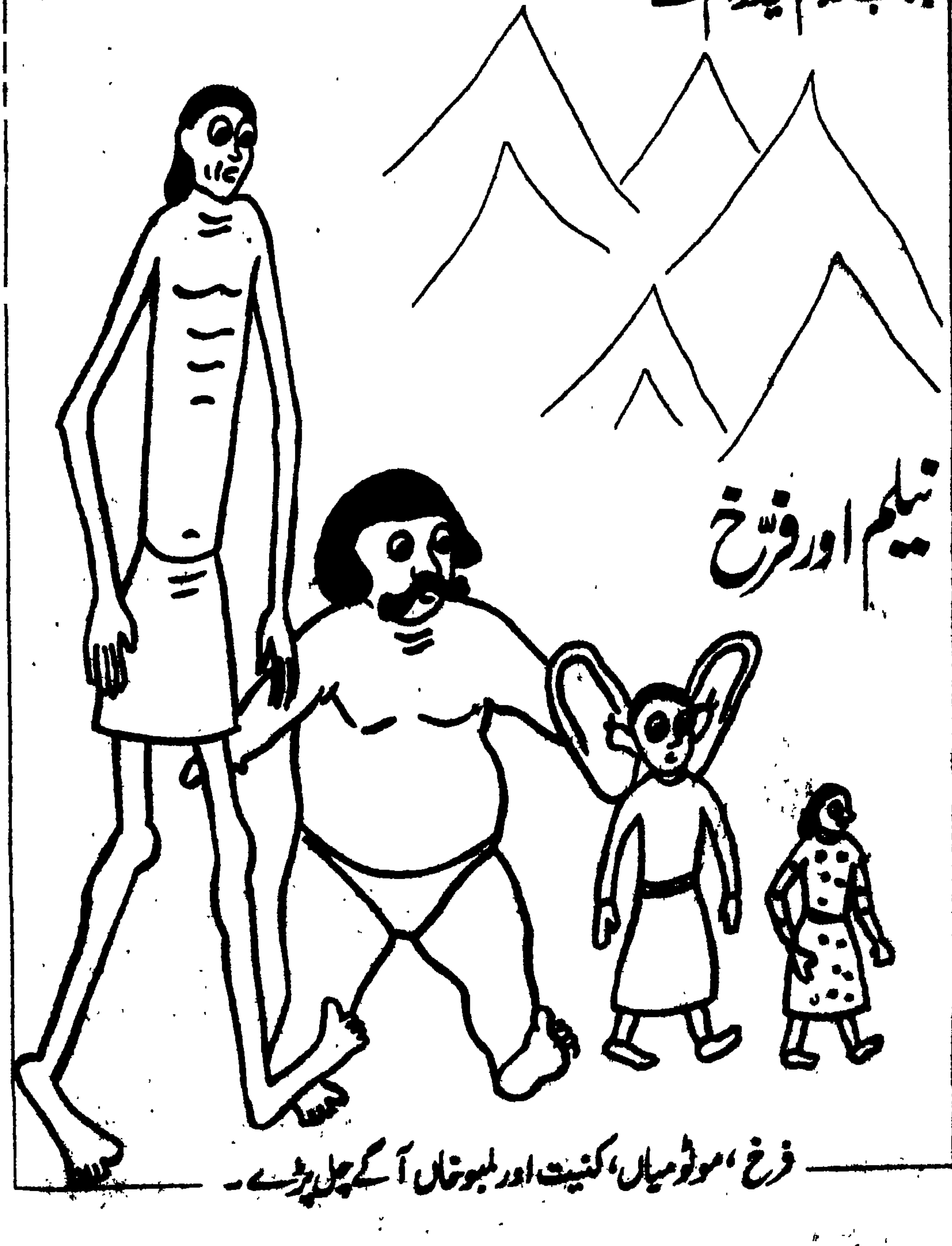
ٹیپو سلطان کو ایک بار انگریزوں سے لڑتے لڑتے بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں نے اول تو مرہٹوں سے ساز باز کیا اور کہا کہ دکن میں ٹیپو کی بڑھتی ہوئی قوت ہم دونوں کے لیے خطرے سے خالی نہیں۔ دوسرے یہ کہ ہم الگ الگ ہو کر سلطان کا مقابلہ کریں تو ہم میں سے کوئی بھی تنہا میدان میں اس کے مقابل کھڑا رہنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم دونوں مل کر ٹیپو کا مقابلہ کریں۔ مرہٹوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور انھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ انگریزوں نے سلطان کے کئی پہاڑی قلعے ان سے چھین لیے۔ اس لیے سلطان مجبور ہو کر سرنگاپٹنم پہنچے تاکہ وہاں کچھ تازہ دم فوج جمع کریں اور پھر انگریزوں سے لڑ کر اپنے قلعے واپس لے لیں۔ لیکن ان کی تمام کوششیں بے کار ہوئیں۔ تب سلطان نے انگریزوں کے پاس امن کا پیام بھیجا ——— انگریزوں نے دیکھا کہ سلطان اب دب کر ہمارے سامنے آ رہے ہیں اس لیے اس موقع کو غنیمت جان کر انھوں نے صلح کی شرطیں سخت کر دیں۔ پہلی شرط یہ تھی کہ سلطان اپنی آدھی سلطنت انگریزوں کے حوالے کر دیں۔ دوسری شرط تھی کہ سلطان اس جنگ کا پورا خرچ اپنے خزانے سے ادا کریں، تیسری شرط یہ تھی کہ سلطان پھر کبھی انگریزوں سے جنگ نہ کرنے کا وعدہ کریں اور اس کی ضمانت میں اپنے دونوں شہزادوں کو انگریزوں کی نگرانی میں دے دیں۔ سلطان نے سب شرطیں منظور کر لیں کیونکہ اس کے سوا ان کے پاس اور کوئی صورت نہ تھی۔

آخری شرط بہت کڑی تھی۔ سلطان نے سوچا۔ اگر شہزادوں کی جگہ کوئی اور دو بچوں کو انگریزوں کے حوالے کر دیں تو شہزادوں کی جان کو کوئی خطرہ نہ ہوگا۔ اور اگر طاقت جمع ہو جائے تو وہ انگریزوں سے دوبارہ جنگ بھی کر سکیں گے۔ اس لیے انھوں نے شہزادوں

بقایا صفحہ [illegible] پر

جناب غلام حیدر ایم اے

نیلم اور فرخ



فرخ، موٹو میاں، کنیت اور لمبو خاں آگے چل پڑے ۔

ابھی وہ کچھ ہی دور گئے تھے کہ انھیں چلچلاتی دھوپ میں ایک آدمی بیٹھا ملا۔ ان کا مارے گرمی کے بُرا حال تھا۔ پسینہ چوٹی سے ایڑی تک بہہ رہا تھا اور وہ آدمی ایسے بیٹھا تھا جیسے بہت سخت سردی میں لوگ دھوپ کھانے کے لیے بیٹھتے ہیں۔ ویسے بھی وہ سردی کی وجہ سے تھر تھرا رہا تھا۔ اس کے دانت سے دانت بج رہے تھے اور بات کرنا بھی مشکل تھی۔ سردی کے مارے اس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔ فرخ حیران رہ گیا۔

فرخ:۔ کیوں بھائی، تمھیں کیا تکلیف ہے؟ سورج اتنی تیزی سے چمک رہا ہے، ہمارا گرمی کے مارے بُرا حال ہے اور تم سردی سے تھر تھرا رہے ہو



آدمی:۔ بس یہی تو میری مصیبت ہے۔ جتنا سورج گرم ہوتا جاتا ہے۔ میری سردی بڑھتی جاتی ہے۔ بس مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یہ ایک برف کا بڑا سا گولا ہے جو ہر صبح کو نکل آتا ہے۔ اور جوں جوں اوپر چڑھتا ہے میرے جسم میں پھریری سی آتی رہتی ہے۔ دوپہر کو سردی سے میری ہڈیاں کا گودا تک جمنے لگتا ہے۔ پھر جب عام لوگوں کو سردی لگنی شروع ہوتی ہے تو میرے جسم میں گرمی آنی شروع ہوتی ہے۔ جب برف پڑتی ہے میں گرمی سے بھننے لگتا ہوں۔ جسے لوگ برفیلی ہوائیں کہتے ہیں وہ مجھے لو کے تھپیڑے لگتے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ میں برف کی آگ سے بھی گھبراتا ہوں اور آگ کی ٹھنڈک سے بھی پریشان رہتا ہوں۔ میری جان عذاب میں ہے۔

فرخ:۔ تم بھی عجیب آدمی ہو۔ تمھارا نام کیا ہے؟

آدمی:۔ مجھے بے وقت خاں کہہ سکتے ہیں۔

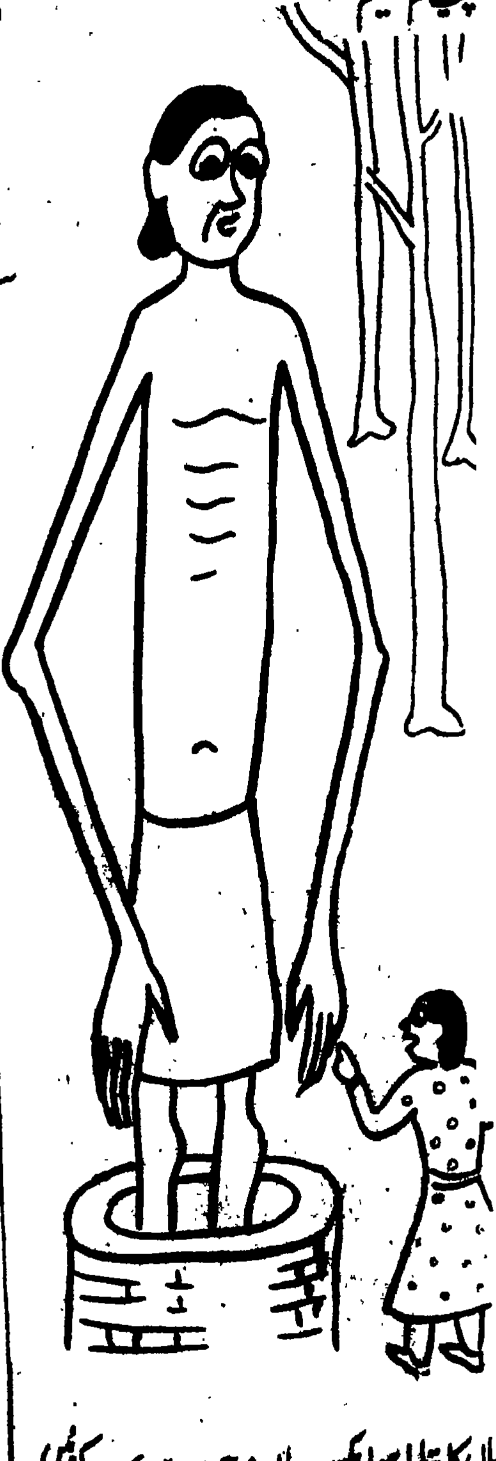
فرخ:۔ اچھا۔ ہاں تو بے وقت خاں اگر تم کوئی اور کام نہیں کرتے تو چلو میرے ساتھ میں تمھیں اپنے ساتھ رکھوں گا۔

اب پانچوں کے پانچوں آگے بڑھ گئے۔ کچھ دور جا کر جو چیز انھیں نظر آئی وہ بھی ایک آدمی تھا جو ایک کنوئیں کے کنارے پر بیٹھا اندر جھانک رہا تھا، جیسے وہ وہیں سے بیٹھا کنوئیں کے اندر کی



کوئی چیز اپنی آنکھوں سے ہی ڈھونڈ رہا ہو۔
فرخ:۔ کیوں بھائی تم اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟
آدمی:۔ میں کنوئیں کے نیچے پڑی ہوئی چیزیں دیکھ رہا ہوں۔ میری آنکھیں اتنی تیز ہیں کہ میں ہر چیز دیکھ سکتا ہوں گھنے جنگلوں کے پار کی چیز مجھے نظر آجاتی ہے۔ پہاڑوں کے پیچھے چھپے ہوئے منظر مجھے نظر آجاتے ہیں۔ اونچے سے اونچے پہاڑ اور گہری سے گہری کھائی میں چھپی چیز میری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ بس صحیح بات یہ کہ دنیا کی کوئی چیز میری آنکھوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔
فرخ:۔ تمھارا نام کیا ہے؟

آدمی:۔ مجھے سوآنکھا کہتے ہیں۔
فرخ:۔ اچھا تو پہلے ہم تمھارا امتحان لیں گے۔
آدمی:۔ ضرور۔
فرخ:۔ اچھا تو بتاؤ، تم نے اس کنوئیں میں کیا دیکھا؟
سوآنکھا:۔ یہ کنواں بہت گہرا ہے۔ کم سے کم دو سو ہاتھ نیچے اس میں پانی شروع ہوتا ہے۔ پھر کوئی تین سو ہاتھ گہرا پانی ہے جو بالکل کالا ہے۔ پانی کے نیچے کوئی پچاس ہاتھ گہری کیچڑ اور کائی کی تہہ ہے۔ اس کے بعد پتھر کا فرش ہے۔ یہاں اس فرش پر ایک لوہے کا بالکل کالا بکس پڑا ہے۔ اس بکس پر ایک ایک انچ کے قریب زنگ چڑھا ہوا ہے۔
فرخ:۔ کیا تم یہ بھی دیکھ کر بتا سکتے ہو کہ اس بکس میں کیا ہے؟
سوآنکھا:۔ یہ بکس، ہیرے اور زیوروں سے بھرا ہے۔
فرخ نے لمبو خاں سے کہا کہ وہ اس بکس کو نکال لیں۔ پہلے لمبو خاں کنوئیں میں اتر گئے جب ان کے پیر پتھر کے فرش سے لگ گئے تو ان کے گھٹنے کنوئیں سے باہر ہی تھے۔ وہ کھڑے تو ہو گئے مگر جھک کر تہہ تک ہاتھ پہنچانے میں ان کی [illegible] ہی آڑے آئی۔ [illegible] نے



ہاں کا بتلایا ہوا بکس وہاں موجود ہے۔ پھر وہ کنوئیں
سے باہر نکل آئے اور باہر بیٹھ کر انھوں نے کنوئیں



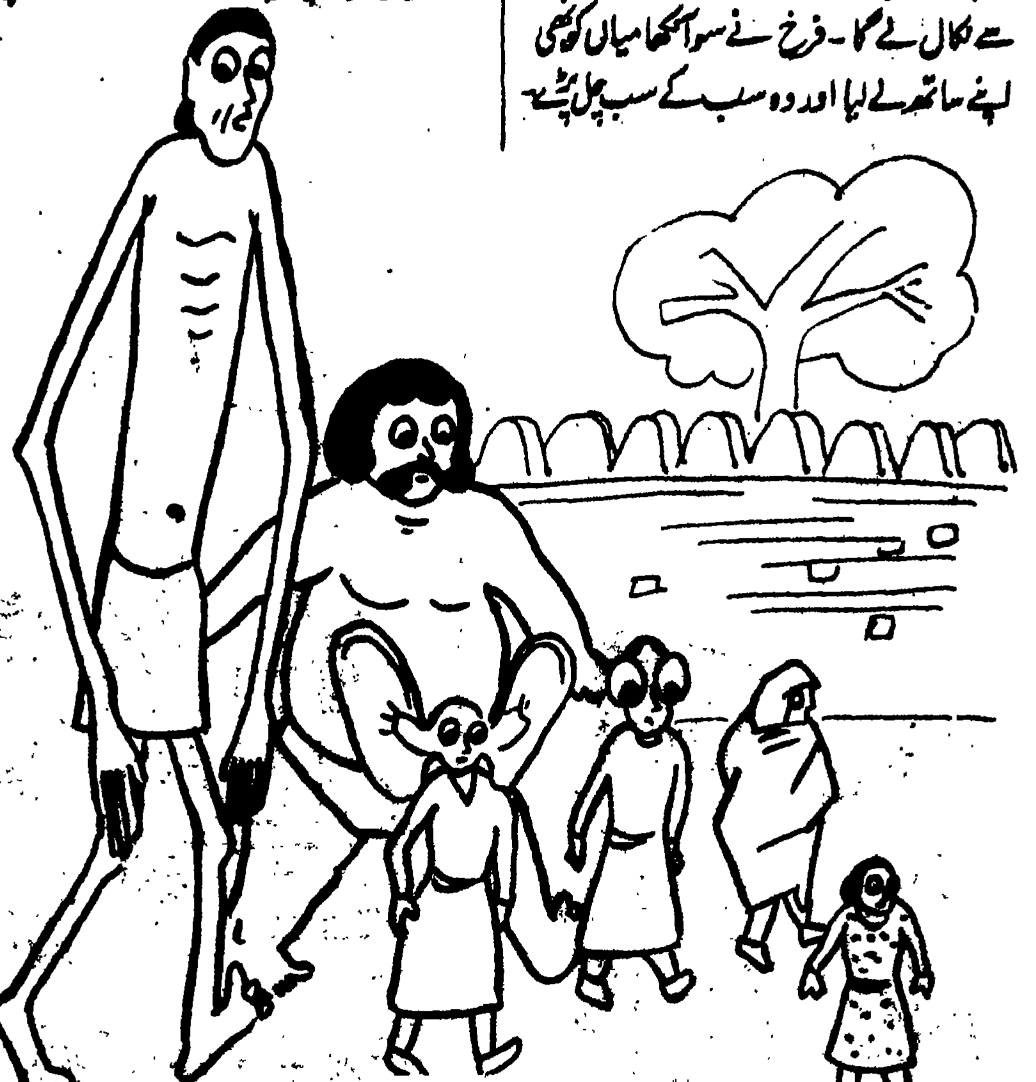
میں ہاتھ ڈال دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ کچھ ہیرا ونگ
سے بھرا ہوا بکس نکال لائے۔ بکس کھولا گیا تو



بیچ وہ تو ایسے چمک دار ہیرے جواہرات اور سونے کے زیوروں سے بھرا ہوا تھا جنھیں دیکھ کر آنکھیں چندھیا جائیں۔

شہزادہ فرخ نے یہ سوچ کر وہ بکس وہیں کہیں دبا دیا کہ جب واپس ہوگا تو اسے وہاں سے نکال لے گا۔ فرخ نے سوا لکھا میاں کو بھی اپنے ساتھ لے لیا اور وہ سب کے سب چل پڑے۔

اب انھیں راستہ میں کوئی اور نہیں ملا۔ آخر انھیں اس خوبصورت شہزادی کے شہر کی دیواریں اور محل کی عمارتیں نظر آنے لگیں۔ شہزادہ فرخ آج بہت ہی خوش تھا۔ جیسے ہی وہ شہر میں داخل ہوا ہے۔ وہ سیدھا ملکہ کے محل کی طرف چلا گیا اور فوراً اس نے ملکہ سے کہا۔



جناب نثار نگری

(بڑے پیامیوں کے لیے)



بچپن کے دوست

لب پر تمہارے آتے ہیں جب نام دوستو
بچپن کے یاد آتے ہیں ایام دوستو

پنچھی کی طرح اُڑتے تھے آزاد ہو کے ہم
کھاتے تھے کھیلتے تھے بہم شاد ہو کے ہم
کچھ رنج و غم سے ہم کو نہ تھا کام دوستو

واقف نہ تھے جہاں کے نشیب و فراز سے
ہم کتنے بے نیاز تھے ہستی کے ساز سے
آغاز جانتے تھے نہ انجام دوستو

کیا خوب تھی ہماری وہ ننھی سی کائنات
ہر روز، روزِ عید تھا، ہر شب شبِ برات
باقی ہے اب وہ صبح نہ وہ شام دوستو

مسلک ہمارا پیار تھا، ہم سب تھے ایک دل
مذہب سے بے خبر تھے مگر پھر بھی نیک دل
اب دل میں بس کے رہ گئے اوہام دوستو

بچپن نہیں رہا وہ فسانے نہیں رہے
وہ دن نہیں رہے وہ زمانے نہیں رہے
ملتا نہیں ہے دل کو اب آرام دوستو

بچپن کے وہ بکھر گئے جب سے حسین خواب
آلام زندگی کو ملے، دل کو اضطراب
اک تازہ واردات ہے ہر گام دوستو

تھا وقت کا تقاضا کہ ہم تم بچھڑ گئے
وہ پیار وہ خلوص کے نقشے بگڑ گئے
اس میں نہیں کسی پہ بھی الزام دوستو

کہتا ہے دل ملیں گے پھر ایک بار ہم تمام
مٹ جائیں گے دلوں سے جدائی کے غم تمام
آئے گا پھر بہار کا ہنگام دوستو

جناب غلام ربانی حیدرآباد

زہرہ

یہ سیارہ روشنی کا ڈلا سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب اُسے دوربین سے دیکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک چھوٹا سا چاند ہے اور ہمارے چاند کی طرح شکلیں بدل بدل کر دکھاتا ہے۔ کبھی ہلال کی ایک پھانک سی نظر آتی ہے۔ پھر بڑھتے بڑھتے آٹھویں چاند کی طرح نصف دائرہ روشن ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد چودھویں کے چاند کی طرح پوری ٹکیا دکھائی دیتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ گھٹنے لگتا ہے۔ گھٹتے گھٹتے اتنا باریک ہو جاتا ہے کہ دکھائی نہیں دیتا۔ چاند یہ ساری شکلیں ایک مہینے میں بدلتا ہے، زہرہ انیس ۱۹ مہینے میں (یہ شکلیں) بدلتا ہے۔

جب زہرہ کی روشنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے اس وقت چاند کی طرح اس کا چہرہ روشن نہیں ہوتا بلکہ ہلال کی طرح کا ہوتا ہے، بات یہ ہے کہ اس وقت وہ زمین کے بہت قریب ہوتا ہے، اس وقت اس کی روشنی آسمان کے ہر ستارے سے بیس گنی سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے۔ یہ سیارہ دن میں بھی دکھائی دیتا ہے۔

زہرہ ہماری زمین کی نسبت سورج سے زیادہ قریب ہے۔ اس لیے وہ زیادہ شعاعیں حاصل کرتا ہے۔ حساب سے معلوم ہوا کہ زمین کے مقابلے میں ۱ء۹ گنا زیادہ روشنی اور حرارت حاصل کرتا ہے۔ یہاں کا درجۂ حرارت کھولتے ہوئے پانی سے کچھ زیادہ ہے۔

چاند کی طرح ابھی زہرہ کا جغرافیہ تیار نہیں ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ زہرہ کے گرد سیکڑوں میل تک ہوا کا موٹا غلاف ہے۔ دنیا کی طاقتور سے طاقتور دوربین بھی زہرہ کی سطح کا حال نہیں بتا سکتی۔

یہ ایک خشک اور گرم دنیا ہے جس میں طوفانی ہوائیں اس زور سے چلتی رہتی ہیں کہ وہاں کی گرد سے ساری فضا تیرہ و تار ہو جاتی ہے اور وہاں کی سطح دکھائی نہیں دیتی۔

ہماری زمین ۲۴ گھنٹے میں اپنے گرد پھر جاتی ہے۔ اس محوری گردش سے دن رات پیدا ہوتے ہیں۔ زہرہ کی محوری گردش کا حال اب تک معلوم نہیں ہوا۔ دوربینوں کے ذریعہ اب تک اس کے جتنے فوٹو لیے گئے ان سے معلوم ہوا کہ زہرہ کا ایک ہی رخ ہمیشہ سورج کے سامنے رہتا ہے جس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ وہاں آدھے

ہے پر ایک طرف ہمیشہ دن رہتا ہے اور دوسری طرف ہمیشہ رات رہتی ہے۔

ستاروں کا علم جاننے والوں میں اب کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہو گئے ہیں، جو اس کی محوری گردش کو مانتے ہیں۔ بعض کے خیال میں یہ سیارہ تیس دن میں اپنے گرد پھر جاتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو زہرہ کا ایک دن ہمارے تیس دن کے برابر ہوتا ہے۔

تم کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ آسمان کے ان سب سیاروں کے وزن بھی معلوم کر لیے گئے ہیں۔

بھلا ان کو تولنے کے لیے اتنی بڑی ترازو اور وزنی باٹ کہاں سے آئے ہوں گے، پھر اس ترازو کو کون اٹھا سکتا ہے، یہ سب باتیں خیالی نہیں ہیں، بلکہ واقعی ہیں۔ تم نے اپنی کتاب میں کشش ثقل کا حال تو پڑھا ہوگا۔ ہماری زمین زہرہ سے کسی قدر بڑی ہے، اس لیے یہاں کشش بھی زیادہ ہے۔ زہرہ چونکہ زمین سے چھوٹا ہے، اس کی کشش بھی کم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہاں پر ہر چیز کسی قدر ہلکی ہوگی۔ حساب سے معلوم ہوا کہ زہرہ کی کشش ہماری زمین کی کشش کا ۹/۱۰ ہے۔ یعنی جس چیز کا وزن یہاں دس من ہے زہرہ پر اس کا وزن نو من ہوگا۔

وہاں ہمارا جسم بھی کچھ ہلکا ہلکا لگے گا۔ وہاں بھاگ دوڑ اور کود پھاند میں بڑی آسانی ہوگی۔ جو لڑکا یہاں پندرہ فٹ لمبا کودتا ہے، زہرہ پر وہ سترہ فٹ لمبی چھلانگ لگائے گا۔ فٹ بال کے کھیل میں مزہ آئے گا۔ جو لڑکا یہاں ۹۰ فٹ لمبی کِک لگاتا ہے۔ وہاں وہ سو فٹ لمبی کِک لگائے گا۔

ہماری زمین کو خدا نے چاند سا ایک خوب صورت بیٹا دیا ہے، ہم اسے چاند ہی کہتے ہیں۔ مریخ سیارہ بھی ہمارا پڑوسی ہے اس کے دو چاند ہیں مشتری کے گرد چار چاند چکتے ہیں۔ زحل کا خاندان بہت بڑا ہے۔ اس کے آٹھ چاند ہیں۔ مگر زہرہ کو ایک چاند بھی نہیں ملا ہے۔ یہ انوکھی دنیا ہے جس میں نہ آسمان ہے نہ چاند تارے۔

نیچے کے دائرے میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینے کے بعد آپ کی مدت خریداری ختم ہو جاتی ہے۔



ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے پیارے پیام تعلیم کی سرپرستی جاری رکھیں گے۔

براہ کرم مبلغ ۲ روپے کا منی آرڈر اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک بھیج دیجیے تاکہ یہ سلسلہ قائم رہے آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کو پرچہ پسند نہیں آیا۔ اور افسوس کے ساتھ اسے بند کر دیں گے۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے۔ آپ کا خریداری نمبر ـــــ ہے۔ منیجر

جناب مشہود مفتی



پرندوں کی چند انوکھی عادتیں



(۲)

انڈوں سے نکلے ہوئے چڑیا کے بچے دبلے پتلے ہوتے ہیں۔ ان کی چونچ نازک اور کم زور ہوتی ہے۔ پھر یہ انڈے کا سخت چھلکا توڑ کر کس طرح باہر نکلتے ہیں؟ جب بچہ انڈے سے نکلنے والا ہوتا ہے تو بچے کی بدنما چونچ کے اوپری حصے پر ایک سخت اور چھوٹا سا دانت ہوتا ہے جس سے وہ انڈے کو توڑ کر باہر نکل آتا ہے۔ باہر نکلنے کے دو ایک دن کے اندر یہ دانت جھڑ کر گر جاتا ہے۔

بچہ نکلنے کے بعد انڈے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چڑیا خود کھا لیتی ہے اور بڑے ٹکڑوں کو گھونسلے سے دور پھینک دیتی ہے تاکہ دشمن کو بچوں یا گھونسلے کا سراغ نہ مل سکے۔

چڑیوں کی خوراک بھی بہت ہوتی ہے چڑیا دن میں اپنے وزن سے آدھے کے برابر ضرور کھا جاتی ہیں۔ بچوں کے لیے چڑیاں دن بھر دانا لاتی رہتی ہیں۔ ایک بار چڑیوں کے ماہر ڈاکٹر آرتھر نے ایک چھوٹی چڑیا کے پھیرے شمار کیے تھے۔ اپنے بچوں کو بھرانے کے لیے اس ننھی سی چڑیا نے صبح سے شام تک اپنے گھونسلے کے ۲۷۰ پھیرے کیے تھے۔

چڑیا کے گھونسلے میں پہنچتے ہی تمام بچے اپنی گردنیں اٹھا کر اور چونچیں کھول کر چوں چوں کرنے لگتے ہیں۔ ایسی صورت میں چڑیا کے لیے یہ معلوم کرنا کہ کس بچے کا پیٹ بھرا ہے اور کون بھوکا ہے بہت مشکل ہے چڑیا بچے کے حلق میں خوراک ڈال کر غور سے دیکھتی ہے۔ اگر ٹکڑا اس کے حلق سے فوراً نیچے اتر جاتا ہے تو وہ اس کو اور کھلاتی ہے۔ اگر حلق سے ٹکڑا فوراً نیچے نہیں اترتا تو وہ اس کے حلق میں چونچ ڈال کر ٹکڑا نکال لیتی ہے۔ اور دوسرے بچے کے حلق میں ڈال دیتی ہے۔ قدرت کی طرف سے بچوں کے حلق کا نظام ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اگر بھوک نہ ہو تو ٹکڑا یا خوراک دیر تک حلق میں دکھائی دیتا ہے اور اس بھید سے چڑیا واقف ہوتی ہے۔

ننھی چڑیوں کے بچے ہفتے دو ہفتے میں گھونسلے سے نکلنے کے قابل ہو جاتے ہیں لیکن بڑے پرندوں کے بچے سال کے زیادہ حصے تک گھونسلے ہی میں

رہتے ہیں جیسے عقاب وغیرہ کے بچے۔ بہت سی چڑیاں تو انڈے سے نکلنے کے بعد ہی اڑنے اور اپنی حفاظت آپ کرنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ یہ چڑیاں ایسے انڈوں سے نکلتی ہیں جن کو چڑیاں سیتی نہیں۔ جیسے میگاپوڈس اور جنوبی پیسفک کی ماؤنٹ بلڈنگ برڈ۔

بچوں کے پر تھیلوں کی شکل میں ان کے بازوؤں میں چھپے رہتے ہیں جب بچہ ایک چوتھائی بڑھ جاتا ہے تو دھیرے دھیرے اس کے پروں کی تہیں کھلنے لگتی ہیں۔ رام چڑیا اور لگو کے بچوں کے پر اس وقت کھلتے ہیں۔ جب وہ پوری طرح بڑے ہو جاتے ہیں جب تک ان کے پر نہیں کھلتے یہ چڑیاں بالکل گوشت کی بڑھی سی بوٹی معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے پر کھلنے کا وقت آتا ہے تو چند گھنٹوں کے اندر کھل جاتے ہیں اور چند گھنٹوں میں پیروالی یہ گوشت کی بوٹی خوبصورت چڑیا بن جاتی ہے۔

چھوٹی چڑیاں عموماً پینتالیس پچاس میل کی رفتار سے اڑتی ہیں۔ کبوتر پچپن ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کرتے ہیں۔ آبی بطخیں ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار رکھتی ہیں۔ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا کی سب سے تیز اڑنے والی چڑیا کون ہے۔

متعدد چڑیوں کی رفتار ایک سی ہوتی ہے۔ چھوٹی چڑیاں جو فطرتاً تیز ہوتی ہیں۔ ان کی پرواز بھی تیز ہوتی ہے۔ ایسی چڑیاں ایک سو ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑتی ہیں۔ لیکن عام طور سے تیز ترین اڑنے والے پرندے شکاری پرندے ہیں مثلاً شاہین اور عقاب۔ شکار کا پیچھا کرنے کے دوران ان کی رفتار ۱۷۰ سے ۲۰۰ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔



کچھ چڑیاں پانی کے اندر بھی اڑتی ہیں۔ جیسے MURRES۔ اس چڑیا کے پر پانی کے اندر اسی طرح حرکت کرتے ہیں ہے جیسے فضا میں اڑتی ہوئی چڑیا کے۔ ایک دوسری چڑیا OUZEL ہے جو غوطہ لگا کر پانی کی تہہ میں اتر جاتی ہے اور اس طرح گھومتی پھرتی ہے جیسے کھیتوں میں چڑیاں گھومتی ہیں۔ اکثر و بیشتر یہ پانی کے اندر پروں کو پھیلا کر اڑتی ہے۔

آپ نے چڑیوں کو پیڑ کی شاخ پر بیٹھے بیٹھے سوتا ہوا دیکھا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ سوتے ہیں شاخ سے نیچے نہیں گرتی ہیں۔ چڑیا جب شاخ پر بیٹھتی ہے تو پنجے شاخ کے گرد خود بخود لپٹ جاتے ہیں۔ یہ انتظام قدرت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس کے پنجے مڑنے کا تعلق اس نس سے ہے جو چڑیا کے ٹخنوں کے جوڑ سے اوپر ہوتی ہے۔ چڑیا جب شاخ پر بیٹھنے لگتی ہے تو اس کے بوجھ سے جوڑ سے اس کے ٹخنے جھکنے لگتے ہیں اور اس نس کے ذریعہ

نیچے کھینچ کر گول ہو جاتے ہیں اور مضبوطی سے شاخوں کے گرد لپٹ جاتے ہیں اور چڑیا گر نہیں پاتی۔

موسم کے اعتبار سے بہت سی چڑیاں اپنے ٹھکانے بدلتی رہتی ہیں۔ ان کا نیا ٹھکانا سیکڑوں میل دور ہوتا ہے۔ لیکن ان کو راستے سے پوری پوری واقفیت ہوتی ہے۔ اس میں ان کی فطری صلاحیت کے علاوہ اور بھی چیزیں مددگار ہوتی ہیں۔ اپنے سفر میں اڑتے وقت زمین کی مقناطیسی لہروں سے انھیں ہدایت ملتی ہے۔ دریا اور پہاڑوں کے سلسلے ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ نئے پرندے پرانے اور تجربہ کار ساتھیوں کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ یہ سفر عموماً رات میں ہوتا ہے۔ ان کی اڑان کافی بلندی پر ہوتی ہے چونکہ سفر رات کا ہوتا ہے اس لیے ہم انھیں دیکھ نہیں پاتے۔ سفر کے دوران ان کی پرواز کی رفتار تعجب خیز ہوتی ہے۔ سمندر کو پار کرتے ہوئے چھوٹی سے چھوٹی چڑیا بھی سینکڑوں میل تک بغیر کہیں رکے ہوئے اڑتی ہے۔ طویل اور دور دراز کے سفر میں پانی کی ضرورت پڑتی ہے لیکن آبی چڑیوں کو پانی کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے۔ صرف سمندری پرندے سمندر کا کھاری پانی پی لیتے ہیں۔ ٹھیک اس طرح جس طرح ہم میٹھا پانی پیتے ہیں۔

ہر چڑیا کا اپنا ایک محدود زمین کا ٹکڑا ہوتا ہے جس پر صرف اسی کی عملداری ہوتی ہے۔ وہ گا گا کر اپنی عملداری کا اعلان کرتی رہتی ہے۔ اگر اس کی حد میں دوسری چڑیا آجاتی ہے تو وہ اسے مار کر بھگا دیتی ہے۔ چڑیاں عموماً اپنا قبضہ زمین کے اس ٹکڑے پر رکھتی ہیں جہاں انھیں پیٹ بھرنے کی آسانی ہوتی ہے یعنی ان کی خوراک کی چیزیں انھیں بہ آسانی مل جاتی — جس طرح بہت سے گھروں کا ایک مشترکہ لان یا پارک ہوتا ہے جسے ہر ایک استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اسی طرح پرندوں میں بھی زمین کا ایک مخصوص ٹکڑا ہوتا ہے۔ جو ہر چڑیا استعمال کر سکتی ہے۔ زمین کے اس ٹکڑے پر کوئی چڑیا اپنا قبضہ نہیں جتا سکتی۔

جناب کمل پرکاش



خرگوش میاں

خرگوش میاں ہیں دیکھو کھڑے
ہے چھوٹی دم اور کان بڑے
رنگ میٹیلا آنکھیں لال
بڑی تیز ہے ان کی چال
اینٹھ رہے ہیں اپنی مونچھیں
آؤ ان کا حال تو پوچھیں
ارے رے یہ تو بھاگ چلے
پوچھیں گے پھر اگر ملے

محمد عباس صدیقی۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ



گڑیا کا بیاہ

کردار:۔

شہناز:۔ دس بارہ سال کی لڑکی جس کی گڑیا کا بیاہ ہو رہا ہے۔

نسیمہ
عارفہ
نفیسہ
انیسہ
} شہناز کی ہم عمر سہیلیاں

منظر:۔ (ایک عام قسم کا کمرہ جہاں گڑیا کے بیاہ کا سامان کچھ تو ترتیب سے رکھا ہے اور کچھ اِدھر اُدھر بکھرا پڑا ہے۔)

عارفہ:۔ (گھبرائی ہوئی سی آتی ہے) ارے کچھ سنا تم نے! انیسہ خبر لائی ہیں کہ دولہا کی برات آدھے راستے تک پہنچ چکی ہے۔ یہاں تو ابھی کچھ بھی تیار نہیں۔

شہناز:۔ ہائے اللہ اب کیا ہوگا! انیسہ منّی ذرا تم ہاتھ بٹاؤ۔ سارا سامان بکھرا پڑا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے دادی جان آکر ساری چیزیں الٹ پلٹ کر گئیں

نسیمہ:۔ ارے گھبراتی کیوں ہو۔ ابھی تھوڑی دیر میں سب کچھ جما دیتے ہیں۔ تم ذرا باہر کا انتظام سنبھالو۔

شہناز:۔ کیوں، انیسہ برات میں کتنے لوگ ہوں گے؟

انیسہ:۔ خاصے لوگ ہیں۔ لیکن مجھے تو دو چار بوڑھے بھی نظر آئے۔

نفیسہ:۔ ہائے اللہ۔ بوڑھے! بوڑھوں کا بھلا گڑیا کے بیاہ میں کیا کام؟

ارے نہیں، وہ کوئی راہ چلتے لوگ ہوں گے۔

نسیمہ:۔ کہیں شاہدہ کے دادا جان اور ان کے دوست احباب تو نہیں؟

شہناز:۔ وہ بے چارے کیوں آنے لگے۔ ان سے تو ٹھیک سے چلا بھی نہیں جاتا۔

شہناز:۔ اچھا بھئی۔ آتے ہیں تو آئیں۔ بٹھا دیں گے انہیں ایک کونے میں۔

ارے عارفہ تم کھڑی کیا کر رہی ہو جاؤ چولہا

سنبھالو۔ چائے جلدی سے تیار کرو۔ بسکٹ
اور کیک کو ہاتھ نہ لگانے دینا۔ کم بخت
ندیدے بچے صبح سے بسکٹ اور کیک کی
تاک میں بیٹھے ہیں۔

انیسہ:۔ ارے کچھ سنا تم نے! باجوں کی آواز آرہی ہے۔

شہناز:۔ (خوش ہوکر) ارے سچ باجوں ہی کی آواز تو
ہے۔ بڑا مزا آئے گا۔
ارے ذرا اقبال میاں کو تو دوڑاؤ۔ دیکھیں
کتنے لوگ آرہے ہیں۔

نفیسہ:۔ اونھ۔ تمھیں تو بس لوگوں کی فکر ہو گئی۔
ارے آ گئے دس بیس لوگ زیادہ تو کیا قیامت
آجائے گی۔

شہناز:۔ ایسی بات نہیں نفیسہ۔ کہیں چائے کم نہ پڑ جائے۔
بڑی مشکل سے دو ہی کلو شکر تو ملی ہے۔ زیادہ
لوگ آگئے تو بڑی پریشانی ہو جائے گی۔

انیسہ:۔ ہائے اللہ! تو کیا دو کلو شکر میں میٹھا پکوان
بھی ہوگا اور چائے بھی بنے گی؟

شہناز:۔ ارے۔ میٹھے پکوان کے لیے الگ سے شکر
رکھی ہے۔

عارفہ:۔ رکھی ہے! یعنی کہ میٹھا ابھی تیار ہی نہیں ہوا؟

نسیمہ:۔ میٹھا تیار ہے بابا۔ میں نے خود تیار کیا ہے۔

عارفہ:۔ ٹھیک ہے۔ تو چلو میٹھا الگ الگ طشتریوں
میں جمادیں۔

انیسہ:۔ (باہر سے آکر) ارے غضب ہوگیا تم یہاں
بیٹھی فضول بک بک کر رہی ہو۔ اور ادھر
باورچی خانے میں میٹھے کا صفایا ہو رہا ہے۔
سارے پیٹو بچے طشتریاں بھر بھر کر نکال
رہے ہیں اور چٹ کر رہے ہیں۔

شہناز:۔ ہائے اللہ۔ یہ کیا مصیبت ہے۔ میں صبح
سے دیکھ رہی ہوں کہ یہ سارے بچے بس باورچی
خانے کے پاس ہی منڈلا رہے ہیں۔ سارے
عارفہ تم ذرا ناہید باجی کو تو بلاؤ۔

عارفہ:۔ نا بابا۔ ناہید باجی ڈانٹ دیں گی۔

شہناز:۔ اچھا انیسہ تم جاؤ۔ ان سے کہنا۔ سب بچے
میٹھے کا ناس مار رہے ہیں۔ بس ذرا دیر کے
لیے آجائیں۔ انھیں دیکھتے ہی سب بھاگ
جائیں گے۔

نسیمہ:۔ اچھا شہناز تم نے قاضی کو بھی بلایا؟

شہناز:۔ قاضی کو ہم تھوڑی بلاتے ہیں۔ وہ دولھا والے
خود ہی ساتھ لاتے ہیں۔

نفیسہ:۔ تو کیا سچ مچ کا قاضی آرہا ہے؟

شہناز:۔ نہیں رے۔ وہ جو عارفہ کی چھوٹی منی کو پڑھانے
کے لیے آتے ہیں۔ وہ آرہے ہیں۔

نسیمہ:۔ تو کیا وہ سچ مچ کا نکاح پڑھائیں گے؟

شہناز:۔ پتہ نہیں کیا کریں گے۔ مگر شاہدہ نے انھیں
بلا بھیجا ہے۔

عارفہ:۔ (ناہید دوڑتی ہوئی آتی ہے) ارے شہناز
باجی آرہی ہیں۔ مگر ان کے ساتھ دادی جان

بھی آرہی ہیں۔ انیسہ ذرا تم چلی جاؤ اور دادی جان سے کہو کہ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ وہ نماز کے لیے چلی جائیں تو پھر گھنٹہ بھر کی فرصت ہو جائے گی۔

عارفہ: مگر برات تو ابھی تک نہیں پہنچی ؟ باجوں کی آواز بھی نہیں آرہی ہے۔

شہناز: ارے ہاں سچ باجوں کی آواز بھی نہیں آرہی ہے۔ ذرا اقبال میاں کو تو دوڑاؤ کہیں راستے میں کچھ گڑ بڑ تو نہیں ہو گئی۔

انیسہ: گڑ بڑ کیا ہوتی۔ میں خود دیکھ آئی ہوں۔ برات ادھر ہی آرہی تھی۔

نسیمہ: ارے وہ کسی اور کی برات ہو گی۔ ہماری برات ہوتی تو اب تک پہنچ نہ جاتی !

نفیسہ: (باہر سے آتی ہے) لو سنو۔ شاہدہ کے گڈے کی برات تو ابھی گھر سے نکلی ہی نہیں۔ وہ کسی اور کی برات تھی ؟

شہناز: وہ دیکھو اقبال آرہے ہیں۔ شاید کچھ خبر لائے ہیں۔

(اقبال آتے ہیں)

اقبال: ایک خوش خبری لایا ہوں۔

شہناز: خوش خبری ! کیسی خوش خبری ؟

اقبال: شاہدہ کے گڈے کا انتقال ہو گیا۔ بیچارے شادی سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

شہناز: مذاق نہ کر میرے بھیا۔ سچ سچ بتا کیا بات ہے ؟

اقبال: ارے ہاں۔ میں سچ ہی تو کہہ رہا ہوں۔ شاہدہ کے بھیا ایاز میاں ملے تھے۔ انھوں نے کہا۔ گڈے میاں ٹوٹے پھوٹے پڑے ہیں اور اعجاز میاں نیا گڈا لانے بازار گئے ہیں۔

شہناز: (سر پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے۔ سب سہیلیاں گھیر کر اسے تسلی دیتی ہیں)

انیسہ: پریشان نہ ہو شہناز۔ ذرا دیر ہو جائے گی۔ مگر وہ لوگ آئیں گے ضرور۔

نسیمہ: مگر شہناز کی امی نے تو صرف مغرب تک کا وقت دیا ہے۔ وہ لوگ مغرب کے بعد آئے تو ؟

نفیسہ: وہ دیکھو شاہدہ کی چھوٹی بہن شاہینہ آرہی ہیں۔ شاید کچھ پیام لائی ہیں۔

شاہینہ: (سب کو سلام کرتی ہے۔) شاہدہ باجی نے آپ سب کو سلام کہا ہے۔ اور کہا ہے کہ برات آج نہ آسکے گی۔

سب ایک ساتھ: ہائے اللہ اب کیا ہو گا ؟

شہناز: ہوگا کیا سب تباہ ہو جائیگا میٹھا سا لے نیچیٹ کر جائینگے پلاؤ ستیاناس ہو جائیگی، بسکٹ کیک جھینگے کھالیں گے۔

انیسہ: مگر برات آج کیوں نہ آئے گی ؟

شاہینہ: بات یہ ہے کہ فیروز میاں نے گڈے کے ہاتھ پیر، سر دھڑ سب کچھ توڑ تاڑ کر

رکھ دیا ہے۔ اب اعجاز میاں دوسرا گڈا
لانے بازار گئے ہیں۔ آج کے آج نیا گڈا
دولھا کیسے بنایا جائے گا؟

شہناز: بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت آگئی۔ اب
ناہید باجی، امی جان اور دادی جان کو کون
سمجھائے گا۔ آج کی چھٹی اور پیسہ تو غارت
ہوگیا۔ خدا جانے اب کب موقع ملے گا۔

انیسہ: اچھا چلو۔ کل کا کل دیکھا جائے گا۔ سب مل
کر میٹھا تو کھالیں۔

شہناز: (ناامید ہوکر) چلو ورنہ میٹھا بھی صاف
ہوجائے گا۔

(سب مل کر جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے)

بچوں کی راست بازی کا بقایا

کو طلب کیا اور تنہائی میں ان پر اپنا ارادہ ظاہر کر دیا۔
شہزادوں نے جب یہ بات اپنے باپ کے منھ سے سنی تو دونوں نے یک زبان ہوکر کہا:۔ ٹیپو سلطان کے لیے ایسا کرنا سزاوار نہیں۔ یہ تو کھلا دھوکا ہے جس میں بیٹھے بٹھائے دو بے گناہ بچوں کی جان چلی جائے گی، بابا آپ نے جب وعدہ کیا ہے تو اس پر قائم رہیے۔ اللہ بڑا ہے۔ انشاءاللہ ہماری جانوں کو کوئی جوکھم نہ ہوگا۔

ٹیپو نے جب یہ بات اپنے بیٹوں سے سنی تو وہ بہت خوش ہوا۔ ان کی راست بازی کی داد دی اور بغیر کسی خوف کے انھوں نے شہزادوں کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔



لطیفہ

جج:۔ گواہ سے "کیا تم نے گولی چلاتے ہوئے دیکھا ہے"

گواہ:۔ "نہیں حضور میں نے صرف آواز سنی ہے"۔

جج:۔ تب تمھارا بیان قابلِ اعتبار نہیں ہے"

(گواہ منھ پھیر کر زور سے ہنستا ہے)

جج:۔ (غصے سے) "تم نے عدالت کی بے عزتی کیوں کی"

گواہ:۔ کیا حضور نے مجھے ہنستے ہوئے دیکھا ہے؟"

جج:۔ "نہیں میں نے تو صرف آواز سنی ہے"۔

گواہ:۔ "تو آپ کی بات قابلِ یقین نہیں ہے"

محمد یحییٰ

بہادر بومبا کا بقایا۔

ہے۔ وہی ہمارا عظیم اور سچا بادشاہ ہے"
اور عظیم سنہرے اسٹول پر جب اس نے اپنی گدی سنبھالی تو سپاہیوں نے بھی نعرے بلند کیے۔

اس وقت سے لے کر اب تک اشنتی قبیلے کے لوگ جو مغربی افریقہ میں رہتے ہیں بومبا کے بارے میں اس کے ایک سے ایک بہادری کارنامے سناتے چلے آئے ہیں۔



عزیزہ مہرنور (بنگلور)

وھیل — جو مچھلی نہیں ہے۔

آپ مچھلیوں کے بارے میں تو بہت کچھ جانتے ہوں گے۔ آیئے آج وھیل کے بارے میں کچھ باتیں بتائیں۔ شاید آپ سوچ رہے ہوں کہ کیا وھیل مچھلی نہیں ہے؟ نہیں بھئی، وھیل مچھلی کہاں سے آئی! اس کا تعلق تو دودھ پلانے والے جانوروں کے گروہ سے ہے۔ انسان بھی تو اسی گروہ میں ہے۔

سائنسی رو سے وھیل کو مچھلی کہنا بالکل غلط ہے۔ ہم اسے صرف پانی کا جانور کہہ سکتے ہیں۔ وھیل اور مچھلی میں کئی بنیادی فرق ہیں، دونوں میں بس اتنی یکسانیت ہے کہ وھیل بھی مچھلی کی طرح پانی میں رہتی ہے۔ اور ان کی شکل صورت مچھلی سے ملتی جلتی ہے۔

مچھلی کی رگوں میں ٹھنڈا خون دوڑتا ہے اور وھیل انسان کی طرح گرم خون والے جانور ہیں۔ یہ باقاعدہ پھیپھڑوں کے ذریعے کھلی ہوا میں سانس لیتے ہیں اور سانس لینے کے لیے ان کو ہر ۱۰ منٹ بعد اپنا سر پانی سے اوپر کر کے نتھنوں کے ذریعہ ہوا اندر لینی پڑتی ہے۔ لیکن مچھلیاں پانی میں گھلی ہوئی ہوا سے آکسیجن حاصل کر لیتی ہیں۔ پھر مچھلیاں انڈے دیتی ہیں ان سے بچے نکلتے ہیں۔ لیکن مادہ وھیل بچے دیتی ہیں۔ انھیں اپنا دودھ پلا کر پالتی ہیں۔

وھیل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کے دانت ہوتے ہیں۔ دوسری وہ جس کے دانت نہیں ہوتے بلکہ اوپر کے جبڑے میں بے حساب تکونی ہڈیاں سی لٹکی ہوتی ہیں۔ یہ قسم قوی ہیکل ہوتی ہے اس کے شکار کرنے کا طریقہ انوکھا ہے۔ یہ وھیل پہلے اپنے منھ میں پانی بھر لیتے ہیں۔ پھر اپنے منھ میں لگی ہوئی جالی سے پوری طاقت کے ساتھ نشانے پر پانی کی دھار کھینچ مارتے ہیں۔ اور بھی شکار زخمی ہو کر منھ میں آجاتا ہے۔

وھیل کی جلد سے بالکل نیچے چربی کی ایک موٹی تہہ ہوتی ہے۔ یہ تہہ اس کو ٹھنڈے پانی میں رہتے ہوئے بھی اپنی جسمانی حرارت برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ وھیل کی ایک اور خصوصیت ہے۔ مچھلی کی طرح ہر چھوٹے بڑے تالابوں یا دریاؤں

میں نہیں رہتے صرف سمندروں میں رہتے ہیں۔

وھیل بحرالکاہل جنوبی میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہاں رہنے والے "نیلے وھیل" کی لمبائی ۳۱ ہزار میٹر اور وزن ۳۰،۰۰۰ ٹن تک ہوتا ہے۔ وھیل کے قوی ہیکل ہونے کا اندازہ اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ اوسطاً ایک وھیل کے جبڑوں کی ہڈی کا وزن ۲ ٹن، کھوپڑی کا ۱/۲ ۴ ٹن، خون کا ۸ ٹن، گوشت کا ۵۶ ٹن، زبان کا ۳ ٹن اور چربی کی تہہ کا ۲۰ ٹن ہوتا ہے۔

وھیل کا گوشت تو نہیں کھایا جاتا، پر وھیل سے انسان کو فایدے بہت پہنچتے ہیں۔ انھی فایدوں کے سبب امریکہ اور دوسرے کئی ملکوں میں وھیل کا شکار کاروبار یا پیشے کے طور پر کیا جاتا ہے جبھی تو وھیل کا شکار اتنی کثرت سے ہونے لگا کہ ان کی نسل کے خاتمے کا اندیشہ ہو گیا اور اس ڈر سے کہ کہیں یہ سرے سے غائب ہی نہ ہو جائیں کئی ملکوں مثلاً (کنیڈا، ڈنمارک، فرانس، اور جنوبی افریقہ وغیرہ جہاں یہ شکار جاری ہے) نے مل کر ایک ادارہ "آئی ڈبلیو، سی" (INTERNATIONAL WHALING COMMISION) قایم کرلیا۔

اس ادارے نے ۱۹۶۶ء سے یہ قانون جاری کر دیا ہے کہ سالانہ صرف ۵۰،۰۰۰ وھیلوں کا شکار کیا جاسکتا ہے۔ یہ ادارہ مختلف خاندان کے وھیلوں کی عمر، لمبائی اور نسل بڑھانے کے وقفے وغیرہ کا مطالعہ کرنے والوں کو مدد دیتا ہے۔ خود بھی اپنے خاص عملے کے ذریعے یہ کام انجام دیتا ہے۔ اس ادارہ سے ہر بار اگلے سال شکار کے لیے وھیلوں کی تعداد مقرر کر دی جاتی ہے اور اس کے ممبر ملکوں کو شکار کی ہوئی وھیلوں کی تعداد یہاں پر باقاعدہ درج کرانی پڑتی ہے۔

وھیل کا شکار پہلے وھیل کی ہڈی اور تیل حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ چربی سے تیار کیا ہوا تیل جلانے کے کام آتا تھا اور ہڈیوں کی کمر پیٹیاں فیشن کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ بیمار "سپرم وھیل" کی انتڑیوں میں پایا جانے والا مادہ "ایمبرگس" جو بہت قیمتی ہے خوش بو بنانے میں استعمال ہوتا تھا۔ آج کل وھیل کے کئی اور فایدے نکل آئے ہیں۔

اب شکار کیے ہوئے وھیلوں کے گوشت ہڈیوں اور چربی کو پہلے علیحدہ کر کے گوشت ابال لیا جاتا ہے۔ پھر گوشت اور ہڈیوں کو ملا کر مرغیوں اور مویشیوں کی غذا تیار کی جاتی ہے۔ "مارگیرن" بنانے، چند دوائیاں اور کیمیائی کھاد FERTILSERS تیار کرنے میں بھی وھیل کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ دوسری بڑی لڑائی کے زمانے میں وھیل کے تیل سے دھماکا پیدا کرنے کا سامان بھی تیار کیا جاتا تھا۔

پہلے وھیل کا شکار بہت مشکل، خطرناک

اور جو کھم کا کام تھا۔ اس وقت نشانہ باندھ کر ہاتھ کی مدد سے ہارپون (وہیل کو مارنے کا آلہ اور ایک لوہے کی سلاخ) پھینکا جاتا تھا لیکن ۱۸۶۴ء میں ناروے کے ایک سائنس داں "سوینڈ فائن" نے "ہارپون بندوق" ایجاد کرلی۔ اس ایجاد کے بعد وہیل کا شکار آسان اور محفوظ ہو گیا۔ اب چھوٹی چھوٹی دخانی کشتیوں میں برقی ہتھیار لگا کر ان کا شکار آسانی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

یہ کشتیاں ایک کیبن والی موٹر بوٹ جتنی بڑی ہوتی ہیں اور ریڈیو اور راڈر کے ذریعے اپنے مرکزی جہاز سے رابطہ رکھتی ہیں۔ ان کے اوپر کے حصے میں "ہارپون گن" نصب ہوتی ہے۔ اس میں ۱۰۰ کلوگرام وزنی ہارپون لگے ہوتے ہیں۔ اس ہارپون کے سرے پر بارودی گولا بھی لگا ہوتا ہے۔ اس بندوق سے ۱۶ سے ۳۵ میٹر کے فاصلے کے اندر تاکے گئے نشانہ پر ہارپون چلا کر وہیل کو مارا جاتا ہے۔

آج کل ان کشتیوں میں ہوا کے پمپ بھی لگے ہوتے ہیں۔ ان سے مردہ وہیلوں کے پیٹ میں ہوا بھر دی جاتی ہے تاکہ مرکزی جہاز تک لاتے وقت وہ پانی کے اوپر ہی اوپر تیرتے رہیں۔ یہ مرکزی جہاز بھی کچھ چھوٹے موٹے نہیں ہوتے بلکہ ایک اچھی خاصی فیکٹری ہوتی ہے۔ ان میں ایک ہی وقت میں تیس میٹر لمبے نہ صرف تین سے زیادہ وہیل آسکتے ہیں بلکہ بیس ہزار ٹن تیل بھی رکھا جاسکتا ہے جو اسی جہاز پر وہیل کی چربی سے نکالا جاتا ہے اتنا ہی نہیں تقریباً سات سو ملازم بھی آٹھ مہینوں تک اپنی ضرورت کی عام چیزوں سمیت جہاز میں رہ سکتے ہیں۔

اس جہاز کے بالائی حصہ میں مردہ وہیلوں کی چربی الگ کرکے ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کیے جاتے ہیں۔ اس کام کے لیے آج کل بھاپ سے چلنے والے آرے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ آرے صرف چالیس منٹ میں اس قوی ہیکل جسم کو کاٹ کر رکھ دیتے ہیں۔

اب یہ شکار اتنا فائدے مند اور مقبول ہو گیا ہے کہ آسٹریلیا، برازیل اور کچھ دوسرے ملکوں نے سمندر کے ساحل پر بھی وہیل فیکٹریاں بنا لی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک وہیل کا شکار کرنے سے چالیس ہزار روپے کا فائدہ ہوتا ہے اور ایک بار کی مہم سے اندازاً چار سو پچاس لاکھ روپے ملتے ہیں۔

وہیل کے مسلسل شکار کے سبب اس کی نسل کے خاتمے کا خطرہ تو ہے لیکن آئی ڈبلیو سی کے اندازے کے مطابق پچھلے سال بحر منجمد شمالی میں کوئی ۳۱ ہزار باؤتے وہیلوں کا شکار کیا گیا اور حیرت کی بات ہے کہ اب بھی وہاں کوئی ساڑھے بیس ہزار وہیل موجود ہیں۔ ●●●

جناب آزاد بارانوی

آزادی کی صبح



ہر طرف چھائی ہے رحمت کی گھٹا آج کے دن
ہم پہ مائل بہ عنایت ہے خدا آج کے دن

کتنے پر کیف ہیں یہ ارض[1] و سما[2] آج کے دن
حسن ہر چیز میں ہے جلوہ نما[3] آج کے دن

س قدر آج عنادل[4] کے گلے ہیں شیریں
کیا معطر ہے گلستاں کی ہوا آج کے دن

ب[5] تاریک گئی صبح درخشاں آئی
مہر پُر نور نمودار ہوا آج کے دن

س سے حاصل ہوئی تاریخ وطن کو زینت
اُس نئے باب کا آغاز ہوا آج کے دن

ینکڑوں سال کی لعنت سے ملی ہم کو نجات
ملک محکوم تھا مختار ہوا آج کے دن

ب نفرت کو کریں، داغِ کدورت دھوئیں
کچھ نہ ہو دل میں محبت کے سوا آج کے دن

مجھ کے بہر حال ہمیں رہنا ہے
آؤ یہ باندھ لیں پیمانِ وفا آج کے دن

یونہی ہم شاد رہیں ایسے ہی آزاد رہیں
بس نکلتی ہے یہی دل سے دعا آج کے دن

[1] زمین [2] آسمان [3] ظاہر [4] عندلیب کی جمع بلبلیں [5] اندھیری رات

جناب م ندیم

ہارون رشید کا انصاف



ڈرامے میں کام کرنے والے

ہارون رشید
لکڑہارا
علی صیقل
داروغہ، سپاہی اور درباری وغیرہ

[پہلا ایکٹ]

پہلا منظر

[پردہ اٹھتا ہے۔ خلیفہ ایک تخت پر بیٹھا ہے۔
دو خادم پنکھا جھل رہے ہیں
لکڑہارا دو سپاہیوں کے ساتھ حاضر ہوتا ہے]

لکڑہارا۔ [زمین چومتا ہے] خدا خلیفہ کو سلامت رکھے حضور مجھ پر ظلم ہوا ہے۔ انصاف چاہتا ہوں۔

خلیفہ:۔ تم کو جو شکایت ہے صاف صاف کہو۔ تمہارے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔۔ اگر خلیفہ کے بیٹے نے بھی تمہارے ساتھ ظلم کیا ہوگا تو اس کو بھی سزا دی جائے گی۔ بتاؤ تم پر کس نے ظلم کیا ہے؟

لکڑہارا:۔ حضور میں ایک غریب لکڑہارا ہوں، صبح سے شام تک جنگل میں، دھوپ اور گرمی میں مارا مارا پھرتا ہوں، لکڑیاں اکٹھا کرتا ہوں ان کو بیچ کر اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔۔۔ حضور جس آدمی نے مجھ پر ظلم کیا وہ شہر بغداد کا مشہور حجام ہے۔۔۔

خلیفہ:۔ کیا نام ہے اس کا؟

لکڑہارا:۔ حضور اس کا نام علی صیقل ہے۔

خلیفہ:۔ کیا کیا ہے اس نے تمہارے ساتھ؟

لکڑہارا:۔ حضور اس کے ہاتھ میں وہ کمال ہے کہ لوگوں کے سر کے بال اپنے تیز استرے سے آنکھیں بند کرکے مونڈ سکتا ہے، کیا مجال کہ ذرا بھی خراش آجائے۔۔۔ تھوڑی

کے سارے بڑے چھوٹے لوگ اس کو جانتے
ہیں اور مانتے ہیں۔ قاضی، مفتی، اور کوتوال
اس کے دوست ہیں۔۔۔!

خلیفہ:۔ تو بہت ہوشیار ہے اپنے فن میں!

لکڑہارا:۔ مگر حضور، اس نے میری حجامت تو بغیر
استرے کے بنا ڈالی۔ مجھے دھوکا دیا۔۔۔
اور میری فریاد کسی نے نہیں سنی۔۔۔ قاضی سے
شکایت کی، مفتی کے پاس جاکر رویا، کوتوال
کے پاس بھی گیا۔۔۔ مگر سب نے مجھے
ہی قصوروار ٹھہرایا۔۔۔ اب آپ ہی انصاف
کرسکتے ہیں۔۔۔!

خلیفہ: تمھارے ساتھ ضرور انصاف ہوگا۔ مگر
پہلے تم پوری بات تو بتاؤ!

لکڑہارا:۔ بات یہ ہے حضور والا کہ میں پچھلے جمعہ کو اپنے
گدھے پر لکڑیاں لاد کر شہر میں بیچنے لایا۔۔۔
علی صیقل نے مجھے بلایا اور پوچھا: "اس
گدھے پر لدی ہوئی سب لکڑیوں کی کیا قیمت
ہوگی؟" میں نے قیمت بتائی۔۔۔ تھوڑے
مول تول کے بعد سودا طے ہوگیا۔۔۔ میں نے
لکڑیوں کا گٹھا اتار کر علی صیقل کی دکان پر رکھ
دیا۔ اس پر وہ چالاک حجام بولا کہ ساری لکڑیوں
کی قیمت طے کی ہے۔ اس میں گدھے کی کاٹھی
بھی شامل ہے۔ وہ بھی لکڑی ہی ہے۔ میرا
اور اس کا اس بات پر جھگڑا ہوا۔ بہت سے
لوگ اکٹھا ہوگئے۔ میری کسی نے نہ سنی سب نے
اسی کی بات ٹھیک بتائی، اس طرح میرے
گدھے کی کاٹھی اس چالاک آدمی نے اتروالی
۔۔۔ میں قاضی شہر، مفتی اور کوتوال کے
پاس گیا، سب نے یہی کہا کہ علی صیقل نے
ٹھیک ہی کیا۔

خلیفہ:۔ (مسکراتے ہوئے) میاں لکڑہارے، ہمیں
تمھارے ساتھ ہمدردی ہے۔
علی صیقل نے سودا گدھے پر رکھی ہوئی ساری
لکڑیوں کا کیا تھا۔۔۔ اس لحاظ سے اس کو
کاٹھی لینے کا حق پہنچتا ہے۔ خیر گھبراؤ نہیں۔۔۔
میرے قریب آؤ، تمھارے کان میں ایک
بات کہنا چاہتا ہوں۔۔۔۔

(لکڑہارا خلیفہ کے قریب آجاتا ہے خلیفہ اس
کے کان میں کچھ کہتا ہے۔ لکڑہارا خوش ہوتا ہے
زمین چومتا ہے اور واپس جاتا ہے۔)

(دوسرا منظر)

(خلیفہ تخت پر بیٹھا ہے۔۔۔ دو خادم پنکھا جھل
رہے ہیں۔۔۔ سامنے کی قطاروں میں کچھ درباری
بیٹھے ہیں۔
لکڑہارا داخل ہوتا ہے۔۔ (زمین کو چومتا
ہے)

لکڑہارا:۔ خلیفہ کی دہائی ہے۔۔۔ علی صیقل نے میرے
ساتھ زیادتی کی ہے۔ مجھے اپنی دکان سے
دھکے دے کر نکال دیا۔۔۔۔۔

خلیفہ:۔ (مسکرا کر) اچھا تمھارے ساتھ انصاف ہوگا۔ (داروغہ سے مخاطب ہو کر) علی صیقل کو فوراً حاضر کیا جائے!

(علی صیقل حاضر ہوتا ہے)

علی صیقل:۔ (زمین چومتا ہے) حضور کا اقبال بلند ہو

خلیفہ:۔ میاں لکڑہارے اب بیان کرو کیا بات ہے!

لکڑہارا:۔ حضور والا بات یہ تھی کہ میں آج علی صیقل کی دوکان پر حجامت بنوانے گیا۔۔۔ اور میں نے کہا "میاں علی صیقل کیا میری اور میرے ساتھی کی حجامت بنا دوگے۔" علی صیقل نے ہامی بھرلی اور کہا "ہاں میں تمھاری اور تمھارے ساتھی کی حجامت بنادوں گا۔۔ اپنے ساتھی کو بھی لے آؤ۔" میں اپنے ساتھی گدھے کو لے گیا اور کہا "یہ رہا میرا ساتھی اس کی حجامت بنا دو" اس پر علی صیقل بہت بگڑا مجھے برا بھلا کہا اور دھکے دے کر نکال دیا۔۔۔

خلیفہ:۔ علی صیقل کیا یہ بات سچ ہے کہ تم نے دونوں کی حجامت بنانے کی ہامی بھری تھی؟

علی صیقل:۔ حضور والا ۔۔۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ میں نے ہامی بھری تھی ۔۔۔ مگر آپ ہی انصاف کیجیے کہ آج تک کسی معقول آدمی نے نامعقول جانور گدھے کو ساتھی اور دوست کہا ہے اور اس کی حجامت بنوانے پر اصرار کیا ہے۔۔

خلیفہ:۔ مگر یہ تو قول و قرار کا معاملہ ہے اگر اپنے قول قرار سے پھر جایا کریں تو کون کس پر اعتبار کرے ۔۔۔۔ تو سنا ہے کہ کسی معقول آدمی نے گدھے لدی ہوئی لکڑیوں کے ساتھ گدھے کو بھی لکڑیوں کے ساتھ لینے پر اصرار ۔۔۔ تمھارے اور لکڑہارے کے درمیان بات طے ہوئی ہے اس کو پورا کرنا ہے۔ اب میاں لکڑہارے کی باری۔ تو گدھے کی حجامت بنانا پڑے گی

علی صیقل:۔ مگر۔۔۔ مگر، حضور والا میں نے آج تک کسی گدھے کی حجامت نہیں بنائی۔۔۔ بغداد میں بدنام ہو جاؤں گا۔۔۔ لوگ میرا مذاق اڑائیں گے۔۔۔۔

خلیفہ:۔ (غصے سے) اگر تم گدھے کی حجامت نہ بنائی تو سخت سزا کے لیے تیار رہو۔۔

علی صیقل:۔ (خوف سے کانپتا ہے) نہیں۔ حضور والا میں حجامت بناؤں گا۔

خلیفہ:۔ میاں لکڑہارے اپنا گدھا لاؤ۔۔ اشرفیوں کی تھیلی تم بہت دلچسپ ہو یہ اس کا انعام ہے۔

لکڑہارا:۔ (اشرفیوں کی تھیلی لیتا ہے) زندہ باد ہے۔ درباری ہنستے ہیں۔۔۔

(پردہ گرتا ہے)

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابن بطوطہ

(مسلسل)

سمرقند والے پیر اور جمعرات کو مزار پر حاضر ہوتے ہیں۔ چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ نذریں مانتے ہیں۔ گائے بھیڑ، روپیہ پیسہ درگاہ کے خادموں کی نذر کرتے ہیں۔ مزار مبارک پر گنبد ہے جس کے چار ستون ہیں۔ اور ہر پائے کے ساتھ دو ستون رنگین متصل ہیں۔ یہ امدادی ستون سنگ مرمر کے ہیں۔ دیواریں بھی سنگ مرمر کی ہیں۔ جن پر سونے کی منبت کاری اور نقش و نگار ہیں۔ گنبد کی چھت سیسہ کی ہے۔

مزار پر آبنوس کا کٹہرا ہے جس کے پایوں پر چاندی چڑھی ہوئی ہے۔ اوپر چاندی کی تین قندیلیں ہیں۔ باہر ایک بڑی نہر ہے جو خانقاہ میں ہو کر گزرتی ہے۔ نہر کے کنارے پر انگور اور چنبیلی کی بیلیں پھیلی ہوئی ہیں۔ خانقاہ میں بہت سے حجرے ہیں جن میں مسافر اور درویش ٹھہرتے ہیں۔ تاتاریوں نے اس درگاہ کی بے ادبی نہیں کی اور اب بھی حاضری دیتے اور نذر و نیاز چڑھاتے ہیں۔

میرے زمانے میں اس کی نگرانی امیر غیاث الدین محمد عبدالقادر عباسی کے سپرد تھی۔ یہ عباسی خاندان سے ہیں اور خلیفہ مستنصر باللہ کی اولاد میں ہیں۔

سلطان ماوراء النہر نے جن کا ذکر ابھی ابھی تم نے پڑھا ہے۔ انھیں مقرر کر دیا ہے۔

سمرقند کا قاضی صدر جہاں ہے بڑا عالم اور صاحب اخلاق ہے۔ میرے قیام ہند میں ہندوستان گیا تھا۔ مگر ملتان سے آگے نہ پہنچا کہ انتقال ہو گیا۔

سمرقند سے رخصت ہو کر ہمارا قافلہ ترمذ پہنچا۔ قدیم ترمذ دریائے جیحون کے کنارے بہت بڑا اور دولت مند شہر تھا۔

یہ وہ شہر ہے جہاں امام ترمذی پیدا ہوئے۔ اور جن کی کتاب ترمذی شریف نصاب حدیث میں شامل ہے۔

یہاں کے لوگ سر کے بال دودھ سے

دھوتے ہیں اور ہر ایک حمام میں دودھ کے بھرے ہوئے برتن رکھے رہتے ہیں۔ ہندوستان والے تل کے تیل سے سر کی مالش کرتے ہیں۔ اور کھلی سے دھوتے ہیں۔ اس لیے ان کے بال اور داڑھیاں لمبی ہوتی ہیں۔

بلخ :- یہ شہر اجاڑ اور غیر آباد ہے پھر بھی اس کی عمارتیں اتنی خوب صورت مضبوط اور پرکشش ہیں کہ ویرانی محسوس نہیں ہوتی۔ مسجد اور مدرسوں کے نقش و نگار اب تک باقی ہیں۔ اکثر عمارتوں میں لاجوردی منبت کاری اب بھی باقی ہے تہائی مسجدیں منہدم ہو گئی ہیں۔ کسی نے تاتاریوں سے کہہ دیا تھا کہ مسجد کے کسی ستون کے نیچے خزانہ ہے۔ جس کے لالچ میں ستونوں کو گرادیا اور مسجدوں کو مسمار کر دیا۔

بلخ کے باہر حضرت عکاشہ بن محصن الاسدی کا مزار ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔

مزار کے ساتھ ایک بڑی خانقاہ بنی ہوئی ہے۔ خانقاہ کے باہر پانی کا تالاب ہے۔ اس کے کنارے اخروٹ کا ایک درخت ہے۔ گرمیوں میں لوگ اس کے سائے میں آرام کرتے ہیں۔

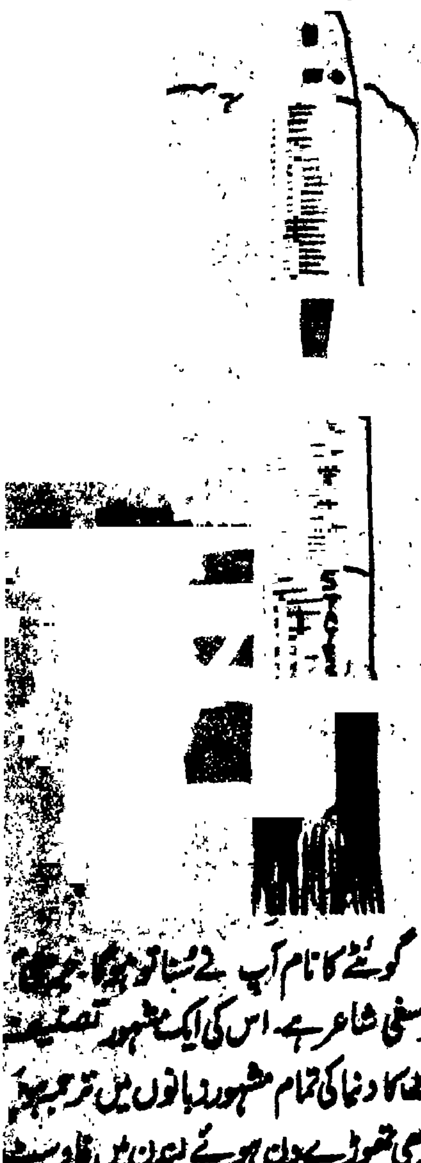
ایک اور مزار ہے جسے حزقیل علیہ السلام کا مزار بتاتے ہیں۔ بلخ میں حضرت ابراہیم ادھم کا محل بھی ہے۔ بلخ سے چل کر قہستان کے پہاڑوں سے گزرے۔ یہاں بہت سی خانقاہیں ہیں۔ پانی کی نہروں سے درخت بہت سرسبز تھے پھل بکثرت تھے۔ پھر ہرات گئے جو اس وقت خراسان کا سب سے زیادہ آباد اور بڑا شہر ہے۔

ہرات کا سلطان حسین معز الدین ابن سلطان غیاث الدین غوری ہے (۱۳۳۲ء) بڑا دلیر اور بہادر انسان ہے۔

ہرات کے صالح لوگوں میں مولانا نظام الدین بڑے پایہ کے بزرگ ہیں۔ شاہی خاندان سے ہیں۔ درویشی اختیار کرلی ہے حسین کے چچا زاد بھائی ہیں۔

ہرات سے ہم جام پہنچے۔ جام میں شہتوت کثرت سے ہیں ریشم بہت ہوتا ہے۔ شہاب الدین احمد الجام یہاں کے مشہور بزرگوں میں ہیں۔ پھر ہم طوس پہنچے جسے امام غزالی کا شہر کہا جاتا ہے۔

یہاں سے مشہد الرضی پہنچے جہاں علی بن موسیٰ الکاظم کا مزار مبارک ہے، یہاں پھلوں کی کثرت ہے۔ پانی کی چکیاں بھی جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ مشہد الرضی کے قریب مدرسہ اور مسجد بھی ہے۔ مزار کے قریب لکڑی کا چبوترہ ہے جس پر چاندی کے پتر چڑھے ہوئے ہیں اور چاندی کی قندیلیں ہیں۔ گنبد کا دروازہ چاندی کا ہے۔ جس پر زریں قسم کا پردہ پڑا رہتا ہے۔ برابر میں ہارون الرشید عباسی کی قبر ہے۔ ہارون الرشید عباسی کی قبر ایک بلند مقام پر ہے۔ جہاں شمع دان رکھے جاتے ہیں۔



ادھر ادھر سے

اپالو نمبر ۱۲ خلاء کی طرف

کیپ کنیڈی - ۱۰ - نومبر - اپالو نمبر گیارہ کی کامیاب اڑان کے بعد اب چودہ نومبر کو اپالو نمبر بارہ چاند کی طرف روانہ ہو جائے گا - اپالو نمبر ۱۲ کے کمانڈر، چارلس کونریڈ جونیئر ہیں (عمر ۳۹ سال) یہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء میں امریکہ کی دو شخصی جیمنی خلائی مشینوں میں اڑان کر چکے ہیں۔

چارلس کونریڈ کے ساتھی - رچرڈ ایف گارڈن جونیئر (۴۰ سال) نے اپالو نمبر ۱۲ کے کمان ماڈیول کے پائلٹ ہیں - یہ ۱۹۶۶ء میں ایک جیمنی مشق میں خلائی پرواز کر چکے ہیں - تیسرے صاحب ایلن امل بین ان کے لیے یہ پہلی خلائی پرواز ہو گی۔

اپالو نمبر ۱۲ اپالو نمبر گیارہ کے مقابلے میں زیادہ دیر تک چاند پر ٹھہرے گا - (تقریباً ۳۰ گھنٹے) اور تین بار چاند پر گھومے پھرے گا - اس مرتبہ وہ اپنے ساتھ ہندوستان کا جھنڈا بھی لے جائے گا۔ امریکی حکومت نے ہندوستانی حکومت سے یہ درخواست بھی کی ہے کہ اپالو نمبر بارہ کی اڑان کے وقت خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو کام آگے بڑھ جائے۔

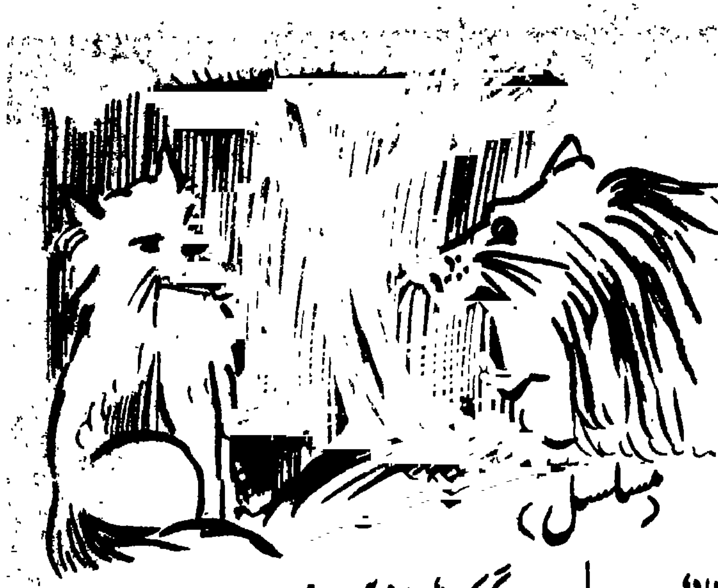
گوئٹے کا نام آپ نے سنا تو ہوگا جرمنی کا مشہور فلسفی شاعر ہے - اس کی ایک مشہور تصنیف فاوسٹ کا دنیا کی تمام مشہور زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے - ابھی تھوڑے دن ہوئے لندن میں فاوسٹ کے مسودے کی ۲۶ سطروں کا ایک لاکھ چودہ ہزار روپئے میں نیلام ہوا - یہ ۲۶ سطریں خود گوئٹے کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں اور کاغذ کے آدھے شیٹ میں آگئے ہیں

غزنی :- غزنیں میں محمود سبکتگین کی قبر دیکھی اور فاتحہ پڑھی ، سردی کے موسم میں غزنی والے قندھار چلے جاتے ہیں۔ پہلے یہ بڑا شہر تھا اب گاؤں ہے۔اس کے باشندے افغان ہیں۔ افغان اپنے کو بنی اسرائیل کی اولاد بتاتے ہیں۔

جولائی کے مہینے میں جب کہ بارش کا پانی گڑھوں میں جمع ہوجاتا ہے۔ سندھ کا صحرا پندرہ دن میں طے کیا اور ۱۲ ستمبر ۱۳۳۳ء کو پنجاب میں دریائے سندھ پر پہنچ گئے۔

اگلے پرچے سے اپ دہلی کے سات سو برس پہلے کے حالات پڑھیے گا۔

جناب محمد رفیق شاستری ایم۔اے



پنچ تنتر کی کہانیاں

شہری گدھا جنگلی دوست! (مسلسل)

بندر نے تب مگرمچھ کی یہ کہانی سنائی۔

کسی جنگل میں گھنے بالوں والا ایک شیر رہا کرتا تھا۔ اس شیر کی خدمت کے لیے ایک گیدڑ ہر وقت ساتھ لگا رہتا تھا۔ اتفاق کی بات ایک بار شیر کا سامنا ایک ہاتھی سے ہوگیا۔ مست ہاتھی نے شیر کو کافی زخمی کر دیا۔ بے چارے شیر کی ایک ٹانگ بھی ٹوٹ گئی۔ اور جنگل کے یہ بادشاہ سلامت شکار کرنے سے لاچار ہو گئے۔

مگر شکار کیے بغیر جنگل میں زندگی کیسے گذرتی۔

گیدڑ میاں کا حال تو اور بھی برا تھا بے چارہ شیر کی ہاں میں ہاں ملا کر اس کے بچے کھچے پر اپنا پیٹ پالتا تھا۔ اب شیر صاحب شکار سے معذور ہو گئے تو دونوں کی آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں۔

ایک دن شیر نے گیدڑ سے کہا کہ ذرا دوڑ بھاگ کر کے کسی طرح کوئی جانور میرے قریب لے آؤ میں اس کا شکار کر لوں۔ جانور پاس آجائے تو اس کا ہاتھ صاف کرنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ مگر کوئی جانور آسانی سے میرے پاس بھلا کاہے کو آئے گا! جا ذرا کوشش تو کر۔ دیکھ یہ اچھی طرح جان لے کہ ہم دونوں کا بھلا اسی ترکیب سے ہو سکتا ہے۔

گیدڑ شکار کی تلاش میں قریب کے گاؤں میں گیا۔ وہاں اس نے تالاب کے کنارے لمبے کان والے گدھے کو ہری ہری گھاس چرتے دیکھا۔ گیدڑ اس کے پاس گیا اور کہنے لگا "گدھے بھیا آداب! بہت دنوں بعد دکھائی دیئے۔ اتنے دبلے کیوں دکھائی دے رہے ہو۔ خدا نہ کرے دشمنوں کا مزاج تو ناساز نہیں ہے؟"

دھوبی میاں کے دن رات ظلم سہتے سہتے بہت دن بعد گدھے میاں کو ایک ہمدرد ملا تھا جو اس سے اس کی خیریت پوچھ رہا تھا۔ گیدڑ کی چکنی چپڑی باتوں سے اس کا جی خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ "بھائی گیدڑ کیا بتاؤں۔ دھوبی کے ظلم سے عاجز ہوں۔ ایک تو وہ بہت سارا گٹھر میری پیٹھ پر لاد

دیتا ہے اور اس پر ستم یہ کہ اگر ایک قدم بھی ڈھیلا پڑتا ہے تو پھر ڈنڈے سے تواضع کی جاتی ہے۔ گھر پر بھوکا ہی مرتا ہوں۔ جب کبھی گھاٹ پر آتا ہوں تو تھوڑی دیر یہی مٹی ملی گھاس چر کر پیٹ بھرتا ہوں۔ میرا تو یہی روز کا حال ہے۔ دنیا میں کوئی میرا حال پوچھنے والا نہیں۔ خیر سے تمھیں کیسے میری خیریت پوچھنے کی فکر ہوئی؟"

گیدڑ بولا: "بھائی گدھے اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ اگر جانور ہی جانور کے کام نہ آئے گا تو بھلا کون آئے گا۔ میں اِدھر سے گذر رہا تھا تمھاری حالت پر ترس آیا تو ذرا رک کر خیریت پوچھ لی۔ مگر تم یہاں پڑے کیوں ہو۔ پاس ہی جنگل میں ہری اور ملائم گھاس کا پورا میدان پڑا ہے۔ وہاں آرام سے رات دن گھاس چرنا۔ اس طرح تمھیں دھوبی کے ظلم سے چھٹی مل جائے گی۔ وہاں پڑے چین کی بانسری بجانا اور مجھے دعائیں دینا۔"

گدھے کو گیدڑ کی یہ بات پسند تو بہت آئی مگر جنگل کا نام سن کر اس کے دل میں خوف بھی پیدا ہوا۔ کہنے لگا: "بھائی گیدڑ، ہم انسانوں کے بیچ رہنے والے جانور ہیں۔ انسان کے ظلم سہنے کی ہمیں عادت ہو گئی ہے۔ جنگل میں تو بھیانک اور خونخوار جانور رہتے ہیں۔ وہاں کوئی جانور مجھے مار کر نہ کھا جائے۔"

گیدڑ بولا: "نہیں بھائی ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس جنگل میں میری حکومت ہے۔ کیا مجال جو کوئی تمھارا بال بیکا کر سکے۔ تمھاری طرح نہ جانے کتنے گدھوں کو میں دھوبیوں کے ظلم سے نجات دلا چکا ہوں۔ چل کر دیکھ لو وہاں تمھیں کئی گدھے ملیں گے جو آرام سے بسر کر رہے ہیں ——— تم جانور ہو کر ایک جانور کی زبان کا کچھ تو اعتبار کرو۔"

گدھے میاں گیدڑ کی باتوں میں آ گئے او گیدڑ کے پیچھے پیچھے اس جگہ آ گئے جہاں بھوکا شیر کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ شیر ابھی اپنا پنجہ اٹھا ہی ر تھا کہ گدھے میاں دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے گیدڑ اس پر بہت جھنجھلایا اور شیر سے کہنے لگا کس دم خم پر ہاتھی سے لڑے تھے۔ میں تو محنت کر کے اتنی دور سے گدھا پکڑ کر لایا اور اس کا بھی سے شکار نہ کرتے بنا۔

شیر شرمندہ ہوا۔ مگر کہنے لگا۔ "تم میرے پنجے کا حال جانتے ہو۔ بڑے بڑے ہاتھیوں کو میں نے اس سے پچھاڑا ہے۔ مگر اس بار میں ابھی حملے کے لیے تیار نہیں ہو پایا تھا۔ بھلا گدھے کی کیا مجال جو میرے پنجے سے نکل جائے۔"

گیدڑ بولا: "اچھا خیر میں ایک بار اور کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔ گدھے کو میں پھر لاؤں گا۔ دیکھنا اس بار وار خالی نہ جائے۔"

گدھے کی تلاش میں گیدڑ پھر نکل پڑا۔ اس نے دیکھا کہ گدھے میاں پھر اسی تالاب کے کنارے گھاس چر رہے ہیں۔

گیدڑ کو دیکھ کر گدھا بولا "بھئی تم خوب جگہ مجھے لے گئے تھے۔ ایک ذرا سا چوک جاتا تو بس خاتمہ ہو جاتا۔ بھلا وہ کون سا جانور تھا جو مجھے دیکھ کر اٹھ رہا تھا اور جس کے بھاری پنجے کا بوجھ اب تک مجھے اپنی پیٹھ پر محسوس ہو رہا ہے"۔

گیدڑ نے ہنستے ہوئے کہا "انسانوں کے بیچ رہتے ہوئے تم جانوروں کی زندگی اور اس کے آداب بالکل بھول چکے ہو۔ تم جس سے ڈر کر بھاگ آئے وہ بھی ایک گدھا ہی ہے۔ جنگل کی ہری ملایم گھاس چر کر ذرا موٹا تگڑا ہو گیا ہے۔ اس نے تو دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ مگر تم ٹھہرے بڑے شہری تمہیں وحشیوں کی "زوردار محبت" کا پتہ نہیں ہے۔ چلو وہ بے چارہ تم سے ملنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ بہت دنوں سے اس کی تم جیسے کسی شہری گدھے سے ملاقات نہیں ہوئی ہے"۔

گدھے میاں ٹھہرے بڑے گدھے۔ گیدڑ کی باتوں میں پھر آ گئے اور اس کے ساتھ پھر جنگل کی راہ لی۔ وہاں پہنچتے ہی شیر اس پر ٹوٹ پڑا اور اس کی بکا بوٹی کر کے رکھ دی۔ گدھے کو مار کر شیر تالاب میں نہانے چلا گیا۔ اور اسے آنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ گیدڑ میاں وہاں رکھوالی کرنے لگے۔ وہ کئی دن کے بھوکے تو تھے ہی۔ سامنے کھانا دیکھ کر ان سے نہ رہا گیا۔ گیدڑ میاں نے ادھر ادھر دیکھ موقع پاتے ہی گدھے کے کان اور دل گردے پر ہاتھ صاف کر دیا۔

شیر جب واپس آیا تو اس نے دیکھا گدھے کے کان ندارد ہیں۔ اور دل گردے بھی غائب ہیں۔ غصے میں آ کر اس نے گیدڑ سے کہا۔ کم بخت تو نے گدھے کا کان اور دل گردہ کھا کر میرا کھانا جوٹھا کیوں کیا۔

گیدڑ بولا "مہاراج مجھ کو یہ الزام مت دیجیے۔ بھلا اس گدھے کے پاس کان اور دل تھے ہی کہاں۔ اگر کان اور دل ہوتے تو ایک بار یہاں سے بچ نکلنے پر وہ بھلا دوبارہ واپس کیوں آتا۔

شیر کو گدھے کی بات پر یقین آ گیا اور دونوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

یہ کہانی سنانے کے بعد بندر نے مگرمچھ سے کہا۔ کم بخت تو نے میرے ساتھ دغا کی تھی۔ وہ تو کہو کہ شیخی بگھارنے میں سچ بات منہ سے نکل گئی۔ شیخی میں سچ بات جس کے منہ سے نکل جاتی ہے اس کا وہی حشر ہوتا ہے جو یدھشٹر کمہار کا ہوا تھا۔

مگرمچھ نے پوچھا وہ کمہار کی کہانی کیا ہے؟

تب بندر نے مگرمچھ کو کمہار اور راجہ کی یہ کہانی سنائی۔

راجہ اور کمہار:۔ ایک گاؤں میں یدھشٹر نام کا ایک کمہار رہتا تھا۔ مٹی کے برتن بنا کر اپنی گزر بسر

کرتا تھا۔ ایک دن کی بات کہ ایک ٹوٹے گھڑے سے ٹکرا کر وہ گر گیا اور گھڑے کا ایک نوکیلا ٹھیکرا اس کے ماتھے میں گھس گیا۔ کافی گہرا گھاؤ لگا تھا۔ خون بہنے لگا۔ مرہم پٹی کرنے سے وہ زخم تو کچھ دن میں ٹھیک ہو گیا۔ مگر ماتھے پر ایک مستقل نشان پڑ گیا۔

ایک بار گاؤں میں سخت کال پڑا۔ جب لوگ گاؤں چھوڑ کر جانے لگے تو یہ یدھشٹر بھی وہاں سے نکلا۔ دوسرے دیش میں آکر اس نے راجہ کے یہاں ملازمت کر لی۔ راجہ نے ایک دن جب کمہار کے ماتھے پر زخم کا گہرا نشان دیکھا تو وہ سمجھا کہ یہ کوئی بہادر شخص ہے جسے لڑائی میں دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اتنا گہرا زخم لگا ہوگا۔ راجہ نے کمہار کو فوج میں ایک اعلیٰ افسر بنا دیا۔ راجہ کا لڑکا اور سپہ سالار یدھشٹر کی اس ترقی پر جلتے تھے لیکن راجہ کے ڈر سے وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔

کچھ دن بعد راجہ کی فوج کو ایک مہم پر روانہ ہونا پڑا۔ لڑائی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہاتھی پر جھول اور ہودے کسے جا رہے تھے۔ گھوڑوں پر زین کسی جا رہی تھی اور فوجی بگل لوگوں کو لڑائی کے میدان کی طرف چلنے کے لیے تیاریاں کرنے کا اعلان کر رہا تھا۔ اس وقت راجہ نے کہیں یدھشٹر سے یہ دریافت کر لیا کہ تمھاری پیشانی پر زخم کا نشان کیسا ہے۔ بھلا کس جنگ میں تمھارے یہ چوٹ لگی تھی۔

کمہار نے سوچا کہ اب راجہ اور اس میں اتنی بے تکلفی پیدا ہو چکی ہے کہ راجہ کو اگر اس حقیقت کا پتہ لگ بھی جائے تب بھی وہ اس پر اسی طرح کی مہربانی کرے گا۔ کمہار نے شیخی میں آکر راجہ سے سچ بات بتا دی کہ یہ کسی ہتھیار کا زخم نہیں ہے اور میں تو ایک کمہار ہوں۔ ایک دن شراب کے نشے میں جب میں گھر سے باہر جا رہا تھا تو میں گھر میں بکھرے ہوئے گھڑوں کے ٹھیکروں سے ٹکرا کر گر گیا اور ایک نوکیلا ٹھیکرا میرے ماتھے میں دھنس گیا۔ یہ نشان اسی کا ہے۔

راجہ یہ بات سن کر بہت شرمندہ ہوا اور طیش میں آکر بولا۔ تو نے دھوکا دے کر اتنا بڑا عہدہ حاصل کیا ہے۔ تو ابھی میری سلطنت سے باہر چلا جا۔ کمہار نے بہت منت سماجت کی مگر سب بے سود۔ راجہ نے اس کی کسی بات پر کان نہ دھرا اور کہنے لگا کہ تمھاری حالت تو اس گیدڑ کی طرح ہے جو شیروں کے بچوں میں پل کر بھی ہاتھی سے لڑائی کے لیے تیار نہیں ہوا تھا۔

یدھشٹر کمہار نے پوچھا وہ کیسے۔

تب راجہ نے کمہار کو شیر اور گیدڑ کی یہ کہانی سنائی۔ (باقی آئندہ)

جناب سید منظر برنی ایم۔اے



بچوں کا کردار

(بڑے پیامیوں کےلیے)

دیکھو بہاریں گلشن کلیاں، غنچے، پھول
مہک رہی ہے ڈالی ڈالی فرش بنا ہے مخمل
رنگ برنگی چمک رہی ہے دھرتی کی پوشاک
پھیلا ہوا ہے ایک اجلا سرخ ہوا ہے آنچل

بل کھاتی لہراتی ندیاں اونچے نیچے جھرنے
شوق کے باعث جھلک رہا ہے لبوں پہ ایک تبسم
قدم قدم پہ دیپ جلے ہیں ڈگر ڈگر ہے روشن
کھیل رہے ہیں ننھے منے خوشی سے مل کر باہم

رنگ و نسل کا فرق نہیں کچھ گورے ہیں کچھ کالے
ذہن میں خالی بغض و حسد سے نہیں کسی سے بیر
مشرق کا ہو یا مغرب کا ان کو سب سے پیار
ان کی نظر میں سارے جہاں میں کوئی نہیں ہے غیر



درسِ محبت دیتے ہیں ہر گام پہ یہ معصوم
ان کی قدریں یک جہتی کی ایک ہے زندہ مثال
ہنستے ہیں تو پھول بکھاور جھنک پڑیں تو پیار
بچوں کا کردار ہے سچ مچ امن کی پیاری ڈھال

جناب نادم عثمانی



حاسد راجہ کا انجام

(تھائی لینڈ کی ایک لوک کہانی)

بہت دنوں کی بات ہے تھائی لینڈ کے علاقے میں ایک راجہ حکومت کرتا تھا۔ یہ راجہ بہت ظالم حاسد اور نا عاقبت اندیش تھا۔ مگر وہاں کی جنتا بہت خوش اخلاق اور شریف تھی۔

ایک دن راجہ اپنے محل میں بیٹھا تھا۔ اس وقت پڑوس کے ایک دوسرے راجہ کی سوجھ بوجھ شرافت اور اس کے ملک کی سرسبزی و شادابی اور ترقی کا ذکر چھڑا ہوا تھا۔

راجہ اپنے پڑوسی راجہ اور اُس کے ملک کی تعریف سن کر جل گیا۔ اس نے اپنے وزیر سے کہا۔

"میری ایک خواہش ہے، اس خواہش کا پورا ہونا ضروری ہے۔"

وزیر نہایت ہی شریف اور سمجھ دار تھا وہ اپنے راجہ کی نا عاقبت اندیشی اور نادانی سے بخوبی واقف تھا اس نے پوچھا۔

"سرکار وہ خواہش کیا ہے جس کا پورا ہونا ضروری ہے"

راجہ نے کہا "میری دلی آرزو اور تمنا ہے کہ اپنے پڑوسی راجہ کا سر ایک تھال میں رکھا ہوا اپنے سامنے دیکھوں"

وزیر چونکہ ہوشیار اور عاقبت اندیش تھا۔ اس لیے اس نے کہا۔

"سرکار! میری رائے میں ایسی تمنا ایسی خواہش مناسب نہیں ہے۔ آپ کے اور اس پڑوسی راجہ کے درمیان کسی قسم کا جھگڑا اور اختلاف نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ایسے خیال کا دل میں جگہ دینا ٹھیک نہیں ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ اس خیال کو دل سے نکال دیں بلکہ عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ کسی اور کے سامنے ہرگز ظاہر نہ کریں"

راجہ وزیر کی یہ نصیحت سن کر لال پیلا ہو گیا۔ وزیر کی بات بالکل نہ مانی اور اپنے اس خیال کا اظہار اپنے فوجی افسروں وغیرہ کے دوسرے لوگوں سے کر دیا۔

یہ خبر ہوا کی طرح پوری حکومت میں پھیل گئی۔ ہوتے ہوتے پڑوسی راجہ کے کانوں میں بھی اس

کی بھنک پڑ گئی۔

پڑوس کا راجہ عقل مند سن رسیدہ اور تجربہ کار تھا۔ اس نے اپنے وزیر کو فوراً بلا کر تھائی لینڈ کے راجہ کے ارادے سے باخبر کیا اور کہا۔

"اس حاسد ناعاقبت اندیش راجہ نے جو ارادہ کیا ہے کامیاب ہوگیا تو ہمارے ملک کی عزت و شہرت میں بٹہ لگے گا۔ اس حاسد کی تمنا خاک میں ملانے کے لیے کوئی تدبیر ضروری ہے۔ ساتھ ہی وزیر سے تاکید کہ میرے اور تیرے سوا کسی کو اس بات چیت کا علم نہ ہونے پائے۔"

راجہ نے حکم دیا کہ "ایک ہزار جہاز تیار کیے جائیں اور ہر جہاز کو ضروری ہتھیاروں سے مسلح کیا جائے۔"

اور پھر راجہ نے اپنے ملک میں اعلان کر دیا کہ راجہ اپنے دیس کے جزیروں میں تفریح کے لیے جانے والا ہے۔ جب سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوگیا تو راجہ ہزار جہاز اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ تھائی لینڈ کی طرف روانہ ہوگیا۔ تھائی لینڈ کے راجہ کو اپنے پڑوسی راجہ کے آدھمکنے کا علم اس وقت ہوا جب وہ تھائی لینڈ کی حد میں قدم رکھ چکا تھا۔ آنے والے راجہ نے اپنی فوجیں تھائی لینڈ میں اتار دیں۔ ان فوجوں نے تھائی لینڈ کے راجہ کو گرفتار کر لیا اور محل پر قبضہ کر لیا۔ راجہ کے امیر وزیر اور درباری بھاگ کھڑے ہوئے۔ حملہ آور راجہ نے سبھوں کو امان دینے کا اعلان کر دیا۔ خود تھائی لینڈ کے تخت پر براجمان ہوگیا۔

اس کے بعد تھائی لینڈ کے راجہ کو اور اس کے وزیر کو راجہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ راجہ نے سوال کیا۔

"تم لوگوں نے ایسی تمناؤں کی جس کا پورا ہونا تمہارے بس سے باہر تھا۔ اور اگر تم اپنی خواہش پوری کر بھی لیتے تو تم کو اس سے کوئی فائدہ نہ تھا۔"

تھائی لینڈ کے راجہ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

اس کے بعد نیک دل راجہ نے حکم دیا۔

"چونکہ اس ناعاقبت اندیش راجہ نے صرف میرا سر چاہا تھا۔ لہٰذا اس پاداش میں صرف اس کا سر کاٹ لیا جائے۔"

چنانچہ راجہ کا سر اتار لیا گیا اور اس کے ملک کی کسی چیز کو بھی ذرہ برابر بھی نقصان نہ پہنچایا گیا۔ پھر فاتح راجہ نے وزیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اے سمجھدار، عاقبت اندیش اور نیک دل وزیر! خدا تمھیں جزائے خیر دے۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ تم نے اپنے راجہ کو نیک مشورہ دیا تھا۔ لیکن اس نے اپنی نادانی اور جہالت سے تمہارے مشورے کو ٹھکرا دیا جس کا انجام تمہارے سامنے ہے۔ اب میں تم کو پورا اختیار دیتا ہوں کہ تم جسے چاہو اپنا راجہ بناؤ۔"

"میں اپنے ملک کو واپس جا رہا ہوں۔ دیکھ لو تمہارے ملک کی تمام چیزیں جوں کی توں موجود ہیں۔"

یہ کہہ کر راجہ اپنے تمام سپاہیوں اور ساتھیوں سمیت اپنے

جناب سید اشرف جامعہ نگر



دماغی ورزش

آئیے آپ کو آج ایک دلچسپ کھیل سکھائیں۔

آپ اپنے ساتھیوں کو یہ کھیل دکھا کر حیرت میں ڈال سکتے ہیں۔ آپ اپنے ساتھی سے کہیے کہ تم (خواہ کتنی بھی لمبی) تین رقمیں لکھو تو میں بغیر جوڑے فوراً اس کا ٹوٹل بتا سکتا ہوں۔

آپ کا ساتھی حیران ہو کر کہے گا۔ نہیں بھائی کیوں گپ ہانکتے ہو!

اچھا تو آجاؤ میدان میں ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔

آپ کا دوست فوراً جیب سے قلم نکال کر کاغذ پر بڑی سے بڑی (جتنی بھی بڑی وہ رقم لکھ سکتا ہے) لکھنے لگے گا۔

مگر میری بھی ایک شرط ہے!

وہ کیا؟ آپ کا دوست فوراً پوچھے گا۔

وہ یہ کہ جب تم تین رقمیں لکھ لوگے تو ٹوٹل تو میں فوراً بتادوں گا لیکن ان تین رقموں میں دو رقموں کا اضافہ میں بھی کروں گا۔

کوئی بات نہیں — آپ کا دوست کچھ سوچ کر کہے گا۔ آپ دو کی بجائے تین رقمیں بھی لکھ لیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

اچھی بات ہے تو پھر لکھو۔

آپ کا دوست آپ کو تین رقمیں لکھ کر دے گا۔ اب آپ کو اس کا ٹوٹل بتانا ہے۔ آپ یوں کریں کہ آپ کا دوست جو رقم لکھے اس میں سے تیسری رقم میں جو ہندسے ہوں ان میں اکائی میں سے ۲ کا ہندسہ گھٹا دیں اور یہ ۲ کا ہندسہ رقم کے آخر میں بائیں طرف لکھ دیں۔ جیسے آپ کے دوست نے تیسری رقم یہ لکھی ۲۶۵۴۳۱۲۔ آپ نے اکائی میں سے ۲ نکال کر یہ ۲ آخر میں لکھ دیے اس طرح ٹوٹل ۲۲۶۵۴۳۱۰ یہ ہوا۔ اور یہ اس رقم کا ٹوٹل ہوتا ہے۔ آپ اپنے دوست سے کہہ سکتے ہیں کہ لو بھئی یہ ٹوٹل ہے۔ اب مجھے اپنی شرط پوری کرنے دو۔

آپ یوں کریں کہ ہر ہندسہ کے نیچے ایک ایسا ہندسہ لکھ دیں جس سے اس کا ٹوٹل ہو جائے۔

مثال کے طور پر آپ کے دوست نے یہ رقم لکھی۔

۹۴۶۷۲۵۶

۴۲۷۹۵۰۱

۲۶۵۴۳۱۲

آپ پہلی رقم میں ۶ کے ہندسے کے نیچے ۳، ۵ کے نیچے ۴، ۲ کے نیچے ۷، ۷ نیچے ۲، ۶ کے نیچے ۳، ۴ کے نیچے ۵ اور ۹ کے نیچے ۰ لکھ دیں اس طرح ہر ہندسہ ۹ ہو جائے گا۔

اسی طرح اپنے دوست کی دوسری رقم کے نیچے ۱ کے نیچے ۸، ۰ کے نیچے ۹، ۵ کے نیچے ۴، ۹ کے نیچے ۰، ۷ کے نیچے ۲، ۲ کے نیچے ۷، اور ۴ کے نیچے ۵ لکھ دیں۔ یعنی اس طرح۔

آپ کے دوست نے رقم لکھی۔ ۹۴۶۷۲۵۶

آپ نے اضافہ کیا۔ ۰۵۳۲۷۴۳

آپ کے دوست کی رقم ۴۲۷۹۵۰۱

آپ نے اضافہ کیا۔ ۵۷۲۰۴۹۸

آپ کے دوست کی رقم۔ ۲۶۵۴۳۱۲

اور آپ اس کا ٹوٹل پہلے ہی بتا چکے ہیں۔

یعنی ۲۲۶۵۴۳۱۰

اب آپ اپنے دوست سے کہیے کہ لو بھئی جوڑ کر دیکھ لو۔ ٹوٹل وہی ہوگا جو میں بتا چکا ہوں۔ آپ کا دوست جب جوڑ کر دیکھے گا تو بہت حیران ہوگا۔ کیونکہ آپ کا دعویٰ بالکل سچا تھا۔ ٹوٹل بالکل وہی ہے جو آپ عدد لکھنے سے پہلے بتا چکے ہیں۔

ہے نا حیرت کی بات۔

لیکن ایک گُر کی بات اور بتا دوں۔ آپ اس کھیل کو بار بار نہ دکھائیں۔ ورنہ آپ کا دوست آپ کی چالاکی تاڑ جائے گا۔!



میں گرمیوں کی چھٹی میں دوسری بار گھر آیا تھا۔ میرے چھوٹے بھائی شاہد نے ایک دم مجھ سے کہا کہ بھیا مجھے تیس تک کے پہاڑے یاد ہیں۔ میں نے اچنبھے سے کہا سارے تمھیں تو کل سو تک گنتی بھی ٹھیک سے یاد نہیں تھی۔ پھر اتنے پہاڑے کیسے یاد کر لیے۔ اس نے کہا۔ آپ کو یقین نہیں تو سنیے۔ میں نے کہا سناؤ۔ اس نے شروع کیا۔

۵ یکم پانچ ۵

۵ دونی دس

۵ تیاں پندرہ

۵ چوکے بیس

۵ پنجے پچیس

۵ چھکا تیس

شاہ نواز خاں

بچوں کی کوششیں



لالچ کا نتیجہ

ایک مسافر تھا وہ سوچ رہا تھا میرے پاس اتنے سارے پیسے ہیں اگر میں کسی سرائے میں یہ رات کی رات کو گزار دوں تو خدشا ہے کہ کسی رہزن کسی چور یا کسی غنڈے کو شک ہو جائے اور وہ میرے پیچھے لگ جائے۔ پھر اتنے سارے پیسے جو میں نے بڑی محنت سے کمائے ہیں زور زبردستی چھین لے اور کہیں میری جان کا بھی دشمن نہ ہو جائے

وہ ابھی سب خیالوں میں ڈوبا ہوا اسٹیشن کے باہر نکل آیا۔ اور ایک قہوے خانے میں پہنچا قہوہ خانے کے مالک کو شریف اور ہمدرد سمجھ کر اس نے اپنا راز اس سے کہہ ڈالا اور کہا میرے بھائی اگر ممکن ہو تو رات گزارنے کی کوئی اطمینان بخش جگہ بتاؤ تاکہ میں وہاں رات گزار دوں۔ صبح سویرے کسی گاڑی سے میں اپنے گاؤں چلا جاؤں گا۔

مالک کے دل میں پیسے کا لالچ پیدا ہوا۔ اس نے موقع غنیمت جان کر ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں یہ میرا دالان بہت ہی اطمینان بخش آپ میرے ساتھ چلیے میں بستر کیے دیتا ہوں۔ آپ وہاں اطمینان سے سوئیے صبح چلے جائیے گا۔

مالک نے دکان بند کی اسے ساتھ لے کر دالان میں آیا۔ بستر کر کے سو جانے کی ہدایت کی۔ اور خود سونے کے لیے اندر گھر میں چلا گیا۔ اور پھر بیوی کو اس راز سے آگاہ کیا۔ اور کہا کہ تم چھرا نکال کر رکھو میں اس کے سو جانے کا انتظار کرتا ہوں اور پھر اس کا کام تمام کر دوں گا۔

اِدھر یہ بے چارا مسافر کافی دیر تک لیٹا رہا۔ لیکن اسے نیند نہ آئی۔ اس نے سوچا اس طرح لیٹے رہنے سے فائدہ ہی کیا ہے۔ بہتر ہے کہ پلیٹ فارم ہی پر ٹہلوں گا۔ اور وہ اٹھا اور اسٹیشن کی طرف چل دیا۔

اتفاق ایسا کہ اسی رات مالک کا بیٹا بھی کہیں سفر سے آنے والا تھا۔ جس وقت وہ اجنبی شخص اسٹیشن پر پہنچا ایک گاڑی آئی اور اسی گاڑی سے مالک کا بیٹا اترا۔ اور اپنے گھر کی طرف چلا۔ دالان میں آیا دیکھا کہ چارپائی پر بستر کیا ہوا ہے۔ اس نے سوچا اپنا ہی تو گھر ہے۔ ماں باپ سوتے

ہوں گے۔ انھیں کیوں تکلیف دوں۔ بہتر ہے کہ رات یہیں سو جاؤں صبح اندر چلا جاؤں گا۔ اور وہ اسی بستر پر لیٹ گیا اور چادر اوڑھ کر سو گیا۔ راستے کی تھکان کی وجہ سے نیند میں مدہوش ہو گیا۔

اندر مالک نے اپنی بیوی سے کہا۔ بیگم اٹھو اور تم میرے پیچھے پیچھے چلو مجھے امید ہے کہ وہ مسافر سو گیا ہوگا۔ اب زیادہ دیر کرنا ٹھیک نہیں۔

وہ دونوں دالان میں آئے اپنے سوتے ہوئے لڑکے کو مسافر سمجھ کر دو ٹکڑے کر ڈالا۔ لیکن جب اس کی تلاشی لی تو دو چار روپیہ کے سوا کچھ اور نہ پایا۔ مالک نے اپنی بیوی سے کہا چراغ لے آؤ۔ اندھیرے میں صحیح پتہ نہیں چل رہا ہے۔ بیوی چراغ لائی مالک نے چراغ کی روشنی میں اسکا چہرہ غور سے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ یہ تو میرا بیٹا ہے۔ دونوں بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے لیکن اب کیا ہوتا۔ لالچ نے دونوں کو یہ دن دکھایا۔

سید سجاد احمد دربھنگوی

ہمدردی:- ناصر بہت نیک لڑکا تھا۔ اس کے ابا کا انتقال ہوئے قریب ڈیڑھ سال ہوا تھا۔ اس کی امی محلے کے بچوں کو پڑھا کر گھر کا خرچ چلاتی تھیں۔ ناصر بہت ذہین اور سمجھدار لڑکا تھا۔ ہر سال امتحان میں اول آنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ اب وہ ساتویں کلاس میں پہنچ چکا تھا۔ سالانہ امتحان قریب تھا اور گھر پر فیس کے لیے ایک پیسہ نہ تھا۔ اس کی امی اب بوڑھی ہو چکی تھیں۔ اس لیے پڑھائی کا سلسلہ ختم ہو چل رہا تھا۔ گھر کا سارا بوجھ ناصر کے اوپر تھا۔ آج جب اسے اسکول سے چھٹی ملی تو وہ سیدھا اپنے دوست نعیم کے گھر گیا اور بولا "نعیم بھائی ایک کام ہے بولو کرو گے یا نہیں؟"

"کیوں نہیں کہو کیا بات ہے؟" نعیم بولا۔

"نعیم بھائی میرے پاس فیس کے لیے پیسے نہیں ہیں اگر تمہارے پاس ہوں تو دے دو پھر لوٹا دوں گا۔" ناصر دھیمی آواز میں بولا۔ نعیم دوڑا ہوا اپنی ماں کے پاس گیا اور بولا "امی کچھ پیسے دے دیجیے۔ میرا دوست ناصر بے چارا بہت غریب ہے۔ اس کے پاس فیس کے لیے پیسے نہیں ہیں اگر آپ کے پاس ہوں تو دے دیجیے۔" نعیم کی امی اس کی اتنی اچھی باتیں سن کر جھٹ اپنے کمرے میں گئیں۔ بکس کھولا۔ اس میں سے انھوں نے دو روپے کے نوٹ نکالے اور دوڑتی ہوئی نعیم کے پاس گئیں اور کہا "نعیم لو یہ ناصر کو دے دو۔" نعیم دوڑ کر ناصر کے پاس گیا اور کہا ناصر یہ لو۔

ناصر روپے پا کر بہت خوش ہوا۔ اس نے نعیم کا شکریہ ادا کیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچ کر ناصر نے ایک ٹوکری لی اور پھل والے گودام میں پہنچ کر اس نے بارہ آنے کے پھل خریدے اور بازار میں بیٹھ کر نہایت ایمانداری سے فروخت کرنے لگا۔ اسی طرح اس نے چار پانچ روز تک پھل فروخت کیے۔ اب اس کے پاس پانچ روپے ہو چکے تھے۔ سب سے پہلے اس نے نعیم کا قرض ادا کیا۔ اور دوسرے دن فیس بھی جمع کر دی۔

رشید احمد اعظمی



آزاد بارانوی - باراں -

پیام تعلیم ماہ ستمبر اب میرے ہاتھوں میں آیا ہے۔ اب تک بچوں کے مطالعے میں تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس بار تو خلائی سفروں اور چاند پر پہنچنے کی کوششوں پر آپ نے جتنا مواد اس چھوٹے سے پرچے میں جمع کر دیا ہے۔ وہ حقیقتاً کوزہ میں سمندر ہے۔ آپ کا مضمون تو اس سلسلہ میں اس قدر معلوماتی اور قابلِ قدر ہے کہ کیا کہوں۔ میں نے کسی رسالے اور اخبار میں اتنی معلومات یک جا نہیں دیکھیں جتنی آپ نے ایک مضمون میں جمع کر دی ہیں۔

غلام حیدر صاحب، محمد امین صاحب اور جاوید اشرف صاحب کی کوششیں بھی قابلِ تحسین ہیں۔ ابھی پورا پرچہ نہیں پڑھ پایا ہوں۔

خلیق انجم اشرفی

ستمبر کے پیام تعلیم میں عزم انسانی کی بے مثال فتح پر رنگا رنگ اور دلچسپ مضامین نظم و نثر پیش کر کے آپ نے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ پیام تعلیم واقعی پیام تعلیم ہے۔ یہ شمارہ ہر لحاظ سے بہت عمدہ تمام مضامین بے حد پسند آئے جناب علقمہ چھوٹے بچوں کو بہت پسند آئی۔ تایا جان مضمون خاصے کی چیزیں ہیں۔

چاند کی فتح واقعی بڑی خوشی بڑی بات ہے۔ انسانی جدوجہد اور انتھک کوشش بڑی شاندار کامیابی ہے۔

جہانگیر احمد شمسی کلکتہ

آپ کا ستمبر ۶۹ء کا پیام تعلیم نظر نواز کے حساب سے آپ نے ٹائٹل بہت ہی خ اور معلوماتی دیا ہے۔ دیگر اسی سلسلے میں علقمہ نظم اور جناب تایا جان کا، جو کہ نہ جانے کیوں آپ کو تایا جان یوسف ناظم کہلوانا پسند نہیں مضمون "ہم سب کیچڑ میں کھڑے ہیں" بہت اچھا نیلم اور فرح کہانی اچھی ہے۔ مگر اس کی تصاویر سب بے کار کیا کوئی نئے آرٹسٹ تشریف لائے ہیں۔ اور آپ کا مضمون "چاند" واقعی تعریف کے لائق ہے۔ تسلسل اور معلو اس مضمون کی خوبی ہے۔

واقعی یہ رسالہ اس وقت بالکل ایسا لگا ہے کہ چاند سے شائع ہوا ہے۔ اب اگر آ ارادہ "چاند نگر" سے کوئی رسالہ شائع کرنے اس کا نام رکھیے گا "پیام چاند"۔

افضل امام کلکتہ

ستمبر کا پیام تعلیم ملا۔ سرورق پر نظر پڑتے ہی دل باغ باغ ہوگیا۔ سرورق کی تصویر ایک یادگاری تصویر ثابت ہوگی۔ کیونکہ تصویر میں وہ پہلا شخص ہے جس نے چاند پر پہلا قدم رکھا ہے۔ خیر پیام تعلیم پاتے ہی ایک ایک کرکے تمام مضامین اور نظمیں پڑھ ڈالیں۔ آپ کا لکھا ہوا مضمون "چاند کی مہم" پڑھ کر ہماری بہت سی معلومات بڑھی اور بہت سی غلط باتوں کی تصحیح ہوئی۔ آپ ایسے اچھے مضمون لکھنے پر مبارک باد قبول کریں۔ جناب دینا ناتھ گردھر کی "چند دلچسپ جھلکیاں" کافی دلچسپ اور معلوماتی ہیں اور نظم میں جناب کیفؔ احمد صدیقی کی نظم "مبارک باد" پسند آئی ان کے لکھنے والوں کو مبارک باد قبول ہوں۔

بدر وفا جامعی شیدائی سہسرامی

ستمبر کا پیام تعلیم نظر سے گزرا۔ واقعی آپ نے اسے "چندا ماموں نمبر" نکال دیا۔ میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔

"آدھی ملاقات" میں یہ پڑھ کر بے حد افسوس ہوا کہ بہت سے ممبر اسے کمیونسٹ خیال کا پرچہ تصور کرتے ہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے، بکواس ہے۔ یہ پرچہ نہ تو مذہبی ہے اور نہ سیاسی۔ بلکہ یہ ایک بچوں کا تعلیمی پرچہ ہے جو ہمیشہ بچوں کو علم کی روشنی دکھاتا رہے گا۔

سید حمید حسن قمر

پیام تعلیم نظر نواز ہوا۔ نیلم اور فرح ہگمنڈی اونٹ، چاند کی مہم، چچا تنتر کی کہانیاں بہت پسند آئیں نیا نا احمد میر سری نگر۔

اگست کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ ٹائٹل دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ اس شمارے میں خاص طور پر "چاند پر انسان کا پہلا قدم" "کھلونوں کی جنگ، خرگوش، ڈاکٹر صاحب، آسٹریلیا کے جانور، عربی وقت، ہوا میں پانی اور پاس ہو جاؤ" "نظم" یہ سب بے حد پسند آئیں۔ یہ آپ کی دن رات محنت کا نتیجہ ہے جو کہ ہر ماہ ہر شمارہ انوکھے انداز میں پیش ہوتا ہے۔

عبدالواحد کلیمی میل وشارم۔

"ذاکر صاحب" کا ہم نوا ہو گیا ہوں۔ بقول حفیظ الدین صاحب، وہ کیمیا گر تھے تو واقعی ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم اس کیمیا گر کے فیض سے محروم ہو گئے۔ سید محمد نوشی صاحب نے ہمارے ذاکر صاحبؒ کے استادانہ اور شاگردانہ تعلق کو اجاگر کیا ہے وہ بھی قابلِ رشک ہے۔ عبداللہ ولی بخش قادری نے "صدر انجمن کی تلاش" میں مجھ جیسے کمزور کو بھی لگا دیا ہے۔ انھیں تو انجمن نظر آتی ہے اور مجھے انجمن کا بھی کہیں پتہ نہ لگ سکا۔ مولانا مقبول احمد نے "موت کی روشنی" میں تاریخ کے جن یادگار و بزرگوں سے ہمارا تعارف کرایا اس کے لیے بھی وہ قابلِ مبارک باد ہیں۔ "صحابیؓ کی ایک بات" کہنا تو برکت علی فراق ہی کا کام تھا۔ سعید انصاری نے

نام :- نیاز احمد میر   عمر :- ۱۵ سال۔
مشغلے :- پیام تعلیم اور بچوں کے دوسرے رسالے پڑھنا، فٹ بال کھیلنا، آٹوگراف جمع کرنا، ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنا۔
پتہ :- ۲۳/۷ میر منزل جواہر نگر۔ سری نگر (کشمیر)

نام :- شمیم عالم   عمر :- ۱۴ سال
مشغلے :- پیام تعلیم، الحسنات، نور، اور دوسرے ادبی رسالے پڑھنا، ڈرائنگ بنانا۔
پتہ :- شری پور-۳- ڈاک خانہ- شری پور- کالی پہاڑی- ضلع بردوان- (مغربی بنگال)

نام :- احسان المظفر   عمر :- ۱۶ سال
مشغلے :- پیام تعلیم اور دوسرے رسالے پڑھنا- فٹ بال کھیلنا، قلمی دوستی کرنا۔
پتہ :- احسان المظفر، شاہی محلہ- ڈاک خانہ اردل ضلع گیا (بہار)

نام :- عزیز احمد عزیز   عمر :- ۱۴ سال
مشغلے :- کہانی لکھنا، کرکٹ کھیلنا، فٹ بال کھیلنا، بیڈمنٹن کھیلنا اور بچوں کی کتابوں کا مطالعہ
پتہ :- عزیز احمد عزیز، ربانیہ ہائی اسکول- مرغاسال آسنسول ضلع بردوان

نام :- محمد رفعت اللہ رفیع - عمر :- ۱۶ سال -
مشغلے :- اچھی اچھی کتابوں کا مطالعہ کرنا- رسالے پڑھنا، قلمی دوستی کرنا۔
پتہ :- شاہد منزل ۱۲/۲/۱۴ منڈی بازار- ورنگل

نام :- محمد علیم الدین فاروقی   عمر :- ۱۶ سال
مشغلے :- افسانے لکھنا، کیرم کھیلنا، گیت، غزلیں نظمیں سننا اور سنانا۔
پتہ :- محلہ قاضی پورہ، ڈاک خانہ، کلم نوری ضلع پربھنی (مہاراشٹرا)

نام :- خالد رشید چکد نوی ناشاد   عمر :- ۱۶ سال
مشغلے :- کہانیاں، مضمون اور افسانے لکھنا، ادبی پرچوں کا مطالعہ کرنا- قلمی دوستی کرنا
پتہ :- خالد رشید- کرنا ہاؤس- عالم گنج- (پٹنہ)



دو ہزار برس پرانا سرنگ والا پیڑ گر گیا۔

کیلی فورنیا (امریکہ) کے نیشنل پارک میں ایک عجیب درخت تھا۔ بہت پرانا بہت ہی پرانا۔ لوگ تو کہتے ہیں حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے بھی پہلے کا۔ امریکہ کے لوگوں کی اور دوسرے ملکوں کے سیاحوں کی نہ جانے کتنی پیڑھیاں اسے "سرنگ والے پیڑ" کے نام سے جانتی ہیں۔ لیکن اس کا اصلی نام تو "سی کویا" ہے۔ یہ نام ایک امریکن ریڈ انڈین سردار "سی کویاہ" کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس سردار نے لگ بھگ ڈیڑھ سو (۱۸۲۱ء) برس پہلے اپنی زبان کے لیے حروف تہجی ایجاد کیے تھے۔ اسی لیے اس کو یہ اعزاز بخشا گیا۔ اس عظیم الشان اور اہمیت کے غیر معمولی درخت کا نام اس کے نام پر رکھا گیا۔

یہ درخت کچھ زیادہ اونچا نہیں۔ کل ۱۷۰ فٹ اونچائی ہوگی۔ اسی نیشنل پارک میں اس سے بھی زیادہ اونچے پیڑ ہیں۔ ۳۰۰ فٹ تک اونچے۔ اس کی خصوصیت یک امتیاز یہ ہے اس کے تنے کی جڑ میں بہت بڑا سوراخ یا سرنگ ہے۔ ہے نا عجیب و غریب بات۔

غالباً تاریخی عہد سے پہلے اس جنگل میں آگ لگی ہوگی پیڑ تو جیسے تیسے بچ گیا مگر نیچے جڑ کی طرف آرپار سوراخ ہوگیا ـــــ ۱۸۸۱ء میں اس سوراخ کو بڑا کر دیا۔ گیا۔ اب اس سوراخ کی چوڑائی تین میٹر اور لمبائی ۹ میٹر ہو گئی۔ اچھی خاصی سرنگ سی بن گئی۔ اتنی چوڑی کہ ایک بڑی سے بڑی موٹر آسانی سے گزر سکے۔ اب تم خود اندازہ لگاؤ۔ اس پیڑ کی گولائی کتنی ہوگی۔ اپنے دیس میں برگد کا پیڑ تم نے دیکھا ہوگا۔ بھلا کتنا موٹا ہوتا ہے اس کا تنا پر امریکہ کے اس تاریخی پیڑ کے مقابلے میں بڑے سے بڑے موٹے سے موٹے برگد کی موٹائی کچھ بھی نہیں۔ جبھی تو اس نیشنل پارک کی سیر کرنے والا جب تک اس عجیب و غریب پیڑ کی زیارت نہ کرلے اپنی سیر کو ادھورا سمجھتا ہے۔

ان گنت لوگ اسی پیڑ کو دیکھنے اس جنگل میں آتے ہیں۔ مگر اب تو اس کا نام ہی نام رہ گیا۔ اس سال یہ زمین پر آرہا ـــــ پر یہ ہوا کیسے۔ کہتے ہیں اس سال اس علاقے میں برف باری بہت ہوئی۔ تقریباً

ڈگئی ہوتی۔ یہ درخت جس کا بوڑھا درخت برف کے اس بوجھ کو سہار نہ سکا اور زمین پر آ رہا۔ مگر اس پارک میں کام کرنے والے ماہرین مطمئن نہیں ہیں۔ وہ اس کے گرنے کے اسباب کی کھوج کر رہے ہیں۔ اس بات کی کھوج بھی کر رہے ہیں کہ اس پارک یا جنگل میں درختوں کے اس بادشاہ کی ٹھیک ٹھیک عمر کتنی تھی۔

اورکن پھاد ثر

بہاردین غار:- ترکمانیہ میں لوگوں نے اس بہاردین غار کو قدرتی عجوبے کا نام دیا ہے۔ یہ غار "کوپیٹ داغ" پہاڑوں میں عاشق آباد سے ۔۔ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

غار کی بڑی بڑی محرابیں بجلی سے روشن کی جاتی ہیں۔ یہ روشنی مدھم ہوتی ہے۔ اس کی سیڑھیاں نیچی طرف جاتی ہیں۔ پھر آپ کو دھندلے میں دیواروں سے گھری ہوئی ایک شفاف جھیل دکھائی دیتی ہے۔ یہ جھیل ۔ میٹر لمبی اور ۔ میٹر سے زیادہ چوڑی ہے۔ کناروں کے قریب یہ نسبتاً پایاب ہے لیکن کناروں سے دور یہ ۔ فٹ تک گہری ہے۔ اس زیر زمین جھیل میں پانی ہمیشہ گرم رہتا ہے ——— اس غار اور جھیل کا پتہ پہلے پہل کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے (۱۸۰۰ء) میں چلا تھا۔ لوگوں نے اس عجوبے کے متعلق دلچسپ قصے گھڑے ہیں اور مریض یہاں جا کر اپنی بیماریوں کا علاج کرنے کے لیے آتے رہتے ہیں۔

اس غار کی ایک خصوصیت اور بھی ہے۔ یہ چمگادڑوں کی بستی ہے۔ یہاں تقریباً ۲ ہزار چمگادڑ ہیں۔ یہ غار عشق آباد کے گرد و نواح میں اور آس پاس کے دیہات میں انگوروں، مچھروں، پتنگوں اور کھیتی کو نقصان پہنچانے والے دوسرے کیڑوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ ہر روز سینکڑوں سیاح اس غار کو دیکھنے آتے ہیں۔ وہ اس کے خوش نما منظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور زمین کے نیچے کی اس غیر معمولی جھیل کے گرم پانی میں نہا سکتے ہیں۔ (تاس، شعبۂ اطلاعات روسی سفارت خانہ دہلی)

مصنوعی پیروں والا پینگوئن:-

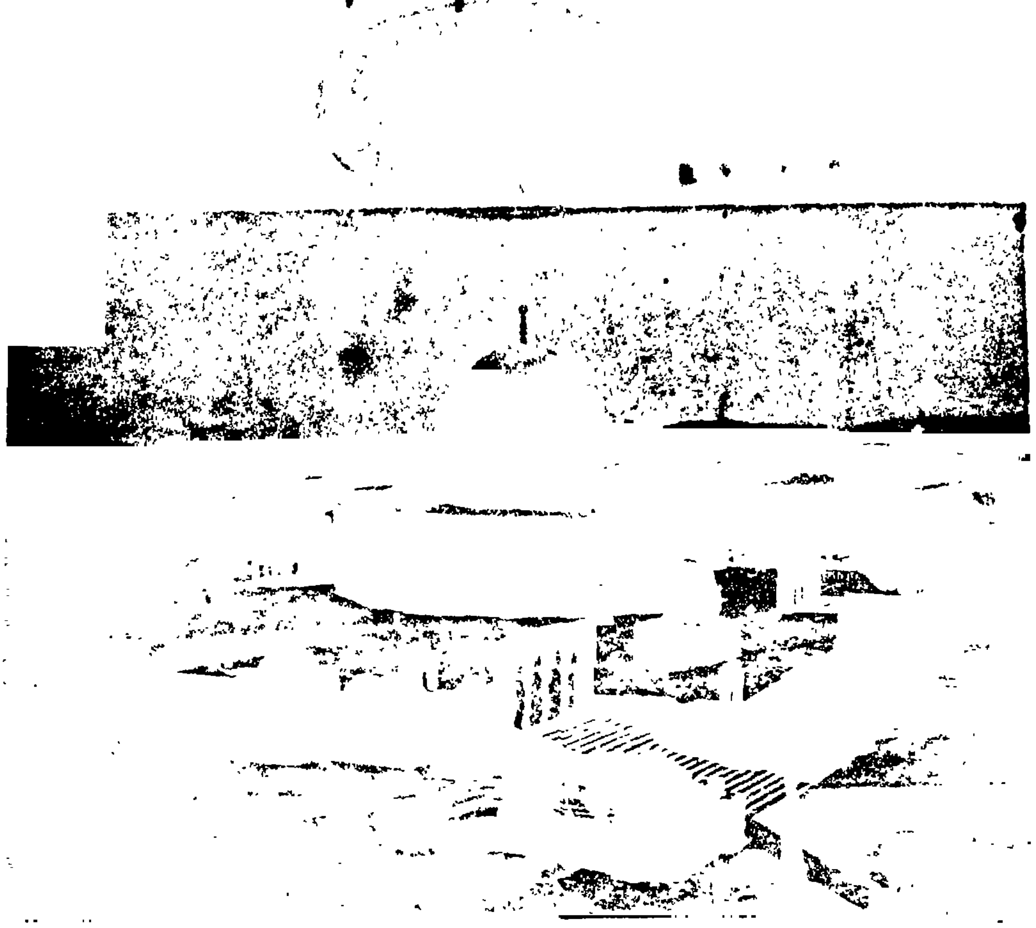
ہنوور (ڈاڈ) یہ پینگوئن تین سال سے وفاقی جمہوریہ جرمنی کے شہر ہنوور کے چڑیا گھر میں گمنام زندگی بسر کر رہا تھا۔ اچانک اس کے بائیں پاؤں کو کوئی ایسا روگ لگا جو جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔ چڑیا گھر کے منتظموں نے اسے ہنوور میں ایا اج پچوں کے مشہور و معروف شفاخانے میں پہنچا دیا۔ یہاں سرجنوں نے معائنہ و تشخیص کے بعد آپریشن کے ذریعہ اسے کاٹ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ جب زخم اچھا ہو گیا تو ڈاکٹروں نے اس کے پیر کی ایک نقل مصنوعی مال سے بنوا کر چڑھا دی۔ کچھ دنوں کے بعد یہ بے چارہ چلنے پھرنے اور تیرنے کا عادی ہو گیا۔ اور راتوں رات دنیا کے اس سب سے پہلے مصنوعی ٹانگ والے پینگوئن کی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی۔ اسے دیکھنے کے لیے روزانہ سینکڑوں لوگ ہنوور کے چڑیا گھر پہنچا کرتے ہیں۔

Payam - I - Taleem

NEW DELHI-25.

نیشنل مطبوعہ فائن پریس دہلی

پیامِ تعلیم



بچوں کی پسندیدہ تفریح گاہ

ریاست اے میسور، مدھیہ پردیش، جموں و کشمیر کے
تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

پیام تعلیم

شمارہ ۱۲ دسمبر ۱۹۶۹ء جلد ۶

ایڈیٹر محمد حسین حسّان ندوی

صدر دفتر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار، دہلی ۶
شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنس بلڈنگ بمبئی ۳
شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڈھ

قیمت فی پرچہ ۵۰ پیسے سالانہ چندہ چھ روپے

فہرست

[illegible] سے باتیں

اس مرتبہ عیدالفطر دسمبر کے دوسرے ہفتے میں ہوگی۔ پیام تعلیم آپ کے پاس بھی کافی پہلے پہنچ جائے گا۔ رمضان کے تیس روزوں کے بعد ہر روزہ دار اس عید کے موقع پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے روزے رکھنے کی اور عبادت کرنے کی توفیق دی۔ اسی لیے عید کا دن اس کے لیے سچ مچ بڑی خوشی کا دن ہوتا ہے۔ ہم بھی اس خوشی میں آپ کے شریک ہیں اور اپنے سب بھائیوں کو اور پیام تعلیم کے چھوٹے بڑے پڑھنے والوں کو دلی مبارک باد دیتے ہیں۔

شاید آپ کو معلوم ہو مخدوم و محترم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم جامعہ کے امیر و چانسلر تھے۔ ان کے انتقال سے امیر جامعہ کی جگہ خالی ہو گئی تھی۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اس اہم عہدے کے لیے محترم جسٹس ہدایت اللہ صاحب چیف جسٹس سپریم کورٹ کو منتخب کیا گیا ہے۔ ہم اس سلسلے میں محترم ہدایت اللہ صاحب کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ جامعہ کے کارکنوں کو بھی مبارک باد دینا چاہیے کہ انھوں نے ایک ایسی شخصیت کو اپنا امیر بنایا۔ پچھلے سال کی طرح اس سال بھی ۲۹ اکتوبر کو جامعہ میں کانووکیشن یا تقسیم اسناد کا جلسہ بہت دھوم دھام سے منایا گیا۔ محترم امیر جامعہ جسٹس ہدایت اللہ صاحب نے صدارت فرمائی اور [illegible] صاحب نے کانووکیشن ایڈریس پڑھا۔ جامعہ کے مختلف کالجوں سے سندیں لینے والے طالب علموں کو انھوں نے نصیحتیں فرمائیں۔

جامعہ کے سب سے اچھے طالب علم کو نہرو انعام (مبلغ ایک ہزار روپے) بھی اسی جلسے میں دیا جاتا ہے۔ اس سال اس انعام کی مستحق عزیزہ ریحانہ بیگم قرار پائیں۔ یہ جامعہ کے ثانوی مدرسے کی [illegible] ہیں۔ ہم عزیزہ ریحانہ بیگم کو دلی مبارک باد دیتے ہیں۔ ثانوی کے استادوں کو بھی اور ریحانہ کے والدین خصوصاً محمد عرفان قدوسی صاحب کو بھی جن کی محنت کا [illegible] اچھا ہو۔ بچے اسی طرح پھولیں پھلیں۔ عزیزہ ریحانہ کی تصویر اور ان کا مختصر حال شاید ہم اگلے پرچے میں دے سکیں۔

اکتوبر [illegible] کو جامعہ کی عمر پچاس سال کی ہو جائے گی۔ [illegible] میں جامعہ نے اپنا جشن سیمیں بہت شان و شوکت بہت اہتمام سے منایا تھا۔ یہ جشن، جشن زریں ہوگا۔ پہلے سے بھی کہیں زیادہ اہتمام سے منایا جائے گا۔ تیاریاں ابھی سے شروع ہو گئی ہیں۔ جامعہ کے طالب علم دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ سب بھائی اس تیاری میں ہاتھ بٹائیں گے۔

اس خیال سے کہ جشن زریں کی تیاریوں میں ڈھیل نہ ہو جائے اس سال تعلیمی میلا بھی نہیں منایا گیا۔ لیکن مدرسہ ثانوی کے پرنسپل جناب عبدالحق خاں صاحب نے گاندھی صدی کے مقابلوں کو ملتوی کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کئی دن تک ان مقابلوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخری دن [illegible] کو بڑی دھوم دھام رہی۔ اس دن آخری مقابلے تھے۔ انعام بھی اسی موقع پر تقسیم کیے گئے۔ ہم اس تقریب کی کامیابی پر عبدالحق صاحب اور ان کے ساتھیوں کو دلی مبارک باد دیتے ہیں۔ ان مقابلوں کی دلچسپ تفصیل اگلے پرچے میں پڑھیے گا۔

یہ پرچہ سال کا آخری پرچہ ہے۔ اگلا پرچہ سالنامہ ہوگا۔ اس سال آپ کے سالنامے کے علاوہ ڈاکٹر ذاکر حسین [illegible] بچوں کی تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے [illegible]

...ں نے بہت سراہا۔ ہم ان سب کے شکر گزار ہیں۔ ہمارے ...تے میں مالی مشکلیں نہ ہوں تو ہم آپ کے پیام تعلیم کو بہت آگے ... بہت آگے لے جانے کا حوصلہ اور امنگ رکھتے ہیں۔ ان ...شکلوں کو دور کرنا آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جی ہاں۔ صرف آپ کے ہاتھ میں۔

اس سال حضرت بابا گورو نانک کی پیدائش کا پانچ سوواں سال منایا جا رہا ہے۔ حضرت بابا صاحب پنجاب میں پیدا ہوئے تھے ...ان کی بتائی ہوئی اچھی اور سچی باتیں ساری دنیا کے لیے تھیں۔ ...اس پرچے میں ان پر مجاہد حسین زیدی صاحب کا مضمون پڑھیے۔ ...ہ مضمون اور ایک نظم گاندھی جی پر پڑھیے اور ایک مضمون ذاکر صاحب پر بھی۔ مقصد یہ ہے کہ ان بزرگوں کی یاد تازہ رہے اور ...ن کی بتائی ہوئی اچھی اچھی باتیں کانوں میں پڑتی رہیں۔

لکھنؤ میں میر تقی میر کی یادگار میں ایک اکادمی قائم ہے۔ یہ ...ہ علمی ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ایک کام اور بھی کرتی ہے۔ ...پی کے مصنفوں کی شاعروں کی ادیبوں کی انعام اور وظیفے ...شکل میں حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اس سال اکادمی نے ...مارے محترم شاعر اور مضمون نگار جناب حرمت الاکرام صاحب ...خدمت میں بھی ۲۰۰ روپے کا وظیفہ پیش کیا ہے۔ محترم ...رمت الاکرام صاحب مبارک باد قبول فرمائیں کہ ان کی ادبی ...دمت قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ سالنامے میں ان کی ...ت بڑی اچھی نظم پڑھیے گا۔

سالنامے کی تیاری کا سلسلہ جاری ہے۔ بہت سے مضمون آچکے ہیں بہت سی نظمیں آچکی ہیں۔ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ دعا کیجیے کہ ہم آپ کی خواہشوں اور امنگوں کے مطابق ...ے نکال سکیں وقت پہ نکال سکیں۔

اور ہاں دیکھیے۔ رجسٹری کے دو روپے بھجوا دیجیے تاکہ سالنامہ یقینی طور پر آپ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ راستے میں غائب نہ ہو جائے۔

اس مرتبہ محترمہ ہیڈ مسٹریس عبدالسلام مسلم گرلس انٹر کالج مراد آباد نے سالانہ چھ پرچوں کی خریداری منظور فرمائی ہے۔ انجمن ہائی اسکول رون (دھارواڑ) سکریٹری سوراج سبھا پرائمری اسکول لٹواں (رتناگری) لیڈی جیوا بائی گرلس ہائی اسکول بمبئی۔ اردو پرائمری اسکول رام درگ (بیلگام)، بزم اطفال لائبریری بیرار نے ایک ایک سال کی خریداری منظور کی ہے۔ محترمہ ضیا النسا صدیقی نے پچھلے سال کی طرح اس مرتبہ بھی پانچ خریدار مرحمت فرمائے ہیں۔ ان کے علاوہ نسیم صاحب غوالیوری مارشل طارق عظیم نگینہ، محترمہ عبداللہ شرقی مدراس، محترمہ منور غفار جامعہ نگر۔ مس غزالہ بیگم الہ آباد، شاہدہ فیروز آباد، جناب جبار حیدر الہ آباد، ابوالبرکات صاحب فیض آباد، مس شہناز فاطمہ نے خود خریداری قبول فرمائی ہے۔

آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ آپ کے پرچے کے قدردانوں کی تعداد کچھ نہ کچھ بڑھ رہی ہے۔ پھر بھی رفتار بہت دھیمی ہے۔ بہت سست! ہم ان صفحوں میں آپ کی توجہ برابر اس طرف دلاتے رہتے ہیں۔ اب اپنی کوششوں کو ذرا اور تیز کر دیجیے عید کے اس مبارک تہوار اور نئے سال کی خوشی میں ہمارے لیے یہی آپ کا بہترین تحفہ ہوگا۔

ضروری بات

اگلا پرچہ سالنامہ ہوگا۔

جناب محمد عبداللہ شرقی



یتیم بچے کی عید

وہ دیکھو فلک پر نیا چاند آیا
وہ دیکھو نظر عید کا چاند آیا

وہ دیکھو، بڑی عید آئی ہماری
دلوں میں تھی جس کے لیے بے قراری

وہ بچوں کے دل کھل گئے ہیں خوشی سے
وہ ہیں منتظر صبح کے شام ہی سے

بھلا پوچھنا کیا ہے ان کی خوشی کا
نیا رنگ ہے ہر مکاں، ہر گلی کا

گلی میں ہیں کچھ مال داروں کے بچے
ہیں ساتھ ان کے غربت کے ماروں کے بچے

نہیں فرق آپس میں کرتے ذرا وہ
نہیں جانتے کچھ خوشی کے سوا وہ

ہے ان کا بھی کیا بادشاہی زمانہ
نہ آفت اٹھائی، نہ دکھ درد جانا

مگر کیا بھروسا جہاں کی خوشی کا — نہیں غم سے خالی کبھی دل کسی کا
کٹی رات ساری، ہوا اب جو تڑکا — اٹھا اپنے بستر سے جھٹ ایک لڑکا
گیا ماں کے نزدیک اور اس سے پوچھا — "بتاؤ کب آئیں گے گھر میرے ابا
کروں انتظار آخر ابا کا کب تک — نئے کپڑے میرے نہیں آئے اب تک

میرے حق میں یہ عید آئی ہے کیسی
نہ کپڑے نئے ہیں، نہ جوتا، نہ ٹوپی"

یہ سنتے ہی دل ماں کا غم سے بھر آیا — کلیجے سے بیٹے کو اپنے لگایا
کہا اس سے "جلدی تمھیں کیا ہے بیٹا — نہایت ہی معصوم دل ہے تمھارا
بہت دن ہوئے جب کہ ابا تمھارے — ہمیں چھوڑ کر اس جہاں سے سدھارے
مگر کس لیے تم ہو غمگین بیٹا ؟ — کہ ماموں تمھارے تمھیں دیں گے جوڑا
نہالو ذرا چل کے رکھا ہے پانی — وہ دیکھو، چچا جان لائے ہیں ٹوپی
وہ لو، ماموں ابا چلے آ رہے ہیں — وہ جوڑا تمھارے لیے لا رہے ہیں"
بڑے زور کی ہو گئی عید اب تو — کرو دور غم کو، ہنسو اور بولو
ابھی تم تھے غمگیں، ہوئے اب تو شاداں — کیا پل کے پل میں خدا نے یہ احسان

بھلا اس کی قدرت کو کیا کوئی جانے
نہیں ہے وہ ایسی سمجھ میں جو آئے

جناب چندن ریدی



گرو نانک

بابا نانک سکھوں کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے گرو اب سے کوئی پانچ سو سال پہلے [illegible] لاہور کے قریب ایک گاؤں تلونڈی میں پیدا ہوئے۔ ان کے پتا کا نام کالو تھا ۔۔ وہ ذات کے بیدی کشمیری تھے اور گاؤں میں ایک چھوٹی سی دُکان کرتے تھے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ پٹواری تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا بڑا ہو کر ایک بیوپاری بنے۔ اسی لیے انھوں نے نانک کو اپنے ایک ہمسائے سید حسن سے فارسی پڑھنے اور ایک پاٹ شالہ میں ہندی اور گورمکھی سیکھنے کے لیے بھیجا مگر بابا نانک جی پاٹ شالہ میں نہ لگتا تھا۔ ان کو بچپن سے فقیروں اور سادھوؤں سے بہت دلچسپی تھی۔ تلونڈی کے پاس گھنے جنگلوں میں اکثر سادھو اور فقیر آکر ٹھہرتے تھے۔ بابا نانک سب کام کاج چھوڑ کر ان کے پاس بیٹھے رہتے اور ان سے باتیں کرتے رہتے۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو باپ نے سوچا کہ وہ اُن کا ہاتھ بٹائیں اور کوئی کام دھندا شروع کریں۔ پہلے مویشی چرانے کے لیے بھیجا لیکن وہ جانوروں کی دیکھ بھال کرنے کی بجائے سادھوؤں کے پاس جا بیٹھتے۔ بارہ برس کے تھے کہ انہوں نے باپ کے حکم سے کھیتی باڑی کا کام شروع کیا۔ لیکن جب بھی موقع ملتا ہل اور بیلوں کو چھوڑ کر چل دیتے۔ اس کے بعد بابا نانک کو دُکان پر بٹھا دیا گیا۔ مگر وہاں بھی ان کا جی نہ لگا۔ آخر چودہ سال کی عمر میں ان کی شادی بٹالہ ضلع گورداسپور کے رہنے والے کی بیٹی سلکھنی بی بی سے کر دی گئی۔ ان سے دو لڑکے بھی پیدا ہوئے لیکن بیوی بچوں کی محبت بھی بابا نانک کی طبیعت میں کوئی فرق نہ لا سکی۔ اب بھی دنیا سے الگ تھلگ بے پروا اور پہلے کی طرح فقیروں کے دوست بنے رہے۔

بابا نانک کی ایک بہن تھیں۔ نانکی جی۔ ان کے پتی جے رام پنجاب کے حاکم دولت خاں لودھی

سکھ یہاں ملازم تھے۔ بابا نانک کے پتا نے لوگوں کے صلاح مشورہ سے انھیں اپنے بہنوئی کے یہاں سلطان پور بھیج دیا۔ جے رام کے کہنے پر دولت خاں نے بابا نانک کو بھی توشہ خانہ کے حساب کتاب کے لیے ملازم رکھ لیا۔ بابا نانک کو جو تنخواہ ملتی اس میں سے تھوڑا سا رکھ کر باقی سب محتاجوں کو بانٹ دیتے اور رات رات بھر خدا کی یاد کیا کرتے۔ ایک دن نہ جانے ان کے جی میں کیا بات سمائی کہ صبح سویرے ندی پر نہانے گئے اور ایسا غوطہ لگایا کہ کہیں پتہ نہ لگا۔ لوگ سمجھے کہ بابا نانک ڈوب گئے مگر تین دن کے بعد گھوم پھر کے وہ پھر سلطان پور آ گئے۔ واپس آکر انھوں نے اپنی ساری پونجی خدا کی راہ میں بانٹ دی اور کہتے ہیں کہ توشہ خانہ سے بھی بہت سی چیزیں خیرات کر دیں۔ لیکن جب خان نے اس کا حساب مانگا تو پائی پائی ٹھیک نکلی۔

اب بابا نانک نے تلونڈی گاؤں کے رہنے والے مردانہ ڈوم کو ساتھ لے کر جنگل کی راہ لی۔ مردانہ رباب بہت اچھا بجاتا تھا۔ اس کے ساتھ پنجاب کا دورہ کر ڈالا۔ اس کے بعد دکھن میں لنکا تک، پورب میں کامروپ اور پوری تک اور پچھم میں ایران اور عرب تک کا دورہ کیا۔ راستے میں وہ فقیروں سے ملتے باتیں کرتے اور خدا کو ڈھونڈنے کی نئی راہیں سیکھتے اور سکھاتے جاتے تھے۔ کہتے ہیں جب وہ مکہ پہنچے تو کعبہ کی طرف پاؤں کر کے لیٹ گئے۔ لوگوں نے ٹوکا کہ خدا کے گھر کی طرف پاؤں مت کرو۔ تو جواب دیا۔ بھائی میرے پاؤں اس طرف کر دو جدھر خدا نہ ہو۔

واپسی پر جب بابا نانک پنجاب واپس پہنچے تو بابر کی فوج کے ہاتھ گرفتار ہو گئے۔ لیکن جیسے ہی بادشاہ کو ان کی بڑائی کا پتہ لگا تو اس نے عزت کے ساتھ انہیں چھوڑ دیا۔ یہاں سے بابا نانک اپنی عمر کے آخری دنوں میں ... کرتارپور کے مقام پر ... سے ہوتے ہوئے کرتارپور آئے اور سادھوؤں کے کپڑے اتار کر معمولی کپڑے پہنے اور لوگوں کو ہدایت دینے لگے۔

گرو نانک کی تعلیم بہت سادہ اور دل میں اتر جانے والی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ پیدا کرنے والا ایک ہے اور اس کی نظر میں سب برابر ہیں۔ اس نے ہر ایک کے دل میں اپنا نور پیدا کیا ہے۔ نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان۔ خدا سے ملنے کا طریقہ صرف اس کا دھیان ہے۔ دکھاوے کی باتیں اور دکھاوے کی عبادت سب بے کار ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ دنیا کے دھندوں میں رہ کر بھی اپنے من کو صاف رکھے یہی سچا دھرم ہے اور یہ سچا دھرم صرف گرو کے کہنے پر چلنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

۱۵۳۹ء میں بابا نانک نے وفات پائی۔ جب بابا جی کی موت کا وقت قریب آیا تو انھوں نے اپنے ایک چیلے لہنا کو انگد کا خطاب دے کر ...

جناب احسان نامی

سدا بہار مہاتما



دہلی گیٹ سے سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ جائیے۔ ایک صاف ستھری سڑک آپ کو گاندھی سمادھی کی طرف لے جائے گی۔ لیکن سمادھی تک پہنچنے سے پہلے آپ کو ہرے بھرے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آئے گا۔ کچھ پودے ایسے ہوتے ہیں جو سدا ہرے بھرے رہتے ہیں۔ پھل پھول دیتے رہتے ہیں۔ یہ جھنڈ ایسے ہی پودوں کا ہے اور اس کے پیچھے ایک خوب صورت سی دو منزلہ عمارت ہے جس میں ایک سدا بہار مہاتما نے ڈیرا لگا رکھا ہے۔ بہت دن ہوئے۔ تمھارے جنم لینے سے پہلے۔ یہ مہاتما ایک پرارتھنا کے جلسے سے اس طرح رخصت ہوا تھا کہ پھر کبھی لوٹ کر نہ آیا۔ لیکن وہ اتنے بہت سے اصول سلیقے سے جینے کے اتنے بہت سے گر اور پریم کا ایک ایسا چراغ اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے جس کی لو اندھیرے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے چمکتی جاتی ہے۔

تو اس دو منزلہ عمارت میں موہن داس کرم چند گاندھی کی زندگی کی ساری کہانی تصویروں، ان کے خطوں اور ان کی چیزوں کے ذریعہ دکھائی گئی ہے۔ یہ گاندھی میوزیم ہے جہاں ہر تصویر کے پیچھے ایک کہانی ہے۔ جہاں ہر خط کے پیچھے بھارت کی تاریخ ہے۔ جہاں ہر درشن کی ایسی اور ہی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ جسے کچھ لوگ گاندھی جی کہتے تھے۔ کچھ مہاتما کہتے۔ اور کچھ پیار سے باپو پکارتے تھے۔

میوزیم دو بڑے بڑے کمروں میں پھیلا ہوا ہے۔ آپ اندر آئے سر اٹھایا سامنے رابندر ناتھ ٹیگور کے سنہری لفظ دکھائی دیتے ہیں "یہ وہ انسان ہے جو ہزاروں غریبوں کی جھونپڑیوں تک پہنچا۔ ان سے ان کی زبان میں باتیں کیں جو سچائی کا پتلا تھا۔ اور اسی لیے بھارت کے لوگوں نے اسے مہاتما کا نام دے دیا۔"

سامنے شیشے کی الماری ہے۔ اس میں بالکل معمولی سیدھی سادی کھڑاویں رکھی ہیں جن لوگوں کو باپو کو دیکھنے کا موقع ملا ہے ان کو آج

بھی ان کھڑکیوں سے جھکے ہوئے دبلے پتلے لیکن مضبوط قدم اٹھنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ "کھٹ کھٹ کھٹ" کی یہ آواز وہ آواز ہے جس نے بندوقوں اور مشین گنوں کی آواز کو دبا دیا تھا۔

ایک طرف باپو کی عینک ہے۔۔۔ ہے تو معمولی۔ جو ہم اور آپ لگاتے ہیں۔ لیکن باپو نے اس عینک سے نہ صرف نظر کے سامنے کی چیز دیکھی تھی بلکہ بھارت کے مستقبل کو بھی پڑھا تھا۔

قلم ہے جس نے مفلسی اور چھوت چھات کے خلاف جہاد کیا تھا۔

آپ اور آگے بڑھے۔ بائیں ہاتھ کے کمرے سے کہانی شروع ہوئی۔ پوربندر کے اس گھر کی تصویر سامنے آئی جہاں ۲ر اکتوبر ۱۸۶۹ء کو موہن داس کرم چند گاندھی نے جنم لیا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ جو کبھی آپ جیسا بچہ تھا وہ بڑا ہوتا گیا۔ پڑھائی کا زمانہ شروع ہوا۔ بڑوں کا ادب کرنا سیکھا۔ جھوٹ سے نفرت سیکھی۔ چوری کو پاپ جانا۔ اور ہر کام کو سلیقے سے کرنے کی عادت کو اپنایا۔ پڑھائی ختم ہوئی۔

آپ نے نمائش کے کمرے میں دو قدم آگے بڑھائے۔ وہی دبلا پتلا کمزور سا لڑکا اب بڑا ہو گیا۔ کوٹ پتلون میں مسکراتا ہوا نوجوان آپ کے سامنے ہے۔ انگلستان جانے کی تیاریاں ہیں۔ پڑھنے کے لیے دیس سے باہر جانا ان دنوں بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔

جوں جوں آپ آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ باپو کی زندگی کی کہانی کھلتی چلی جاتی ہے۔ انگریزوں کے ساتھ تصویریں ہیں جنھوں نے باپو کی محبت کے سامنے اپنا سب کچھ قدموں پر رکھ دیا ہے۔

جنوبی افریقہ کی تصویریں ہیں۔ جہاں باپو کو پہلی دفعہ جینے کا مقصد معلوم ہوا تھا۔ جہاں انھوں نے سفید رنگ کے لوگوں کو کالے رنگ کے لوگوں سے نفرت اور چھوت کا برتاؤ کرنے کے خلاف جان کی بازی لگائی تھی۔

آپ کے سامنے اب اسی کمرے کی دوسری دیوار آجاتی ہے ـــ یہاں سے باپو کی زندگی کا ایک دوسرا موڑ شروع ہوتا ہے۔

یہاں گاندھی ٹوپی جنم لیتی ہے۔ دیس کے مسئلے بدلتے ہیں۔ ایک مذہب کے لوگ دوسرے مذہب والوں سے نفرت کیسے کرسکتے ہیں؟

"اگر تم اپنے بھائیوں سے نفرت کروگے تو میں اس وقت تک کے لیے کھانا پینا چھوڑ دوں گا جب تک تم نفرت کرنا نہیں چھوڑو گے۔"

لیجیے باپو نے مرن برت رکھ لیا۔ بن کھائے ہفتوں گزر گئے ہیں لیکن چہرے کی مسکراہٹ وہی ہے۔ ہمت وہی ہے۔ لیکن مستقبل پر نظریں جمی ہیں۔ ۲۱ دن کے فاقوں نے نڈھال کر دیا ہے۔ بستر پر لیٹے ہیں اور سرہانے ایک خوب صورت سی کالی گہری آنکھوں والی چھوٹی سی لڑکی بیٹھی ہے۔ باپو اس

کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں۔ آپ اس [illegible] کو غور سے دیکھئے۔ [illegible] گاندھی سے کتنی صورت ملتی ہے۔

لیکن صورت کیوں نہ ملے؟ یہ ہمارے یہ [illegible] ہی تو ہیں۔ یہ تصویر تو بہرحال پہلی تصویر ہے۔

آیئے اب ذرا آگے چلیں۔

دیکھئے اس فوٹو میں باپو شانتی نکیتن میں [illegible] ٹیگور سے کتنی گہری باتیں ہو رہی ہیں۔ دونوں نے دیس کی آزادی کے خواب دیکھے ہیں۔ اب ان کو سچ کر دکھانے کے پروگرام بن رہے ہیں۔

لیکن انگریزی راج ہے۔ اور راج سنگھاسن کون ہے جو اپنی مرضی سے چھوڑنے پر تیار ہو جائے!

اب انگریزی سرکار کے خلاف لڑائی شروع ہو گئی۔ بھلا وطن کی آزادی کی آگ دنیا کے کسی دیس میں کسی زمانے میں کسی [illegible] کے دبائے دب سکی ہے! بندوق اور ہتھیار [illegible] دشمن کے پاس ہیں تو ہمارے پاس بھی اہنسا کا عدم تشدد کا ایٹم بم ہے۔

یہ دیکھو یہ اور ایل کی تصویر ہے جس میں رہ کر باپو نے اپنی جنوبی افریقہ کی کہانی لکھی تھی۔ اور یہ دوسری بھی اسی تصویر جو سامنے دکھائی دے رہی ہے۔ اس میں بھارت کے لاکھوں لوگ باپو کے خیالات سنانے ان کی نصیحتیں سننے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ جہاں تک نظر جاتی ہے آدمی ہی آدمی نظر آ رہے ہیں۔

اب ہم اور آگے بڑھتے ہیں۔

یہ تصویر [illegible] کی ہے۔ [illegible] کی [illegible] ہیں ان کے [illegible] ہوئے پیر دھنسے ہیں۔ پیدل سفر، سب کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ لیکن باپو نے تو بہت لوگوں کو قریب سے جاننے کی کوشش کی تھی۔ ان کے دکھ درد میں حصہ لینے کی کوشش کی تھی۔ اور اس کے لیے گھر گھر پیدل چل کر جانا ضروری ہے۔

اب ہمارے بائیں طرف ہاتھ کی بنائی ہوئی باپو کی ایک تصویر ہے۔ بڑا سا فریم ہے۔ تصویر کے رنگ ہلکے ہیں۔ اس کے نیچے کچھ لکھا ہے تو سمجھ یہ تصویر رنگوں سے نہیں بلکہ مونگ پھلی کے چھلکوں سے بنی ہے۔

دونوں دروازوں کے بیچ میں جو حصہ ہے اس پر لکڑی کا بنا ہوا ایک اسٹیچو لٹک رہا ہے۔ ایک پتلا مگر مضبوط ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا ہوا ہے۔ ایک موٹا سا پیر زمین پر جما ہوا ہے اور دونوں کے بیچ میں اس آدمی کا جسم ہے جس نے ہر ظلم کے خلاف آواز اٹھائی تھی جس نے ہر موقع پر سچ بولا تھا اور جو اپنے بدن کو صرف ایک با ایک سی دھوتی میں لپیٹے ڈھیلی سنگھوں کے ساتھ اس طرح بڑھتا تھا جیسے لوہے کی [illegible] بکھر [illegible] ہوں۔

اب ہم [illegible] کے پاس سے ہو کے ہوئے [illegible] کرے میں آ گئے ہیں۔ یہاں [illegible] کے

آخری دنوں کی تصویریں ہیں۔ انگریزی سرکار کے افسر ہیں۔ وائسرائے ہے۔ سڑکوں پر ہزاروں لاکھوں لوگ نعرے لگا رہے ہیں۔

پرسہا برس کی غلامی کی زنجیریں ایک دبلے پتلے، بکری کا دودھ پینے والے، اہنسا کے پجاری نے توڑ دی ہیں۔

تصویریں، فوٹو، چتر۔ ایک کے بعد ایک اپنی کہانی آپ سناتے چلے جاتے ہیں۔ غلامی کی لمبی چوڑی کالی سڑک آزادی کی اونچی منزل پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔

اور پھر ایک تصویر میں باپو اپنا ڈنڈا سنبھالے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور وہ کہہ رہے ہیں کہ میں ایسے بھارت کے لیے کام کر رہا ہوں۔ جس کا غریب سے غریب آدمی اس کو اپنا ملک سمجھے گا۔ اور جس کے بنانے میں اس کا ہاتھ ہوگا۔

آزادی کے جھنڈے آسمان سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ باپو کسی کرسی پر نہیں بیٹھتے۔ وہ اب بھی پد یاترا پر نکلتے ہیں۔ وہ اب بھی اچھوتوں کو پاک استھانوں تک پہنچانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ اب بھی پرارتھنا میں لوگوں کو جینے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔

اور پھر ہم اس جگہ پہنچ جاتے ہیں جہاں یہ کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ باپو ہمیں سب کچھ دے کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ ان کی راکھ ایک برتن میں رکھی ہے۔ ریل کے ڈبے کھڑے ہیں۔ یہ ان کی استھی (ہڈیوں) کو لائے تھے۔

واپس لوٹتے ہیں تو آپ کو باپو کے تین بندر دکھائی دیتے ہیں۔ ایک کان بند کیے ہے۔ دوسرا آنکھ بند کیے ہے اور تیسرا منہ بند کیے ہے۔

میوزیم کا ایک حصہ ختم ہو گیا ہے۔ میں پہلی منزل سے نیچے اترا۔ نیچے ایک طرف تھیٹر ہے جہاں باپو کی زندگی پر بنائی ہوئی فلمیں دکھائی جاتی ہیں اور دوسری طرف ایک بڑی سی لائبریری ہے۔ اس لائبریری میں گاندھی جی پر ۱۲ ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں۔ ہزاروں رسالے اور میگزین ہیں۔

یہ سب کچھ تو ہے۔ ٹھیک ہے۔ ہونا بھی چاہیے تھا۔ لیکن بات جو نہرو جا نے کہی تھی۔ بڑی سچی تھی۔ انھوں نے کہا تھا "آپ باپو کو میوزیم کی چاردیواری کے اندر کیسے بند کر سکتے ہیں، دراصل سارا ہندوستان ان کا میوزیم ہے۔"

انھوں نے تو ادھ مرے لوگوں میں زندگی کی روح پھونکی تھی۔ انھوں نے ان کی آنکھوں میں چمک پیدا کی تھی۔ انھوں نے سر اٹھا کر چلنے کی ادا سکھائی تھی۔

آج باپو ہم میں نہیں ہیں۔ لیکن فخر سے گردن اٹھا کر چلنے کا سبق ہم نے ان ہی سے سیکھا تھا۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)



جناب وقار خلیل

باپو نے کہا تھا

حق محبت ہے، حق عبادت ہے
یہ کہانی نہیں حقیقت ہے
صبح کا نام پیار، پھول، وفا
جہل، فتنہ، فساد ظلمت ہے
لوگ کہتے ہیں جس کو ستیا گرہ
وہ سچائی کی ایک طاقت ہے
علم حاصل کرو کہ دنیا میں
علم دانش ہے، علم دولت ہے
وہ جو چرخا ہے، اس کے چکر میں
آشتی، صلح اور محبت ہے
پیار کو زندگی بنا کے چلو!!
اس سے عظمت ہے اور شوکت ہے
انکساری، خلوص، جہد و عمل
یہی انسانیت کی جنت ہے
کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا!
سب برابر ہیں سب میں عظمت ہے
وعدہ کر لو، انھیں نہ بھولو گے
تم کو "باپو" سے گر عقیدت ہے

۱ جہالت ۲ تاریکی اندھیرا ۳ عقل ۴ روشنی ۵ کوشش۔

بچوں کی کوششیں

تھی ہوتا ساتھی اپنا

ہاتھی ہوتا ساتھی اپنا
بڑا مزہ پھر مجھ کو آتا
بلے چوڑے کان ہلاتا
سونڈ اٹھاتا سونڈ گراتا
یچ صبح وہ گھر آجاتا
تو میں اس کو کہاں بٹھاتا
کیا کھاؤ گے بولو ہاتھی
ن کر بھی وہ چپ ہو جاتا
و میں دیتا وہ کھا جاتا
سونڈ ہلا کر کچھ بتلاتا
ڈ جاتے سب میرے ساتھی
پلاتے بس ہاتھی ہاتھی
یں کہتا وہ میرا ساتھی
چلو یہاں سے ساتھی ہاتھی
سونڈ پکڑ کر اس پر چڑھتا
پر وہ مجھ کو نہیں گراتا

(قمر احمد آزاد وستاسوی)

خلیفہ کے بچوں کی عید

یہ اب سے بہت دنوں پہلے کی بات ہے۔ عرب میں ایک بار عید آئی تو لوگوں نے پہلے ہی سے عید کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اپنے بال بچوں کے لیے اچھے سے اچھے کپڑے بنوائے اور خوب قیمتی سامان خریدا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے صاحب زادوں نے سوچا۔ ہمارے باپ تو خلیفہ ہیں۔ وہ ہمارے لیے ان سے کہیں اچھے سامان خریدیں گے۔ ایسے کہ [illegible] سب دیکھتے رہ جائیں گے۔ لیکن ہوتے ہوتے عید بالکل قریب آگئی۔ عید کا چاند بھی دیکھا جا چکا۔ پر ان کے گھر کوئی سامان نہ آیا تو وہ بھی اپنی والدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کہنے لگے ”امی جان کل عید ہے ہمارے تمام ساتھیوں کے لیے اچھے اچھے کپڑے بن گئے ہم کیا پہنیں گے؟“ ان کی والدہ نے کہا ”کیا تمہارے پاس کپڑے نہیں ہیں؟“ انھوں نے جواب دیا ”کپڑے تو ہیں لیکن سب پرانے ہیں کوئی ایک جوڑا بھی صحیح سلامت نہیں ہے سب میں پیوند لگے ہیں۔“

والدہ نے فرمایا ”تو کیا ہوا۔ تم دھلے کپڑے پہن کر عید کی نماز پڑھ آنا۔“

لیکن بچے کہاں ماننے والے تھے۔

”نہیں امی جان! ہمارے لیے بھی کپڑے بنوا دیجیے نیا جوتا لا دیجیے۔ سب لوگ نئے کپڑے پہنیں گے اور ہم لوگ خلیفہ کے بیٹے ہو کر پھٹے پرانے کپڑوں میں عید کریں۔“

بے چاری ماں بچوں کو رات بھر سمجھاتی رہیں لیکن وہ نہ

قسطنطنیہ رنگ برنگے شیشوں اور سنگِ مرمر سے آراستہ ہے۔

اسی گرجا گھر میں امیر المومنین، عمر فاروقؓ نے عیسائیوں کے امان کے لیے عہد نامہ لکھا تھا جو اس کی لائبریری میں اب تک موجود ہے اور گرجا گھر کے بڑے پادری کے پاس بیت المقدس کی وہ کنجی بھی محفوظ ہے جسے باشندوں نے حضرت عمرؓ کے حوالے کیا تھا۔

حضرت عمرؓ گرجا گھر ہی میں تھے کہ نماز کا وقت آگیا، پادریوں نے اسی جگہ نماز پڑھ لینے کی درخواست کی، مگر امیر المومنین نے فرمایا کہ اگر میں نے یہاں نماز پڑھ لی تو اسے مسجد میں تبدیل کر دیا جائے گا، اور گرجا گھر کے دروازے سے دس قدم ہٹ کر نماز ادا کی۔ آج وہاں ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے، اسلام کی عظمت کا نشان اور اسلام کی رواداری، انصاف پسندی اور سادگی کی آئینہ دار۔

بیت المقدس کو مسلمان عربوں نے ۶۳۸ء میں فتح کیا، ماریا پہاڑی کے ۲۵ ایکڑ وسیع رقبہ میں "مسجدِ ابراہیمی اور معبدِ سلیمانی" کو تلاش کر کے مسجد اقصیٰ تعمیر کی اور بنو امیہ کے تاجدار عبد الملک بن مروان نے مسجد اقصیٰ اور گنبدِ صخرہ کی نئے سرے سے تعمیر کے لیے اپنی حکومت کے خزانے کھول دیئے۔

اس کی تعمیر میں قیمتی پتھر، نادر سنگ مرمر، رنگین نقش و رنگ اور نقش نما شیشوں کا استعمال کیا۔ دیواروں پر خوب صورت حروف میں قرآنی آیتیں کندہ کرائیں۔

پہاڑ ماریا کے پھیلے ہوئے ۲۵ ایکڑ رقبے کو حرم شریف قرار دیا، اور اس کے جنوب میں مستطیل شکل میں مسجد تعمیر کی گئی۔ اس کے مشرق میں مسجد عمر اور چند گز کے فاصلے پر مسجد فاطمہ ہے، اس میں صرف عورتیں نماز پڑھتی ہیں، اور مردوں کا داخلہ منع ہے۔

مسجد کے صحن میں ایک حوض ہے جو کبھی وضو کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس سے سو گز کے فاصلے پر قبۃ الصخرہ کے زینے شروع ہو جاتے ہیں۔

صخرہ چٹان کو کہتے ہیں، اسی چٹان سے ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج ہوئی تھی، اور یہی مسجد اقصیٰ ہے جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔ عبد الملک بن مروان نے اس چٹان پر بہت شاندار، خوب صورت اور دل کش اور دل فریب گنبد بنوایا۔

اس کے ٹھیک مشرق میں حضرت سلیمانؑ کی قبر ہے، اور اس سے متصل جنوں کا قید خانہ ہے۔ اس میں حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں قصوروار جنوں کو قید کر دیا جاتا تھا۔

گنبد سے قریب ایک برج میں زنجیر لٹک رہی ہے جس کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ یہ انصاف کی زنجیر ہے۔

گنبد کے مغربی جانب ایک کمرے میں ہمارے

جنگ آزادی کے عظیم رہنما اور جامعہ ... کے بانی رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کا مزار ہے آپ کا انتقال لندن میں ہوا تھا مفتی فلسطین الحاج امین الحسینی کی خواہش پر مسجد اقصیٰ کے حرم میں دفن کیے گئے۔

مسجد کے مشرق میں ایک میوزیم ہے اس میں قدیم نادر، نایاب اور قیمتی یادگاریں ہیں، کلام پاک کے خوبصورت اور قدیم نسخے، پرانے زمانہ کے برتن بادشاہوں کے لباس اور صخرہ میں جلی ہوئی موم بتیاں بطور نمونہ و یادگار محفوظ ہیں۔

پورا حرم بڑا بارونق، دلکش خوش نما، پُرسکون امن و آشتی اور سلامتی کا گہوارہ اور مرکز معلوم ہوتا ہے، اس پر سے شہر بڑا بھلا لگتا ہے۔ نیچے جنوب میں گہری گھاٹیاں اور وادیاں ہیں، جن میں جا بجا پانی کے چشمے غاروں میں سے بہتے ہیں۔ کہیں کہیں قدیم گرجا گھروں، عبادت گاہوں اور عمارتوں کے کھنڈر اور ٹیلے بھی نظر آتے ہیں۔

شمال مشرق میں پُر امن قدیم شہر بیت المقدس ہے اور اس مقدس شہر میں عرب مسلمان اور عیسائی بستے ہیں۔ جنوب مشرق میں نیا یروشلم ہے، جدید طرز کی گلیاں اور خوب صورت عمارتیں، بلند گھنٹہ گھر، اونچی اونچی عبادت گاہیں ہیں، یہ حصہ یہودیوں کا ہے۔ اور تمام تر اسرائیلی حکومت کے قبضہ میں ہے۔

قدیم و جدید شہر کے درمیان ایک قد آدم دیوار تھی جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد یہودیوں نے پرانے شہر پر قبضہ کر کے دیوار توڑ دی۔

منصوبہ یہ ہے کہ قدیم و جدید شہر کو ملا کر یہودی شہر بنا دیا جائے، اور مسلمانوں اور عیسائیوں کی مقدس یادگاروں کو توڑ پھوڑ کے نئے سرے سے ہیکل سلیمانی کی بنیادوں کو تلاش کیا جائے اور اس پر ہیکل تعمیر کیا جائے۔ یہ منصوبہ اسی وقت پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے جب کہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو نیست و نابود کر دیا جائے۔

۲۱ اگست ۱۹۶۹ء کی صبح ۷ بجے مسجد اقصیٰ میں آگ لگانا اس منصوبے کی پہلی کڑی تھی، اس مجرمانہ حرکت سے نہ صرف مسجد کی بے حرمتی ہوئی بلکہ مسجد کے جنوبی حصہ کو شدید نقصان پہنچا اس کے قیمتی جھاڑ فانوس، عمدہ زرکاری، اور نقش و نگار اور قیمتی سرمایہ، سلطان صلاح الدین ایوبی کی فتح کا یادگار نشان اور شاندار و نادرِ روزگار منبر جل کر خاکستر ہو گیا۔

یہ مسجد اقصیٰ نہ صرف مسلمانوں کا قبلۂ اول ہے بلکہ خدا کے بیشتر پیغمبروں، بزرگوں، ولیوں اور بادشاہوں اور سلاطین کی دعوت، تبلیغ، فتح و نصرت، تعمیر و آرائش، تمناؤں، امنگوں اور دعاؤں کی جولان گاہ اور مرکز رہی ہے۔ اس کی بے حرمتی ان سب کی بے حرمتی ہے۔ اور اس کی بے عزتی و تخریب ان سب کی دل آزاری اور ان کی آرزوؤں کا خون ہے



عنایت اعجاز اختر

مینا کی دُم

ایک مینا تھی۔ وہ بہت بھوکی تھی۔ اپنی بھوک مٹانے کے لیے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اچانک اسے ایک گھر میں دودھ کی پیالی رکھی نظر آئی۔ دل للچا گیا۔ پھر سے اڑ کر پیالی پر جا بیٹھی۔ اور دودھ پینے لگی۔ دودھ پیتے میں اس کی دم ہوا میں لہرا رہی تھی۔

اچانک ایک بڑی بی گھر میں آئیں۔ انھوں نے مینا کو دودھ پیتے دیکھا۔ بہت لال پیلی ہوئیں اور اس کو پکڑنے دوڑیں۔ مگر مینا کی لہراتی ہوئی دم ہی پکڑ سکیں۔ مینا نے اپنے پر مارے اپنی دم چھڑانے کے لیے۔ مگر مینا دم تو نہ چھڑا پائی اور یہ پھڑپھڑانے میں دودھ کی پیالی گر گئی۔ سب دودھ گر گیا۔ مینا نے اپنی دم کو زور سے کھینچا اور وہ فوراً آزاد ہو گئی۔ مگر یہ کیا؟ اس کی دم تو بڑھیا کے ہاتھ میں رہ گئی تھی! ہائے ہائے۔ کتنی خوبصورت دم تھی۔

"بڑی بی! میری دم واپس کر دو۔"

مینا نے التجا کی۔ مگر بڑی بی نہ مانیں۔ کہنے لگیں۔ "میں تمہاری دم تب واپس کروں گی جب تم میرا دودھ واپس کرو گی۔"

اب بے دم کی مینا کیا کرتی۔ پھر سے اڑی اور گائے کے پاس پہنچی۔

"ہمیں گائے۔ اپنی گائے! مجھے تھوڑا سا دودھ دے دو۔ اگر تم مجھے دودھ دو گی تو یہ دودھ میں بڑی بی کو دوں گی۔ اور بڑی بی مجھ کو دم واپس کر دیں گی۔ مجھے بغیر دم کے اپنا آپ دکھانے جاتے شرم آتی ہے؟"

"میں مزید تمہیں اپنا دودھ دوں گی۔" گائے نے جواب دیا۔ "مگر پہلے تم تھوڑی سی گھاس لا دو۔"

مینا پھر سے اڑی اور چراگاہ کے پاس پہنچی۔

"پیاری چراگاہ!" کہا "تم مجھے تھوڑی سی گھاس دو گی۔ جو گھاس دو گی تو میں وہ گائے کو دوں گی۔ میں گائے کو گھاس دوں گی تو وہ مجھے دودھ دے گی۔ میں دودھ بڑی بی کو دوں گی تو وہ میری دم واپس

کر دیں گی۔ مجھے بغیر دم کے اپنے امی ابا کے پاس جاتے شرم آتی ہے۔"

"میں تمھیں گھاس دوں گی" چراگاہ نے کہا۔ "مگر پہلے تم مجھے پانی لا دو۔"

مینا پھر سے اڑی اور اڑتی اڑتی ایک سقے کے پاس پہنچی۔

"اچھے سقے میاں۔ اچھے سقے میاں۔ کیا تم مجھے تھوڑا سا پانی دو گے؟" مینا نے گڑگڑا کر کہا۔

"تم مجھے پانی دو گے تو میں وہ چراگاہ کو دوں گی۔ میں چراگاہ کو پانی دوں گی تو وہ مجھے گھاس دے گی۔ چراگاہ مجھے گھاس دے گی تو میں وہ گھاس گائے کو دوں گی۔ وہ مجھے دودھ دے گی۔ میں دودھ بڑی بی کو دوں گی اور وہ مجھ کو دم واپس کریں گی۔ مجھے بغیر دم کے اپنے امی ابا کے پاس جاتے شرم آتی ہے۔"

"میں تمھیں پانی ضرور دوں گا مگر میں بھوکا ہوں۔" سقے نے کہا۔ "پہلے مجھے انڈا لا دو۔"

مینا پھر سے اڑی اور مرغی کے پاس جا پہنچی۔

"لے بی کٹ کٹ کٹاک۔ لے بی کٹ کٹ کٹاک مجھے ایک انڈا دو۔" مینا نے ہانپتے ہوئے کہا۔ اڑتے اڑتے اس کی سانس پھول گئی تھی نا۔

"تم مجھے انڈا دو گی تو میں اسے سقے کو دوں گی۔ انڈا سقے کو دوں گی تو وہ مجھے پانی دے گا۔ سقہ مجھے پانی دے گا تو وہ پانی میں چراگاہ کو دوں گی۔ چراگاہ کو پانی دوں گی تو وہ مجھے گھاس دے گی۔ میں وہ گھاس گائے کو دوں گی تو میری دم مجھے مل جائے گی۔ اور جب مجھے دم مل جائے گی تب میں اپنے امی ابا کے گھر جا سکوں گی۔ مجھے بغیر دم کے اپنے امی ابا کے گھر جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

مرغی نے مینا کو دیکھا: "چچ چچ۔ واقعی بے چاری بغیر دم کے کتنی بری لگتی ہے۔ اور پھر وہ ایسی حالت میں اپنے امی ابا کے پاس جائے گی تو وہ اسے ڈانٹیں گے۔ شاید بغیر دم کے پہچان بھی نہ سکیں۔" مرغی کو ترس آ گیا۔ اور اس نے فوراً ایک انڈا دے دیا۔

مینا انڈا لے کر پھر سے اڑی اور اسے سقے کو دیا۔ سقے نے اسے پانی کی ایک پیالی دی۔ مینا پانی لے کر پھر سے اڑی اور چراگاہ کو دیا۔ چراگاہ نے اسے گھاس دی۔ مینا یہ گھاس لے کر پھر سے اڑی اور گائے کو دی۔ گائے نے اسے دودھ کی ایک پیالی دی۔

مینا دودھ کی پیالی لے کر اڑی اور بڑی بی کے گھر پہنچی۔ دودھ بڑی بی کو دے دیا۔ بڑی بی بہت نیک تھیں۔ انھوں نے وعدے کے مطابق دم واپس کر دی۔ بلکہ مینا کو اپنی دم باندھنے میں مدد بھی دی۔

مینا نے دو تین بار اڑ کر دیکھا کہ دم اچھی طرح لگ گئی یا نہیں اور وہ بڑی بی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اپنے امی ابا کے پاس اڑ گئی۔ اب اسے دم مل گئی تھی۔ پھر اپنے امی ابا کے سامنے جاتے کیوں شرماتی بھلا!

جناب کیف احمد صدیقی

ہمارے استاد

کتنی محنت سے بڑھاتے ہیں ہمارے استاد
ہم کو ہر علم سکھاتے ہیں ہمارے استاد
توڑ دیتے ہیں جہالت کے اندھیروں کا طلسم
علم کی شمع جلاتے ہیں ہمارے استاد
منزلِ علم کے ہم لوگ مسافر ہیں مگر
راستہ ہم کو دکھاتے ہیں ہمارے استاد
زندگی نام ہے کانٹوں کے سفر کا لیکن
راہ میں پھول بچھاتے ہیں ہمارے استاد
دل میں ہر لمحہ ترقی کی دعا کرتے ہیں
ہم کو آگے ہی بڑھاتے ہیں ہمارے استاد
سب کو تہذیب و تمدن کا سبق دیتے ہیں
ہم کو انسان بناتے ہیں ہمارے استاد
آدمیت کی ہو تعلیم کہ درسِ اخلاق
سارے آداب سکھاتے ہیں ہمارے استاد
ہم کو دیتے ہیں وہ ہر لمحہ پیامِ تعلیم
اچھی باتیں ہی بتاتے ہیں ہمارے استاد
خود تو رہتے ہیں بہت تنگ و پریشان مگر
دولتِ علم لٹاتے ہیں ہمارے استاد
ہم پہ لازم ہے کہ ہم لوگ کریں ان کا ادب
کس محبت سے پڑھاتے ہیں ہمارے استاد

جناب واحد پریمی



ایک افسانہ ایک حقیقت

(اپالو الا کی کامیابی پر)

میں نے یہ بچپن میں سنا تھا
اڑن کھٹولے ہوتے ہیں
جن پر دیو، پری اور جن
رات کو اڑتے پھرتے ہیں
لیکن آج خلاؤں میں.
انساں کو اڑتا دیکھ رہا ہوں
اور تو اور اس خاک نشیں کو
چاند پہ چلتا دیکھ رہا ہوں
یعنی کل کا جھوٹا فسانہ
آج بنا ہے ایک حقیقت

خاک پر بیٹھنے والے یعنی زمین پر

جناب غلام حیدر



نیلم اور فرخ

(مسلسل)

فرخ :- میں اب تمھارے ملک میں آگیا ہوں جو بھی کام چاہو تم مجھے بتا سکتی ہو اگر میں نے تمھارے بتائے ہو سارے کام پورے کر دیے تو پھر تمھیں شہزادی نیلم کی شادی میرے ساتھ کرنی ہوگی

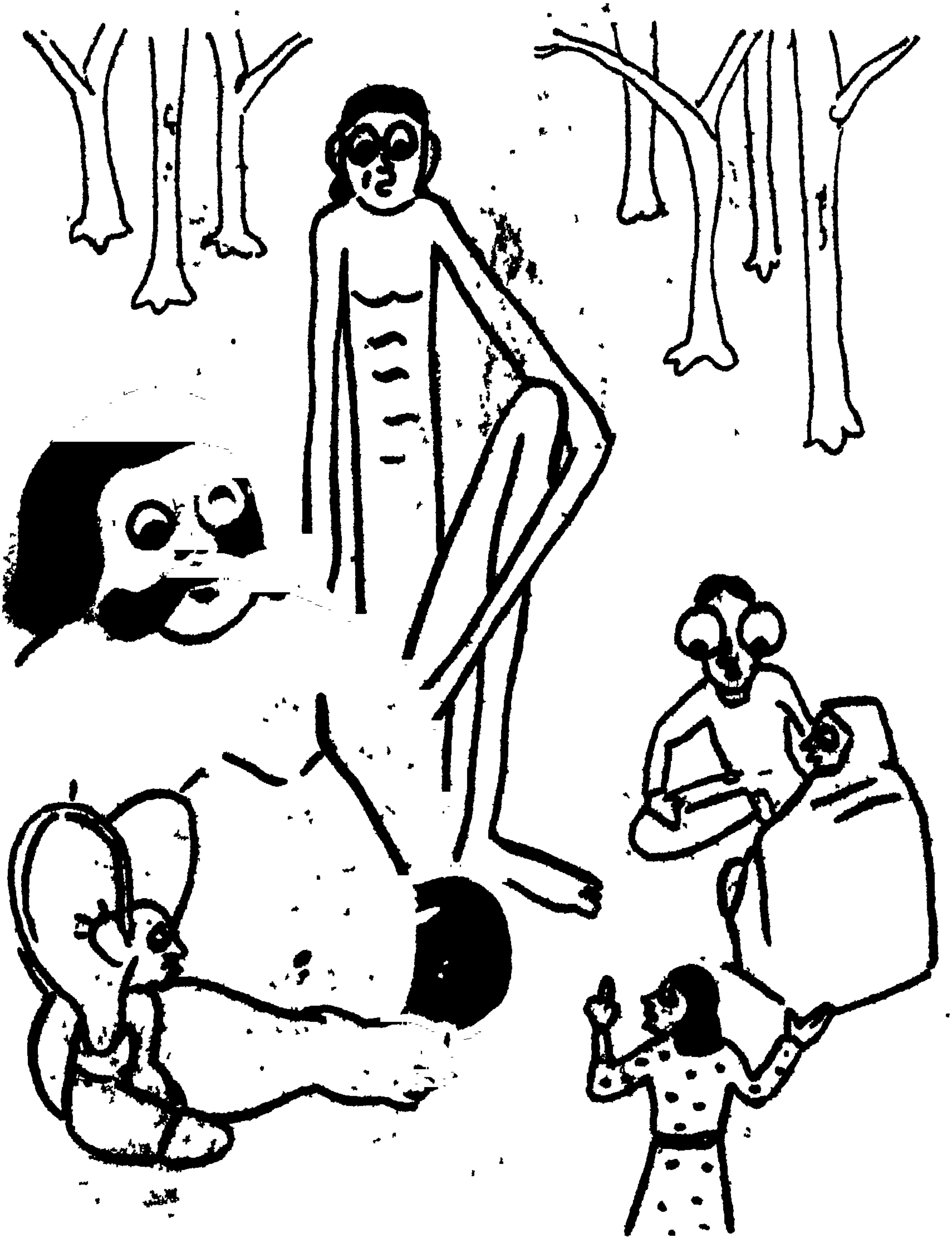
ملکہ :- اچھا، میں تمھیں تین کام بتاؤں گی. اور اگر تم نے میرے تینوں کام پورے کر دیے تو نیلم کی شادی تمھارے ساتھ ضرور کر دی جائے گی. لیکن اگر تم ان میں سے کوئی ایک کام بھی پورا نہ کر سکے تو تمھیں فوراً قتل کروا دیا جائے گا۔ کہو منظور ہے؟

فرخ :- تم بتاؤ۔ پہلا کام کیا ہے :

ملکہ :- میری ایک انگوٹھی بحر قلزم کہیں گر پڑی ہے تمھیں اسے ڈھونڈھ کر لانا۔

شہزادہ فرخ اپنے پانچوں ساتھیوں کے پاس پہنچا۔ اور انھیں بتایا ۔

فرخ :- پہلا ہی کام کوئی آسان کام نہ ہے۔ بحر قلزم میں کہیں ملکہ کی انگوٹھی گر گئی ہے اسے ڈھونڈ کر ملکہ کو دینا ہے۔ اب تم سب سر کر بیٹھو اور بتاؤ کہ اسے کیسے ڈھونڈا جائے۔ بس فوراً سوا لکھا خاں کھڑے ہوتے او

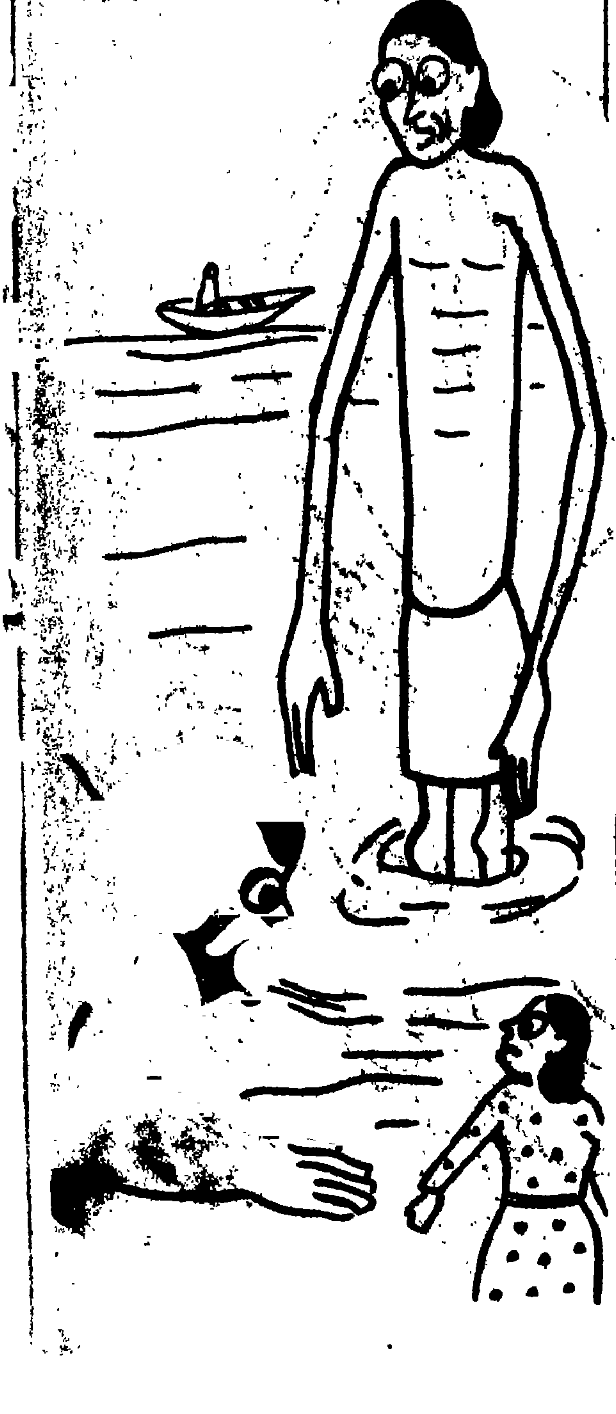


...سے کہا
سوکھا: میں دیکھ کر بتاؤں گا کہ وہ کہاں
...ڑی ہے۔ اور تھوڑی دیر میں چلّا کے بولا: میں نے دیکھ
لی۔ وہ تہہ میں ایک پتھر کے ٹکڑے پڑی چمک رہی ہے۔
لمبو خاں: اپنے سینے پر ہاتھ مارتے



...ہوئے بولے: میں اسے نکال لاؤں گا چاہے وہ
پاتال میں کیوں نہ پڑی ہو۔ مگر بس میں پہلے اسے
...ایک بار دیکھ لوں گا
موٹو میاں: یہ کیا مشکل بات ہے۔
...کر دوں گا تمہاری۔
اور وہ سب کے سب سمندر کے کنارے
پہنچ گئے۔ موٹو میاں سمندر کے کنارے پر منہ
کے بل لیٹ گئے اور پانی سے منہ لگا کر انھوں نے

سمندر کا پانی پینا شروع کر دیا۔ موٹو میاں شڑاپ
شڑاپ پانی پیتے رہے۔ ان کا پیٹ پھولتا رہا۔
سمندر خالی ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہہ میں







پڑی ہوئی مچھلیاں، پانی کے جانور، چمک دار پتھر، اور پھر کائی سے ڈھکے ہوئے پتھر نظر آنے لگے۔

پھر سوا لکھا خاں نے اشارے سے لمبو خاں کو بتایا کہ کئی میل دور پتھر پہ انگوٹھی پڑی ہوئی ہے جب لمبو خاں پھر بھی انگوٹھی نہ دیکھ سکے تو انھوں نے سوا لکھا خاں کو اپنے بائیں ہاتھ پر بٹھا لیا اور تھوڑا سا جھک کر ہاتھ آگے کو بڑھا دیے۔ سوا لکھا خاں انھیں بتاتے رہے اور انھوں نے دوسرے ہاتھ سے ٹٹول کر انگوٹھی اٹھالی۔

شہزادہ فرخ بہت خوشی خوشی انگوٹھی لے کر ملکہ کے پاس گیا۔ دوسری طرف موٹو میاں نے اپنے پیٹ کا سارا پانی سمندر میں پھر اگل دیا۔

فرخ: ملکہ، میں تمھاری انگوٹھی ڈھونڈ کے لایا ہوں۔ [illegible]



ملکہ :- تم حیرت انگیز آدمی ہو۔ ملکہ بڑی حیران تھی کہ یہ کام اس نے بالکل ناممکن سمجھ کر فرزانہ کے سپرد کیا تھا۔ یہ تو اس نے پورا کر دیا۔ بہرحال تم نے یہ کام تو پورا کر دیا، اب دوسرا سنو۔

دوسرا سوال ملکہ فرخ سے کیا گیا یہ جاننے کے لیے سالنامہ کا انتظار کیجیے۔

لطیفہ

مجسٹریٹ :- (چور سے) اگر تم جھوٹ بولو گے تو کہاں جاؤ گے؟

چور :- جہنم میں۔

مجسٹریٹ :- اگر سچ بولو گے تو؟

چور :- جیل میں۔

طاول فرید دکننگ



جناب [illegible]

پرندوں کی انوکھی عادتیں



WOOD COCK

چوہا، بلی اور بہت سے جانوروں کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ وہ اپنے بچوں کو منہ میں دبا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔ بہت تو نہیں ہاں چند پرندے بھی اسی طرح اپنے بچوں کو لے کر اڑتے ہیں۔ خطرے کے وقت جل کوے کی مادہ اپنے بچے کو رانوں میں دبا کر اڑ جاتی ہے اور کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر بچے کو رانوں سے جدا کرتی ہے۔ مادہ بطخ بھی بچے کو اپنی چونچ میں دبا کر اڑتی ہے۔

پرندوں میں دیکھنے اور محسوس کرنے کی قوت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ ہماری آنکھیں منہ پر ہوتی ہیں اور ہم دونوں آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن الو وغیرہ کو چھوڑ کر زیادہ تر چڑیوں کی آنکھیں سر کے دونوں جانب ہوتی ہیں۔ اسی لیے ان کے دیکھنے کا انداز ہم سے مختلف ہوتا ہے۔ آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ انسان کسی چیز کو بغور دیکھنے کے لیے گردن کی جنبش سے سر کو کتنا ٹیڑھا کر سکتے ہیں۔ قدرت نے ان کو تیز نظر بنا کر ان کی زندگی آسان بنا دی ہے نیچے زمین پر پڑے ہوئے دانے اور کیڑوں مکوڑوں سے پیٹ بھرنے والی چڑیاں قوتِ بینائی ہی کے بل بوتے پر زندہ رہتی ہیں۔ شکاری پرندوں کی بینائی عام چڑیوں سے کہیں زیادہ اور حیرت انگیز ہوتی ہے۔ باز اور شکرے جیسے پرندوں کی نگاہیں تو بہت ہی تیز ہوتی ہیں۔ "عقاب جیسی آنکھوں" والی ترکیب آپ نے سنی ہوگی۔ عقاب کی تیز نگاہی کا ایک سچا واقعہ پرندوں کے ماہر MR.E.H.ELON کی زبانی سنیے۔

"میں جھیل کے کنارے کھڑا تھا اور آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا انتہائی بلندیوں پر ایک عقاب بے انتہا تیز رفتاری سے اڑ رہا تھا۔ اڑتے اڑتے یکایک اس نے اپنا رخ بدلا اور بالکل ترچھے رخ پر جھپٹا ہوا۔ مجھ سے بہت دور جھیل کے کنارے کی طرف ٹوٹ پڑا۔ جب وہ اوپر اٹھا تو اس کے پنجوں میں مچھلی تھی۔ اور جس مقام سے اس نے مچھلی پکڑی تھی وہ اتنا دور تھا کہ

دوسرے ... بھی ہیں کہ ... ہوتی تھی نہیں ... سکتی تھی۔ اس واقعہ کے بعد میں نے ... صاحب نے ... کر رکھی تھی۔ اور ... کر رہا تھا۔ بہت احتیاط اور ... دونوں مقاموں کا درمیانی فاصلہ ناپا۔ یہ فاصلہ تین میل تھا۔ اب آپ خود اس کی تیز نگاہی کا اندازہ کر لیجیے۔"

گدھ کی نگاہیں اور سونگھنے کی قوت دونوں بہت تیز ہوتی ہیں۔ گدھ بھی بلندیوں سے نیچے پڑے ہوئے مردہ جسم کو دیکھ لیتا ہے — ایک بار ALAN DEROC ماہر حیوانات اپنی تجربہ گاہ کے قریب اس طرح زمین پر پڑ گئے جیسے مر گئے ہوں۔ ان کی تجربہ گاہ سطح زمین سے کچھ بلندی پر تھی۔ آدھے گھنٹے کے اندر انہیں مردہ سمجھ کر گدھوں نے گھیر لیا۔

پرندے رنگوں کی تمیز بھی رکھتے ہیں۔ بہت سے رنگ ایسے ہوتے ہیں جو انہیں بخوبی نظر آجاتے ہیں، جیسے سرخ، سبز اور زرد رنگ۔ نیلے رنگ کی تمیز پرندہ بہت کم کرتا ہے۔ تجربہ کرنے والوں نے کبوتروں کی آنکھوں پر نیلے اور بنفشی چشمے لگائے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ بالکل نہیں دیکھ سکے۔ لال، سبز رنگ کے چشمے سے کبوتر بہ آسانی دیکھ لیتے ہیں۔ اس طرح مرغیوں پر بھی تجربہ کر کے دیکھا گیا ہے۔ مرغی خانے میں دانہ ڈال دیجیے۔ اور پھر جتنی جگہ میں دا... ہو اس پر نیلی روشنی ڈالیے۔ مرغیاں اس کے اردگرد گھومیں گی سوا نہ انہیں نظر نہ آ... صرف الو ہی ایک ایسا پرندہ ہے جو نیلے ... کی تمیز کر لیتا ہے۔

چڑیوں کی آنکھوں سے متعلق بہت سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ گرد دار ہوا کے جھونکے چڑیوں کی آنکھیں ... کرتی ہیں۔ چڑیاں تو کھلے آسمان کی بلندیوں ... بہت تیز اڑتی ہیں۔ اور ان کی آنکھوں پر شدید ... کا اثر بھی پڑنا چاہیے۔ یہ بھی قدرت کی کا... ہے کہ پرندوں کی آنکھوں کے کونوں میں ایک تیسرا پپوٹا ہوتا ہے جس کی جھلی سے با آسانی دیکھا جا سکتا ہے۔

اڑتے وقت پرندوں کے اس پپو... کی جھلی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور آنکھ... تیز ہوا کے اثر سے محفوظ رہتی ہیں۔ پانی کے ... ہم دیکھ نہیں پاتے لیکن رام چڑیا شاخ پر بیٹھے بیٹھے پانی کے اندر کی مچھلی دیکھ لیتی ہے اور غو... لگا کر پکڑ لاتی ہے۔ غوطہ خور شکاری چڑیوں کی آنکھوں کی بناوٹ کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ پانی میں داخل ہوتے ہی ان کی آنکھوں کے ا... کوئے ان کو پانی کے اندر دیکھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ آنکھوں کے ان غلافوں سے پرند...

(باقی ...)


گرفت میں آ گئے...؟ 'سینفورائزڈ' کی مدد لیجیے
اور مسٹر شرنک کی گرفت کھول ڈالیے!
·SANFORIZED·



بـ اظہر افسر

یلورا اور اجنٹا کی سیر

(پس منظر موٹر کار کی آواز)

ن۔ چچا جان آج کا دن بڑا اچھا ہے۔
۔ اچھا! وہ کیوں؟
ن۔ ایک عرصے سے ایلورا اور اجنٹا کی سیر کی آرزو
تھی شکر ہے آج پوری ہو رہی ہے۔
۔ دیکھو بھئی پہلے تو تم کوئی وعدہ نہیں کرتے۔
کرتے ہیں تو جلد سے جلد پورا بھی کر دیتے ہیں۔
۔ اب اور کتنی دور ہیں ایلورا کے غار چچا جان۔
۔ بس اب تھوڑی دیر میں پہنچنے ہی والے ہیں۔
یہ غار اپنے شہر اورنگ آباد سے چودہ میل
دور ہیں۔ اورنگ آباد کا چھوٹا سا شہر ابھی
ابھی گذرا ہے تو ایلورا کے یہ غار جو سوا
میل کی دوری پر پھیلے ہوئے ہیں۔ خلد آباد
سے ایک میل کے فاصلے پر ہیں۔
ن۔ سنتے ہیں چچا جان یہ غار بہت پرانے ہیں۔
۔ ہاں بہت پرانے ہیں۔ اس بستی کا نام پہلے
ایلاپوری تھا۔ پہاڑی سلسلے میں اندر ہی اندر
تراشے ہوئے یہ کوئی ۳۴ غار ہیں۔ ان ۳۴
غاروں میں سے ۱۲ غار بودھی ہیں، ۱۷ برہمنی
ہیں اور ۵ جینی ہیں۔ سب سے خوبصورت
غار "کیلاش" ہے۔ تم نے مہاتما بدھ کا نام تو
سنا ہوگا۔
حامد۔ جی ہاں ہم نے تاریخ میں پڑھا ہے چچا جان کہ
اودھ کے شمال میں کپل وستو نامی شہر میں
حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے کوئی ۵۶۰ سال
پہلے پیدا ہوئے تھے۔
منی۔ اور یہ کہ ان کا اصلی نام سدھارتا تھا۔
چچا۔ ہاں جوانی کے زمانے میں یہ دنیا سے ایسے
بیزار ہو گئے کہ اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ کر
جنگل کی طرف نکل گئے۔ کئی سال بعد انہیں
ایک پیپل کے درخت کے نیچے گیان حاصل
ہوئے۔ (اسے بودھی کہتے ہیں) اسی دن
سے ان کا نام گوتم بدھ ہو گیا۔ گوتم بدھ کو

ساکیہ منی کہتے ہیں

حامد۔ جی ہاں کیونکہ گوتم بدھ ساکیہ خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔

چچا۔ بودھی حاصل ہونے کے بعد گوتم بدھ نے اپنے مذہب کو پھیلانا شروع کیا۔ اس مذہب کے ماننے والے بودھ یا بودھی کہلاتے ہیں۔ ایلورا کے یہ غار پہلے پہل انہی لوگوں نے بنائے۔ یہ غار پہلی صدی عیسوی سے لے کر چھٹی صدی عیسوی اور گیارھویں عیسوی تک تعمیر کئے گئے ہیں۔ لو بھئی باتوں باتوں میں وہ غار بھی آگئے۔ دیکھو یہاں سے ان غاروں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

حامد۔ یہ تو بالکل گھروں جیسے ہیں۔

چچا۔ ہاں ذرا ان کی چھتوں کو دیکھو اور ان ستونوں کو بھی کیسے خوبصورت ہیں۔

حامد۔ ستونوں اور دیواروں پر طرح طرح کی مورتیاں بنی ہیں۔

چچا۔ چھت پر بھی تو دیکھو کس نفاست سے نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔

منی۔ اللہ۔ کیا ایک جال ہے۔

حامد۔ کیسے عمدہ نقش و نگار ہیں۔

منی۔ پتھر ہی پتھر میں دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں پہاڑی طرز کی گائیاں اور جانور بنے ہوئے ہیں۔ پتھر ہی میں ان کے چہرے کیسے صاف بنائے

گئے ہیں

چچا۔ یہی تو کمال ہے۔ ان لوگوں نے پتھر کو بھی ایسے استعمال کیا ہے جیسے موم۔ اور پھر بھی کام دو دو تین تین منزلہ غاروں میں کیا گیا ہے۔ غار نمبر ۱۲ اس کی بہت عمدہ مثال ہے۔ آؤ سب سے پہلے غار نمبر ۱۰ میں چلتے ہیں۔

حامد۔ اوہو۔ یہ تو ایک عالی شان محل معلوم ہوتا ہے۔

منی۔ بھئی واہ، کیا ستون ہیں کیا اونچی چھت ہے۔

حامد۔ اور کیا چوڑی چوڑی غلام گردشیں ہیں کیا وسیع صحن ہے۔

چچا۔ یہ غار وشوکرما کہلاتا ہے۔ یہ خوب صورت ستون جو تم لوگ دیکھ رہے ہو، چودہ چودہ فٹ بلند ہیں۔ وہ دیکھو بالکل سامنے مہاتما بدھ کا بت ہے۔ انھیں بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔

منی۔ کتنا اونچا پتھر کا بت ہے۔ آؤ حامد قریب سے دیکھیں۔

حامد۔ منی تمھارا سر تو بت کے گھٹنے تک ہی پہنچتا ہے۔

منی۔ تم کون سے اونچے ہو۔ تمھارا کندھا لگ رہا ہے بس۔

حامد:- بہت بڑا بت ہے۔
منی:- چچا جان پیاس لگی ہے۔
چچا:- تم کو پیاس لگی ہے تو آؤ یہاں پانی پی لو۔
ادھر ایک چھوٹا سا خوب صورت چشمہ بھی ہے۔
حامد منی: ہاں ہاں چچا جان ضرور پئیں گے۔
چچا:- یوں تو ہر غار میں پانی کا چشمہ ہے مگر
اس دسویں غار کے چشمے کا پانی آج تک
نہایت صاف اور میٹھا ہے۔ کھدی ہوئی
مورتیاں دیکھنے کے لائق ہیں۔ مگر اب آؤ
غار نمبر ۱۶ میں چلتے ہیں۔ یہ غار راون کی کھائی
کہلاتا ہے۔ دیکھو اس غار کے سامنے چار
ستون ہیں اور اندر بارہ ستون ہیں۔ ہال
چوالیس فٹ چوڑا ہے اور [illegible] لمبا ہے۔
دیکھو ستونوں پر پھولوں کے کیسے پیارے
پیارے گلدستے ہیں۔
حامد:- جی ہاں۔ ہیں سچ مچ چچا جان۔
چچا:- واہ، واہ ستونوں پر بھی کیسی پیاری مورتیاں
تراشی گئی ہیں۔ اور کس ادا سے کھڑی ہیں۔
یہ مورتیاں بھی واہ۔
حامد:- بڑی پیاری پیاری مورتیاں ہیں۔
چچا:- ادھر دیکھو۔ یہاں اس تصویر میں شیوجی اور
پاربتی جی، دونوں ایک اونچے چبوترے پر
بے فکر بیٹھے ہیں۔ ادھر راون کیلاش
پہاڑ کو [illegible] اٹھا

رہا ہے۔ کیلاش پہاڑ پاربتی اور شیو ہیں۔
پاربتی ڈر کر شیوجی سے لپٹ گئی ہیں شیوجی
اپنے پیر سے کیلاش کو دبا رہے ہیں تاکہ
راون اٹھا نہ سکے۔
منی:- یہ راون ہے نا چچا جان جس کے دس سر اور
بیس ہاتھ بنائے گئے ہیں۔
چچا:- ہاں۔ سر پہ تاج ہے اور تاج پر گدھے
کا سر بنا ہوا ہے۔
منی:- ارے! ادھر تو بہت سی تصویریں ہیں۔
ادھر ہو ہو۔
چچا:- یہاں لکشمی جی کنول کے پھول پر بیٹھی
ہیں اور دوسری مورتیاں پانی کے گھڑے
پکڑی ہیں۔
منی:- لکشمی جی کے چار ہاتھ ہیں سیدھے ہاتھ
میں سنکھ ہے۔
حامد:- ارے لیجیے ہاتھی لکشمی جی کو اشنان بھی کرا رہے
ہیں۔
چچا:- ادھر وشنو جی کی مورتی بنی ہوئی ہے ان
کے دونوں طرف سری دیوی اور بھو دیوی
ہیں۔ آس پاس چار آدمی [illegible] کھڑے
ہیں۔ ادھر بہت سے [illegible] ہیں۔
یہاں دیکھو وشنو جی ایک [illegible] تخت
پر بیٹھے [illegible] ہیں
[illegible]

ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں۔

حامد:۔ واہ وا، واہ۔ بہت عمدہ۔

چچا:۔ اب چلو سب سے وسیع اور سب سے بڑے غار کی طرف چلیں۔

منی:۔ وہ کون سا غار ہے چچا جان۔

چچا:۔ وہ ہے غار نمبر ۱۶۔

حامد:۔ اوہ ہو کتنا وسیع غار ہے۔

چچا:۔ اسے کیلاش یا رنگ محل بھی کہتے ہیں۔ آٹھویں صدی عیسوی میں کہا جاتا ہے کہ راشٹر کوٹ کے راجا کرشنا رائے اول کے حکم سے جو سنہ ۷۵۸ء سے ۷۷۲ء تک حکمران تھا، ایک بہت بڑے پہاڑی سلسلے میں تراشا گیا تھا۔

حامد:۔ ہاں کرشنا رائے اول کا دور ہم تاریخ میں پڑھ چکے ہیں۔ اوہو کتنا بڑا صحن ہے۔

چچا:۔ سامنے دیول ہے، بے شمار ہاتھی اپنے سروں پر دوسری منزل کو لیے کھڑے ہیں۔ وسیع صحن دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ شمالی حصہ اور جنوبی حصہ ہر حصے میں ایک بہت بڑا ہاتھی کھڑا ہے اور نقش و نگار سے آراستہ صحن کے ہر حصے میں ایک بہت بڑا ستون ہے۔

منی:۔ کتنے خوب صورت ہاتھی ہیں چچا جان۔

چچا:۔ ہاں یہاں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ جیسا ہاتھی ہو ویسا ستون۔ اور نقش و نگار اور مورتیاں ایک طرف بنائی گئی ہیں۔ صحن کے دوسرے حصے میں بھی بالکل ایسا ہی ہاتھی ستون اور مورتیاں ہیں۔

منی:۔ یہ کیسی تصویریں ہیں چچا جان۔

چچا:۔ یہاں تصویروں ہی تصویروں میں بتایا گیا ہے کہ نرسنگھ ہرن کشیپ کو چیر رہے ہیں ادھر چتر بھوجی شیوجی اور نندی کی مورتیاں ہیں اُدھر انپورنا جی ہاتھوں میں پانی کا لوٹا، مالائیں اور پھول لیے کھڑی ہیں۔ کرشن جی کا پیر کالے ناگ پر ہے۔ کالا ناگ سات پھن کا ہے۔

حامد:۔ جی ہاں۔ اوہو۔

چچا:۔ اِدھر شیو پاروتی ہیں۔ پاروتی جی نے اپنے بال کیسے سنوارے ہیں۔

منی:۔ ان مورتیوں میں سب کے بال بالکل نئے طریقے سے سنوارے گئے ہیں۔

چچا:۔ (ہنستے ہیں) ہاں آج جو بال بنانے کا نیا فیشن نکالا گیا ہے، وہ انھی مورتیوں سے لیا گیا ہے۔ اِدھر شیو جی کی تصویر ہے۔ سیدھے کاندھے پر ترشول ہے۔ بائیں ہاتھ میں کمنڈل ہے۔ سیدھے ہاتھ میں ڈمرو ہے۔ سامنے پاروتی جی ہیں۔

حامد:۔ گلے میں ناگ بھی تو ہے۔

چچا:۔ اِدھر دیکھو کتنا خوب صورت مور ہے۔

چچا۔ اسا ادھر دیکھو بہت بڑی برات چلی جا رہی ہے۔ لوگوں کا ہجوم ہے۔ پالکی میں راجہ کی سواری جا رہی ہے۔ ادھر ہاتھیوں کی قطاریں ادھر ہرن ہیں۔ کچھ دوڑ رہے ہیں کچھ سو رہے ہیں۔

حامد۔ ادھر چچا جان شاید چشمے کا منظر ہے جس کے کنارے درخت ہیں، بیلیں ہیں پھندے ہیں۔

چچا۔ ہاں بعض تصویریں یہاں رنگین بھی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس غار کی تصویروں کو آٹھویں صدی عیسوی میں رنگا گیا ہے۔ ادھر دیکھو، یہاں سے وہاں تک رامائن کے منظر دیئے گئے ہیں۔ رامائن تو تم نے پڑھی ہوگی۔

حامد۔ ہاں چچا جان اس کا ایک حصہ تو ہمارے کورس کی کتاب میں بھی ہے۔ یہاں راون سیتا جی کو چرا کر لے جا رہا ہے۔

چچا۔ ادھر رام اور راون کی لڑائی ہو رہی ہے۔ ادھر سے ہنومان بھی مدد کو آ رہا ہے۔ پھر یہاں سیتا جی کی رہائی دکھائی گئی ہے۔ اس طرح تصویروں اور مورتیوں سے بھرپور یہاں ۳۴ غار ہیں جن میں گنیش غار، دانیشور غار، نیل کنٹھ کا غار، تیلی کا گھانہ، کمہار واڑہ، گوپی کا غار، سیتا کی نہانی اور جینی غاریں جگناتھ سبھا اندر سبھا کے دیول ہیں۔ چلو اب چلیں شام تک اجنتا کے غار بھی تو دیکھ لینے ہیں۔

حامد۔ جی ہاں۔ چلیے۔

(کار کی آواز ابھرتی ہے)

چچا۔ اجنتا کے غار اورنگ آباد شہر سے کچھ میل دور ہیں۔ تم نے حامد تاریخ میں ہیون سانگ کا نام پڑھا ہے۔

حامد۔ جی ہاں۔ یہ ایک چینی سیاح تھا جو ۶۲۹ء میں ہندوستان آیا تھا۔

چچا۔ یہی سیاح بیان کرتا ہے کہ اجنتا چالوکیہ راجہ پلکیشن اوّل کی راجدھانی تھا اور پہلا غار خیال کیا جاتا ہے کہ پہلی صدی قبل مسیح سے ساتویں صدی عیسوی تک تعمیر کیے گئے ہیں ایک عجیب بات ہے۔

حامد۔ وہ کیا چچا جان۔

چچا۔ یہ غار نصف دائرے میں پھیلے ہوئے ایک طویل پہاڑی سلسلے میں بنائے گئے ہیں مگر اٹھارویں صدی عیسوی تک کسی کو ان غاروں کا پتہ نہ تھا۔ ۱۸۱۹ء میں انگریزی سپاہیوں کا ایک دستہ مرہٹوں سے لڑائی کے زمانے میں اس جنگل سے گزرا۔ ان غاروں کو قدرتی سمجھ کر ان سپاہیوں نے پناہ لی اور جب داخل ہوئے تو دیکھ کر حیران

رہ گئے کہ یہ غار مورتیوں اور نقش و نگار سے
آراستہ ہیں اور ایسی ایسی تصویریں بنی ہوئی
ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔
حامد۔ اب ہم کہاں سے گزر رہے ہیں چچا جان۔
چچا۔ اجنتا کے غاروں میں داخل ہونے کے لیے
یہ نواب نظام علی خاں کی بنائی ہوئی فصیل
ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں۔ اس کے تین
دروازے ہیں۔ سرائے دروازہ، پھول
دروازہ اور سیونا دروازہ۔ یہ سرائے دروازہ
ہے۔ ایلورا کی طرح بودھ مذہب کے پیروؤں نے
یہاں ۲۹ غار تراشے ہیں۔ ان غاروں میں
پانچ بڑے بڑے عبادت خانے ہیں اور
۲۴ خانقاہیں ہیں۔ ان خانقاہوں اور عبادت
خانوں میں رنگین تصویروں کے علاوہ پتھر
میں تراشی ہوئی بے شمار مورتیاں ہیں پھول
پتے اور دوسری کاری گری کے نفیس نمونے
ہیں۔
منی۔ اب ہم ۲۹ غار دیکھیں گے چچا جان۔
چچا۔ نہیں بھئی ان ۲۹ غاروں میں سے صرف
غار نمبر ایک، غار نمبر دو، غار نمبر نو، دس،
سولہ اور سترہ ہی میں، واضح مورتیاں
تصویریں اور نقش و نگار رہ گئے ہیں۔
باقی غاروں میں زمانے کے ہاتھوں سب
کچھ ختم ہو گیا۔ پھر بھی ان تصویروں کو
دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں
ہندوستان کا فن مصوری کس قدر ترقی اور
عروج پر تھا۔
(ریکارڈ کی آواز ختم ہو جاتی ہے)
چچا۔ آؤ اب ہم غاروں کی طرف چلتے ہیں۔ یہ
پہلا غار ہے۔
حامد۔ سچ مچ کیا نقش و نگار ہیں۔
منی کیا بیل بوٹے ہیں۔
چچا۔ ذرا ان انسانی مورتیوں کو دیکھو۔
حامد۔ ایسا معلوم ہوتا ہے چچا جان کہ اب بول
پڑیں گی۔
چچا۔ اِدھر دیکھو ایک راجا جو بھکشو ہو گیا تھا۔
اپنے ہی محل کے دروازے پر بھکشا مانگنے
آیا ہے۔ رانی بھکشو کی آواز پہچان کر
تھال میں کھانا بھیج رہی ہے۔ تصویر میں
رانی کے چہرے پر جذبات کو کس خوبی سے ظاہر
کیا گیا ہے۔
حامد۔ ہاں چچا جان واہ واہ۔
منی رانی کا زیور سر کا تاج اور مالائیں بھی تو
دیکھیے۔
چچا۔ بھکشو کے چہرے پر روحانی عظمت ہے۔
پہرہ دار جو دروازہ کے درمیان بیٹھا ہے
اس کی لٹکتی ہوئی مونچھیں اور چہرہ بھی تو
دیکھو۔

حامد۔ جی ہاں، رنگ بھی کیسے عمدہ اور موزوں ہیں۔

چچا۔ پہلے پتھر پر مورتیاں اور نقش و نگار بنائے گئے ہیں پھر ان پر خاص مسالہ پوت کر اس پر رنگ کیا گیا ہے۔

منّی۔ اور رنگ بھی ایسا کہ آج تک قایم ہے۔

چچا۔ یہی تو اجنتا کی خوبی ہے۔

منّی۔ چچا جان یہاں دو بیل آپس میں لڑ رہے ہیں واہ کتنے عمدہ بیل ہیں۔

چچا۔ اِدھر مہاتما بدھ کو نہلایا جا رہا ہے۔ ایک طرف خادم کھڑے ہیں۔ دوسری طرف فقیر ہیں۔ ایک آدمی کپڑے سیے کھڑا ہے۔ چلو اب دوسرے غار میں چلیں۔

منّی۔ چلیے۔

چچا۔ یہ دیکھو۔ یہاں ناگ راجہ کی بیٹی اُوندتی جھولا جھول رہی ہے۔ سہیلیاں آس پاس کھڑی ہیں۔ اُدھر ناچنے والی عورتیں اپنے فن کو پوری خوبی سے دکھا رہی ہیں۔

حامد۔ چھت کے بیل بوٹے کتنے عمدہ ہیں۔

چچا۔ یہ غار نمبر ۹ ہے۔ ذرا یہاں کی بہار دیکھو۔ کیسی انوکھی مورتیاں طرح طرح کے پھول اور گل بوٹے ہیں۔ حامد اور منّی اِدھر آؤ اِدھر۔ ان تصویروں کو قریب سے کبھی نہ دیکھنا چاہیے۔ ان تصویروں کو دیکھنے کے لیے کم سے کم سات فٹ کے فاصلے سے کھڑا ہونا چاہیے۔ یہاں سے دیکھو پھر تمہیں تصویروں کی اصلی خوبی اور خوبصورتی دکھائی دے گی۔

حامد۔ واہ وا واہ چچا جان ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کبھی پتھر میں بنی ہوئی ایسی عجیب و غریب تصویریں دیکھ سکیں گے۔

چچا۔ اب آؤ غار نمبر ۱۶ میں چلیں۔

منّی۔ اوہو کتنا بڑا کتبہ لگا ہے یہاں۔

چچا۔ ہاں یہ کتبہ راجہ ہری سینا کے وزیر نے لکھوایا تھا۔ اس میں قدیم سنسکرت زبان میں لکھی ہوئی ۲۰ سطریں ہیں۔ آؤ اندر چلیں۔ یہاں بھی اور غاروں کی طرح بیل بوٹے نقش و نگار اور تصویریں ہیں اِدھر ساری مذہبی کہانیوں کو تصویروں میں دکھایا گیا ہے۔ اور یہ غار نمبر ۱۷ ہے۔

منّی۔ جی۔

چچا۔ اِدھر دیکھو یہ ایک راجہ کے محل کا نقشہ ہے۔ راجا تخت پر بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے رانی بیٹھی ہے۔

منّی۔ کتنے خوبصورت راجا رانی ہیں۔

چچا۔ آس پاس محل کی دوسری عورتیں ہیں۔ ذرا اس عورت کی طرف دیکھو جو ستون کے پیچھے سے جھانک رہی ہے۔ راجا کے تخت کے پاس دو عورتیں چنور لیے

گھڑی ہیں۔ سامنے ایک مسخرہ ہے دو بڑے آدمی کھانے کے تھال لیے ہوئے ہیں۔ ذرا عورتوں کے بالوں کی بناوٹ دیکھو۔

منّی: بالکل جیسے ہماری بڑی آپا بناتی ہیں۔

چچا: (ہنستے ہیں) ہاں ہاں بالکل۔ اچھا بھئی اب چلو واپس چلیں۔ شام ہو چلی ہے گھر بھی لوٹنا ہے۔

حامد: چلیے، چلیے۔

منّی: ہمارے کو جی تو نہیں چاہتا۔

چچا: ہاں یہ تو ہے۔ ان غاروں کو جتنی دیر اور جتنا دیکھو کم ہے۔ آؤ۔۔

حامد: مگر چچا جان آج کی یہ ایلورا اور اجنتا کی سیر ہمیشہ یاد رہے گی۔

منّی: بے شک ہمیشہ یاد رہے گی۔ ہم زندگی بھر نہ بھولیں گے۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

مینڈک کی چند انوکھی عادتیں، ۔ کا بقایا۔

پانی کے باہر بالکل نہیں دیکھ سکتا۔

چڑیاں اپنی آنکھوں کو برائے نام ہی گردش دے سکتی ہیں۔ متحرک چیزوں سے باخبر رہنے کے لیے وہ برابر اپنا سر گھماتی رہتی ہیں۔



جناب محمد طاہر (بی بی دتا نیاں)



بندر کی قربانی

ایک جنگل کے کنارے ایک بستی میں کسی شخص نے بہت اچھا پھلوں کا باغ لگوایا۔ زمانے کا انقلاب دیکھیے۔ بستی ویران ہو گئی اس میں بھی ایک جنگل اُگ آیا۔ اس طرح وہ باغ بھی جنگل میں شامل ہو گیا۔

بندروں کا ایک گروہ گھومتا پھرتا اِدھر جا نکلا وہ باغ انھیں بہت پسند آیا اور وہ وہیں رہ پڑے۔ خوب پھل کھاتے اور آزادی سے رہتے۔

ایک دن ایک ریچھ بھی اِدھر آ نکلا۔ اس نے بندروں کو اس باغ میں رہتے دیکھا۔ اسے بڑا رشک ہوا۔ اس نے بھی یہاں پھل کھانے چاہے۔ بندروں کو یہ بہت بُرا لگا اور انھوں نے ریچھ کو مارنا شروع کر دیا۔ ایک سمجھ دار بندر نے منع کیا کہ یہ ہمارا مہمان ہے۔ اس کی خاطر مدارات کرنی چاہیے۔ لیکن بندروں نے اس کی بات نہ سنی اور ریچھ کو مار پیٹ کر باغ سے نکال دیا۔

ریچھ بھاگ کر اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا اور بولا۔ بھائیو! بڑے افسوس کی بات ہے ہم ریچھ اتنے طاقت ور ہو کر اپنے جنگل میں رہیں اور بندر جو ہم لوگوں سے کہیں کمزور ہیں۔ باغ میں رہیں اور میوے کھائیں۔ ہمیں ان پر حملہ کر کے باغ سے نکال دینا چاہیے اور خود باغ پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ سب ریچھوں نے اس کی تائید کی۔

دوسرے دن ریچھ بندروں کے باغ پر چڑھ دوڑے۔ پیڑوں پر چڑھ چڑھ کر بندروں کو مارنے لگے۔ بندر ریچھوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ کچھ مارے گئے کچھ زخمی ہوئے باقی سب جان بچا کر بھاگ گئے۔

جنگل میں سارے بندر ایک مقام پر اکٹھا ہوئے اور جس بندر نے انھیں ریچھ کو مارنے سے منع کیا تھا اس سے معافی مانگی اور کہا: "ہم نے آپ کا کہنا نہیں مانا اسی کی یہ سزا ہم کو ملی ہے۔"

بندر نے کہا: "بھائیو! جو ہونا تھا سو ہوا۔ اب پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں لیکن اگر اب بھی تم لوگ سمجھ جاؤ تو باغ حاصل ہو سکتا ہے اور تم ریچھوں کا نام و نشان مٹا سکتے ہو۔

بندروں نے کہا اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے ہم آپ کے کہنے پر ضرور عمل کریں گے آپ ہمیں وہ بات بتائیں۔

اس نے کہا تم لوگ مجھے خوب مارو، میرے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالو اور مجھے اسی باغ کے پاس ڈال آؤ۔

بندروں نے کہا: واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ ہمارے بزرگ ہیں ہم آپ پر کیسے ہاتھ اٹھا سکتے ہیں۔

تب وہ بندر بولا: "بھائیو! اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

مجبوراً بندروں نے دکھی دل سے اپنے ہمدرد اور رہنما کو پیٹا، اس کے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالے اور اس کو لا کر اس باغ میں ڈال آئے۔

باغ کے پاس بندر نے چلا چلا کر رونا شروع کیا۔ ریچھوں نے اس کے چلانے کی آواز سنی اور یہ دیکھنے کو آئے کہ کیا بات ہے بندر نے ان سے کہا۔

"میں نے جو ریچھ کو مارنے کو منع کیا تھا اس کی وجہ سے سب بندر مجھ سے ناراض ہو گئے اور مجھے مار پیٹ کر یہاں ڈال گئے ہیں کہ تم جن کے ہمدرد ہو انھی کے ساتھ رہو۔"

ریچھوں نے اس سے پوچھا اب تم کیا چاہتے ہو؟ بندر بولا: اب میں ان سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ وہ جگہ معلوم ہے جہاں وہ چھپے ہیں، تم سب لوگ میرے ساتھ چل کر انھیں مار ڈالو تب ہی میرا دل ٹھنڈا ہوگا۔

ریچھ بندر کے کہنے کے مطابق چلنے کو تیار ہو گئے۔

وہ دوسرے دن صبح سویرے ان کو جنگل کے کنارے ایک ریتلے اور چٹیل میدان میں لے گیا۔ ایک ریچھ زخمی بندر کو اپنی پیٹھ پر لادے آگے آگے چلتا تھا اور بندر راستہ بتاتا تھا کہ آگے چلو۔ صبح کے ٹھنڈے وقت میں وہ ان کو ریگستان میں بہت دور تک لے گیا۔ جب بھی ریچھ پوچھتے کہ بندر کہاں ہیں تو وہ یہی جواب دیتا کہ ابھی اور آگے چلو۔ یہاں تک کہ دن کے بارہ بج گئے۔ سخت گرمی پڑنے لگی اور لو چلنے لگی گرمی سے ریچھ سخت پریشان ہو گئے، پیاس سے زبان باہر نکلنے لگی تو انھوں نے بندر سے پھر پوچھا۔

"تم بتاتے کیوں نہیں کہ بندر کہاں ہیں؟"

اب بندر نے جواب دیا۔

"بندر یہاں کہاں ہیں؟ تمھاری موت تم کو یہاں لائی ہے۔ اب تم میں سے کوئی بھی یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ میں اپنی قوم کا بدلہ لینے کے لیے تم کو یہاں لایا ہوں۔"

یہ سنتے ہی ریچھوں نے فوراً اس بندر کو مار ڈالا۔ لیکن اس کے بعد وہ خود بھی گرمی اور پیاس سے تڑپنے لگے۔ ان کے جسموں میں جیسے آگ لگ گئی۔ دور دور تک سایہ کا یا پانی کا پتہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر وہ وہیں جھلس کر ختم ہو گئے۔

جب بندروں نے دیکھا کہ باغ خالی پڑا ہے تو انھوں نے پھر آکر اس پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح ایک بندر کی قربانی سے باقی سب بندروں کو آزادی اور سکون حاصل ہوا۔

[redacted]

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابن بطوطہ

ہندوستان

لیجیے جناب ابن بطوطہ صاحب گھومتے گھامتے ملکوں ملکوں کی سیر کرتے آخر آپ کے دیس ہندوستان پہنچ گئے۔ اب ان سے سات سو برس پہلے کے ہندوستان کا آنکھوں دیکھا حال سنیے۔ اس وقت حکومت کیسی تھی! اس دیس کے لوگ کیسے تھے۔ کس طرح رہتے تھے۔ آپس کے میل جول کے کیا طریقے تھے۔ شادی بیاہ، ریت تیوہار، غرض تہذیب تمدن کا اس وقت کیا انداز تھا۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ سلسلہ آپ پوری دل چسپی اور غور سے پڑھیں گے۔

"ایڈیٹر"

۷۳۴ھ محرم کی پہلی تاریخ تھی کہ ہم دریائے سندھ پہنچ گئے۔ اُسے پنج آب بھی کہتے ہیں۔ یہاں سے سلطان محمد شاہ کی حکومت شروع ہوتی ہے۔

ملتان کا حاکم قطب الملک ہے۔ ہماری اطلاع قطب الملک کو پہنچ گئی تھی۔ ملتان سے دہلی تک پچاس دن کا راستہ ہے۔ مگر بادشاہ تک پانچ دن میں خبر پہنچ جاتی ہے۔

ڈاک کا انتظام گھوڑوں سے بھی ہوتا ہے۔ اور پیدل بھی ہوتا ہے۔ ہر چار کوس پر گھوڑے بدل دیتے ہیں۔ اور تازہ دم گھوڑے ڈاک لے کر سرپٹ دوڑنے لگتے ہیں۔

پیدل ڈاک کے ہرکارے

پیدل ڈاک کی ہر ایک میل میں تین چوکیاں ہیں۔ اور ہر چوکی پر ہرکارہ کمر کسے تیار کھڑا رہتا ہے۔ ہرکارے کے پاس برچھا ہوتا ہے جس کی نوک پر گھنگھرو بندھے رہتے ہیں۔ ان گھنگھروؤں کی آواز سنتے ہی چوکی پر بیٹھا ہوا ہرکارہ چوکس ہو جاتا ہے۔ اور ڈاک کا تھیلا لے کر پوری قوت سے بھاگ پڑتا ہے۔ یہ ڈاک گھوڑوں سے پہلے پہنچ جاتی ہے۔

جب کبھی بادشاہ کے لیے خراسان کے میوے آتے ہیں تو اسی ڈاک سے آتے ہیں۔ کبھی کبھی سنگین مجرم بھی چارپائی پر باندھ کر ہرکارے لاتے

ہیں جب میں دولت آباد تھا۔ تو اسی ڈاک سے
بادشاہ کے لیے گنگا کا پانی آیا کرتا تھا۔

گینڈا۔

دریائے سندھ پار کر کے بانس کا جنگل آیا۔
راستہ اسی جنگل سے ہو کر جاتا تھا۔ ہم نے جنگل میں
گینڈا دیکھا۔ نہایت خوفناک شکل تھی۔ سیاہ رنگ تھا۔
ڈیل ڈول بڑا تھا۔ گینڈا ہاتھی سے چھوٹا ہوتا ہے۔

---------- گینڈے کی
پیشانی پر ایک سینگ ہوتا ہے۔ تین بالشت لمبا
ایک بالشت چوڑا۔

جب ہم جنگل سے نکلا ایک سوار سامنے
آگیا۔ گینڈے نے گھوڑے کے سینگ مارا اور
سوار کی ران چیر کر اسے گرا دیا پھر جنگل میں گھس گیا۔
شام کے وقت ایک گینڈا پھر دکھائی دیا۔
یہ گھاس چر رہا تھا۔ ہم نے اسے مارنا چاہا مگر وہ
بھاگ گیا۔ ایک دفعہ بادشاہ کے ساتھ بھی گینڈا
دیکھا تھا میں ایک ہاتھی پر سوار تھا۔ اور بادشاہ
بھی ہاتھی پر سوار تھا۔ بانس کے جنگل میں چلے جا رہے
تھے۔ پیدل سپاہی گینڈے کو گھیر کر لائے اور مار
ڈالا۔ پھر اس کا سر کاٹ کر کیمپ میں لائے۔

دوسری منزل چل کر ہمیں ایک شہر ملا۔
جسے ملتانی کہتے ہیں۔ شہر کے بازار بہت خوبصورت
ہیں۔ اس شہر میں سامرہ قوم آباد ہے۔ سامرہ قوم
والے کسی کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے اور کھاتے
والا تھا کیونکہ یہ سکستان کا سردار تھا نا
کا ایک آدمی ہے۔

میرا سفرنامہ پڑھنے والوں کو یاد ہو گا
سکندریہ میں مجھ سے شیخ برہان الدین نے فرمایا تھا
کہ جب تو ہندوستان جائے گا تو میرے بھائی
فرید الدین سے ملاقات ہو گی اور سندھ میں رکن الدین
سے۔ یہاں میری ملاقات شیخ رکن الدین سے ہوئی
یہ حضرت شیخ بہاء الدین قریشی ملتانی کی اولاد ہیں

سیہوان۔

یہاں سے ہم سیہوان پہنچے۔ یہ ریگستانی
شہر ہے۔ ببول کے سوا کسی درخت کا نام نہیں
ہے۔ شہر کے کنارے پر خربوزوں کی کاشت ہوتی
ہے۔ جوار اور مٹر کی روٹی کا یہاں زیادہ رواج ہے۔
مچھلی بہت ہے، دودھ بھی خوب ملتا ہے۔ سیہوان
والے ریگ ماہی بھی کھاتے ہیں۔

ریگ ماہی پاؤں سے چلتی ہے دم
نہیں ہوتی۔ ریت کھود کر نکالی جاتی ہے گوہ
سے ملتی جلتی صورت ہوتی ہے۔ مجھے تو بڑی کراہت
ہوتی تھی کہ جانے یہ لوگ کیسے کھا لیتے ہیں۔

یہاں گرمی سخت پڑتی ہے۔ ہم لوگ
رومال بھگو کر سر پر ڈالتے تھے تب چین آتا
تھا۔ جامع مسجد کے امام شیبانی ہیں۔ انھوں نے
مجھے وہ پروانہ دکھایا جو حضرت عمر ابن عبدالعزیز
نے ان کے دادا کو خطیب مقرر کرتے وقت دیا تھا

شیبانی کے خاندان میں یہ پروانہ محفوظ چلا آتا ہے اور حضرت عمر بن عبد العزیز کے قلم کے الفاظ الحمد للہ وحدہٗ پروانہ کے سرنامہ پر ہیں۔ اس شہر میں عمر بغدادی سے ملاقات ہوئی لوگ کہتے ہیں ان کی عمر ایک سو چالیس سال کی ہے۔

لاہری :-

یہاں سے ہم لاہری بند پہنچے ۔ لاہری سمندر کے کنارے بہت خوب صورت شہر ہے۔ یہاں یمن اور فارس کے سوداگر بکثرت آتے ہیں۔ اس لیے خوشحال اور دولت مند بھی ہے۔ علاء الملک نے بتایا کہ اس شہر کی آمدنی ساٹھ لاکھ ہے ــــ شہر سے سات کوس پر ایک میدان ہے جسے تارنہ کہتے ہیں میدان میں ان گنت مورتیاں ہیں۔ جانوروں کی آدمیوں کی شباہت بھی اور ٹوٹی ہوئی۔ پتھر کے گیہوں، پتھر کے چنے، برتن گھریلو سامان، ایک پتھر کا گھر ہے جس کے بیچوں بیچ چبوترہ ہے چبوترے پر پتھر کا ایک آدمی کھڑا ہے۔ جس کا سر ذرا لمبا ہے، منہ ایک طرف پھرا ہوا - دونوں ہاتھ کمر پر بندھے ہوئے ہیں۔

مشہور ہے کہ پہلے کسی زمانے میں یہ بہت بڑا شہر تھا، خدا کی پھٹکار پڑی اور تباہ ہو گیا۔ ہاتھ میں عصا یہاں کا بادشاہ ہے۔

اس گھر کو راجا کا محل کہتے ہیں جگہ جگہ ہندی زبان میں کتبے دیواروں پر کندہ ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بربادی ایک ہزار برس پہلے ہوئی تھی۔

پانچ دن میں علاء الملک کا مہمان رہا اور اس نے میری بڑی خاطر کی۔ لاہری بندر سے ہم بکھر پہنچے یہاں میری ملاقات امام عبد اللہ حنفی قاضی شہر ابو حنیفہ اور شمس الدین محمد شیرازی سے ہوئی۔ شیخ شمس الدین نے بتایا کہ ان کی عمر ایک سو بیس[120] سال کی ہے۔

اوچھ :-

یہاں سے اوچھ گئے۔ اوچھ [illegible] کے کنارے بڑا شہر ہے۔ عمارتیں صاف ستھری ہیں ــــ شہر کا حاکم جلال الدین [illegible] آدمی ہے۔ یہاں میری ملاقات سید جلال الدین علوی حیدری سے ہوئی جنہوں نے مجھے اپنا [illegible] بھی دیا۔

ملتان :- اوچھ سے ملتان آئے [illegible] کی راجدھانی ہے۔ یہاں کا حاکم قطب الملک ہے۔ شہر میں جانے سے پہلے ایک دریا ہے جسے کشتی سے عبور کرتے ہیں۔ یہاں ہر ایک کے سامان کی تلاشی لی جاتی ہے۔ تجارتی مال پر چوتھائی رقم محصول لیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی گھوڑا ساتھ ہو تو سات دینار لیتے ہیں۔ مجھے ڈر تھا کہ نہ جانے کتنا محصول دینا پڑے، سامان اگرچہ مالیت میں زیادہ نہ تھا۔ مگر دیکھنے میں بہت زیادہ معلوم ہوتا تھا۔

"باقی آئندہ"

جنیبا اشفاق گوہر

کتاب

کہتے ہو تم جس کو کتاب
اس کا ہر ہر نقطہ گہر ہے
علم کے گھر کا دروازہ ہے
جو اس کو پڑھ لے وہ عالم ہے

اس میں ہزاروں راز چھپے ہیں
جو پڑھتا ہے اس کی سطریں
اس کو علم کا یم کہتے ہیں
علم کی اس پہ کھلتی ہیں لہریں

اے میرے اسکول کے بچو
اچھی کتابیں پڑھنا سیکھو
تم اس سے ہی دل کو لگاؤ
علمی کتابیں پڑھنا سیکھو

دولت ہے اک اچھی کتاب
اس دولت کو چھوڑ نہ دینا
پڑھ کر تم بن جاؤ نواب
رخ اپنا تم موڑ نہ لینا

تم بھی بنو گے نہرو چاچا
تم گاندھی آزاد بنو گے
ہوگا تمہارا گھر گھر چرچا
دنیا میں تم نام کرو گے

لیکن! یہ ہیں ساری باتیں
قدرت کا انعام کتابیں
پڑھنے لکھنے کی سوغاتیں
عزت کا پیغام کتابیں

منہ کو ان سے موڑ نہ لینا
پڑھتے رہو گے تم جو کتاب
ان کا پڑھنا چھوڑ نہ دینا
قدر کریں گے سب احباب

محترمہ عذرا یٰسین

انوکھا روزہ

"اشرف"

"ہوں؟"

"للہ بتادو نا، تم نے تو تنگ کر دیا کتنی دیر سے پریشان کر رہے ہو"۔ ثمینہ نے عاجزی سے کہا۔

"عجیب ہو؟ کہا نا میں تم سے کچھ نہیں لوں گا۔ پھر تم مجھ سے کتنی چھوٹی ہو۔ مجھے تحفہ دیتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئے گی؟" اشرف نے اپنی بڑائی جتائی۔

"بہت اچھا دلہا جان! مگر بہتر یہی ہے کہ آپ اس چھوٹے بڑے کے پھیر میں نہ پڑیں بس خاموشی سے اپنی پسند بتا دیجیے تاکہ میں یہاں سے رفوچکر ہو جاؤں"۔ ثمینہ نے شوخی سے کہا۔

"اگر تمہیں دینے لینے کا ایسا ہی ارمان ہے تو جو تمہاری مرضی آئے وہ لے آؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا مجھے ہر چیز پسند ہے"۔ اشرف پیچھا چھڑا کر بھاگا۔ ثمینہ بہت دیر سے اس کی جان کو آئی ہوئی تھی۔ ثمینہ بھی مسکراتی ہوئی اٹھ گئی وہ اس وقت خلافِ معمول اشرف سے بہت خوش تھی وجہ یہ اشرف کے اس طرح پیچھا چھڑانے پر وہ اس کی جان کو آ گئی تھی۔

ثمینہ اشرف کی تایازاد بہن تھی۔ آج اشرف کی سالگرہ تھی۔ اس تقریب میں شریک ہونے کے لیے وہ اشرف کے گھر چار دن سے ڈیرہ ڈالے ہوئے تھی۔ اس وقت وہ ریشمی پھولدار فراک میں بہت بھلی لگ رہی تھی، بالکل چینی کی گڑیا۔

اشرف سے اس کی ذرا نہ بنتی تھی جیسی بنی کیسے۔ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ اتنا ہی فرق تھا جتنا دن اور رات میں سورج اور چاند میں جو کبھی ایک ساتھ نہیں نکل سکتے۔ اشرف بہت ہی سنجیدہ طبیعت کا تھا۔ بڑوں کا ادب اور ان کا حکم ماننا اس کا پہلا فرض تھا۔۔۔۔ ثمینہ تھی چنچل اور شریر ضد میں بھی اپنی مثال نہیں رکھتی تھی۔ کوئی بات من میں سما جائے تو ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے مگر اپنی ضد سے باز آنا اس نے نہ سیکھا تھا۔ نتیجہ میں مار پیٹ، پھٹکار، ڈانٹ ڈپٹ ملتی مگر یہ

سب لوگوں کے سامنے [illegible] — [illegible]
ان واہیات کا ماں باپ کس طرح ممکن تھا۔

ثمینہ گھر بھر کی لاڈلی تھی اس لیے ماں اور دادی کی بے حد چہیتی تھی۔ بچپن میں وہ اس کی ہر جا و بے جا خواہش کو فوراً پورا کر دیتے تھے۔ مگر اب وہ اپنی بات منوانے کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ اپنی مرضی کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتی تھی۔ ماں باپ اب بہت پریشان تھے۔ بچپن کی ڈالی ہوئی عادت اتنی پختہ ہو جائے گی انھیں وہم و گمان بھی نہیں تھا — وہ ثمینہ کے ہر وقت کے بے جا مطالبوں، ضد اور غرور سے بے حد عاجز آ چکی تھیں۔ مگر ان کی سمجھ میں اس کی اصلاح کی کوئی ترکیب نہیں آ رہی تھی۔

آخر ایک دن ان کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ وہ سیدھی اشرف کے والد کے پاس آئیں — سوچتے ہوئے کہ ثمینہ کے دل میں کسی کا خوف تھا تو وہ ایک چچا کی شخصیت تھی۔ ان کی بات نہ ماننے کی ہمت اس میں نہ تھی۔ ویسے وہ ان کی دلچسپ باتوں کو دل سے پسند بھی کرتی تھی۔ اشرف کے والد نے اپنی بھابی سے وعدہ کرنے کو تو کر لیا مگر ابھی تک انھیں اس کے سمجھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اصل میں وہ کسی اچھے موقع کی تلاش میں تھے۔ آج ان کے لڑکے اشرف کی سالگرہ تھی انھوں نے سوچا اس سے اچھا موقع اور کیا ہوگا۔ لہٰذا انھوں نے ثمینہ کو اس وقت گھیر لیا جب وہ کہیں جانے کی تیاری میں مصروف تھی۔

"کہیں کی تیاری [illegible]
" چچا جان! ان کے ساتھ [illegible]
جان! ثمینہ نے شگفتگی سے [illegible]
ہوئے جواب دیا۔
"اب یہ بھی چاہتی کا ارادہ [illegible]
چچا جان نے مسکرا کر دوسرا سوال [illegible]
"کچھ نہیں — بس ایسے ہی [illegible]
"خیر نہ بتاؤ — مگر ہمیں پتہ ہے
رہی ہو" چچا جان معنی خیز مسکراہٹ
"کہو تو بتا دوں کہ بڑی بی اشرف کے
تحفہ لینے جا رہی ہیں"
"اسے آپ کو کیسے پتہ چلا؟
بھی نہیں بتایا" ثمینہ کی آنکھیں حیرت
اشرف سے اسے امید تھی کہ اس نے
بات چیت کا ذکر ان سے نہ کیا ہوگا۔
"بس یہ نہ پوچھو۔ تمھیں پتہ [illegible]
کچھ گھر کے [illegible] چچا جان اپنی آواز
کر کے بولے پھر ذرا راز دارانہ لہجہ [illegible]
تو بتاؤ کیا لینے جا رہی ہو؟ —
"اشرف سے تو میں نے [illegible]
نے کچھ بتایا ہی نہیں مجھے [illegible]
ٹافیاں بہت پسند ہیں۔ اس کا [illegible]
ثمینہ نے [illegible] سے جواب دیا۔
اور مگر اشرف کی طرف سے [illegible]

کمنی تو پوری کریں گی؟" چچا جان ثمینہ کو غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"ضرور ضرور۔" ثمینہ خوش ہو گئی۔ "آپ ہی بتا دیجیے۔ ان نواب صاحب سے تو میں پوچھتے پوچھتے ہار گئی۔ مگر انہیں نہ بتانا تھا نہ بتایا۔"

"لیکن ثمینہ باجی میں بھی ایسی آسانی سے نہیں بتاؤں گا۔ پہلے پورا کرنے کا وعدہ کرو۔" چچا جان مسکرا کر بولے۔

"آپ بتائیے تو سہی میں ضرور پورا کروں گی۔" ثمینہ بڑے اعتماد سے بولی۔

"اور اگر نہیں پورا کر سکیں تو؟" چچا جان نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے اپنا جملہ ناتمام چھوڑ دیا۔

"اگر میرے بس میں ہے تب تو ضرور پورا کروں گی ورنہ مجبوری ہے اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں جس بات پر اڑ جاؤں وہ ابا سے کروا کر ہی دم لیتی ہوں۔" ثمینہ نے بڑے غرور سے کہا۔

"نا بابا نا۔ ابا جان" چچا جان مسکرائے۔ "مجھے کچھ تمہارے ابا سے لینا ناحق ہے۔ مجھے تو وہ چیز تم سے صرف تم سے چاہیے ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے وہ چیز تمہارے اختیار میں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس میں بہت ہمت اور حوصلہ کی ضرورت ہے۔"

"جب آپ کو معلوم ہے کہ وہ بات میرے اختیار میں ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ میں جو بات زبان سے نکال دوں اس کو پورا کرکے ہی دم لیتی ہوں تو پھر مجھے بتانے میں کیوں پس و پیش ہے۔ آپ مطمئن رہیے میں انشاءاللہ اپنا وعدہ پورا کروں گی۔ اس کے لیے چاہے مجھے کتنی ہی محنت کیوں نہ کرنا پڑے۔" ثمینہ نے اعتماد سے کہا۔

"اچھا ایسی بات ہے۔ تو آؤ۔" چچا جان نے خوشی اور حیرت ظاہر کی اور اسے لے کر اپنے کمرے میں آئے جہاں ثمینہ کی دو سہیلیاں پروین اور شاہین بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔ چچا جان اپنے پلنگ پر بیٹھ گئے اور اپنے پاس ہی ثمینہ کو بٹھا لیا۔

"ہاں چچا جان بتائیے نا۔" ثمینہ نے اکتا کر اس خاموشی کو توڑا جو چچا جان کے سوچنے سے پیدا ہو گئی تھی۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ اگر تم میری خواہش پوری نہ کر سکیں تو مجھے بہت افسوس ہوگا۔"

"آپ کو تو صرف افسوس ہی ہوگا مگر میرے لیے وہ ڈوب مرنے کا مقام ہوگا کہ ایک چیز میرے اختیار میں ہے اور میں اسے پورا نہیں کر سکتی پھر بھی میں آپ کو اتنا یقین دلاتی ہوں کہ میں اگر آپ کی خواہش پوری نہ کر سکی تو کبھی آپ کے گھر میں قدم نہیں رکھوں گی۔" ثمینہ نے بڑے جوش سے کہا۔

"اب تو میں اپنی خواہش کا اظہار کبھی نہیں کروں گا۔" چچا جان مسکرا کر بولے۔ "نا بابا نا۔ مجھ سے یہ کبھی نہ ہوگا اگر خدانخواستہ تم میری خواہش پوری نہ کر سکیں تو میں کیا کروں گا ایک ہی تو میری ننھی منی گڑیا سی بھتیجی ہے۔ اس کے لیے بھی میں اپنے گھر کے دروازے

"خیر، نہ بتایئے" ثمینہ نے روٹھے ہوئے لہجے
میں جواب دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا بابا ناراض نہ ہو۔ میں اپنی خواہش بتائے
دیتا ہوں" چچا جان نے ثمینہ کا ہاتھ پکڑ کر پھر اسے اپنے
پاس بٹھا لیا اور چشمہ کو اپنی ناک پر جماتے ہوئے بولے

"اچھا بھئی سنو! میری صرف اتنی سی خواہش
ہے کہ اشرف کے سالگرہ کے تحفہ میں تم مجھ سے ایک
روزہ رکھنے کا وعدہ کر لو۔"

"روزہ"؟ ثمینہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل
گئیں۔ وہ تو سمجھے ہوئے تھی کہ نہ معلوم چچا جان کون
سی ایسی بات کہیں گے جو انہیں اس کے پورا ہونے
کی توقع نہیں ہے مگر چچا جان نے کہی بھی تو کیا بات جو
اس کی عین تمنا تھی۔ روزہ رکھنے کو تو اس کا بھی ایک
مدت سے دل چاہتا تھا۔ گھر میں سب کو روزہ رکھتے
دیکھتی تو خود بھی بے چین ہو جاتی۔ مگر بھوک کی برداشت
نہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اگلے سال روزہ رکھنے کا سوچ
کر دل کو تسلی دے لیتی تھی۔ اب اپنی مدت کی آرزو
کو اس بہانے یوں پورا ہوتے دیکھ کر خوش ہو گئی مگر
اچانک ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا
اور وہ پھر اداس ہو گئی۔ اس نے سوچا چچا جان نے
محض اس کے ناراض نہ ہونے کی وجہ سے یہ بہانہ بنایا
ہے۔ ورنہ ذرا سی بات کے لیے اتنے ناامید کیوں
ہوتے۔ تو وہ بے یقینی سے بولی۔

اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے تمہیں یقین نہیں آیا" چچا جان حیرت
سے بولے اور پھر اسے بٹھا لیا۔ "واقعی میں تم سے رو
زہ رکھنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔"

"مگر چچا جان آج کل روزوں کے دن کہاں
ہیں؟" ثمینہ کی سہیلی پروین نے پہلی بار مداخلت کی۔
وہ بڑی دلچسپی اور حیرانی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

"اوہ! تم لوگ رمضان شریف کے روزے
سمجھ رہی ہو۔ مگر میں ان روزوں کے بارے میں نہیں
کہہ رہا ہوں" چچا جان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر کون سے روزے کی بات کر رہے ہیں؟"
ثمینہ نے حیرت سے پوچھا۔

"میں تم سے ایک ایسا روزہ رکھنے کے لیے
کہہ رہا ہوں کہ اگر تم اسے رکھ لو تو دنیا کی سب سے
خوش نصیب لڑکی بن جاؤ۔ کوئی بھی لڑکی اس دنیا میں
تمہارے مقابلہ پر نہ نکلے" چچا جان اپنی بات کا اثر
دیکھنے کو خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر کہنا
شروع کیا "پھر دولت، عزت، شہرت سب تمہارے
قدم چومے اور مزے کی بات یہ کہ اس روزہ میں منہ
کھلنے کی قید ہے نہ پانی کی، نہ سحری کے لیے جاڑوں
کی سرد راتوں میں اٹھنا پڑتا ہے نہ افطار کے لیے مغرب
کی اذان کا بے چینی سے انتظار کرنا پڑتا ہے کہ کب
اذان ہو اور ہم کھانے پر ٹوٹیں۔ اس روزہ کی سحری

زندگی میں صرف ایک مرتبہ کھائی جاتی ہے جو مرتے دم تک برقرار رہتی ہے۔ رہا افطار تو وہ نہ زندگی میں ہوتا ہے نہ مرنے کے بعد۔ ہاں اس کا اجر اللہ تعالیٰ دنیا میں تو دیتا ہی ہے مگر مرنے کے بعد تو خاص طور سے اپنے ہاتھ سے وہ انعام دے گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ پھر اس انعام کو دیکھ کر تمھاری اور سہیلیاں بھی تمنا کریں گی کہ کاش ہم نے بھی یہ روزہ رکھا ہوتا تو آج اللہ میاں ہمیں بھی انعام دیتے لیکن بس وہ تلملاتی ہی رہ جائیں گی۔ کیونکہ اس وقت تک تو بہت دیر ہو چکی ہوگی اور وہ انعام پانے کا وقت ہوگا سحری کرنے کا نہیں۔"

ثمینہ، پروین اور شاہین تینوں حیرت بنی چچا جان کی تقریر سن رہی تھیں۔ مگر جس روزے کے متعلق چچا جان یہ تقریر کر رہے تھے وہ تینوں میں سے ایک کے بھی پلے نہیں پڑا تھا۔ وہ سب حیران و پریشان اپنے جی میں سوچ رہی تھیں کہ آخر وہ کون سا روزہ ہے جو نہ کھانے سے ٹوٹتا ہے نہ پانی سے اور جو ساری عمر کے لیے رکھا جاتا ہے۔ آخر شاہین نے ہی اپنی حیرت کم کرنے کے لیے پہل کی۔

"چچا جان! پھر تو وہ روزہ بہت ہی سخت اور مشکل ہوگا جو تمام زندگی کے لیے رکھا جاتا ہے؟"

"ہاں! یہ تو سچ ہے کہ یہ روزہ بہت سخت اور مشکل ہے۔ مگر ناممکن نہیں۔ انسان کوشش کرے تو اس روزہ کو رکھنے میں کامیاب ہو سکتا ہے بس ذرا اسے اپنے نفس کو مارنا پڑے گا۔" چچا جان نے تینوں کو بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا اور چند لمحوں بعد پھر کہنا شروع کیا: "اور ہاں کر تمھیں اور بھی حیرت ہوگی کہ اس روزہ میں صرف ایک بات کا دھیان رکھنا پڑتا ہے یا یوں سمجھو کہ تمھیں ایک بات کا روزہ رکھنا پڑے گا۔"

"ایک بات کا؟" تینوں کے منھ سے بے ساختہ نکلا۔

"ہاں صرف ایک بات کا!" چچا جان کے چہرے پر ایک لطیف سی مسکراہٹ لہریں لینے لگی۔ انھوں نے پھر کہنا شروع کیا: "ساری دنیا میں اپنی مثال قایم کرنے، عزت و دولت شہرت حاصل کرنے کے لیے اور عقبیٰ میں اللہ تعالیٰ سے انعام پانے کے لیے تمھیں ایک اور صرف ایک بات کا ہر وقت دھیان رکھنا پڑے گا۔ ایک بات کا ہمیشہ پابند رہنا پڑے گا۔"

"آخر وہ کون سی بات ہے؟" پروین نے بے تابی سے پوچھا۔

"واہ بھئی! اگر ایسے بتا دیا تو مزہ ہی کیا رہے گا۔ پہلے روزہ رکھنے کا وعدہ کرو پھر بتاؤں گا۔" چچا جان نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اچھا چچا جان فرض کیجیے وہ روزہ ہم سے بھولے سے ٹوٹ جاتا ہے تو پھر ہمیں کیا کرنا ہوگا؟" یہ سوال ثمینہ نے کیا۔

"شاباش! یہ تم نے بہت عمدہ سوال کیا۔

...جان نے ثمینہ کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔

"بھئی بھول چوک تو انسان سے ہوتی ہی رہتی ہے۔ آخر غلطی کا پتلا جو ٹھہرا۔ اللہ تعالیٰ بھی رمضان میں بھول سے کھانے والے انسان کو معاف کر دیتا ہے۔ مگر اسی شرط پر کہ بندہ روزہ کا خیال آتے ہی فوراً ...ا چیز کو تھوک کر کلی کر لے۔ اسی طرح اس روزہ میں بھی اگر تم سے بھول چوک ہو جائے تو فوراً اس ...کو دوبارہ نہ کرنے کا دل میں تہیہ کر لینا۔"

"اچھا چچا جان اب بتائیے وہ کیا بات ہے جس میں روزہ رکھنا ہے۔ میں روزہ رکھنے کو تیار ہوں" ...نہ نے چچا جان کے خاموش ہوتے ہی بڑے اعتماد ...اپنے روزہ رکھنے کا اعلان کر دیا۔

"شاباش!" چچا جان نے ثمینہ کی پیٹھ تھپتھپائی ...پھر پروین اور شاہین کی طرف سوالیہ نظروں سے ...ان دونوں نے بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر روزہ کی حامی بھر لی۔

"سوچ لو اب بھی موقع ہے" چچا نے تینوں ...سے گہری نظر ڈالی۔

"چچا جان اب بتا بھی ڈالیے" ثمینہ نے بے ...سے کہا "آپ پہیلیاں بجھا رہے ہیں اور ہم اشتیاق ...مرے جا رہے ہیں"

"بھئی تمہاری ہی مرضی ہے ورنہ تو تمہیں ایک موقع ...دے رہا تھا" چچا جان ثمینہ کے اضطراب پر ...مسکرا پڑے۔

"چچا جان کا سنو! وہ بات جس نے تمہیں پریشان کر رکھا ہے اور جس کا تمہیں روزہ رکھنا ہے وہ صرف اتنی سی بات ہے کہ ہمیشہ اپنے بڑوں کا کہنا مانو۔ وہ جو کہیں اسے تم ہر ممکن طریقے سے پورا کرو۔ خواہ وہ بات تمہیں بھلی لگے یا نہ لگے"

"ارے!" ایک بار پھر تینوں پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ وہ تو نہ معلوم کیا سوچے ہوئے تھیں۔ انھیں تو ایسا لگا کہ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔ "واقعی چچا جان بس اتنی سی بات تھی یا آپ مذاق کر رہے ہیں؟" ثمینہ نے حیرت اور بے یقینی کے ملے جلے لہجہ میں پوچھا۔

"کیوں بھئی اب بھی یقین نہیں آ رہا ہے؟" چچا جان تینوں کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولے "یہ کیا آج تم تینوں نے میری کسی بھی بات پر یقین نہ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے؟"

"مگر چچا جان! اگر ہم آپ کی بات مان بھی لیں تو بھی وہ اتنی ڈھیر ساری نعـ.........."

"...نعمتیں وہ سب حاصل ہو جائیں گی تم ایک بار عمل کر کے تو دیکھو" چچا جان نے شاہین کی بات بیچ سے اچک لی "میں نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل سچ ہے ذرا بھی جھوٹ نہیں۔ اگر تم نے میرے کہنے پر عمل کیا تو ساری دنیا میں چاند کی طرح چمکو گی۔ عزت دولت شہرت سب تمہاری لونڈی غلام ہوں گی اور یہ سب کچھ صرف ایک شخص کا کہنا ماننے سے حاصل ہوگا۔

تمھیں نہیں معلوم تمھارے بزرگ جو کچھ بھی تم سے کہتے ہیں وہ صرف تمھاری بھلائی کے لئے کہتے ہیں۔ مارتے پیٹتے وقت یا بُرا بھلا کہتے وقت بھی ان کی نظروں میں تمھاری بھلائی ہی ہوتی ہے۔ وہ ہر صورت میں تمھاری بھلائی چاہتے ہیں۔ ان کی باتوں پہ ناراض ہونے اور بُرا ماننے کی بجائے ٹھنڈے دل سے سننا چاہئیں۔ ان کی ذرا ذرا سی باتوں پر عمل کرنا چاہیے۔ یہی معمولی معمولی باتیں تمھیں ترقی کے دور اہے پر لاکھڑا کریں گی تمھیں ترقی کی راہ پر دیکھ کر وہ کتنا خوش ہوں گے اور جب وہ سب تم سے خوش ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کیوں نہ خوش ہوگا۔ اس خوشی میں وہ تمھیں جو دے دے وہ تھوڑا ہے۔"

"واقعی چچا جان آپ نے تو دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔" ثمینہ نے حیرت سے کہا۔ وہ اس انکشاف سے بہت زیادہ متاثر نظر آ رہی تھی۔

"پھر بھی اگر تم لوگوں کو یقین نہ آ رہا ہو تو ایسا کرو کہ یہ روزہ ایک دن کے لیے تجربے کے طور پر رکھ کر دیکھ لو۔ ایک دن میں تمھیں اس کے نفع نقصان کا اندازہ ہو جائے گا۔ فائدہ نظر آئے تو اس روزے کو بڑھا کر زندگی بھر کے لیے رکھ لینا۔" چچا جان نے اپنا تیر نشانے پر لگتا دیکھ کر اپنے روزے میں تھوڑی سی ترمیم کر دی اور تینوں کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں تو بتاؤ کیا ارادہ ہے؟"

"چچا جان! اب خیال اور ارادہ ظاہر کرنے کی تو آپ نے گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ آپ تو ہم سے پہلے ہی وعدہ لے چکے ہیں۔ اب تو ہم یہ انوکھا روزہ رکھیں گے اور ضرور رکھیں گے بس آپ دعا کیجیے کہ ہم اس میں بھول چوک نہ کرنے پائیں۔" تینوں نے اعلان کیا۔

"آمین! خدا تمھیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔" چچا جان نے پھر اس انداز سے بزرگانہ انداز میں دعا دی کہ تینوں لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ چچا جان نے خود بھی ان کا ساتھ دیا اور گھڑی پہ نظر ڈالتے ہوئے بولے۔

"اچھا اب جاؤ سالگرہ کا وقت قریب آ گیا ہے۔" اور خود بھی مسکراتے ہوئے اٹھ گئے۔

اس سرخ نشان کا مطلب ہے کہ اس مہینے کے بعد آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔۔۔۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے پیارے پیام تعلیم کی سرپرستی جاری رکھیں گے۔۔۔۔ براہ کرم مبلغ ۶ روپے کا منی آرڈر اس مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بھیج دیجیے تاکہ یہ سلسلہ قائم رہے۔ آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کو پرچہ پسند نہیں آیا۔ اور افسوس کے ساتھ بند کر دیں گے۔ منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے۔ آپ کا خریدار۔۔۔۔ ہے

"منیجر"



پنچ تنتر کی کہانیاں (مسلسل)

گیدڑ بچہ

راجہ نے کمھار کو تب گیدڑ اور شیر کی یہ کہانی سنائی:۔

ایک جنگل میں شیر شیرنی کا ایک جوڑا رہا کرتا تھا۔ شیرنی نے دو بچے دیئے۔ شیر روزانہ ہرن کا شکار کرکے شیرنی کے لیے گوشت لے آتا تھا۔ ایک دن شام تک جنگل کی خاک چھاننے پر بھی کوئی شکار ہاتھ نہ لگا۔ یوں ہی خالی ہاتھ گھر واپس آرہا تھا کہ راستے میں اسے گیدڑ کا ایک بچہ ملا۔ اسے بچے پر ترس آیا اور اسے وہ زندہ ہی گھر اٹھا لایا اور شیرنی کے سامنے ڈالتے ہوئے اس سے کہا۔ آج کوئی شکار تو ملا نہیں۔ راستے میں یہی بچہ ملا۔ میں اسے زندہ ہی لے آیا ہوں۔ اگر تمھیں بھوک بہت ستا رہی ہو تو اسے مار کر کھا لو۔ صبح پھر کوئی شکار لادوں گا۔"

شیرنی بولی۔ تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔ جس نادان بچے پر تمھیں ترس آیا اسے بھلا میں کیسے کھا سکتی ہوں۔ میں تو اسے اب اپنے بچے کی طرح پالوں گی۔ یہ گیدڑ کا بچہ بھی شیرنی کا دودھ پی کر میرے جیسا ہی طاقتور ہو جائے گا۔ یہ میرے بچوں کے ساتھ کھیلا کرے گا۔

شیر شیرنی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ اس تیسرے گیدڑ کے بچے کو بھی پالنے لگے اور تینوں سے یکساں محبت کرنے لگے۔

ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ اس جنگل میں ایک موٹا ہاتھی آگیا۔ اسے دیکھتے ہی شیر کے دونوں بچے غراتے ہوئے اس کی طرف لپکے۔ ہاتھی کو دیکھ کر گیدڑ کے بچے کے تو ہوش اڑ گئے۔ اس نے شیر کے دونوں بچوں کو ایسا کرنے سے منع کیا۔ وہ کہنے لگا "ہاتھی ہمارا دشمن ہے۔ ہمیں دشمن سے دور ہی رہنا چاہیے۔" یہ کہہ کر اس نے گھر کا رخ کیا۔ شیر کے بچوں کا بھی اس سے حوصلہ پست ہوا۔ وہ بھی گھر کی طرف لوٹ آئے۔

گھر پہنچ کر شیر کے بچوں نے گیدڑ کے بچے

کی شکایت کی اور بدتمیزی پر اسے خوب پھٹکارا اور اس کا مذاق بھی اڑایا۔ گیدڑ کا بچہ یہ لعن طعن سن کر غصہ ہو اٹھا۔ اور وہ ان دونوں کو بھی جلی کٹی سنانے لگا۔ شیرنی نے اسے اکیلے میں بلا کر کہا: "تمھیں ان بچوں کی بات پر اتنا غصہ نہیں دکھانا چاہیے۔ وہ چھوٹے ہیں نا سمجھ ہیں۔ ان کی بات پر تمھیں دھیان نہیں دینا چاہیے۔"

گیدڑ بچہ شیرنی کے سمجھانے بجھانے پر اور بھی بھڑک اٹھا۔ وہ کہنے لگا: "بھلا میں کس بات میں ان دونوں سے کم ہوں جو اس طرح کی بات سنوں۔ بہادری میں، عقل مندی میں یا ہنر میں آخر میں کس بات میں ان سے کم ہوں۔ میں کیوں ان کی اس طرح کی بات سنوں۔ میں ان کو اس کا مزا چکھاؤں گا اور ان کا خون پی جاؤں گا۔"

شیرنی گیدڑ بچے کی یہ بات سن کر بہت ہنسی اور بولی: "تو بہادر بھی ہے، عقل مند بھی ہے، خوب صورت بھی ہے۔ مگر جس گھرانے میں تو پیدا ہوا ہے۔ وہاں ہاتھی نہیں مارے جاتے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ میں تجھے سب کچھ بتا دوں۔ بیٹا تم شیر کے نہیں گیدڑ کے بچے ہو۔ میں نے اپنا دودھ پلا کر تمھیں پالا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں بچے اس حقیقت کو سمجھیں تمھاری بھلائی اس میں ہے کہ تم یہاں سے بھاگ نکلو اور اپنی برادری کے لوگوں میں جا ملو۔ نہیں تو یہ دونوں بچے تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

یہ سن کر وہ گیدڑ بچہ وہاں سے بھاگ نکلا اور گیدڑوں کی غول میں شامل ہو گیا۔

کہانی سنانے کے بعد راجہ نے کمہار سے کہا: "اس سے پہلے کہ دوسرے شہزادوں کو تمھاری اصلیت کا پتہ چلے تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔ اگر ان لوگوں کو پتہ چل گیا کہ تم کوئی بہادر سورما نہیں ہو بلکہ ایک معمولی کمہار ہو اور تمھارے ماتھے کا یہ نشان مٹکے کا ٹکڑا لگ جانے کی وجہ سے لگا ہے تو وہ تم کو زندہ سلامت نہ چھوڑیں گے۔ اب تمھاری خیر اسی میں ہے کہ تم اس گیدڑ بچے کی طرح جا کر کمہاروں کی برادری میں شامل ہو جاؤ۔"

بندر سے اتنی کہانی سننے کے بعد مگرمچھ کچھ پریشان ہوا مگر اس سے پہلے کہ مگرمچھ یہاں کچھ کہیں بندر مگرمچھ سے کہنے لگا: "تو نے عورت کے کہنے میں آکر میرے ساتھ دغا کی ہے۔ عورتوں کا کبھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ کیا تو نے لنگڑے اور برہمن عورت کی کہانی نہیں سنی ہے؟"

مگرمچھ نے کہا: "نہیں تو۔"

بندر نے پھر مگرمچھ کو لنگڑے اور برہمن عورت کی یہ کہانی سنائی۔

کسی جگہ ایک برہمن اور اس کی بیوی بہت
میل جول سے رہتے تھے۔ مگر برہمن کی عورت
برہمن کے گھر والوں سے جلتی تھی۔ وہ ان کے ساتھ
اچھا برتاؤ نہیں کرتی تھی۔ روز روز کے جھگڑوں
سے تنگ آکر برہمن نے سوچا کیوں نہ ماں باپ
اور بھائی بہن کا ساتھ چھوڑ کر کہیں دور الگ جاکر
رہا جائے۔ بس پھر کیا تھا۔ برہمن اپنی بیوی کے
ساتھ سفر پر نکل پڑا۔

راستہ لمبا تھا جنگل میں پہنچنے پر برہمن عورت
کو پیاس لگی۔ برہمن پانی لینے چلا گیا۔ دور سے
پانی لانے میں دیر لگی۔ وہ پانی لے کر آیا تو کیا دیکھتا
ہے کہ عورت مری پڑی ہے۔ برہمن رونے چلانے
لگا اور بھگوان سے گڑ گڑا کر دعا مانگنے لگا۔ اس
کے اس طرح آہ و زاری کرنے سے دیوتاؤں کو
اس پر رحم آگیا۔ اور غیب سے آواز آئی "اے
برہمن۔ اگر تجھے اپنی بیوی سے اتنی ہی محبت ہے
اور تو اسے زندہ دیکھنا چاہتا ہے تو تجھے اپنی آدھی
زندگی اسے دینی ہوگی" برہمن یہ بات مان گیا اور
عورت زندہ ہوگئی۔ دونوں نے پھر سفر شروع کر دیا۔

بہت دور جانے پر ایک شہر ملا۔ شہر سے
باہر ایک باغ تھا۔ اس باغ میں برہمن نے اپنی بیوی
کو چھوڑ کر کہا "تم یہیں رہو میں شہر جاکر کھانے کا
کچھ سامان لے آؤں"

برہمن کے جانے کے بعد عورت وہاں اکیلی
رہ گئی۔ اس وقت باغ کے کنویں پر ایک لنگڑا آگیا
وہ لنگڑا ضرور تھا مگر تھا بہت خوبصورت۔ برہمن
کی عورت اس سے بولی "میں اس برہمن کے
بہت تنگی میں زندگی گزار رہی ہوں۔ گھر سے نکلنے
کے بعد آرام نہیں ملا ہے۔ تم مجھے اپنے ساتھ لے
چلو تاکہ مجھے ان مشکلوں سے نجات مل سکے۔"

برہمن جب کھانا لے کر واپس آیا تو برہمن
کی عورت نے اس سے کہا "یہ لنگڑا ابھی بھوکا ہے
اسے بھی اپنے حصے میں سے دے دو۔"

جب آگے چلنے لگے تو برہمن عورت
نے کہا "سفر میں بات چیت کرنے کے لیے کوئی
نہیں ہے۔ اس لنگڑے آدمی کو ساتھ لے لیا جائے
بات چیت میں سفر اچھا کٹے گا"

برہمن بولا "یہاں اپنا ہی بوجھ اٹھانا مشکل
ہو رہا ہے۔ اس لنگڑے کا بوجھ خواہ مخواہ کیوں اٹھایا
جائے"

مگر عورت نہ مانی۔ اس کی ضد کے آگے
برہمن کو جھکنا پڑا اور لنگڑا بھی آگے کے سفر میں ان
کا ساتھی بن گیا۔ دونوں نے اسے ایک پٹارے
میں بند کر لیا۔ اور اپنے سر پہ لاد کر آگے بڑھے
کچھ دور جاکر لنگڑے نے برہمن کو دھوکا
دے کر کنویں میں گرا دیا اور یہ سمجھ کر کہ وہ مر گیا ہے
وہ لنگڑا اور عورت وہاں سے آگے بڑھے۔
کچھ دور جاکر جب وہ ایک شہر کی حد میں

داخل ہوئے۔ تو سرحد کے پہرہ داروں نے تلاشی لی۔ پٹارے میں ایک لنگڑے آدمی کو بند دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئے۔ ہوتے ہوتے یہ بات راجہ کے کانوں تک پہنچی۔ راجہ کے پوچھنے پر عورت نے بتایا یہ لنگڑا اس کا شوہر ہے۔ گھر والوں سے تنگ آکر ہم لوگوں نے گھر چھوڑ دیا ہے۔ راجہ نے اپنے ملک میں رہنے کی اجازت دے دی۔

ادھر کا قصہ سنیے جس کنویں میں برہمن گرا ہوا تھا ادھر سے ایک سادھو کا گذر ہوا۔ سادھو نے کنویں میں سے کسی کے چلانے کی آواز سنی جھانک کر دیکھا تو ایک آدمی چلاّ رہا تھا۔ اس نے کنویں سے اس برہمن کو نکال لیا۔ برہمن کنویں سے نکل کر گھومتا پھرتا اسی شہر میں پہنچا۔ برہمن کی عورت نے جب اسے دیکھا تو اسے فکر ہوئی۔ اس نے راجہ سے کہا۔ یہ شخص ہمارے گھر والوں کا پرانا دشمن ہے۔ اسے شہر بدر کرا دیا جائے۔

راجہ کو یہ سن کر غصہ آیا۔ اس نے برہمن کو پھانسی دینے کا حکم دے دیا۔

پھانسی کا حکم سن کر برہمن نے راجہ سے کہا: "مہاراج اس عورت نے مجھ سے کچھ لے رکھا ہے۔ مرنے سے پہلے آپ مجھے وہ چیز دلوا دیجیے۔"

راجہ نے عورت سے کہا: "تم نے اس آدمی سے جو بھی چیز لی ہو وہ واپس کر دو۔"

عورت بولی: "مہاراج یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے اس کی کوئی چیز نہیں لی۔"

تب برہمن نے اسے یاد دلایا کہ اس نے اس کی آدھی جان لے رکھی ہے اور تمام دیوتا اس کے گواہ ہیں۔

عورت نے دیوتاؤں کے ڈر سے آدھی جان واپس کرنے کا وعدہ کر لیا اور وعدہ کرنے کے ساتھ ہی اس کی جان نکل گئی۔

عورت کے مرنے کے بعد برہمن نے سارا قصہ راجہ کو بتا دیا۔

یہ کہانی سنانے کے بعد بندر نے پھر مگرمچھ سے کہا: "تم بھی عورت کے غلام بن گئے ہو جس طرح یہ راجہ بن گیا تھا۔"

مگرمچھ نے پوچھا وہ کیسے۔ تب بندر نے مگر کو یہ کہانی سنائی۔

آگے کا دلچسپ حال جنوری میں پڑھیے۔

اگلا پرچہ سالنامہ ہے۔

انتظار کیجیے۔

جناب خلیق انجم اشرفی

فرض شناس

موت حقیقت ہے بڑی تلخ حقیقت ہے۔ ہر آنے والے کو آخر جانا ہے۔ یوں تو ہر موت غم ناک ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کا سوگ کنبے کے چند آدمی یا محلّے کے چند سو یا چند ہزار آدمی مناتے ہیں لیکن بعض شخصیتوں کی موت پوری انسانیت کو سوگوار بنا دیتی ہے ذاکر صاحب کا شمار ایسی ہی شخصیتوں میں ہے۔

ذاکر صاحب کی جدائی پر ہر شخص اس لیے سوگوار نہیں تھا کہ وہ جمہوریۂ ہند کے صدر تھے بلکہ اُن کی شخصیت کی عظمت کا، بڑائی کا راز ان کے اپنے کردار میں پوشیدہ تھا۔ شرافت، خدمت کا جذبہ رواداری، محبّت، شفقت، انکسار، خلوص، سنجیدگی بردباری، ضبط و صبر اور فرض شناسی کی خصوصیات ان کی شخصیت میں اس طرح رچ بس گئی تھیں کہ ان سے الگ ان کی شخصیت کا تصوّر ممکن ہی نہیں۔

ایک تراشے ہوئے ہیرے کا ہر پہلو دوسرے سے زیادہ تاب ناک اور روشن نظر آتا ہے اسی طرح ذاکر صاحب کی شخصیت کا ہر پہلو دوسرے پہلو سے زیادہ دل کش اور تاب ناک تھا۔

ان کی شخصیت کا غالباً سب سے زیادہ تاب ناک پہلو اُن کی فرض شناسی تھی۔ اسی فرض شناسی نے ان میں خدمت اور خلوص کے جوہر پیدا کر دیے تھے۔ ان کی تمام زندگی ملک اور قوم کی خدمت میں گزری، فرض کی ادائیگی اور لوگوں کی خدمت ہی ان کے لیے عبادت تھی اور اس طرح ان کی تمام زندگی یوں سمجھیے کہ خدا کی بہترین عبادت میں گزری۔ انسان کے پیدا کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں کے دُکھ درد کو اپنا کر اس کا مداوا کرنے کی کوشش کرے۔

ذاکر صاحب کی فرض شناسی کا ایک واقعہ تو آپ پیامِ تعلیم کے صفحوں میں بار بار پڑھ چکے ہیں کہ کس طرح انھوں نے اپنی چہیتی بیٹی ریحانہ سلمہٰ کی بے ہوشی اور پھر انتقال کی خبر سُن کر بے مثال صبر و ضبط سے کام لیا تھا، فرض کو محبّت پر ترجیح دی تھی، یہ بے حسی نہ تھی بلکہ فرض شناسی کا ایک مظاہرہ تھا ایسا مظاہرہ جسے خدا ہمیں آپ کو سب کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

ذاکر صاحب نے جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے ذریعے ملک و قوم کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا تھا۔ جامعہ کے لیے اُن کی محبّت کا جذبہ اتنا قوی تھا کہ جب جرمنی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس آئے تو کئی یونیورسٹیوں نے انھیں وائس چانسلر کا عہدہ

پیش کیا لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ:

"میں قرول باغ کے مدرسہ (جامعہ ملیہ) کا ملازم رہنا پسند کرتا ہوں۔"

ذاکر صاحب خود فرض شناس تھے فرض کی بجا آوری میں کسی کو تساہلی کرتے دیکھتے تو اچھے ڈھنگ سے اسے سیدھی ڈگر پر لے آتے۔ ایک مشہور واقعہ ان کے گھر کے ایک نوکر کا ہے، یہ بہت سست اور کاہل تھا صبح کو دیر تک بستر پر پڑا اینڈتا رہتا تھا گھر والے اس کی اس عادت سے بہت نالاں تھے جب انھوں نے اسے نکالنے کا ارادہ کیا تو ذاکر صاحب نے منع فرمایا کہ ایسا نہ کرو اور اس کو مجھ پر چھوڑ دو۔

دوسرے دن صبح وہ کندھے پر تولیہ ڈال کر اور ہاتھ میں پانی کا جگ لے کر اس نوکر کے پلنگ کے پاس پہنچے اور بولے:

"اٹھیے صاحب! منہ ہاتھ دھو لیجیے، ناشتہ تیار ہے۔"

نوکر نے آنکھیں کھول کر ذاکر صاحب کو دیکھا تو بھاگ کر چھپ گیا اور پھر جلدی سے ناشتہ لگا دیا۔ اس کے بعد کسی کو اس سے کوئی شکایت نہ ہوئی۔ یہ بھی دیکھیے کہ نوکر کو راہ پر لانے کے لیے انھوں نے کس حکمت عملی سے کام لیا اور وہ اپنے کام میں کیسا چاق بن گیا۔

ذاکر صاحب کی زندگی کا بیشتر اور بہترین حصہ جامعہ کو سنوارنے کی کوششوں میں گزرا۔ غور کیجیے تو ان کی ساری زندگی ایک اچھے اور شفیق استاد کی زندگی ہے اسی لیے جب وہ بہار کے گورنر نائب صدر جمہوریۂ ہند اور پھر صدر جمہوریۂ ہند بنے تو عملاً تو طالب علموں سے دور ہو گئے لیکن باوجود اس کے طالب علموں کی بہبودی کا انھیں ہر وقت خیال رہتا تھا۔ ادھر کچھ عرصے سے طالب علموں میں جو بد نظمی اور ہنگامہ خیزی پیدا ہو گئی تھی اس سے بہت تکلیف پہنچی تھی ایک بار انھوں نے اسی بد نظمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"طلباء فرض کو اوّلین مقام دینے کا خیال کریں فرض کی ادائیگی کا انحصار حقوق کے حصول پر نہیں۔ ملک کا مستقبل طلباء کی فرض کی ادائیگی کی خواہش اور قابلیت پر منحصر ہے ورنہ کسی کے حق کے لیے ان کا کوئی بھی مطالبہ مہمل ہوگا۔"

ان کے اس جملے سے صاف ظاہر ہے کہ وہ فرض کی ادائیگی کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔

ذاکر صاحب جب صدر جمہوریۂ ہند منتخب ہوئے تو وہ ستر سال کے ہو چکے تھے، انکی صحت جواب دے چکی تھی اور ایک انتہائی اہم ذمّہ داری ان کے شانوں پر آ پڑی تھی، لیکن انھوں نے جس خوش اسلوبی سے آخری دم تک اس اہم عہدہ کی ذمّہ داریوں کو نبھایا وہ ان کی فرض شناسی کی تابندہ مثال ہے۔

پچھلے سال یوم جمہوریہ کے موقع پر ان کی صحت اس قابل نہ تھی کہ وہ سلامی لے سکیں لیکن ڈاکٹروں کے منع

کرسکیں پھر بھی انھوں نے سلامی لی۔ کچھ ہی دن پہلے دل کا
دورہ پڑ چکا تھا اس لیے ڈاکٹر بہت فکرمند تھے اور انھوں
نے اس شرط پر ذاکر صاحب کو سلامی لینے کی اجازت
دی کہ وہ جب تک کوئی تکلیف محسوس نہ کریں اپنا ایک
پیر ہلاتے رہیں تاکہ ڈاکٹروں کو یہ معلوم رہے کہ وہ بالکل
ٹھیک ہیں اور اگر گھبراہٹ محسوس کریں تو پیر ہلانا بند
کردیں۔ ذاکر صاحب مستقل طور پر یہ تکلیف دہ فرض انجام
دیتے رہے۔

محترمہ شاہجہاں بانو (بیگم ذاکر صاحب) کا
بیان ہے کہ انتقال سے چند روز پہلے وہ دن بھر کے کاموں
سے فارغ ہوکر شام کے سات بجے کھانا کھانے بیٹھے تو
انتہائی اہم کاغذات دستخط کے لیے آگئے۔ بیگم صاحبہ
نے کہا کہ کھانا کھاکر یہ کام کردیجیے گا لیکن ذاکر صاحب
بھلا فرض کے تقاضے کو کیسے نظرانداز کرسکتے تھے کھانا
چھوڑ کر اٹھ گئے اور فرمایا: "اسی کام کی تو روٹی کھاتا ہوں
بھلا اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟"

"کام عبادت ہے۔" آبِ زر سے لکھے جانے کے
قابل یہ جملہ ساری زندگی ان کے لبوں پر رہا اور اسی
سے وہ اپنے ساتھیوں اور کارکنوں کی ہمت بڑھاتے
رہے اور ان میں فرض کی ادائیگی اور لگن اور جذبہ
پیدا کرتے رہے۔

زندگی پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کا بستر ہے۔
اسے پھولوں کی سیج بنانے کے قابل بنانے کے لیے ان کانٹوں کو ہٹانا
[illegible] یہ آسان کام نہیں اس کے لیے [illegible]

ہمت، بڑے صبر اور مسلسل محنت کی ضرورت ہے [illegible]
تھک جاتی ہیں، بازو شل ہوجاتے ہیں لیکن انھی تھکے
ہاتھوں سے زندگی کو روشنی ملتی ہے۔ انھی زخمی ہاتھوں
ٹپکتے ہوئے لہو کے قطرے زندگی کی سیج کے پھول بن جا[تے]
ہیں یہ ایک مقدس فریضہ ہے لیکن اگر کوئی شخص اس فر[ض]
کو محض اپنی زندگی کے لیے مخصوص نہ کرکے تمام انسانوں [کے]
لیے عام کردے تو وہ صحیح معنوں میں انسان کہلانے [کا]
مستحق ہے۔ ذاکر صاحب نے تمام عمر یہی کیا ہے، وہ خو[اہ]
ہڈی کی پلیٹ میں پڑے روٹی کے بچے کچے ٹکڑوں ا[ور]
پھیکی سی سبزی کو اس لیے کھالینے کا واقعہ ہو کہ ا[س]
طرح ان کا کھانا دوسروں کے کام آسکتا ہے یا گومتی [کے]
بھیانک سیلاب میں آفت زدوں کی امداد کے لیے کا[م]
کرتے ہوئے بیمار پڑ جانے کا یا جامعہ کی بہبودی کے [لیے]
ہر بڑے عہدے کی پیش کش ٹھکرا دینے کا، ہر جگہ وہی فر[ض]
شناسی اور دوسروں کی زندگی کے کانٹوں کو پھولوں [میں]
بدلنے کا جذبہ نظر آتا ہے۔

نصف صدی سے زیادہ عرصے تک ملک و قوم کی بہ[بود]
کے لیے مسلسل محنت کرتے کرتے وہ تھک چکے تھے۔ آگے قد[م]
بڑھانے کے لیے دم لینے کو ٹھہر گئے ہیں۔ دم لینے کے بعد ان کا
سفر یقینی ہے مگر وہ ہماری نظروں سے بے شک اوجھل ہ[یں]
لیکن ان کی شخصیت ایک مینارۂ نور کی طرح جل، قر[یب]
فرض سے غفلت و تساہل کی تاریکیوں کو دور کرتی رہے گی
[illegible] اس منارۂ نور کی روشنی [illegible]
[illegible]

[illegible]
منا رہے تھے۔ عید کی نماز پڑھ کر تمام بچیاں امیر المومنین حضرت
عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں گئیں۔ دیکھا تو خلیفہ پھٹے
پرانے کپڑے پہنے جائے نماز پر بیٹھے ہاتھ اٹھائے گڑگڑا
کر دعا مانگ رہے ہیں۔ داڑھی آنسوؤں سے تر ہے۔
حضرت فاطمہ نے جب ان کو اس حال میں دیکھا تو ان کا دل
بھر آیا۔ اور آنکھوں میں آنسو لا کر ان سے کہا۔ مسلمانوں
کے لیے آج عید کا دن ہے۔ تمام مسلمان خوشیاں
منا رہے ہیں۔ اور آپ جو ان کے سردار ہیں رو رہے ہیں۔
خلیفہ نے جب ان کی آواز سنی تو سر اوپر اٹھایا اور حضرت
فاطمہ سے فرمایا۔ فاطمہ! رمضان شریف کا مہینہ گزر گیا
کتنا مبارک مہینہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے گناہوں سے توبہ
کرنے، نیکیاں کمانے اور اپنی اصلاح کرنے کا کتنا اچھا
موقع دیا تھا۔ اب ہمیں سوچنا چاہیے کہ کیا ہم نے اس مبارک
مہینے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ ہم نے اتنی نیکیاں
کمائیں جو قیامت کے دن ہمارے کام آسکیں۔ اچھا مہینہ
ختم ہو گیا۔ یہ کہتے ہی آپؒ بے ہوش ہو گئے۔ حضرت فاطمہ
نے جلدی سے پانی کے چھینٹے منہ پر دیے تب جا کر آپؒ کو
ہوش آیا۔ اور پوچھا "فاطمہ تم میرے پاس کیوں آئی ہو؟"
انہوں نے کہا "بچے رات ہی سے ضد کر رہے ہیں کہ آج عید
ہے ہمارے لیے نئے کپڑے سلوا دیجیے۔ میں نے ان کو بہت
سمجھایا لیکن وہ مانتے ہی نہیں۔"
حضرت عمرؒ بولے "فاطمہ تم ہی بتاؤ کہ میں ان کے
لیے نئے کپڑے کیسے سلوا سکتا ہوں۔ میں بیت [illegible]
[illegible] کے لیے [illegible] تو دوسری طرف
کپڑے تک نہیں ہیں۔" یہ سن کر حضرت فاطمہ نے فرمایا۔
"آپ خلیفہ ہیں۔ بیت المال کی ساری کنجیاں آپ
کے ہاتھوں میں ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو وہ بیت المال سے
لے سکتے ہیں"۔ خلیفہ نے فرمایا "بیت المال کوئی میرا
اپنا خزانہ تو ہے نہیں۔ وہ تمام مسلمانوں کا ہے۔
میں تو صرف اس کا رکھوالا ہوں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ
بچوں کے کپڑے سلوانے کے لیے تمام مسلمانوں کی امانت
میں خیانت کروں۔ اور اس طرح بچوں کو خوش کر
کے اللہ تعالیٰ کو ناراض کروں"۔
یہ سن کر حضرت فاطمہ کچھ دیر سر جھکائے کچھ
سوچتی رہیں اور پھر بولیں "آپ اگلے مہینے کا وظیفہ پیشگی لے
لیں۔ مہینہ ختم ہوتے ہی کسی طرح کٹ ہی جائے گا اور
ان کی ضد بھی پوری ہو جائے گی۔" خلیفہ نے کہا "فاطمہ
تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں ابھی ایک مہینہ اور
زندہ رہوں گا۔ موت کا کیا ٹھکانہ جب بھی آ جائے
ممکن ہے آج ہی مر جاؤں تو آخرت میں اگلے مہینے کا
وظیفہ کس سے لوں۔ تم جاؤ بچوں کو سمجھا دو"۔
یہ سن کر حضرت فاطمہ واپس چلی گئیں اور
بچوں سمیت پھٹے پرانے کپڑوں میں عید کی۔

شیخ سانتڑو کا سودہ



کمال الدین صدیقی صاحب۔ گنج

ماہنامہ "پیام تعلیم" کا ماہ نومبر ۸۲ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ شمارہ بہت اچھا لگا۔ مولانا اجتباء ندوی کا "مسجد اقصیٰ" عزیزہ س۔ نور کا "وصیل جو مچھلی نہیں" محترمہ آصفہ مجیب کا "انقرہ میں چند دن" غلام ربانی کا "زہرہ" اور جناب مشہود مفتی کا "پینسل کی چند انوکھی عادتیں" نہایت ہی معلوماتی مضامین ہیں۔ کہانیوں میں جناب محمد امین کی "بہادر بوسبا" م۔ نسیم کی "اعلان رشید کا انصاف" نادم عثمانی کی "حاسد راجا کا انجام" جیسی کہانیاں بہت پسند آئیں۔

آپ اس انتھک کوشش دور میں۔ بچوں کے لیے اتنا اچھا جریدہ نکال رہے ہیں، یہ آپ کی اولوالعزمی کا ہی ثبوت ہے۔

کہانی، نظم اور دیگر تخلیقات کے آخر میں یا بشروع میں آپ اگر مصنفوں کے نام کے ساتھ ہی ان کے پتے بھی شائع کریں تو پیاری بھائی بہنوں کو ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے کی اچھی خاصی سہولت دستیاب ہو جائے گی۔

محمد الواحد سیل۔ ورشادم

نومبر ۸۲ء کا پرچہ زیر نظر ہے۔ طباعت اور کتابت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ خط بھی کشادہ ہے۔ طبیعت بہت خوش ہوتی ہے کمزور بصارت والا بھی آسانی سے پڑھ سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آیندہ بھی اسی طرح کتابت اور طباعت ہوگی۔ مضامین اور کہانیاں دو قسطوں سے زیادہ طویل نہ ہوں تو بہتر ہے۔ مختصر افسانہ نویسی اردو ادب میں زیادہ مقبول ہے۔ اسی طرح بچوں کے ادب میں بھی مختصر افسانہ نویسی زیادہ پسند کی جائے گی۔ مختصر اور نومبر کے پرچے میں محترمہ آصفہ مجیب کا مضمون "انقرہ میں چند دن" میری اس بات کی تائید کے لیے کافی ہے۔ محترمہ اگر چاہتیں تو اس کو اور طول دے سکتی تھیں مگر ظاہر ہے کہ مختصر جملوں میں انھوں نے اپنی مسرتوں کا اظہار کر کے ہمیں بھی اپنے گھریلو ماحول میں ... لینے کا سبق دے دیا۔ "ابونواس اور اس کی بیوی" تو مجھے بہت پسند آئی۔ آپ نے ترجمہ کرنے میں بڑا کمال کیا ہے۔ اب یہ کہانی غیر زبان کی نہیں اپنی ہی کہانی معلوم ہوتی ہے۔

مہرو دلوی تھانہ

نومبر کے پرچے میں تمام مضامین نظم و نثر بہت معیاری، کارآمد اور لائق تعریف ہیں۔ سرورق اور تصویر بہت عمدہ ہیں مگر بیچ میں مسجد اقصیٰ کی تصویر دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہا ہے ---



دریائی گھوڑا اور اس کا ننھا منا بچہ

Regd. ۲۹ D. 1457 DECEMBER

Payam - i - Taleem

NEW DELHI 25

ان کتابوں کو اپنی لائبریری کی زینت بنائیے

بڑے دادا	۱/۷۵	دہلی	۱/۵
سمندر کے نیچے	۲/-	ہماری پارلیمنٹ	۱/۵۰
سمندر کے کنارے	۱/۱۲	برف کا گھر	۰/۸۰
میر انیس	۱/۲۵	برف کے تیرتے پہاڑ	۰/۳۰
میر تقی میر	۱/۲۰	آستین کا سانپ	۰/۵۰
ابو خاں کی بکری	۲/۵۰	الٹی دوا	۰/۵۰
انوکھا عجائب خانہ (مکمل)	۱/۹۰	بادشاہ کے کپڑے	۰/۵۰
زمین اناڑی	۱/۴۰	زمین کی گردش	۰/۵۰
ستاروں کی سیر	۱/۰۵	سونے کی چڑیا	۱/-
خرگوش کا سپنا	۱/۷۵	چمپاوت کا آدم خور شیر	۰/۳۵
جن حسن عبد الرحمٰن (مکمل)	۴/-	ایک ٹانگ کا بادشاہ	۰/۳۰
آدمی کی کہانی	۱/۲۵	انوکھی ملاقات	۰/۲۵
بڑے دادا کی کہانی	۰/۵۶	جلو مرغابی	۱/-
چٹانوں کی کہانی	۱/۷۵	گلابو چوہیا	۰/۴۵
دادا نہرو	۱/۵۰	ظالم کسان	۰/۲۵

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنس بلڈنگ بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار، دہلی ۶

لے لیے۔

رضو ان کھلونوں کو دیکھ کر کچھ اتنی متوالی ہوئی اور یہ اسے کچھ ایسے پسند آئے کہ دو تین دن تو وہ انہی میں جیسے کھوئی سی رہی بس وہ تھی اور اس کے نئے کھلونے۔

ان میں ایک تو بہت خوب صورت بڑی سی گڑیا تھی اس میں ایک خاص بات یہ تھی کہ اُسے موڑا جائے یا پیٹ کے پاس ذرا سا دبایا جائے تو اس میں سے ایک آواز نکلتی تھی جیسے پکار رہی ہو "ممی"۔ جب بھی اُسے دباؤ پکارتی "ممی"! رضو کو اس کی آواز بڑی اچھی لگتی۔ وہ اُسے جلدی جلدی دباتی تو گڑیا بھی اتنی ہی جلدی جلدی چیختی جیسے سچ مچ کوئی چھوٹا سا بچہ چیخ رہا ہو۔

دوسرا کھلونا ایک چھوٹا سا کیکڑا تھا اس میں چابی لگی ہوئی تھی جب چابی بھر کر اُسے زمین پر چھوڑا جاتا تو وہ بڑی تیزی سے اپنی بہت سی ٹانگوں سے زمین پر اِدھر اُدھر رینگتا تھا اس کا چھوٹا سا منہ کھلتا اور بند ہوتا رہتا تھا۔ آگے کی دونوں ٹانگیں جن میں دو نکیلے ناخن بھی لگے تھے کھلتی اور بند ہوتی رہتی تھیں۔ بالکل ایسا لگتا جیسے جو چیز بھی اس کے سامنے آئے گی یہ دونوں ٹانگیں اُسے پکڑ لیں گی اور ناخن چبھ جائیں گے۔ یہ دونوں نئے کھلونے اُسے کچھ ایسے بھائے کہ بس دن بھر وہ انہی سے کھیلتی رہتی دو تین دن تو اپنے اور کھلونوں کو وہ بالکل بھولی رہی۔

ایک رات وہ اپنے بھیّا سے لڑ کر ابھی لیٹی تھی۔ بھیّا اس کے یہ نئے کھلونے چھیننا چاہتا تھا۔ اور رضو کو پتہ تھا کہ تین سال بڑے بھیّا کے ہاتھ کوئی کھلونا لگ گیا تو اس کی خیر نہیں۔ خیر اس وقت تو اس کی یہ نئی گڑیا اور کیکڑا سامنے اونچی سی الماری پر رکھے تھے۔ ابھی ابھی کمال کو امی نے بہت ڈانٹا تھا اس لیے ان کھلونوں کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ امی کا باورچی خانے کے کام سے قریب قریب فراغت پا چکی تھیں باجی چارپائی پر لیٹی پڑھتے پڑھتے سو گئی تھیں۔ بھیّا کمال نے جاتے وقت شرارت سے بجلی کا بٹن دبا دیا تھا۔ کمرے میں اندھیرا ہو گیا تھا لیکن باہر صحن کے بلب کی ہلکی ہلکی روشنی کمرے میں آ رہی تھی۔ رضو نے بھی سوچا اب کون اُٹھے، پہلے کرسی کھینچ کر بٹن کے پاس لائے پھر اس پر چڑھ کر بٹن کھولے، بس اس نے روشنی بغیر ہی لیٹے رہنا اچھا سمجھا۔ وہ یونہی خاموش لیٹی تھی اور وہی نئے کھلونے اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔

لے لو! اچانک اس نے ایک بات دیکھی بالکل ان ہونی بات بالکل انوکھی بات! اس کے پرانے کھلونوں کا ڈھکن آپ سے آپ کھل گیا۔ اس کو ڈر سے زیادہ حیرت ہوئی کہ اس بکس کا ڈھکن تو خود اس سے بڑی مشکل سے کھلتا تھا یہ آج اتنی آسانی سے اپنے آپ کیسے کھل گیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے سارے کھلونے اس میں سے باہر نکلنے لگے۔

سب سے پہلے وہ کھلونا باہر آیا جسے گھر میں سب لوگ جوکر کہتے تھے۔ جوکر بالکل بونا بھنا سا لگتا تھا۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ کھلی رہتیں، لمبی ناک اور پچکے ہوئے گلے، لال لال ہونٹ چندیا بالکل صفاچٹ۔ مگر ماتھے کو چھوڑ کر ہر طرف کنارے پر چند بال اُگے ہوئے تھے۔ غرض اس کھلونے کی صورت دیکھتے ہی ہنسی آ جاتی تھی۔

رضو نے دیکھا کہ اس کا جوکر کود کر باہر آ کر کھڑا ہو گیا اس نے باہر آتے ہی بکس میں جھانکا اور اپنے سب سے قریبی دوست سپاہی کو آواز دی۔

"اے سپاہی میاں کہاں ہو، چلو باہر نکلو"!

"میری مدد کرو"۔ اندر سے سپاہی کی آواز آئی۔ اور جوکر



مسجدِ اقصیٰ

(۲)

ہیرودس نے ہیکل کے اصل نقشے میں کچھ تبدیلی بھی کر دی اور اسے سیاست و عدالت کا مرکز بنا دیا، اس سے ہیکل بڑا، وسیع اور دلکش و دل فریب بن گیا۔

لیکن ہیکل کی یہ آخری بہار تھی، ہیرودس کے بعد جو رومی حاکم اس کے جانشین ہوئے وہ بڑے ظالم اور سخت گیر تھے۔ یہودی ان سے پریشان ہو کر بغاوت اور سرکشی پر آمادہ ہو گئے۔

رومیوں نے بیت المقدس (یروشلم) کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور تین برس تک مسلسل ان کا محاصرہ و گھراؤ جاری رہا، لڑائی، بھوک اور فاقہ سے یہودیوں کا بہت سخت جانی و مالی نقصان ہوا، رومی شہر میں داخل ہو گئے، اور اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا، ہیکل سلیمانی کو توڑ پھوڑ دیا، صرف ایک دیوار ہیکل کی یادگار کے طور پر باقی رکھی، جو بعد میں "دیوارِ گریہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہودی اپنے ہیکل اور مقدس یادگار اور مقدس توریت کی تباہی و بربادی پر اس دیوار کے پاس کھڑے ہو کر آنسو بہاتے اور روتے چلاتے تھے۔

ہیکل کی آخری تباہی اور بے حرمتی اگست ۷۰ء میں ہوئی اور اس کے بعد سے یہودیوں کا شیرازہ بکھر گیا، زوال اور بے چارگی کا دور شروع ہوا۔

بعد کے رومی بادشاہوں نے یہودیوں کو وہاں رونے سے بھی منع کر دیا تھا، اور اس جگہ کوڑا کرکٹ اور گندگی ڈالا کرتے تھے لیکن مسلمان ترکی بادشاہ سلطان سلیم نے وہاں سے گندگی اور کوڑا کرکٹ ہٹوا کر یہودیوں کو دوبارہ رونے کی اجازت دے دی۔ اور جون ۱۹۶۷ء میں بیت المقدس پر یہودی قبضہ تک یہ روایت باقی تھی۔

جب رومی بادشاہ قسطنطین عیسائی ہو گیا۔ تو بیت المقدس عیسائی شہر میں تبدیل ہو گیا، اور عیسائیوں کے قدیم ترین گرجا گھر "کنیسۃ القیامۃ" کی تعمیر ہوئی۔ یہ عمارت بڑی مضبوط، فلک بوس

سائنس دان اب تک یہی سمجھتے رہے کہ یہ کانٹے دشمن سے حفاظت کے لیے ہیں لیکن اب یہ نئی بات معلوم ہوئی کہ ان کا ایک اور مقصد بھی ہے بہت ہی اہم مقصد — چھپکلی کے جسم کی جلد پر ایک کانٹوں والی تہہ ہے اس میں ان گنت سوراخ ہیں۔ اگر پانی کا ایک قطرہ بھی چھپکلی پر ٹپکایا جائے تو یہ سوراخ فوراً اسے جذب کرلیں گے۔

عجیب بات یہ ہے کہ یہ پانی خود جسم کے اندر نہیں پہنچے گا۔ یہ سوراخ کچھ اس طرح کے ہیں کہ پانی جلد کے راستے بس ایک ہی طرف رُخ کرتا ہے یعنی سر کی طرف جاتا ہے یہاں یہ چھوٹے چھوٹے سوراخ والی گدیاں، تھون یا تھیلیوں میں جمع ہو جاتا ہے۔ یہ تھیلیاں چھپکلی کے منہ کے ایک کونے میں بڑی ہوتی ہیں۔ چھپکلی اک ذرا اپنا جبڑا ہلا کر ان تھیلیوں میں سے پانی کے قطرے اپنے منہ میں لے آتی ہے۔

مولوچ چھپکلی پانی نہیں پیتی ہے۔ صحرا میں کہیں کسی گڑھے میں پانی ہو یا کوئی چشمہ مل جائے تو اس میں غڑاپ سے ڈبکی لگالیتی ہے اس طرح وہ جلد کے سوراخوں یا مساموں سے بہت سا پانی جمع کرلیتی ہے اگر منہ سے پیتی تو اتنا ہرگز جمع نہ ہو پاتا۔ یوں سمجھیے کہ اس کی یہ مسام دار یا سوراخوں والی جلد اس کے لیے پانی کا اسٹور ہاؤس ہے۔

اور سنیے مولوچ چھپکلی کے کانٹوں کی نوکیں بھی ایک اور بڑا کام انجام دیتی ہیں۔ رات کے وقت ہوا میں پانی کے جو ننھے ننھے قطرے ہوتے ہیں کانٹوں کی نوکیں انھیں جذب کرلیتی ہیں اور یہ فوراً جلد میں پہنچ جاتے ہیں۔ گویا مولوچ چھپکلی ہوا سے نمی تری یا پانی جذب کرتی ہے۔

داران کو پنجرے میں بند کرنے کے بعد زیادہ پانی کی ضرورت کیوں ہوتی ہے

یہ سوال مضمون کے شروع میں ذہن میں پیدا ہوا تھا اس کا جواب بھی سنیے:

"ایک بار ریگستان میں سفر کرتے وقت میں نے بیٹھنے سے پہلے پتھر کے کچھ ٹکڑے ہٹائے ان میں سے ایک کچھ گیلا گیلا سا لگا پھر تو میں نے اور پتھروں کو دیکھنا شروع کیا بہت سے پتھروں پر نمی تھی اور نیچے کے چند پتھروں پر پانی کے ننھے ننھے قطرے بھی نظر آئے۔ ان پتھروں پر اور ان کے شگافوں میں صرف شبنم ہی نہیں گرتی بلکہ ہوا جب ریت میں داخل ہوتی ہے تو کچھ پانی بھی چھوڑ جاتی ہے۔ یہ پانی کسی شمار میں نہیں ہوتا برائے نام سمجھیے۔ مگر کبھی کبھی تو اچھا خاصا ہوتا ہے۔

کراکیمی (KARAKYMY) ریگستان کے انتہائی مغربی علاقے کے ریت میں تربوز پیدا ہوتے ہیں۔ بھلا یہاں پانی کہاں جو ان کی سینچائی کی جائے۔ ریگستان کے اس حصے میں کہیں کہیں تازہ اور صاف پانی کے سوت یا چشمے ہیں اور پھر خلیج کرا بوگز گول (KARABOGAZ GOL) بھیگی ہوئی یا نم ہوائیں لاتی ہے اور جب یہ ہوائیں رات میں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں تو ان میں اتنا پانی ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ریت انھیں جذب نہیں کرسکتا اور کسی گہرے گڑھے میں برتن رکھ کر اسے جمع کرسکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ داران سمیت صحرا یا ریگستان کے سبھی جانداروں کو معلوم ہے کہ شبنم کو کہاں سے ڈھونڈھ نکالا جائے جو چٹانوں کی دراروں میں اور بلوں میں یا جھنڈوں میں اکٹھا ہو جاتی ہے

حسین حسان ندوی

دوسری اور آخری قسط



لینن

ساشا غیر معمولی طور پر سنجیدہ اور متین تھے۔ ہر وقت خیالات میں ڈوبے رہتے تھے۔ اپنے کام کو پوری پوری ذمے داری کے ساتھ انجام دینے کا شدید احساس رکھتے تھے۔ لینن کے لیے تو وہ ایک مثالی نمونہ بن گئے تھے۔ لینن کوئی بھی کام کرتے ساشا کے ذمہ داری کے احساس اور اپنے کام کی طرف پوری پوری توجہ کی مثال ان کے سامنے ہوتی۔

ساشا میں ایک اور بڑی خوبی تھی اور وہ خوبی تھی دوسروں سے اچھا سلوک اور برتاؤ۔ سلیقہ مندی شفقت سب کے ساتھ منصفانہ اور برابری کا یا مساویانہ برتاؤ۔ یہ خوبی یا خوبیاں ایسی تھیں کہ گھر کے سبھی لوگ ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ لینن تو ان سب اچھائیوں کی پوری پوری نقل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

لینن ذرا مزاج کے تیز تھے مگر ساشا کو اپنے مزاج پر پورا قابو تھا وہ بہت متحمل مزاج اور بردبار تھے۔ لینن نے ساشا کی اس خوبی کو بھی اپنایا۔ ایسا اپنایا کہ دھیرے دھیرے یہ ان کی عادت بن گئی۔ یہ اچھی عادت بعد کی زندگی میں بہت کام آئی اور اچانک بھڑک اٹھنے کا کوئی واقعہ بہت کم دیکھنے میں آیا۔

اپنوں کی اور دوسروں کی کمزوریوں اور خامیوں کو پرکھنے کی عادت لینن میں بچپن سے تھی۔ کہتے ہیں کم عمری میں بھی دوسروں کی کمزوریوں کی طرف ان کی نظر بڑی تیزی سے جاتی تھی اور وہ ان کا خوب مذاق اڑاتے تھے۔

مگر ساتھ ہی ساتھ دوسروں کی خوبیاں بھی ان کی نظر میں کھب جاتی تھیں اور پھر وہ یہ دیکھتے تھے کہ یہ اچھائیاں خود ان کے اندر ہیں یا نہیں اور دوسرے لوگوں کی کون سی اچھائیاں ہیں جو انھیں اختیار کرلینی چاہئیں۔

لینن کی یہ عادت برابر ترقی کرتی گئی اپنے کاموں کی جانچ بڑی سختی سے کرتے تھے۔ اپنی کمزوریوں خامیوں ناکامیوں پر ان کی نظر بڑی تیزی سے جاتی تھی مگر سمجھ بوجھ ہونے کے بعد یہ چیز ان کے کیرکٹر کا ایک خاص جزو بن گئی۔

لینن کو شیخی بگھارنے سے بھی بچپن سے نفرت تھی۔ بڑی عمر میں تو اس طرح کی بری خصلتوں کو تو وہ برداشت نہیں کرسکتے تھے۔

یہ سب پڑھ کر آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ لینن کوئی بہت ہی خشک مزاج آدمی تھے۔ اپنے ساتھیوں میں دوستوں میں یا اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے درمیان ان کی خوش مزاجی ہنسی دل لگی کی باتیں۔ چھوٹے بہن بھائیوں میں کھیل کود